جشنِ آزادی مبارک
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
سسپنس ڈائجسٹ
اگست 2017
نگران اعلیٰ
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ
مدیرِ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 47 • شمارہ 08 اگست 2017 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

جون ایلیا

ورنہ ظاہر ہے

اب تو میں نے یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ پاکستان کو وجود میں آئے کتنے برس ہوئے یا کتنے دقیقے۔ گزشتہ سال ہا سال پہلے کے پاکستان کے اطوار کیا تھے اور اب اس سالگرہ کے موقع پر اس کا حال احوال کیا ہے؟ ''پاکستان کی سالگرہ، یومِ آزادی یا جشنِ آزادی'' کے کیا معنی ہیں، یعنی آخر کیا؟

کیا ان لفظوں کے کوئی معنی ہیں؟ کیا ان لفظوں کے کوئی معنی بھی ہونے چاہئیں۔

امِ فروہ کی شمیم زیر بغل کی قسم، ان لفظوں کے اب کوئی معنی نہیں ہیں۔ کبھی ان لفظوں کے کچھ معنی تھے۔ ایک زمانے میں پاکستان کی سالگرہ کا جشن بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اسے واقعی ایک قومی تہوار کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور ہونا بھی چاہیے تھا۔

پاکستان کے بارے میں قائداعظم کی وفات کے بعد دو طرح سے سوچا جانا شروع ہوا۔ کچھ لوگ وہ تھے جن کا خیال تھا کہ پاکستان خلافتِ راشدہ کا دوسرا دور ہے جو چودہ سو برس بعد کارفرما ہوا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف کوئی توجہ نہیں دی کہ پاکستان کے بڑے راہنماؤں کا رہن سہن، ان کا طرزِ رفتار و گفتار، ان کا حلیہ اور ان کا ہنجار یکسر فرنگی ہے۔ وہ رنگ دار انگریز ہیں۔ معلوم نہیں کہ وہ ان کرسٹانوں کوٹ پتلون پہننے والے ڈاڑھی منڈوں سے یہ امید کیسے رکھتے تھے کہ وہ مقدس خلافتِ راشدہ کے دور کا احیا کریں گے۔ کوئی شبہ نہیں کہ یہ اگر تاریخ کی بے مثال بھول نہیں تو سادہ دلی اور سادہ لوحی ضرور ہے۔

اب رہے دوسری طرح کے لوگ، ان کا خیال تھا اور ہے کہ پاکستان ایک خوش حال اور روشن خیال ریاست ہے۔ وہ اس جدید عہد کی ایسی ریاست ہے جس کے اعلیٰ حکمران مسلمان ہوا کریں گے اور یہ کہ پاکستان اس لیے بنا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت ننگی بھوکی تھی...... الم ناک حد تک پس ماندہ اور درماندہ تھی۔ پاکستان کا حصار انہیں کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے بغیر ایک جمہوری، ترقی یافتہ، مہذب اور معاشی طور پر ایک پُرمایہ قوم بنانے میں فیصلہ کن کردار ادا کرے گا لیکن ہوا یہ کہ نہ پہلے گروہ کی امیدیں پوری ہوئیں اور نہ دوسرے گروہ کی۔ یہ دوسرا گروہ جو سوچ رکھتا تھا، وہ میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ کیا وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ پاکستان میں زمیں داری، جاگیرداری اور قبائلیت کو باقی رہنا ہے۔ سو ایک جاگیردار اور قبائلی ملک میں عوام کی بات کرنا، جمہوریت کی بات کرنا، خوش حالی کی بات کرنا اور عام لازمی تعلیم کی بات کرنا، ایک پاگل پن کی بڑ نہیں؟

مشکل یہ ہے کہ عوام اللہ میاں کی گائے ہوتے ہیں۔ وہ ہر کسی بڑبولے کی سنتے اور مانتے ہیں۔ یہاں کے حکمران بڑے باتونی گزرے ہیں۔ بڑبولے پن اور بڑ ہانکنے میں ان کا کوئی جواب نہیں پیش کیا جا سکتا۔ ان کی ہر بات سننے والوں کے درمیان کرسی نشین ہو جاتی تھی۔ یہ لوگ یہ عالم پناہ لوگ باتوں کا جھاڑ باندھ دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ ان کی باتیں دل میں اتر جاتی تھیں۔ عوام ہر بار نا امید ہوتے تھے مگر جب کوئی دوسرا بدبنا اور بڑبولا آتا تھا تو ان کی شنوائی، اس کی ہرزہ سرائی کی دل سے بیعت کر لیتی تھی اور نئے خواب و خیال کا بے جا اور بے ہودہ سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

اب تک جو ہوا وہ یہ تھا۔ اب پھر ایک امید پرور اور امید پرور ہی نہیں بلکہ ''منتظم اعلیٰ'' آئے ہیں۔ منتظم اعلیٰ کے معنی شش پہلو ہیں۔ ہماری ان سے درخواست ہے کہ وہ کوئی امید نہ دلائیں۔ یہ میری سچی درخواست ہے۔ بے امیدی کے بھی اپنے مزے ہوتے ہیں اور اگر انہیں بھی امید دلانا ہے تو پھر وہ امید پوری ہونی چاہیے۔ آخر عوام کے ساتھ مذاق کرنے کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ اب امید دلانا ہی نہیں ہے، اسے پورا بھی کرنا ہے۔ ہمیں یقینی طور پر پوری ہونے والی امید درکار ہے اور بس۔ ورنہ...... ورنہ ظاہر ہے!

☆☆☆

آپ کے خط

عزیزانِ من!

السلام علیکم!

اگست 2017ء کا شمارہ جشنِ آزادی کی سوغات لیے حاضر ہے۔ امید ہے کہ گزشتہ عید الفطر کے خوبصورت لمحات آپ کے لیے خوشیوں کا پیام لائے ہوں گے اور اپنوں کے ساتھ ساتھ اپنی خوشیوں میں حقداروں کے حقوق بھی ادا کیے گئے ہوں گے۔ اللہ ہم سب کی نیکیوں اور عبادات کو قبول فرمائے (آمین) ایک عید گئی دوسری چلی آئی 14 اگست کا دن بھی تمام پاکستانیوں کے لیے عید جیسی خوشی سے کم نہیں مگر ہر پاکستانی اس دن کا خاص طور پر ملکی حالات و ماحول، مسائل اور وسائل کے تناظر میں ایک خاص نگاہ سے محاسبہ کرنے لگا ہے...... اور سب سے آخر میں یہ سوال ذہن کے کسی گوشے میں لازمی پھانس کے مانند چبھتا ہے کہ کیا اسی دن اور ان ہی حالات کے لیے قائد نے پاکستان بنایا تھا...... کیا وہ مشکلات اسی لیے جھیلی تھیں کہ آئندہ آنے والی نسلوں کی مشکلات اور تکالیف کبھی کم نہ ہوں...... خدارا نئی نسلوں کی امیدوں اور خوابوں کی حفاظت اور قدر کیجیے اور ان پر پورا اترنے کی کوشش بھی کہ اربابِ اختیار اور حکومتوں سے عوام اپنے خواب اور امیدیں وابستہ کیے ہوئے زندہ رہتے ہیں۔ باتیں تو بہت ساری کرنا ہیں آپ سے مگر ان میں سے ایک بات جو بالخصوص کرنا چاہتے ہیں...... جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ سسپنس کے اجرا کو تقریباً چار عشروں سے زیادہ وقت گزر چکا ہے۔ لہٰذا قارئین کی جگہیں بھی بدل چکی ہیں۔ جنہوں نے جوانی میں سسپنس کی .... رفاقت اپنائی وہ یقیناً اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں اور جو نئی نسل سسپنس کی یادگار تحریریں نہیں پڑھ سکی، ہم ان کے لیے خاص طور پر گزشتہ 70 اور 80 کی دہائی کے شماروں سے نادر اور یادگار تحریریں ''سسپنس کلاسک'' کے عنوان تلے گاہے بگاہے شائع کرتے رہیں گے۔ اگرچہ پہلے بھی یہ کوشش کی گئی مگر آپ میں سے کچھ قارئین اس بات کی حقیقت اور افادیت کو نہ جان سکے۔ لہٰذا اس وضاحت کی ضرورت محسوس کی گئی تاکہ ہماری نئی نسل تک بھی گاہے گاہے یہ خوبصورت تحریری مواد پہنچ سکے اور کتاب پڑھنے کی عادت کو مزید رواج اور پختگی مل سکے۔ بالخصوص ان مرحوم مصنفین کی یادگار تحریریں جن کی آپ لوگوں نے بے حد فرمائش بھی کی ہے اور ان کی تحریریں ہمارے لیے کسی قیمتی سرمائے سے کم نہیں ہیں جن سے نئی نسل کو روشناس کرانا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ عہدِ حاضر میں انٹرنیٹ اور موبائل نے تو بچوں کو کتاب سے بہت دور کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں آپ کی آراء کا انتظار رہے گا۔ امید ہے کہ آپ ہماری کاوش کو ضرور سراہیں گے۔ ان باتوں کی حقیقت ایک طرف اور اپنی محفل کی رونق ایک طرف۔ تو جناب ان باتوں کی ڈور ہاتھوں میں لیے چلتے ہیں اب اسی رنگا رنگ رونق کی طرف۔

⌘ عادل عباسی، بہاولپور سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''اس دفعہ عید کا شمارہ نہایت دیدہ زیب سرورق اور بہترین داستانوں سے مزین ملا جس کے لیے میں ادارے کا مشکور ہوں۔ یقیناً جس وقت آپ لوگوں تک میرا یہ محبت نامہ پہنچے گا، آپ عید سعید کی خوشیوں سے خوب لطف اندوز ہو چکے ہوں گے جس کی مبارک باد دینا ہمارا فرض اور وصولنا آپ کا حق ہے۔ لیجیے حضور سسپنس کے تمام قارئین کو ہماری طرف سے عید مبارک (خیر مبارک)۔ دعا ہے خدا آپ کا ہر دن عید اور ہر رات مسرتوں سے بھر دے۔ سب سے پہلے پڑھی جانے والی کہانی حسام بٹ صاحب کی وقت تھی لیکن...... تبصرہ ہم جون ایلیا کے انشائیہ سے کریں گے۔ جناب نے کیا خوب لکھا حکومت چاہے کسی بھی بادشاہ کی رہی ہو سکہ ہمیشہ نوکر شاہی کا ہی چلا ہے۔ لگتا ہے ہم الٹ کر گئے خیر سمجھ تو گئے ہوں گے آپ۔ یہ حقیقتیں صرف بادشاہت تک ہی محدود نہیں رہیں، حضور آج کے اس جمہوری دور میں بھی کمشنر سے زیادہ بااختیار اس کا چوکیدار اور اسپتال کے ایم ایس سے زیادہ اس کا نائب قاصد نظر آئے گا...... خیر سانوں کی۔ اس دفعہ عید کے خصوصی شمارے کی بادشاہت پائندہ خان سلیمان خیل کی خوش نصیبی کا اعلان کر رہی تھی۔ جناب کا تبصرہ بھرپور اور شاندار تھا لیکن حضور کا نام خاصا وضاحت طلب ہے۔ وزارت پر نوکر شاہی کی عملی تفسیر زرین آفریدی موجود تھیں (نیور مائنڈ) بخش صدیقی کی شادی کی مبارک باد حاضرِ خدمت ہے۔ قبول فرمائیے۔ مٹھائی بہاولپور بھجوا دیں۔ محترمہ پاکستان کے حالات سے کافی مایوس اور دلبرداشتہ نظر آئیں جبکہ مایوسی کفر ہے۔ ہمیں اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہونا چاہیے، باقی رہی حالات کی بات تو پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ اللہ رب العزت کے فضل اور اس کے بعد پاک فوج کی محنتوں اور قربانیوں سے حالات درست ہو چکے ہیں۔ خدا ہمارے ازلی دشمن کو ذلیل کرے۔ اپنوں سے غیریت اچھی بات نہیں۔ کہانیوں میں ہماری عدالت کے فیصلے کے مطابق پہلی پوزیشن پر کبیر عباسی کی (دُرِ پردہ) رہی۔ جناب کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟ معزز مصنف نے مشہور کہاوت دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی شہتیر نظر آتا ہے کی عملی تفسیر اور انسانی ذہن کی کج روی پر بھرپور وضاحت انتہائی ماہرانہ اور دلنشین انداز میں کی۔ یہ بات سچ ہے کہ ہم نے آج دین اور دنیا کو الگ پلڑوں میں رکھا ہوا ہے حالانکہ دین معاملاتِ دنیا کی اصلاح کے لیے اتارا گیا ہے۔ دوسرے نمبر پر مغرب سے

دریافت شدہ تحریر شاکر لطیف کی (نشانہ) رہی۔ رشتوں کے بیوپار کا گورکھ دھندا کرنے والے ڈین اینڈ کمپنی اپنے انجام کو پہنچی۔ راسٹر کو عین وقت پر آنے والی سمجھ اس کو بڑی تباہی سے بچا گئی۔ حسام بٹ کی تحریر (تقاضائے انصاف) انصاف کے تقاضوں پر پوری نہ اتر سکی (معذرت کے ساتھ)۔ ظفر اقبال ظفر کی (اعتماد شکن) کُل فی سبق آموز تحریر تھی۔ بے وقوفی احمر کی تھی جو عدیل جیسے کمینے کو گھر گھسالایا۔ دوستیاں گھر سے باہر ہی اچھی لگتی ہیں۔ آنبل مجھے مار والے کام کر کے مظلومیت کا رونا بجز حماقت کے کچھ نہیں...... خیر...... حسام بٹ صاحب کی وقت اچھی جارہی ہے۔ کسی کو مزہ آئے یا نہ آئے، ہمیں تو آرہا ہے۔ خاص کر ہمارے ہیرو کی ڈیلفی سے چھیڑ خانیاں اور فلرٹ، اچھے جارہے ہو بھائی۔ ڈیلفی کی منفی قوت، کمرے میں آگ لگ جانا کچھ ہضم نہیں ہو رہا۔ مجھے تو یہ سب ربی آئرک اور ڈیلفی کی ملی بھگت لگ رہی ہے اس بچے کو پھنسانے کی۔ اب یہ اپیل کا بام، آئی مین...... ایما اپیل بام کی آمد بھی اسی کی کڑی بلکہ شہتیر لگتا ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی غرق محبت بھی خوب رہی لیکن انجام ہماری محبت جیسا ہی ہوا...... واہ ری قسمت مغل صاحب کی نظم اک ٹیس بھی اٹھ کے کہتی ہے، تم کب تک مجھ کو بھولو گے۔ واہ صاحب! دل ہی لوٹ لیا۔ کیا کہنے۔ بہاولپور کی کہانی تھی، اپنی اپنی سی لگی لیکن ایک بات نا قابلِ ہضم ہے (ہاجمولا بھجوا دیں) کہ سخت سیکورٹی حصار اور پھر ایک بچہ وہ بھی تیرہ سال کا ہاتھ میں خنجر لیے کیسے اندر داخل ہو سکتا ہے؟ شیش محل نہایت بوجھل اور تھکی ہوئی سی اختتام پذیر ہوئی جو خاص متاثر نہ کر سکی۔ کسی اچھی کہانی کے منتظر ہیں۔ محفل شعر و سخن میں اشفاق شاہین لاہور، مرحا گل، رمنا گل، درابن کلاں اور سنعیہ منظور، یوحنا آباد لاہور کا انتخاب پسند آیا۔ دعا ہے خدا آپ کو ہنستا مسکراتا رکھے۔"

✠ ناہید یوسف کی اسلام آباد سے شرکت۔ "رمضان کے آخری عشرے کے روزے تھے، ویسے تو ہم رمضان سے قبل ہی ضرورت کی ہر چیز لے لیتے ہیں مگر اس دفعہ کچھ چیزیں رہ گئی تھیں، سو وہ لینے کے لیے بازار کا رخ کیا۔ چیزیں خرید کر جب ہم واپسی کا ارادہ کر رہے تھے تو فٹ پاتھ پر ایک چھ، سات سالہ بچے کو بے سروساماں اور اداس کیفیت میں بیٹھے پایا۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے نہ آنے والی "عید" کا پتا ہے نہ کچھ اور...... وہ تو بس اپنی ہی دنیا میں مگن سب سے لاتعلق بیٹھا تھا۔ ہم نے اسے دیکھا تو جانے کیوں ہمارا دل تڑپ اٹھا۔ آخر کو ہم بھی ایک ماں ہیں، ہم نے فوراً گاڑی رکوائی۔ میں اس کے پاس گئی۔ جب اس کا حال پوچھا تو اس نے نظر اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ اس کی "اس" نظر نے ہمیں سرتا پا لرزا دیا۔ کیونکہ اس معصوم کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ بہ زبانِ خموشی جیسے اپنی زبوں حالی پر نوحہ کناں تھیں۔ جب ہم نے اسے تسلی دلاسے دینے کے بعد پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک دن سے بھوکا تھا۔ ماں باپ اس کے تھے نہیں اور وہ یونہی فٹ پاتھوں، سڑکوں کی زینت بنا ہوا تھا۔ خیر ہم اسے اپنے ساتھ لائے، نہلایا دھلایا، نئے کپڑے پہنائے اور اس کے لیے کھانا لگایا۔ مختصراً یہ کہ ہم نے ہر طرح سے اس کی دلجوئی کی اور اب ہمارا ارادہ اسے اپنے پاس رکھنے کا ہے۔ اس کے لیے ہم قانونی پیچیدگیوں کو بھی مدنظر رکھ کر "اقدامات" کر رہے ہیں۔ یہ سب بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہمارے ملک میں اس طرح کے لاتعداد بچے جو ہمارا مستقبل ہیں، حالات کی چکی میں پس رہے ہیں۔ نہ ہمارے ملک میں قانون کی پاسداری ہے اور نہ ایسے بچوں کے لیے حکومت کچھ کر رہی ہے۔ ایسے بچے جن کا کوئی پرسانِ حال نہیں، حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر غلط ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں یا کسی غلاظت میں پڑ جاتے ہیں۔ خدارا! ہماری حکومت، اعلیٰ عہدیداروں اور عوام سے جو بھی قابلِ استطاعت ہے، سے گزارش و التجا ہے کہ ایسے بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے اقدامات کریں اور انہیں "اپنا فرض" سمجھ کر ان کی بہتری، پرورش، تعلیم و تربیت کے لیے جو ممکن ہو سکتا ہے، کریں...... تاکہ اس ملک کا آنے والا مستقبل تابناک ہو اور یہاں کا بچہ بچہ تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو اور ملک کا نام روشن کرے۔ دعا ہے کہ رب تعالیٰ ہمارے ملک سے غربت کا خاتمہ کرے اور ہمارے حکمرانوں اور ہم عوام میں "دوسروں کا احساس" پیدا کرے تاکہ پھر کوئی بچہ سڑکوں، فٹ پاتھوں پر زندگی بسر نہ کرے...... آمین۔ اف! آج تو میں جذباتی ہو گئی۔ کیا کریں، دل جو دکھا ہوا تھا۔ خیر محفل کے سبھی دوستوں کو ہماری طرف سے خوش آمدید۔ سب کو دلی عید مبارک۔ محفل کے سبھی ساتھیوں نے جنہوں نے ہمارا تبصرہ پسند کیا، سب کا ہماری طرف سے شکریہ۔ دعا ہے یہ محفل اسی طرح قائم و دائم رہے۔ سب سے پہلے تو ہم تبصرہ کریں گے غرقِ محبت پہ، کیونکہ کیا شاندار کہانی تھی۔ مغل صاحب نے دل خوش کر دیا مگر اینڈ میں تشنگی اور اداسی دے گئے۔ کم از کم ہیروئن کو تو صحیح سلامت رکھتے۔ تاریخی کہانی سلسلے وراثت کے اچھی تحریر تھی۔ تاریخی کہانی کا فائدہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ شیش محل کا اینڈ کافی اچھا رہا۔ اسما قادری نے تمام کرداروں کے ساتھ بھرپور انصاف کیا۔ بس چاند بانو اکیلی رہ گئی، اس کا افسوس ہوا۔ چھوٹی کہانیوں میں ہمیں شاکر لطیف کی نشانہ سب سے اچھی لگی۔ بہت اچھی اسٹوری تھی۔ واقعی مافیا تنظیمیں رشتوں کو نہیں دیکھتیں۔ انہیں تو صرف مفادات سے غرض ہوتی ہے۔ بہرحال راسٹر سیدھے راستے پر چلا اور قسمت اس کے ساتھ تھی جو اس کی جان بھی بچ گئی۔ منظر امام کی آنکھیں بھی اچھی کہانی تھی۔ نیا سلسلہ وقت ابھی تو کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکا ہے۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ ہمیں اس کہانی میں ابھی تک کوئی دلچسپی کا سامان نظر نہیں آیا۔ آگے دیکھتے ہیں کہانی اپنا رنگ جماتی ہے کہ نہیں۔ مرزا امجد بیگ کی تقاضائے انصاف بہتر کہانی تھی۔ امجد بیگ صاحب قانونی پیتروں کے علاوہ جاسوسی وغیرہ کا نیٹ ورک بھی اچھا چلاتے ہیں۔ ثمر عباس کی دوسرا دشمن تھوڑی پیچیدہ کہانی تھی۔ کہانی نے خاص مزہ قائم نہیں کیا۔ ظفر اقبال کی اعتماد شکن ہمیں زبردست لگی۔ بیوی کی وفائی نے دکھی کر دیا اور احمر کی موت کا بھی افسوس ہوا۔ تاہم احمر نے شائلہ کو عدیل کا نہ ہونے

دیا۔ تصوف کے بارے میں ہم کیا کہیں۔ اتنے ایمان افروز واقعات پڑھ کر دل منور ہو جاتا ہے۔ شکریہ ضیا تسنیم بلگرامی آپ کا۔ محفلِ شعروسخن کے تمام اشعار قابلِ داد تھے۔ مجموعی طور پر رسالہ شاندار تھا۔‘‘

✠ محمد صفدر معاویہ کا ضلع خانیوال سے تبصرہ۔ ’’جولائی 2017ء کا شمارہ 18 جون کو ملا پشاور میں۔ سرورق کو ایک خوبصورت ماڈل عطا کی گئی جو اس کی رونق دوبالا کر رہی تھی۔ جون ایلیا صاحب اپنے لفظوں کے موتی خوبصورت انداز میں بکھیر رہے تھے تو آپ بھی اپنے اداریہ میں مسائل اور خوشیوں کی بات کرتے نظر آئے۔ اللہ پاک تمام مسلمانوں پر اپنا کرم فرمائے اور آپ کو بھی مبارک ہو۔ کہانیوں میں شروعات کی شیش محل سے۔ جب پڑھنا شروع کیا تو لگا کہ یہ آخری قسط ہے۔ جب پلٹ کر دو صفحات واپس آئے تو واقعی میں محترمہ اسما قادری صاحبہ کا خوبصورت ناول اپنے اختتام کو جا پہنچا۔ ابھی ہمیں یہ امید نہیں تھی پر مصنفہ کی مرضی...... آخری قسط کافی جاندار رہی کہ آغا نے جولی کے ساتھ نہیں بلکہ ثنا نے کھیل کھیلا اور آخر میں بہت بری بیماری میں پھنسی۔ ادھر محب اللہ فاروق بھی واپس پہنچا اور جولی اور اس کا آخر کار ایک ہونا لکھا تھا۔ باقی تمام کرداروں کو بھی ان کے انجام تک پہنچایا گیا، پر سب سے بڑھ کر خوبصورت انداز رہا چاند بانو کا جس نے محبوب کی خاطر یہ گوارا نہ کیا کہ وہ میری وجہ سے مشکل میں پڑے اور گھر کو چھوڑ کر اپنے اللہ سے اور رشتہ مضبوط کر لیا۔ ایک تشنگی رہ گئی کہ اڈے والوں کا کیا بنا۔ ویری ویلڈن اسما جی۔ اس کے بعد مغل صاحب کی غرقِ محبت پڑھی۔ دلاور کو اس کی محبت مل کر بھی نہ مل سکی۔ کاش وہ سویرا کی بات مان لیتا اور باہر چلا جاتا اور شاید کہ وہ اور جی لیتی پر مغل صاحب کو یہ منظور نہیں تھا۔ باقی درمیان میں جو کچھ اس پر بیتا اور جو کچھ اس نے کیا ویری نائس مغل صاحب پر آپ سے یہ اتنی جلدی ختم کرنے کی امید نہ تھی پھر پہلے صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کی سلسلے وراثت کے پڑھی عالم گیر اور اس کے بیٹوں نے حکومت کرنے کے لیے اپنے سگے بھائیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ شاہ عالم نے تھوڑی سی کوشش کی بھی سارے مل بانٹ کر کھالیں پر اعظم اور کام بخش کو سمجھ نہ آئی۔ اگر یہ اس طرح بانٹ کر حکومت کر لیتے تو شاید آج ہماری تاریخ کچھ اور ہوتی۔ تبصروں میں پائندہ خان اپنے بہترین تبصرے کے ساتھ کرسیِ صدارت کے حق دار ٹھہرے۔ مبارک ہو جی۔ باقی دوستوں کے تبصرے اور باقی رسالہ ابھی پڑھنا باقی ہے جو ٹائم کی کمی کی وجہ سے نہیں پڑھ سکا۔ اللہ کرے جس طرح روزے سکون سے گزر رہے ہیں، ویسے عید بھی امن و امان سے گزرے۔ باقی موسم نے کچھ تو گرمی میں کمی کر دی بارشوں کی صورت باقی واپڈا والے کہتے ہیں روزے تو اس وقت بھی رکھے جاتے تھے گرمی میں جب بجلی نہیں تھی۔ پاکستان نے بھارت کو فائنل میں شکست دے کر چیمپئنز ٹرافی جیت کر پاکستان کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ عید کا بہترین تحفہ دیا ہے ہماری پاکستانی ٹیم نے قوم کو۔ تمام پاکستانیوں کو یہ جیت مبارک اور پاکستانی ٹیم کا بہت شکریہ کہ ہمیں اتنی بے انتہا خوشی دی ہے۔ اللہ پاک آپ کو اسی طرح کامیاب و کامران رکھے آمین۔‘‘

✠ اشفاق شاہین، لاہور سے حاضرِ محفل ہیں۔ ’’عید الفطر کی مناسبت سے حسینہ ٹائٹل پر بہترین انداز میں جلوہ افروز تھی، سرورق پسند آیا۔ انشائیہ میں جون ایلیا نے جمہوریت کی اصل حقیقت کو کھول کر بیان کیا ہے اور اس لفظ جمہوریت سے حقیقتاً فائدہ اٹھانے کے لیے عوام میں شعور کا ہونا بنیادی کنجی ہے۔ اپنی محفل میں پہنچے، پائندہ خان کرسیِ صدارت پر بہترین تبصرے کے ساتھ براجمان تھے، مبارک باد۔ زرین آفریدی، عبدالجبار رومی، رمضان پاشا، مرحا گل، زاہد خان، محمد خواجہ، ادریس خان اور صفدر معاویہ بہترین تبصروں کے ساتھ محفل کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتے نظر آئے۔ بینش صدیقی کو شادی کی ڈھیروں مبارک باد۔ مسز صدیقی آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ خبر گرم تھی کہ شیش محل کی آخری قسط ہے، یقین نہیں آ رہا تھا۔ پرچہ ہاتھوں میں آیا تو یقین آیا۔ کہانی کا ٹیمپو ایک دم اتنا تیز کر کے اس کو ختم کر کے اچھا نہیں کیا گیا اور مزید ستم غرقِ محبت کو ختم کر کے کیا۔ بہرحال پہلے شیش محل پر آتے ہیں۔ فاروق نواب محب اللہ اپنے بڑوں اور چاہنے والوں کے درمیان پہنچا۔ زندگی بھر جس سے یکطرفہ محبت کرتا رہا اسے پا لیا لیکن گھر پہنچنے کے وقت جذباتی مناظر نے ہمیں دکھی کر دیا تھا۔ چاند بانو کی ریاضتوں نے کام تو کیا لیکن وہ پھر بھی بے ثمر رہی، چاند بانو کا لازوال کردار ہمیشہ یاد رہے گا۔ ایسے مخلص لوگ خال خال ملتے ہیں۔ بہرحال شیش محل نے اپنا رنگ جمایا ہوا تھا۔ ابھی امید رکھتے ہیں کہ اس سے بھی بہتر اور دلچسپ کہانی لے کر آئیں گے۔ اعلان نہ کر کے آپ نے سسپنس کو بڑھا دیا ہے۔ غرقِ محبت بہترین رہی۔ سویرا کا لافانی کردار، دلاور کی ترقی اور تیزی اور انتقام اور آخر میں وصال کے بعد نمناک انجام غمزدہ کر گیا۔ بہرحال بہت دلچسپ اور بہترین تحریر تھی۔ ’’وقت‘‘ اپنی جگہ بہترین جا رہی ہے۔ اسد علی ابھی تک ڈیلفینا کے حیرت کدے کی بھول بھلیوں میں گم ہے۔ اس میں دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔ تنویر ریاض کی سزا بھی بہت اچھی لگی۔ کبیر عباسی کی ’’درِ پردہ‘‘ فکر انگیز اور سبق آموز تحریر تھی، پسند آئی۔ شاکر لطیف کی ’’نشانہ‘‘ مختصر کہانیوں میں سب سے بہترین رہی، بہت پسند آئی خصوصاً انجام زبردست رہا۔ مرزا امجد بیگ اپنے مخصوص انداز کے ساتھ انصاف کے تقاضے پورے کرتے نظر آئے، ویلڈن اور محفلِ شعروسخن میں انتخاب بہترین رہا، خصوصاً نوید ہاشمی، منیر شگفتہ اور عالیہ خان کا انتخاب لاجواب رہا۔‘‘

✠ محمد خواجہ کی کورنگی، کراچی سے آمد۔ ’’جولائی کا شمارہ وقت پر مل گیا۔ سرورق پر عید کے لیے سج دھج کر دوشیزہ نے اپنے حنائی ہاتھ کو اس طرح رکھا ہے جیسے اب انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے والی ہیں۔ پہلی دفعہ ادارے کی ایک بڑی غلطی کی شکایت ملاحظہ فرمائیں۔

جب مجھے رسالہ ملا تو میں سب سے پہلے کترنیں اور فہرست مضامین دیکھتا ہوں۔ بیچ کے کچھ صفحات غائب تھے۔ (آپ کی شکایت بجا ہے۔ اکثر چند کاپیوں میں بائنڈنگ کی غلطی کی وجہ سے ایسا ہوجاتا ہے۔ آپ ادارے سے پرچہ بدلوا سکتے ہیں) ۔ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ سلسلے وراثت کے، تاریخ کے حوالے سے بہت دلچسپ سبق آموز لاجواب کہانی معلومات اور منظر کشی کا خزانہ لیے ہوئے۔ شیش محل آخر اپنے اختتام کو پہنچی، اسما قادری صاحبہ نے اپنے زورِ قلم سے کہانی کے تانے بانے کو بڑی خوبصورتی سے قائم رکھا۔ مصنفہ کا مشاہدہ، مطالعہ، یا پھر تجربے کو خوبصورت شکل دینا کوئی معمولی بات نہیں۔ آخری قسط میں ہر فسانہ اور کردار کو اپنے منطقی موڑ پر لا کر پورا کیا گیا۔ یہ داستان ذہن اور دل پر یادگار نقوش چھوڑ گئی۔ مبارک باد قبول ہو۔ سزا، دو معصوم بچوں کی مجبوری اور جسم وجاں کے رشتے کو قائم رکھنے کی جستجو اور ایک بدکردار فادر اولیری کی درندگی کی مختصر داستان۔ اچھی لگی۔ درپردہ، ایک عجیب لرزا دینے والی کہانی۔ ایک طرف مذہب کی پاسداری، روزہ، نماز، تراویح اور اس کے عین پیچھے بدکرداری۔ دونوں جانب سے یعنی گناہ کرنے والے اور گناہ کا اہتمام کرنے والے ایک ساتھ چل رہے تھے۔ انجام تو یقیناً یہی ہونا تھا۔ یہ خدا کا انصاف ہے رونگٹے کھڑے کرنے والی داستان عبرت۔ ہمارے اردگرد ایسے بھی کردار رہتے ہیں۔ خدا رحم فرمائے اپنے نیک بندوں پر۔ تقاضائے انصاف، وکیل صاحب کے یوں تو ہر کیس اور ان کا حل قابلِ تحسین ہوتا ہے۔ مذکورہ کہانی میں ایک معصوم خاندان کی معصوم سربراہ خاتون اور عیار ومکار مافیا کی ستم ظریفی۔ ایک سچے اور ہمدرد ذہین وکیل اور خدا کا انصاف معصوم اور ستم رسیدہ کے ساتھ رہا اور مافیا کا قلع قمع کر دیا گیا۔ بہت زبردست کہانی۔ غرقِ محبت، طاہر جاوید مغل کے قلم کی روانی اور جذباتیت کا تال میل ایسے شاہکار قصے تخلیق کرتے ہیں جو مدتوں یاد رہیں۔ یہ کہانی کا دوسرا اور آخری حصہ تھا۔ انسان کا ٹوٹ کرا کٹھا ہونا۔ مغرور اور ظالم طاقتوروں کی دنیا کا ایک ایسا باب جو ہمیشہ سے چلتا رہا اور خدا کے انصاف اور عذاب کا مزہ بھی ملتا رہا۔ ایک نوجوان کی خداداد صلاحیت کو غلط طریقے سے استعمال کیا گیا۔ آخر اس کی صلاحیت صحیح جگہ استعمال ہوئی اور وہ زمین سے آسمان کی بلندی پر گیا لیکن اس کی سچی محبت مل کر بھی جدا ہوگئی اور وہ پھر سے ٹوٹ گیا مگر اب وہ بکھر گیا۔ بہت دلچسپ درد انگیز اور یاد رکھنے والی کہانی۔''

✠ پرویز احمد لانگا کی جدہ، سعودی عرب سے پہلی بار حاضری۔ ''ملک سے باہر ہونے کے باعث سسپنس جاسوسی وغیرہ لیٹ ملتے ہیں لیکن پڑھے بغیر گزارہ نہیں ہوتا اور اب تو تبصرے کرنے کا چسکا بھی پڑ گیا ہے۔ جاسوسی کا میدان مارنے کے بعد اب سسپنس میں پہلی حاضری لگا رہا ہوں۔ امید ہے کہ مناسب پذیرائی ملے گی۔ (جی جی بالکل...... خوش آمدید) اہلِ سسپنس تو مجھے نہیں جانتے اس لیے اس بار بخش رہا ہوں، اگلی بار ٹانگ ضرور کھینچوں گا۔ دوپٹے کی اوٹ سے مسکراتی لڑکی مجھے لفٹ کرانے کی کوشش کر رہی تھی پر میں اپنی سواری لے کر فوراً شیش محل پہنچ گیا۔ بہت دنوں سے سسپنس کی شاندار کہانی شیش محل پر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن وقت نہ مل سکا۔ آخری قسط دیکھ کر دل کو بڑا گہرا صدمہ پہنچا کہ اب تو کہانی کا اصل مزہ آنے لگا تھا۔ اسما قادری صاحبہ نے بڑی خوبصورتی اور عجلت کے ساتھ کہانی کا اینڈ کر دیا۔ اتنی کیا جلدی پڑ گئی تھی ان کو؟ بہرحال میری طرف سے ان کو اس خوبصورت تخلیق پر مبارکباد۔ وقت جیسی کہانیاں کبھی کبھی ہی منظرِ عام پر آتی ہیں۔ حسام بٹ کی پوشیدہ صلاحیتوں کا اس کہانی میں بڑی اچھی طرح پتا چل رہا ہے۔ یہ قسط پچھلی کے مقابلے میں کچھ ماٹھی رہی لیکن ایپل کا بام کی صورت میں کیا بلا نازل ہوئی ہے اس کا انتظار رہے گا۔ ویل ڈن بٹ صاحب۔ امید ہے کہ آپ کے قلم کے جوہر مزید کھلیں گے۔ کبیر عباسی کی پس پردہ بھی دلچسپ رہی۔ آغاز تھوڑا بے ربط لگا لیکن انجام میں دیا گیا سبق یادگار رہا۔ دوسروں کی ذات میں برائیاں دیکھتے ہوئے ہم اپنے گریبان میں دیکھنا بھول جاتے ہیں۔ غرقِ محبت مغل صاحب کا ایک اور شاہکار ثابت ہوئی۔ مدتوں یاد رہ جانے والی یہ کہانی اپنے انجام پر حسبِ توقع اداس ہی کر گئی۔ اگلی قسط وار ان سے لکھوا دیں تو کمال ہی ہوجائے گا۔ اب کی بار اتنا ہی۔ (بہت شکریہ اتنی دور سے آپ کا محبت نامہ ملا)۔''

✠ رمضان پاشا، گلشن اقبال کراچی سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں۔ ''جولائی 2017ء کا سسپنس مقررہ تاریخ کو ہی مل گیا۔ عید کی مناسبت سے بنی سنوری دوشیزہ اچھی لگ رہی تھی، البتہ ''عید مبارک'' سادہ سادہ تھا۔ فہرست بھی حسبِ معمول ہی تھی۔ جون صاحب کا ''بادشاہ گر'' پھڑ کتا ہوا تھا۔ اداریہ بھی دبنگ تھا لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونا ناممکن ہے۔ (قطرہ قطرہ پانی پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے...... شاید کہ......) خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے پائندہ خان پائندہ بادموصوف کا طویل تبصرہ جاندار اور شاندار تھا۔ پڑھ کر لطف آ گیا۔ دیگر تبصروں میں زرین آفریدی، مسز صدیقی، اشفاق شاہین، محمد خواجہ، مرحا گل، ادریس احمد خان کے تبصرے پسند آئے۔ اشعار کی محفل میں محمد اشفاق سیال، داؤد اشفاق، ناہید یوسف، ماہین فاطمہ، ریاض بٹ کے اشعار قابلِ داد تھے اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ غیر ملکی کہانیوں میں ''سزا'' اچھی نہیں لگی جبکہ ''نشانہ'' خوب تھی۔ تجسس اور سسپنس سے بھرپور ''دوسرا دشمن'' بھی کچھ اچھا تاثر نہ چھوڑ سکی۔ ''شیش محل'' آخر کار یہ خوبصورت داستان اختتام پذیر ہوئی۔ اختتام بھی نہایت خوبصورت۔ ''درپردہ'' مجھے حیرت ہوں کہ ایڈیٹر صاحب نے اس کہانی کو سنسر کیوں نہیں کیا۔ ''تقاضائے انصاف'' بیگ صاحب کو اس بار بڑا دلچسپ کیس ملا، حسبِ معمول، حسبِ روایت عدالتی کارروائی میں خوب لطف آیا۔ حسام بٹ کے ''وقت'' نے ہمارا وقت بھی بڑا اچھا پاس کیا۔ ڈیلفینا نے علی کو گھن چکر بنا کر رکھ دیا۔ ڈیلفینا کی

ڈپلیکیٹ بھی مجھے فراڈ معلوم ہوتا ہے...... ربی آئزک بھی اس فراڈ میں شامل ہے۔ آگے جا کر میرا اندازہ صحیح ثابت ہوگا۔ ''اعتماد شکن'' اس کہانی کا موضوع بہت پرانا ہے۔ یہ ایک روایتی کہانی تھی البتہ اختتام بالکل جداگانہ تھا۔ ''بُری عورت'' کہانی پراثر تھی، اختتام تو بہت ہی اثر انگیز تھا۔ ''آنکھیں'' بہت اچھی کہانی تھی۔ پڑھ کر خوب مزہ آیا۔ ''غرقِ محبت'' اس بار مغل صاحب نے قلم توڑ کہانی لکھ دی ہے۔ یہ کہانی کافی عرصہ بلکہ کافی مدت تک یاد رہے گی۔ میری جانب سے JDP کے تمام ورکروں کو عید مبارک اور دعائیں۔ (آپ کو بھی اللہ رب العالمین بہت ساری خوشیوں سے نوازے، آمین)۔''

✠ پائندہ خان سلیمان خیل، فیروز وٹواں ضلع شیخوپورہ سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''امید قوی ہے کہ آپ اور ادارہ جاسوسی ڈائجسٹ کے تمام ارکان خیریت سے ہوں گے اور آپ سب کی درازی عمر، تندرستی اور خوشحالی کے لیے دعاگو ہوں۔ جولائی کا سسپنس 16 کو مل گیا۔ گھر آ کر دیکھا تو سب سے پہلے بزم دوستاں میں پہنچا۔ خود کو کرسیِ صدارت پر براجمان پایا تو بے انتہا خوشی ہوئی اور سسپنس کے لیے بے اختیار زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہوئے اور نیک خواہشات کے جذبات دل میں امڈ آئے لیکن دوست احباب فکر نہ کریں، سسپنس سب کو باری باری یہ اعزاز دے گا۔ سب دوستوں کے تبصرے اچھے تھے۔ زرین آفریدی اور عبدالجبار رومی کا تبصرہ بھی بہترین تھا۔ مرحا گل، رمنا گل کا تبصرہ بھی بہت اچھا تھا اور میرا تبصرہ پسند کرنے پر ان کا خصوصی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ویسے یہ بتا دیں یہ درابن کلاں ہے کس صوبے میں؟ اب میں محفل سے جون صاحب کے انشائیہ ''بادشاہ گر'' کی طرف آیا۔ یحییٰ برمکی اور جعفر برمکی ہوں یا ابوالفضل اور فیضی، تاریخ گواہ ہے کہ کس طرح ان نوکرشاہوں نے سلطنت کے انتظام و انصرام میں من مانی کی اور بگاڑ اور زوال کا باعث بنے۔ آج بھی نوکرشاہی کی وجہ سے قوموں کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کی تحریر ''سلسلے وراثت کے'' بہترین تحریر تھی۔ سلطنتِ مغلیہ کے وارث آپس میں ہی برسرِ پیکار ہو گئے اور یقیناً ان نوکرشاہوں کی وجہ سے ہی بھائی کی تلوار بھائی کے خون کی پیاسی ہو گئی۔ اس کے بعد ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ'' کا دوسرا حصہ پڑھا تو ایمان تازہ ہو گیا۔ جس شخص کی بیوی جنات نے غائب کر دی اور آپ کی مہربانی سے بازیاب ہوئی، اس کو جنات کے شر سے بچانا اور سعادت یار خان کو بھی جنات کے شر سے بچانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ صاحب کو روحانی و باطنی کمالات سے مالا مال کیا تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی تحریر ''غرقِ محبت'' کا دوسرا حصہ بھی زبردست تھا۔ چوڈیرو حویلی کے وڈیرے شاہ فرمان کو اپنے بیٹے بابر کو پھانسی کے پھندے سے بچانے کے لیے آخرکار دلاور کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔ اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ دلاور کو اس کی محبت مل گئی لیکن سویرا کی موت پر افسوس ہوا۔ بیگ صاحب کی تقاضائے انصاف بہترین تحریر تھی۔ بیگ صاحب نے فراڈیے بدرشاہ سے سنز عالیہ کے پانچ لاکھ روپے نکلوا کر اپنے پیشے کے ساتھ ایمانداری اور دیانتداری کا ثبوت دیا۔ اگر سارے وکیل بیگ صاحب کی طرح ایماندار اور اپنے پیشے کے ساتھ مخلص ہو جائیں تو جرائم پیشہ افراد کے لیے زمین تنگ ہو جائے گی۔ منظر امام صاحب کی تحریر ''آنکھیں'' ہمیشہ کی طرح زبردست رہی۔ آنکھوں سے محروم زبیر نے راحیلہ کا تخیل اپنے احساسات کے ذریعے ذہن میں بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنکھوں سے محروم لوگ اس کائنات کے رنگ اور نظارے دکھانے والی کتنی بڑی نعمت سے محروم ہیں۔ ''وقت'' کی قسط بھی بہترین ہے۔ ڈیلفینا نے آخرکار منتی ڈیلفینا کو شکست دے دی ہے۔ ''اعتماد شکن'' اچھی تحریر ہے۔ احمر نے شائلہ اور عدیل کو اپنے ساتھ ہی موت کی وادی میں دھکیل کر بے وفائی کا بدلہ لے لیا اور عدیل کو شاطرانہ چال میں مات دے دی۔ ''دوسرا دشمن'' بس گزارے لائق تھی، کوئی خاص تاثر پیدا نہ کر سکی۔ در پردہ اچھی تحریر تھی۔ ولید اور دانش معمولی سی عبادت کو کافی سمجھتے ہوئے گناہوں کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔ آخر اس کی سزا بھی پائی۔ شاکر لطیف کی ''نشانہ'' بھی اچھی تحریر تھی۔ ڈین نے بم کے ذریعے راسٹر اور اس کے بیوی بچوں کو اڑانے کی کوشش کی اور آخرکار خود تنظیم کے بڑوں اور باس کے ساتھ ہی اڑ گیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ برائی کی راہ چھوڑ دیتے ہیں، خدا ان کی مدد کرتا ہے اور خطروں سے بچاتا ہے۔ مہتاب خان کی ''بری عورت'' سبق آموز تحریر تھی۔ شیری کو آخرکار اپنے باپ کا اصل چہرہ نظر آ گیا اور اپنی ماں کی بے گناہی کا احساس ہو گیا۔ شیش محل کی آخری قسط ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔ محفلِ شعر و سخن میں احمد خان توحیدی، نوید ہاشمی، اشفاق سیال اور وزیر محمد خان کے اشعار بہترین تھے۔''

✠ طاہرہ گلزار کا مری کوہسار سے تبصرہ۔ ''تمام دوستوں اور ادارے والوں کو گزری عید مبارک۔ 21 اور 22 جون کی درمیانی رات کے ایک بجے میرا محبوب دوست سسپنس میری بھابی کے ہاتھوں مجھ تک پہنچا۔ وہ اپنے شوہر اور میری چھوٹی سسٹر کے ساتھ مال روڈ پر گئی تھی۔ میں سسپنس نہ ملنے پر بہت اداس اور بور ہو رہی تھی۔ دل سے بھابی کے لیے دعائیں نکلیں۔ خط کے بارے میں تو 15 جون کو حسبِ عادت رضوان سلطان تنولی نے شائع نہ ہونے کی خوشخبری دی تھی۔ خیر یہ کوئی پہلی بار تو نہیں، اب کس کس بات پر دکھی ہوتی رہوں۔ زندگی ویسے ہی دکھوں سے بھری پڑی ہے۔ سرورق کی حسینہ پر میں کیا کہوں، میرے تین سال کے بھتیجے نے کہا کہ یہ ماما ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا اس بار بادشاہ گر لائے۔ ویسے وہ خود بھی تو لفظوں کے بادشاہ گر تھے۔ ہر بار کی طرح اس بار بھی اس نے ہماری دکھتی رگ کو چھیڑا، تاریخی آئینہ ہمیں دکھایا کہ کتنے منحوس نوکرشاہی چہرے ہمارے درمیان آتے رہے ہیں۔ واقعی جمہوریت نے کافی حد تک نوکرشاہی کو نکیل

ڈالی ہے۔آج کل ہمارے ملک میں ...... بھی دو ہاتھیوں کے درمیان یہ بے وقوف اور سیدھے سادے عوام پس رہے ہیں۔ اداریے میں وہی پرانے مسئلے بیان کیے گئے لیکن نہ تو ہمارے حکمرانوں نے سدھرنا ہے اور نہ عوام نے۔ وہ ظلم کرتے رہیں گے اور ہم سہتے رہیں گے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ان گداگروں کی وجہ سے ہمیں بھی مسئلے ہیں اور ملک کی بدنامی بھی ہوتی ہے۔ خیر چلتے ہیں دوستوں کی کھٹی میٹھی محفل کی طرف۔ دروازے پر دستک دی تو دروازہ بھائی پائندہ خان نے ہنستے ہوئے کھولا۔ میں نے کہا بھائی مبارکاں مبارکاں۔ مٹھائی خود کھالینا میرا روزہ ہے اور میں شام تک نہیں رک سکتی۔ جناب سسپنس کا جادو سر چڑھ کے بولتا ہے۔ آپ نے دوست کو بھی اس کا مزہ چکھا دیا بہت خوب۔ تبصرہ بہت جامع اور شاندار رہا۔ ہم دوستوں کو بھی یاد رکھا کرو۔ طاہر جاوید مغل محبتوں کے اسیر لفظوں کے بادشاہ گر ہیں...... آخر زرین آپا نے بینش صدیقی کا رشتہ کرا ہی دیا۔ ویسے یہ کام بھی برا نہیں۔ اشفاق شاہین میرے بھائی کے ہم نام بہت جامع اور لاجواب تبصرہ کرتے ہو۔ رمضان پاشا بھائی ایم اے راحت میرے بھی فیورٹ رائٹر تھے۔ مجھے 23 اپریل کو رضوان سلطان تنولی نے پشاور آکر تحفے میں بہت سی کتابیں دیں جس میں ایم اے راحت صاحب کا ایک مشہور اور یادگار ناول سنگ راہ بھی موجود تھا مرحا گل، رمنا گل ان باتوں سے اپنا دل دکھی نہ کرو۔ یہ سیاستدان کبھی نہیں سدھر سکتے۔ خواجہ بھائی آپ کا تبصرہ اس بار تو جاوید میانداد کا انڈیا کے خلاف چھکے کی طرح لگا۔ بہت پیارا اور خوب لکھتے ہو...... ادریس احمد بھائی نے تو لگتا ہے سسپنس کو اس بار ڈاکٹر کی نظر سے دیکھا ہے، پورا ایکسرے نکال بیٹھے۔ آپ کا انداز تحریر ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔ تمام دوستوں اور پورے پاکستان کو کرکٹ فائنل مبارک ہو...... کہانیوں میں پہلے منظر امام انکل کی مختصر تحریر آنکھیں پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح انوکھی اور چونکانے والی تحریر لگی۔ مجھے ہمیشہ منظر امام انکل سے شکایت رہی ہے کہ یہ لمبی کہانیاں نہیں لکھتے۔ سیکنڈ اقلیم علیم صاحب سے شکایت ہے کہ اب انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا ہے...... محبتوں کے علمبردار مغلِ اعظم کی تحریر غرق محبت کے لفظ موتی، یاقوت اور زمرد کی طرح صفحۂ قرطاس پر بکھرے رہے۔ ہر کردار اپنی جگہ پرفیکٹ اور آپس میں ایسے جوڑے کہ علیحدہ کرو تو کوئی کردار مکمل نہ ہو۔ منظر نگاری لاجواب۔ دلاور کی سچی، کھری اور بے غرض محبت اور ہمت نے بہت خوش بھی کیا اور دکھی بھی۔ دلاور جیسے محبت کرنے والے دنیا میں کیوں نہیں ملتے۔ سویرا کی موت نے بہت دکھی کردیا۔ ایسی شاندار تحریر پر مبارک باد۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی پڑھ کے دل و دماغ روشن ہوگیا۔ اللہ آپ کو اس کا اجر جنت کی صورت دے، آمین۔ وقت اس قسط میں زیادہ اچھی نہیں لگی۔ ربی اور علی کی باتیں ہی ختم نہیں ہورہیں، بس آخر میں سسپنس چھوڑ گئے۔ اب دیکھتے ہیں کہ آگے علی کیا کرتے ہیں۔ آخری ہر چیز کے لیے ہے۔ آخر شیش محل بھی ختم ہوگئی لیکن میرے خیال سے یہ ایک دو قسط اور بھی چل جاتی تو اچھا تھا۔ درپردہ کبیر عباسی کی تحریر گناہ، عبادت اور سزا کی مجموعہ ایک بہت حساس موضوع پر تحریر اچھی لگی۔ کاش انسان دوسروں کی جاسوسی کرنے کے بجائے اپنے نفس کی جاسوسی کرے۔ اچھی کاوش ہے۔ اس بار بیگ صاحب تقاضائے انصاف کے تقاضے پورے کرتے نظر آئے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا تاریخی سلسلہ، سلسلے وراثت کے بہت اچھی جارہی ہے۔ مجھے ہسٹری بہت پسند ہے۔ بادشاہی حاصل کرنے کے لیے باپ، بیٹے کو، بیٹا باپ کو، بھائی بھائی کو قتل کرتے آئے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی اس ہسٹری کو پڑھ کر بہت غصہ بھی آتا ہے اور دکھ بھی لیکن کیا کریں یہ سب کچھ تو اب بھی چل رہا ہے۔ سب کو عید مبارک اور کرکٹ کی جیت دونوں مبارک ہو۔ (خیر مبارک)۔"

✠ ادریس احمد خان، ناظم آباد کراچی سے شاملِ محفل ہیں۔ "سسپنس ڈائجسٹ موصول ہوا سرورق بھی خوب تھا۔ اندر انشائیہ میں مستفید ہوئے۔ ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی۔ پائندہ خان نظر آئے مبارک باد۔ دیگر دوستوں کی آراء سے بھی آگہی ہوئی۔ سلسلے وراثت کے ڈاکٹر ساجد امجد بڑے خوبصورت انداز میں تاریخ کے گوشوں سے متعارف کرا رہے تھے۔ "شیش محل" بھی اختتام کو پہنچی جس کا اینڈ بڑے اچھے انداز میں ہوا۔ اسما قادری کو بہت بہت مبارک اتنی اچھی تحریر لکھنے پر۔ ابتدا سے اختتام تک کبھی بھی بوریت کا احساس نہیں ہوا۔ یہی اچھا لکھنے والوں کی کامیابی کا راز ہے۔ امید ہے آئندہ بھی اسی طرح کی تحریر سے وہ قارئین کو محظوظ کرتی رہیں گی۔ اس سے آگے بڑھے نشانہ شاکر لطیف کی اچھی کہانی ثابت ہوئی بیشک گڑھا انسان دوسروں کے لیے کھودتا ہے مگر خود اس میں گرجاتا ہے۔ یہ کائنات کی اٹل حقیقت ہے۔ "دوسرا دشمن" بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں اچھے اور معیاری شعروں نے شعری ذوق کو مہمیز کیا۔ اعتماد شکن بھی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ حسام بٹ کی "وقت" بھی اپنا سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے گوشۂ زندگانی سے بھی بہ خوبی آگاہ ہوئے۔ دنیا و دین کے لیے وہ روشن مثال تھے منظر امام کی "آنکھیں" بھی اثر انگیز تھی جو اپنی ہر تحریر میں ایک پیغام چھوڑ جاتے ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی "غرق محبت" بہترین اور بہت خوبصورت تحریر تھی۔ بیچ بیچ میں مہکتی کلیوں نے بھی مزہ دیا۔ آئی سی سی چیمپئن شپ جیتنے پر ساری قوم کو بہت بہت مبارک ہو۔ عید کی بھی سارے عالم کو مبارک باد۔ "سسپنس" اور دیگر ماہ ناموں کے قارئین کو بھی عیدالفطر کی مبارکباد عرض ہے۔" (خیر مبارک)

✠ آصف محمود کا گوجرانوالہ کینٹ سے تبصرہ۔ "خدا خدا کرکے شیش محل جیسی سست اور بور کہانی آخر کار انجام بخیر کرکے پرلوک سدھار گئی ہے۔ "وقت" بھی حسام بٹ کی سلو پوائزن کی طرح بے مقصد اور خشک جارہی ہے۔ جس کا فی الحال نہ کوئی سر اور پیر نظر آرہا ہے

اور نہ ہی دلچسپی ہے۔ پتا نہیں کیوں ڈیلیفی اور ڈیلفینا نے اگر اتنا ہی پاورفل ہوتا تھا تو وقت کے اسیر کا کیا فائدہ؟ کہانی یوں ہے جیسے سرکش جیسی خشک کہانی کا دوسرا رخ ہے اور وہ بھی بیرون ملک کی آب وہوا اور کرداروں میں مان لیا کہ حسام بٹ کی انگلش ہائی ہے مگر کہانی میں ہنوز دلچسپی ندارد ہے۔ طاہر جاوید مغل ''غرقِ محبت'' کی آخری سرورق کی کہانی اچھی رہی۔ دیگر سسپنس ڈائجسٹ کو مزید بہتر کیا جائے۔ (آپ کے خیالات ہم تک پہنچ گئے ہیں۔ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ کے مصداق پڑھتے رہیے۔ شاید آپ کو کچھ اچھا لگ جائے۔''

✠ اطہر حسین کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ''کافی دنوں کی غیر حاضری کے بعد محفل میں آنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ تمام ساتھی ہمیں دل سے خوش آمدید کہیں گے اور ادارہ بھی ہماری حوصلہ افزائی کرے گا کیونکہ یہ جاسوسی ڈائجسٹ کا ہی خاصہ ہے کہ وہ تمام قارئین و نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کرتا ہے۔ ٹائٹل پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے کیونکہ ہمیں حقیقی چیزوں کی تعریف کرنے کی عادت ہے۔ یعنی ٹائٹل پر تو صرف تصویر ہے...... اور بے جان تصویر کی کیا تعریف کی جائے۔ تعریف اس صورت میں بنتی ہے جب تعریف سننے والا سامنے موجود ہو...... خیر، جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ جون صاحب کافی دور اندیش تھے جو کافی پہلے انہوں نے ملک کے حالات کی نشاندہی کرتے ہوئے حساس معاملات پر آواز اٹھائی اور معاشرے کے سدھار کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو اسی طرح کوشش کرنے کی توفیق عطا فرمائے کیونکہ جب کوشش کی جائے گی تو کہیں نہ کہیں سے بہتری کی راہیں نکلنا شروع ہو جائیں گی۔ فہرست پر نظر دوڑائی اور ہمیشہ کی طرح طاہر مغل کی کہانی سے آغاز کیا۔ آپ سے گزارش ہے جو تقریباً سبھی قارئین کرتے ہیں کہ طاہر صاحب کا کوئی سلسلہ شروع کریں۔ ان کی تحریر میں بہت گہرائی ہوتی ہے، لفظوں کا چناؤ اور حالت کی منظر کشی خوب کرتے ہیں۔ پڑھنے والا سحر انگیزی کی کیفیت میں اس میں کھو سا جاتا ہے۔ طاہر مغل کی غرقِ محبت زبردست کہانی تھی۔ تمام واقعات پڑھ کے ایسا لگ رہا تھا کہ اک فلم سی آنکھوں کے سامنے چل رہی ہے مگر کہانی کے اختتام نے دل دکھی کر دیا۔ دلاور نے سویرا کو پا کر کھو دیا حالانکہ اس کے پاس دنیا کی تمام نعمتیں تھیں، نہیں رہی تو محبت نہ رہی لیکن اس نے اپنی محبت کو زندہ رکھا اور اسی جگہ قیام کیا تاکہ محبوب نظروں کے سامنے رہے۔ بہت ہی شاندار کہانی تھی۔ اس کے بعد شیش محل پڑھی۔ اسما قادری نے بھی اچھا اختتام کیا۔ فاروق کو اس کے اہلِ خانہ سے ملوا دیا اور اس کی محبت اسے مل گئی۔ چاند بانو گوشہ نشین ہوئی۔ بہت خوبصورت اختتام تھا۔ حالانکہ شیش محل شروع میں کافی سست روی کا شکار رہی تاہم آخری اقساط میں تیزی رہی۔ ویلڈن اسما جی۔ وقت حسام بٹ کی صحیح جا رہی ہے۔ گو کہ ٹیمپو تھوڑا سلو ہے اور ڈائیلاگز بھی غیر ضروری ہیں، بہرحال کہانی ابھی شروع ہوئی ہے۔ آگے تیزی کا امکان ہے۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر امام کی آنکھیں بہت بیسٹ تھی۔ منظر صاحب مختصر لکھتے ہیں مگر لوگوں کو سوچنے کے کئی زاویے فراہم کر جاتے ہیں۔ کہانی میں کوئی نہ کوئی سبق ضرور ملتا ہے۔ تنویر ریاض کی سزا بھی بہترین کہانی تھی۔ قادر اولیری نے مذموم فعل کا ارتکاب کیا۔ وہ سزا کا مستحق تھا۔ شاکر لطیف کی نشانہ بھی دلچسپ تھی۔ مافیا تنظیم کی صحیح منظر کشی کی گئی۔ اختتام بہت شاندار تھا۔ واقعی برے کا انجام برا۔ در پردہ بھی سبق آموز کہانی تھی۔ ہمیں اپنی عبادات پر فخر کرنے کے بجائے اس کی قبولیت کی دعا مانگنی چاہیے اور برائیوں سے بچاؤ کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ امجد بیگ کی تقاضائے انصاف بس ٹھیک تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے واقعات پڑھ کر روح تک سرشار ہو گئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سلسلے وراثت نے تاریخ سے آگاہی دی۔ مہتاب خان کی بری عورت کوئی خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ ظفر اقبال کی اعتماد شکن بھی اتنی خاص نہ لگی ہاں البتہ اختتام اچھا تھا۔ ثمر عباس کی دوسرا دشمن اچھی کہانی تھی۔ محفلِ شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ ہماری طرف سے تمام پاکستانیوں کو عید کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ جاسوسی ڈائجسٹ کو مزید ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔''

✠ محمد زریان سلطان اردو بازار کراچی سے خراماں خراماں چلے آ رہے ہیں۔ ''جولائی کا سسپنس سامنے ہے۔ بہت عرصہ ہوا سسپنس کی محفل میں شرکت کیے سوچا کمال ہے کسی نے بھی یاد نہیں کیا...... اب بھلا بتاؤ یہ ہے انسان کی حقیقت...... گویا آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہو گیا ہے۔ بہرحال شکوے شکایات بھی اپنوں سے ہی ہوتے ہیں...... آپ چاہے ہمیں اپنا سمجھیں یا نہ سمجھیں، ہم تو آپ کو اپنا سمجھ ہی لیتے ہیں کہ کوئی تو پہل کرے محبت سے بات کرنے میں۔ خیر جی آپ کے نام سے آپ کی محفل، اوہ سوری ہماری محفل میں روشن ستاروں کے مانند جگمگ جگمگ کرتے رہتے ہیں جنہیں پڑھ کر مجھے بے حد لطف آتا ہے مگر کچھ پرانے قارئین جن کے درمیان اکثر نوک جھونک چلتی رہتی تھی اور جو باقاعدگی سے اپنی حاضری لگواتے رہتے تھے آج کل جانے کس شہر میں جا بسے کہ پلٹ کر کوئی سسپنس کی خبر ہی نہیں لیتا۔ ظاہر ہے مصروف زمانہ ہے کون کسی کو کب تک یاد رکھے گا۔ بہرحال گزشتہ دنوں ہماری کرکٹ نے بھی کچھ دھانسو قسم کا کمال کر دیا ہے۔ چلیں پس منظر میں معاملات چاہے جو بھی رہیں مگر منظر میں تو فتح پاکستان کے حصے میں آئی اور یہ ایک اچھی کوشش تھی، ویلڈن۔ ویسے مبارک باد تو ہمیں سسپنس کی ٹیم کو بھی دینی چاہیے جو اس دور میں بھی قارئین کے ذوق اور مطالعے کے لیے اچھی تحریروں کا انتخاب کرنے اور قارئین کی تسلی کا اہتمام کرتی ہے۔ اس بار شیش محل کی آخری قسط دیکھ کر دل کو لگا ایک زوردار جھٹکا...... اگر رک جاتا تو کیا ہوتا۔ بہرحال شکر اللہ کا پھر سے چل پڑا مگر ہمیں شیش محل کی آخری قسط پڑھ کر ایسا لگا جیسے رائٹر کو شدید بھوک لگی ہو اور لکھنے پر من مائل نہ ہو لہٰذا جلدی جلدی لپیٹ کر اسما قادری نے اپنا فرض ادا کر دیا...... لیکن یہ فرض اگر خوشگوار طریقے سے ادا کیا جاتا تو کیا ہی بات تھی۔ اب

دیکھتے ہیں شیش محل کی جگہ کون لیتا ہے۔ جون ایلیا کا بادشاہ گر پڑھا...... کب تک آخر کب تک بین بجائیں گے...... کسی کے کان پر جوں نہیں رینگنے والی۔ بہت اچھے شیمپو استعمال کرتے ہیں یہ لوگ۔ جوں تو جوں خشکی تک نہیں ہونے دیتے یہ بااختیار لوگ۔ تاریخی کہانی میں سلسلے وراثت کے اچھی کاوش تھی۔ اب اچھی گزرے یا بری...... تاریخ تو ہماری ہی ہے نا۔ ہوس اور مفاد نے ہر مقام پر اپنا وار کیا ہے۔ سزا تنویر ریاض کی اچھی کوشش تھی۔ ظلم کے خلاف آواز بند کرلی جائے تو جرم کی پرورش تیزی سے ہونے لگتی ہے مگر یہاں زینڈی نے اپنے بھائی کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر نہ صرف آواز بلند کی بلکہ اس کا بدلہ بھی بہت اچھے طریقے سے لیا۔ در پردہ میں کبیر عباسی نے بہت اچھا پیغام دیا۔ دوسروں کی طرف انگلی اٹھانے اور خود پر شرافت کا لبادہ ڈالنے سے اصلیت چھپ نہیں جاتی بلکہ کبھی نہ کبھی سامنے ضرور آجاتی ہے۔ وہ جو گن گن کر نیکیاں کرتے تھے بے حساب برائیوں کا شمار بھول گئے۔ ویری گڈ۔ تقاضائے انصاف میں مرزا امجد بیگ نے واقعی انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ایک مظلوم کو انصاف دلا دیا۔ کاش اس دور میں بھی ایسے وکیل ہوتے جو ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر اپنی روزی حلال کرنی کی سعی کرتے۔ محفل شعروسخن میں تو ہمیں کمال کا انتخاب ہوتا ہے۔ ہر شعر پر داد دینے کو دل کرتا ہے۔ اچھی تحریر ہو یا شعر، ذہن پر اثر ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اس بار اعتماد شکن نے بازی جیت لی۔ کیا خوبصورت انداز اور کتنی گہری بات...... پڑھ کر مزہ آگیا۔ وقت حسام بٹ کی تحریر ابھی پیاز کے مانند پرت پرت کھل رہی ہے۔ دیکھتے ہیں آنے والی اقساط میں کون سے کردار کی کیا شکل نکلتی ہے۔ ابھی تو سب کچھ گویا پردے میں چل رہا ہے۔ بری عورت مہتاب خان کی ایک عبرت اثر کہانی...... بروکن فیملی میں بچوں کی ذہنی صورت حال اتنی ہی خطرناک ہوجاتی ہے مگر عاقبت نااندیش والدین اپنی ضد اور انا کی خاطر ان بچوں کو نظر انداز کرکے بہت خطرناک غلطی کرجاتے ہیں...... دوسرا دشمن شر عباس اور آنکھیں منظر امام کی یہ دونوں تحریریں بھی اچھی تھیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی زندگی کے بارے میں پڑھا۔ یہ درست ہے کہ اللہ جسے چاہے ہدایت دے اور بلند درجات سے نوازے مگر اس کے لیے نفس کو مارنا اور اپنی ذات کو بھلا کر عبادت الٰہی اور مخلوق کی بھلائی کے بارے میں خود کو وقف کردینا بہت مشکل کام ہے مگر اللہ کے ولی ان مشکلات سے بہت آسانی کے ساتھ جنگ کرتے آئے ہیں۔ غرق محبت طاہر جاوید مغل کی ایک اور یادگار، دلوں میں چٹکی لینے والی خوبصورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ دوسرے حصے نے ذہن پر ایک خاص اثر چھوڑا۔ طاہر جاوید مغل سے گزارش ہے کہ برائے مہربانی سسپنس کے لیے بھی کوئی سلسلہ شروع کیجیے۔ ہم جو سسپنس کے شوقین ہیں اور آپ کے دیوانے تو اس کا بھی کچھ خیال کیجیے۔ ہم منتظر رہیں گے کہ کب ہماری درخواست پر عمل کیا جاتا ہے۔ اب اجازت۔''

✠ مہتاب احمد حیدر آباد سے شامل محفل ہیں۔ ''اس دفعہ تو رمضان المبارک میں گرمی زوروں پر ہے۔ تاہم اللہ کے فضل و کرم سے روزے پورے جارہے ہیں۔ تمام دوستوں کو ہماری طرف سے عید کی ڈھیروں خوشیاں مبارک۔ رب کریم ہمارے ملک کو خوشیوں کا گہوارہ بنادے۔ عموماً ڈائجسٹ کا مطالعہ ہم رات میں ہی کرتے رہے۔ سب سے پہلے کہانی سلسلے وراثت کے پڑھی۔ ساجد امجد صاحب کی تحریر سے کافی مستفیض ہوئے۔ پھر اس کے بعد شیش محل کا مطالعہ کیا۔ کیا کہنے اسما قادری صاحبہ آپ کے۔ کہانی زبردست تھی۔ ہمارا تو دل چاہ رہا تھا کہانی ختم ہی نہ ہو۔ بہرحال کہانی کا اختتام بھی ضروری تھا۔ فاروق کو اس کے بچ جانے والے گھر والوں کا ساتھ مل گیا اور ساتھ ہی جو لی بھی مل گئی۔ دل خوش ہوگیا۔ چاند بانو اعلیٰ ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے کنارہ کش ہوگئی۔ بہت ہی زبردست اینڈ تھا۔ پھر پہنچے غرق محبت پہ۔ واہ بھئی۔ اس دفعہ تو مزہ ہی دوبالا ہوگیا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ طاہر صاحب کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہم نے ان کی جتنی بھی کہانیاں پڑھیں ہمیں اس میں کوئی کمی نظر نہیں آئی اور کہانی نے ہمیں ایسا جکڑا کہ ہم پڑھ کر ہی اس پر سے نظر یں ہٹاتے تھے۔ غرق محبت، محبت کی لازوال داستان تھی۔ سویرا سے بچھڑ کر بھی دلاور کی محبت میں کمی نہ ہوئی اور اس نے اپنی باقی ماندہ زندگی اس کی قبر کے قریب رہ کر گزارنے کا فیصلہ کیا۔ دیر تک کہانی کا نشہ ہم پر طاری رہا۔ طاہر صاحب کو سسپنس میں سلسلہ لکھے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔ ان کی کوئی سلسلہ وار کہانی شروع ہونی چاہیے۔ وقت کوئی الحال ٹھیک سے وقت نہیں دے پا رہے۔ اس کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔ کہانی میں ایکشن اور ٹیمپو کی کمی ہے۔ در پردہ کافی سبق آموز کہانی تھی۔ دیگر چھوٹی کہانیوں میں ہمیں سزا سب سے اچھی لگی۔ شاکر لطیف کی نشانہ بھی بہترین کہانی تھی۔ راشر نے غلط راستے کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا مگر مافیا نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کرلیا مگر اس کے راہ راست پر چلنے کے فیصلے سے اسے غیبی امداد ملی۔ نہ صرف وہ تنظیم سے علیحدہ ہوا بلکہ اس کو قتل کرنے کا ارادہ کرنے والے خود لپیٹ میں آگئے۔ مرزا امجد بیگ کی تقاضائے انصاف بس ٹھیک لگی۔ منظر امام کی آنکھیں بھی بس ٹھیک تھی۔ ظفر اقبال کی اعتماد شکن کوئی خاص نہ تھی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر نے دل کو ایمان کی روشنی سے منور کردیا۔ تاریخی کہانی نے ہمیں تاریخ سے آگاہی فراہم کی اور شاہی سازشوں سے پردہ اٹھایا۔ کس طرح تخت و تاج کی چاہ میں خونی رشتوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنادیا۔ واقعی حکمرانی کا بھی ایک نشہ ہے۔ محفل شعروسخن پڑھ نہیں پائے لیکن امید ہے تمام اشعار بہترین ہوں گے۔ آخر میں ایک گزارش کہ نواب صاحب مرحوم کی کوئی کہانی شائع کریں۔ ان کا انداز تحریر جدا ہے اور اس کا اپنا مزہ ہے۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے'' صبا سحر، کراچی۔ وسیم احمد، ملتان۔ عاصم خان، کوئٹہ۔ اقبال احمد، کراچی۔ نازیہ حبیب، سکھر۔ فرحانہ عاصم، سرگودھا۔ شاہین شکیل، ٹنڈو الہ یار۔''

سیوا سے سنبھا تک

ڈاکٹر ساجد امجد

بعض اوقات تاریخ اور تقدیر دونوں طے شدہ حالات و واقعات لکھوا کر زمین پر اترتی ہیں۔ جیسے کہ سیوا کے معاملے میں ہوا... سالوں پہلے نجومیوں کی پیش گوئی نے اس کے اجداد کو نہ صرف چونکا دیا بلکہ ناسازگار حالات میں اس کی پیدائش اور پھر پرورش کے کٹھن مراحل میں بھی اسی پیش گوئی کو سامنے رکھتے ہوئے اس کے سچ ہونے کا انتظار کیا جانے لگا... اور پھر بالآخر وہ وقت بھی آگیا جب یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچی ثابت ہوئی اور لوگوں نے دیکھا کہ نسل در نسل اس کے اثرات نے تاریخ پر کیسا رنگ جمایا اور تین نسلوں کی یہ کہانی مغلیہ عہد کے مختلف ادوار میں اپنے حصے کا کردار ادا کرتی رہی... اور جس مقصد کے تحت اس کی پیدائش عمل میں آئی اس کے پورا ہونے تک مخلوق خدا نے کیا کیا مصائب جھیلے... ماضی کے یہ اوراق اس عہد کی بھرپور عکاسی کرنے کے لیے کافی ہیں... بالآخر اورنگ زیب عالمگیر نے اس طرح ان کی مجرمانہ کارروائیوں کی بیخ کنی کے لیے اقدامات کیے کہ اس کے تکبر کا بت پاش پاش ہوگیا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات



چتوڑ کا آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ پچھلی رات ہی سے بادل جمع ہونا شروع ہوگئے تھے اور اب تو بارش کے آثار نے ایسا زور باندھا تھا کہ گلیاں منہ کھولے کھڑی تھیں کہ کب بارش ہو اور کب ان کا حلق تر ہو۔

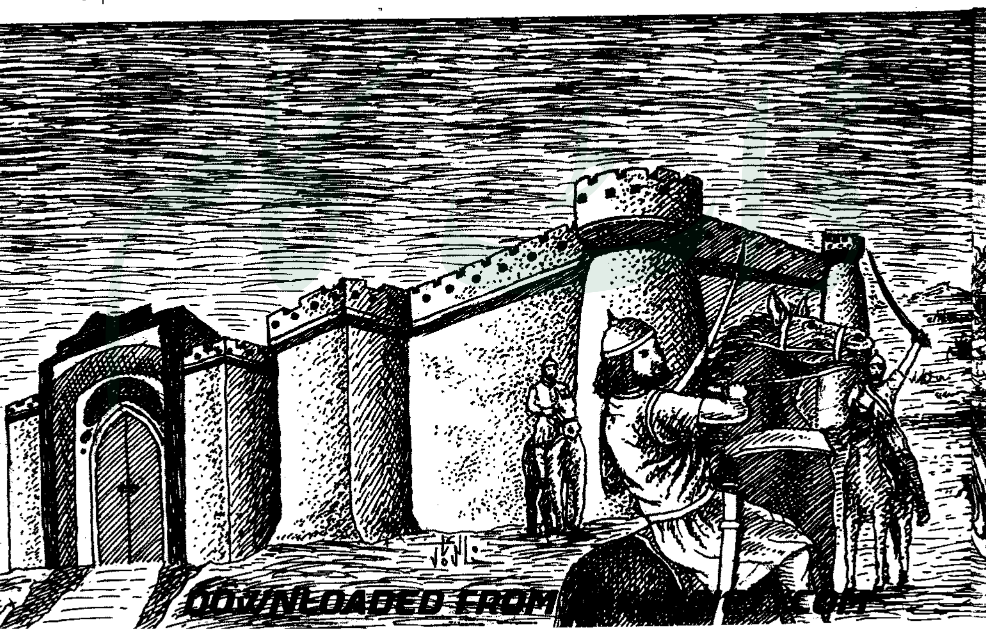
بازار سے گزرتے ہوئے ایک شخص بھوسلہ نے کچھ نہیں تو آٹھویں مرتبہ آسمان کی طرف گھور کر دیکھا اور اپنی رفتار کو تیز کر دیا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ گھر پر گھوڑا بگھی سب موجود تھے پھر وہ بادلوں کے شامیانے کو دیکھنے کے باوجود پیدل کیوں گھر سے نکل آیا تھا۔ اگر بارش ہوگئی تو اس کی بیش قیمت پوشاک گیلی ہوجائے گی اور دھوپ جانے کب تک نہ نکلے۔ دوسرے لوگ بھی شاید اسی کی طرح سوچ رہے تھے۔ سب کو گھر جانے کی جلدی تھی۔ دکانیں بھی زیادہ تر بند ہو چکی تھیں۔

اس نے ابھی چند قدم اور اٹھائے ہوں گے کہ سامنے سے اس کا ملازم گھوڑے پر سوار آتا نظر آیا۔ پلک جھپکتے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے سے کود گیا۔

”مالک! بارش کے آثار ہیں اور آپ ابھی تک گھر نہیں پہنچے۔ میں گھوڑا لے آیا ہوں۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہو آپ گھر پہنچ جائیں۔“

بھوسلہ نے رکاب میں پاؤں رکھا اور سوار ہوگیا۔ اس کا ملازم گھوڑے کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

گھر پہنچتے ہی بھوسلہ نے گھوڑا باہر چھوڑا کہ ملازم پیچھے ہی آ رہا تھا اور گھر میں داخل ہوگیا۔ وہ بارش سے بچ گیا تھا لیکن گھرے بادلوں نے اس کی پیاس بڑھا دی تھی۔ وہ بادلوں کا نظارہ دیکھنے کے لیے سیدھا چھت پر پہنچ گیا۔ بادل یہاں بھی عجیب منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا اور چھت پر ٹہل رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے نسبتاً نیچی دیوار سے دوسری طرف دیکھا۔ ایک لڑکی ہر طرف سے بے پروا اس کی طرح چھت پر ٹہل رہی تھی۔ لڑکی تو اسے بس کہا جا سکتا تھا، وہ آسمان کی حور تھی جو آسمان سے زمین پر اتر آئی تھی۔ اس نے ساری زندگی میں ایسا حسن نہ دیکھا تھا۔ وہ اسے دیکھنے میں محو تھا کہ اس لڑکی کی نظر بھی اس پر پڑ گئی۔ وہ بے اختیار ہنسی اور چھت سے نیچے اترنے والے زینے کی طرف بھاگ گئی۔ اس کے وجود کی روشنی ابھی تک چھت پر تھی۔ بھوسلہ کچھ دیر اس کی روشنی سے لطف اندوز ہوتا رہا اور پھر اس نے بھی وہی حرکت کی۔ زینے تک گیا اور نیچے اتر آیا۔ بوندا باندی شروع ہوگئی تھی۔ اسے یوں بھی نیچے اترنا ہی تھا۔ اتنی دیر میں نیچے کا منظر ہی بدل گیا تھا۔ بارش کی پہلی بوند پڑتے ہی پکوان چڑھ گیا تھا۔ پکوڑے اور سموسے تیار ہو رہے تھے۔ اس کی ماتا رسوئی (باورچی خانہ) میں بیٹھی ملازموں کو ہدایات دے رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ابھی تک چھت کا منظر گھوم رہا



تھا۔ اس لڑکی کا سراپا آنکھوں میں محفوظ تھا۔ اس نے ایک ملازم کو اپنے پاس بلایا۔

"تھوڑا سا پکوان تھالی میں رکھ کر برابر والے گھر میں دے آؤ۔"

"برابر والے گھر میں؟" ملازم نے حیرانی سے پوچھا۔

"اس میں حیران ہونے کی کون سی بات ہے؟"

"مالک! وہ لوگ راجپوت نہیں ہیں، بد اصل ہیں۔"

"تو کیا ہوا۔"

"کیا آپ کو نہیں معلوم؟ غیر راجپوت ہمارے برتنوں کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ ان سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا جاتا۔"

"جو تجھ سے کہا جا رہا ہے وہ کر۔"

"جی مالک! پر ماتا جی؟"

"انہیں بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"سمجھ گیا مالک۔"

ملازم نے سب کی آنکھ بچا کر بھوسلہ کا حکم پورا کیا اور پکوان کی تھال برابر والے گھر میں جا کر دے آیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی اور بھوسلہ کا کام ہو گیا۔

اس پکوان کو لیتے ہوئے اس لڑکی یا اس کے گھر والوں نے کیا سوچا، بھوسلہ کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اگر اندازہ ہوسکتا تھا تو صرف اتنا کہ ایک راجپوت کے گھر سے آنے والا پکوان دیکھ کر انہیں حیرت ضرور ہوئی ہوگی۔ اسے خوف تھا تو یہ کہ کہیں اس لڑکی کے گھر والے بھی جواب میں کچھ نہ بھیج دیں۔ اگر ماتا جی کو معلوم ہو گیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ بڑی دیر تک دروازے پر کان لگائے رہا لیکن کوئی نہیں آیا۔ اتنی دیر میں چھت کے بھی کئی چکر لگا آیا کہ شاید وہ لڑکی نظر آ جائے۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔

رات بھر بارش کے شور میں وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس لڑکی کا نام چمپا تھا۔ یہی وہ لڑکی تھی جس سے نہایت تگ و دو کے بعد بھوسلہ نے تعلقات استوار کر لیے۔ چھت کی دیوار میں دروازہ بن گیا۔ راتوں کے اندھیرے میں گناہ کے اندھیرے شامل ہوتے رہے۔

راجپوتوں میں رواج تھا کہ غیر ذات کی عورتوں سے شادی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر تعلقات ہو بھی جاتے تھے تو وہ عورت داشتہ بن کر ہی رہتی تھی، شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس تعلق کے نتیجے میں بچہ ہو جاتا تو لڑکے کی صورت میں غلام اور لڑکی کی صورت میں اسے کنیز بنا کر رکھا جاتا تھا۔ ایسی اولاد کے کوئی حقوق نہیں تھے۔ ترکہ بھی نہیں ملتا تھا۔ بھوسلہ کو اس رواج کا علم تھا۔ جانتا تھا کہ شادی نہیں ہوسکتی اس کے باوجود اس نے اس عورت کو مدخولہ بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔

بھوسلہ کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب چمپا نے اسے بتایا کہ وہ حاملہ ہو گئی ہے۔ بھوسلہ نے بہت چاہا کہ کوئی راستہ نکل آئے چمپا سے اس کی شادی ہو جائے لیکن ایسی کوئی صورت نظر نہ آئی۔

یہ خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا کہ کسی بھی وقت بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ رسوائی سے بچنے کے لیے اس نے چمپا کو پہاڑوں کے دامن میں بھیج دیا اور ایک عورت کو اس کے ساتھ بھیج دیا تاکہ آنے والا بچہ اسی مقام پر پیدا ہو اور چتوڑ کے لوگوں کو اس کی ہوا تک نہ لگے۔

وہ اس عورت سے اتنی محبت کرتا تھا کہ ماں باپ کے اصرار کے باوجود اپنی کسی ہم قوم لڑکی سے شادی پر تیار نہ ہوا۔ یہاں تک کہ بچے کی پیدائش کا وقت آ گیا۔

بھوسلہ اس پہاڑی غار میں روز جاتا تھا اور اپنی مدخولہ عورت کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا۔

بچہ پیدا ہوا اور اسی پوشیدہ مقام پر پرورش پاتا رہا۔

بھوسلہ کو اس عورت سے محبت تھی، بچے سے نہیں اور اب تو وہ اس فکر میں تھا کہ یہ بچہ کب تک یہاں رہے گا اور کب تک بات چھپلے گی نہیں۔ وہ یہ سوچنے لگا تھا کہ اس بچے کو کسی ایسی ترکیب سے مار ڈالے کہ عورت کو پتا بھی نہ چلے اور اس عورت کو اس کے گھر بھیج دے۔ کچھ رقم دے دلا کر گھر والوں کا منہ بند کر دے۔

ایک روز وہ اپنے بچے سے مل کر واپس آ رہا تھا کہ اس پہاڑ کے دامن میں ایک سادھو نے اس کا راستہ روک لیا۔

"بالک! کس سے مل کر آ رہا ہے؟"

"کسی سے نہیں۔" بھوسلہ گھبرا گیا۔ "میں تو یونہی گھومنے نکلا تھا۔"

"راجپوت ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔"

سادھو کی آواز میں کچھ ایسا اثر تھا کہ بھوسلہ نے اسے اپنا ہمدرد جان کر سب کچھ اگل دیا۔ سادھو نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"بالک! کیوں اپنے ہی خون سے اپنے ہاتھ رنگتا ہے۔"

"بابا! پھر بتا میں کیا کروں۔"

''یہ تو میں نہیں جانتا کہ تجھے کیا کرنا چاہیے۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ اس بچے کی نسل سے ایک ویرا ایسا پیدا ہوگا جو بڑا نام پیدا کرے گا۔ جاگیریں اور تعلقے اس کی مٹھی میں ہوں گے۔ بڑے بڑے بادشاہوں سے ٹکرلے گا۔ اس کی بہادری کا لوہا دنیا مانے گی۔''

''بابا! یہ کب ہوگا؟''

''ہوگا تو اس وقت جب تو اس دنیا میں نہیں رہے گا لیکن اگر تو نے اسے قتل کر دیا تو یہ کبھی نہیں ہو سکے گا۔'' یہ کہہ کر وہ سادھو آگے بڑھ گیا۔ بھوسلہ اس سے کچھ اور پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

بھوسلہ اس سادھو کی باتوں سے کشمکش میں پڑ گیا۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ بچے کو زندہ رکھے تو کیسے رکھے۔ میں اس دنیا میں نہ رہوں لیکن اس کی نسل چلے گی اور اس سے وہ بچہ پیدا ہوگا جس کا ذکر سادھو نے کیا ہے تو نام تو میرا ہی ہوگا۔

آخر بہت سوچنے کے بعد اسے ایک ترکیب سوجھی۔ وہ اس بچے اور اس کی ماں کو لے کر دکن چلا گیا۔

اس نے وہاں جاتے ہی یہ مشہور کیا کہ اس کی بیوی اس کی ہم قوم ہے۔ اس کا بیٹا اس کی ہم قوم عورت کے بطن سے ہے۔ اس نے وہاں فوج میں ملازمت کر لی اور مزے سے دن گزارنے لگا۔

جب یہ لڑکا جوان ہوا تو اس نے اس کا رشتہ کئی صحیح النسب راجپوت گھرانوں میں کرنا چاہا لیکن احتیاط و شبے کی بنیاد پر کوئی اس لڑکے سے نسبت کرنے پر تیار نہیں ہوا۔ مجبوراً اس نے مرہٹہ قوم میں جو خود کو غیر معروف راجپوتوں میں سے سمجھتے تھے، اپنے لڑکے کی نسبت طے کر دی۔

اب بھوسلہ پُرامید تھا کہ فقیر کی پیش گوئی رنگ دکھائے گی۔ اس لڑکے سے جو لڑکا پیدا ہوگا، وہ ضرور اس کا نام روشن کرے گا لیکن کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ فقیر نے کہا تھا، یہ وقت جب آئے گا جب تو نہیں ہوگا۔ پھر وہ یہ بھی سوچتا تھا کہ ضروری تو نہیں کہ جو اس سادھو نے کہا ہے، وہ حرف بہ حرف پورا ہو لیکن حرف بہ حرف پورا ہوا۔ جب اس لڑکے سے ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کا نام ساہو بھوسلہ رکھا گیا اور جب وہ جوان ہونے لگا تو بھوسلہ کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد وہ عورت بھی انتقال کر گئی جس کی خاطر وہ وطن سے بے وطن ہوا تھا۔

ساہو بھوسلہ شاہانِ بے جاپور کی ملازمت میں چلا گیا اور تھوڑے ہی عرصے میں اس نے بڑا نام پیدا کر لیا۔ سادھو کی پیش گوئی کا وقت ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ یہ تو اس کی تمہید تھی۔ اس کی پیش گوئی ساہو بھوسلہ کے بیٹے سیوا بھوسلہ (جو بعد میں سیواجی کے نام سے مشہور ہوا) کی شکل میں پوری ہونے والی تھی۔

واضح رہے کہ یہ دور عہدِ شاہ جہانی تھا۔

ساہو بھوسلہ کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ اسے اس کی خدمات کے عوض دو پرگنے بھی...... جاگیر میں دے دیے گئے۔

ان پرگنوں پر باپ کی طرف سے سیوا مختار کار بن کر بندوبست پر مقرر ہوا اور اس نے وہاں کا سارا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ اس بنجر علاقے میں جو تمام کا تمام اونچے اونچے دشوار گزار پہاڑوں اور خاردار گھنے جنگلوں سے بھرا ہوا تھا، زمینداروں کی طرح رہنے لگا اور اپنے عزائم کے پیشِ نظر اس نے جگہ جگہ پہاڑی قلعے اور مٹی کے حصار بنا لیے جن کو ''گڑھی'' کہا جاتا تھا۔

یہی وہ لڑکا تھا جس پر سادھو کی پیش گوئی پوری اترنے والی تھی۔

سیوا بہادری اور شجاعت میں اپنے قبیلے میں مشہور تھا۔ مکر و حیلہ میں بھی اسے شیطان کا شاگرد سمجھا جاتا تھا۔ جہاں جیسا موقع ہوتا، وہاں ویسا رنگ بدل لیتا تھا۔

اس کی قسمت میں لوٹ مار کرنا لکھا تھا کہ اس نے جیسے ہی بندوبست اراضی سنبھالا، انہی دنوں والیِ بے جاپور عادل خاں بیمار پڑ گیا اور مملکت بے جاپور انتشار سے دوچار ہوگئی۔ جب سیوا نے دیکھا کہ اطراف و جوانب میں کوئی روک ٹوک کرنے والا نہیں۔ سب اپنے اپنے مقاصد پورے کرنے میں لگے ہوئے ہیں تو اس نے بھی ہاتھ پیر ٹکانے شروع کر دیے اور جاگیردار سے ڈاکو بن گیا۔

سیوا نے یہ وتیرہ اپنا لیا کہ وہ آباد و سیر حاصل قصبوں پر جہاں کی رعیت مالدار اور خوش حال ہوتی، اچانک ان پر جا پڑتا اور لوٹ مار کر کے ان کو اپنے قبضے میں لے آتا۔ اس سے پہلے کہ وہاں کے جاگیرداروں کی فریاد بے جاپور کے دربار میں پہنچتی، وہ اپنا عریضہ بھجوا دیتا جس میں جھوٹ سچ جاگیرداروں کے خلاف رپورٹ کر دیتا کہ فلاں قصبے سے زیادہ محصول ہو سکتا ہے لیکن متعلقہ جاگیردار اور اس کے کارندے خیانت کے مجرم ہیں۔ اس

لیے میں نے ان کی گوشمالی کی ہے، میں وہاں سے زیادہ محصول وصول کر کے بھجوا رہا ہوں۔ اس قصبے کو اگر میری جاگیر میں دے دیا جائے تو سرکاری خزانے میں زیادہ رقم جمع ہو سکتی ہے۔

اس کی کارستانیوں کی داستان بھی جاگیرداروں کے ذریعے پہنچتی لیکن اس پُرآشوب دور میں تحقیق کی فرصت کسی کو نہیں تھی۔ اس کی زیادتیوں کے خلاف کسی طرح کی کارروائی نہیں ہوئی اور وہ اپنی من مانی کرتا رہا۔

فرماں روا بستر مرگ پر پڑا ہوا تھا اور سلطنت کے کارندے عیش و غفلت میں۔ سیوا ان کی مٹھی بھی گرم کرتا رہتا تھا چنانچہ بہت جلد اس کے اختیارات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

اس کم ظرف کے ہاتھ میں دولت آئی تو کرائے کے ڈاکو بھی خرید کر اپنے ساتھ ملا لیے۔ رفتہ رفتہ چیدہ چیدہ راہزنوں کی ایک بڑی جمعیت بنالی۔ اردگرد کے بہت سے قلعوں پر قبضہ کر لیا۔ کارروائیوں کے بعد اسے چھپنے کے ٹھکانے مل گئے۔

اس زمانے میں دو ایسے واقعات رونما ہوئے جن کا سہارا لے کر سیوا نے اپنی کارروائیوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں۔ عادل خاں کا بیٹا سکندر عادل کم سنی میں اپنے باپ کا قائم مقام بن گیا۔ اس پر مستزاد یہ کہ شہزادہ عالم گیر بیجاپور پر حملہ آور ہو گیا۔ فرماں روا کی کم عمری اور شہزادہ عالم گیر کے حملے نے ملک کا سارا نظم و نسق معطل کر دیا۔ ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ سیوا نے اس بھگدڑ کا خوب فائدہ اٹھایا۔ اس نے ایک مضبوط فوج فراہم کر لی اور ہندوستان و بے جاپور کے سلاطین کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ دشوار گزار پہاڑوں اور گھنے جنگلوں کی پناہ میں بیٹھ کر راہزنی کرنے لگا۔ مضبوط قلعے اس کا مستقر تھے۔ سکندر عادل خاں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس پر ہاتھ ڈالتا۔

خشکی تو خشکی اس نے سمندر کے بعض جزیروں پر بھی کشتیوں کی مدد سے قبضہ کر لیا اور وہاں بھی قلعے بنوا لیے۔ اب تک وہ چالیس قلعوں کا مالک ہو چکا تھا۔ یہ سب قلعے جنگی سامان سے بھرے رہتے تھے۔

حکمرانی تو وہ کر رہا تھا حالانکہ اسے باغی کہا جاتا تھا۔

اب تک حکومت بے جاپور امراء اور مشیروں کے ہاتھ میں تھی۔ جب سکندر عادل شاہ سن شعور کو پہنچا اور نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا تو اس پر سیوا کی حرکتیں ظاہر ہوئیں لیکن اس وقت تک سیوا کے قدم جم چکے تھے۔ اب مراسلت سے ہی کام چل سکتا تھا۔ سکندر نے سیوا کو مراسلت کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر جب اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو اس نے فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے ایک امیر افضل خاں کو طلب کیا اور اسے سیوا کا سر کچلنے کا حکم دیا اور اسے ایک بھاری لشکر دے کر روانہ کر دیا۔

افضل خاں نہایت لائق منتظم اور بہادر امیر تھا۔ اس نے اس خوبی سے سیوا کے خلاف فوجی کارروائی کی کہ وہ عاجز ہو گیا۔ سیوا نے کھلے میدان میں جنگ کر کے دیکھ لی تھی اور قلعہ بند ہونے میں بھی عافیت نہیں تھی۔ اب مکاری اور چالاکی ہی ایک حربہ رہ گیا تھا جس کا وہ ماہر تھا۔ وہ قلعے میں تھا اور باہر افضل خاں اس کی تاک میں تھا۔ ایک روز قلعے کا دروازہ کھلا اور چند برہمن باہر آئے۔

”مہاراج! سیوا اپنے کیے پر شرمندہ ہے۔ آپ سے معافی کا طلب گار ہے۔ اب آپ چاہیں تو اس کے ٹکڑے کر دیں، چاہیں تو معاف کر دیں۔“ ان برہمنوں نے افضل خاں سے کہا۔

”سیوا کی مکاریوں سے ہم خوب واقف ہیں۔ اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ اپنے قول سے نہیں پھرے گا؟“

”اس کی ضمانت ہم لیتے ہیں۔ وہ غیر مسلح قلعے سے باہر آئے گا اور آپ سے معافی مانگے گا۔ جتنے قلعے اس نے اب تک لیے ہیں وہ سب آپ کے حوالے کر دے گا۔“

آخر کئی گھنٹوں کی گفت و شنید کے بعد طے پایا کہ سیوا اپنے قلعے سے تین چار غیر مسلح خدمت گاروں کے ساتھ باہر آ جائے گا اور ایک مقررہ مقام پر افضل خاں سے ملے گا۔ اگر افضل خاں کہیں گے تو وہ ان کے ساتھ بیجاپور بھی چلا جائے گا۔

افضل خاں ان کی باتوں میں آ گیا۔ مقررہ مقام پر پالکی میں بیٹھ کر بلا کسی ہتھیار کے چلا گیا۔ اپنی فوج کو کچھ فاصلے پر ٹھہرا دیا۔ اسے اپنی بہادری پر ایسا ناز تھا کہ احتیاط کا دامن تک چھوڑ دیا۔

سیوا جی حسبِ وعدہ قلعے سے پیدل ہی باہر آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھے، گویا معافی مانگ رہا ہے۔ جب افضل خاں کی پالکی سے کچھ فاصلے پر پہنچا تو بلند آواز سے معافی کی التجائیں کرنے لگا۔ تھرتھراتے لفظوں میں یہ بھی کہتا جا رہا تھا کہ جو خدمت گار پالکی کے قریب ہیں، انہیں بھی ہٹا دیا جائے۔

اسے کیا کرنا ہے، اس کی سازش وہ پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔

افضل خاں نے اس کی التجا پر ان چند آدمیوں کو بھی ہٹا دیا جو اس کی پالکی کے نزدیک تھے۔ نزدیک آتے ہی

اس نے خود کو افضل خاں کے قدموں پر گرا دیا۔ افضل خاں اس کے ہاتھ میں دبا ہوا ہتھیار دیکھ ہی نہ سکا۔ اب جو افضل خاں نے جھک کر اس کا سر اٹھایا اور اس سے بغل گیر ہونا چاہا تو اس نے نہایت چابکدستی سے وہ خفیہ ہتھیار اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ افضل خاں کو آہ تک کھینچنے کی مہلت نہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی بے شمار سوار اور پیادے پہاڑوں سے نکل آئے۔ یہ وہ تھے جنہیں اس نے پہلے ہی چھپا رکھا تھا۔ ان سواروں اور پیادوں نے افضل خاں کے لشکر پر اچانک حملہ کر دیا اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ جلد ہی افضل خاں کے لشکر کو شکست ہو گئی۔ سیوا جی نے تمام ہاتھی گھوڑے، خزانے اور مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ پھر شکست خوردہ سپاہیوں کے لیے امان کا اعلان کر کے اپنے پاس نوکری دینے کا لالچ دیا۔ لشکر کا ایک بڑا حصہ اس کے ساتھ مل گیا۔

افضل خاں اسے نیست و نابود کرنے آیا تھا مگر اس کی قوت میں مزید اضافہ ہو گیا اور افضل خاں اپنی جان سے گیا۔

جب سکندر عادل کو اس سانحے کی اطلاع ملی تو اس نے ایک دوسرا لشکر سپہ سالار رستم خاں کی کمان میں روانہ کیا۔ یہ لشکر ایک مقام قلعہ پر نالہ کے قریب جا کر رک گیا کیونکہ سیوا اس کے استقبال کے لیے پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ دونوں لشکروں کے درمیان خونریز معرکہ ہوا۔ اس لڑائی میں رستم خاں مغلوب ہو گیا۔ اس فتح نے اس کی طاقت اور دبدبے کو بے پناہ بڑھا دیا۔

تاریخ دورِ شاہجہانی سے دورِ عالم گیری میں داخل ہو چکی تھی۔ شاہ جہاں قید میں تھا اور اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا تھا۔

سیوا کی شوریدہ سری کی رپورٹ دربارِ عالی میں پہنچی تو امیر الامراء صوبہ دار دکن کے نام فرمان صادر ہوا کہ اس کی سرکوبی کی جائے۔ عالم گیر اپنے بھائیوں کی شورشوں سے نمٹنے میں مشغول تھا لیکن سیوا کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ دیکھ رہا تھا کہ یہ فتنہ اس کی راہ میں رکاوٹیں ڈالے گا۔

صوبہ دار نے حکمِ شاہی پر حرف بہ حرف عمل کیا۔ اورنگ آباد میں ایک امیر ممتاز خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے آگے بڑھا۔ سیوا کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ موضع سیوگانو میں ہے۔ امیر الامراء کی آمد کا سن کر وہ وہاں سے نکل گیا۔ امیر الامراء نے بغیر کسی جدال و قتال کے اس قصبے پر

قبضہ کرلیا۔

سیوا کہاں چین سے بیٹھنے والا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو امیر الامراء کے لشکر پر چھاپے مارنے اور رسد لوٹنے پر مامور کردیا۔

جب شاہی لشکر تک رسد پہنچنے میں دقت ہونے لگی تو امیر الامراء نے چار ہزار تجربہ کار سواروں کو متعین کیا کہ وہ رسد کو اپنی حفاظت میں پہنچائیں۔ اس کے باوجود یہ حالت رہی کہ جیسے ہی رسد اور بار برداری روانہ ہوتی، سیوا کے مقرر کردہ قزاق اطراف سے نکلتے اور اونٹ، گھوڑے، آدمی جو بھی ہاتھ آتا لے کر نکل جاتے۔

اسی طرح لڑتے بھڑتے بادشاہی لشکر پونا اور سیوا پور پر پہنچا اور ان دونوں مقامات کو سیوا کے قبضے سے نکال لیا اور پونا کو مستقر بنا کر ''چاکنہ'' کے قلعے پر فوج کشی کی۔

خندقیں کھدوانے اور مورچے، دمدمے لگانے کا کام شروع کرادیا۔

سیوا کی قسمت یہاں بھی کام کررہی تھی۔ ابھی کام مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ بارشیں شروع ہوگئیں۔ اس علاقے کی بارش بڑی تکلیف دہ تھی۔ پانچ ماہ تک مسلسل شب و روز برستی تھی اور گھروں سے نکلنے کی مہلت نہ دیتی تھی۔ دن میں ایسی سیاہ آندھی اٹھتی تھی کہ دن میں رات کا سماں بندھ جاتا تھا۔ آدمی کو آدمی نظر نہ آتا تھا۔

اس خوفناک بارش میں بندوقیں ٹھنڈی پڑگئیں۔ بارود گیلی ہوگئی۔ اس کے باوجود شاہی لشکر نے گولہ باری کرکے قلعے کو چھلنی کردیا۔ محصور مرہٹے بھی رات کے اندھیرے میں قلعے سے نکل کر مورچوں پر حملے کرتے رہتے۔

اسی کشاکش میں 56 دن گزر گئے تھے کہ شاہی لشکر نے ایک برج کو دھماکے سے اڑادیا۔ برج کے اڑتے ہی جاں باز مسلمانوں نے حملہ کردیا۔ مرہٹے بھی قلعے کے اندر رہتے ہوئے مدافعت کرتے رہے۔

بڑی سعی و جہد کے بعد قلعے کے حصار پر شاہی لشکر کا قبضہ ہوگیا۔

جب بالا حصار میں بھی محصوروں پر حالات تنگ ہوگئے تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے اور قلعے سے باہر نکل کر قلعے کو بادشاہی افسروں کے حوالے کردیا۔

اگلے دن امیر الامراء قلعے کے اندر داخل ہوا اور اپنے ایک افسر ازبک خاں کو قلعہ دار بنا کر سیوا کی فکر میں آگے بڑھا۔

بادشاہ عالم گیر کی سالگرہ کا جشن منایا جارہا تھا کہ امیر الامراء کا عریضہ پہنچا جس میں اس واقعے کی تفصیل کے ساتھ یہ خوش خبری بھی پہنچائی گئی تھی کہ قلعہ پرینده جدال و قتال کے بغیر قبضے میں آگیا۔

سیوا کی تلاش کے دوران امیر الامراء نے مرہٹوں کے چند اور قلعے قبضے میں لے لیے اور پھر ''پونا'' میں آکر بیٹھ گیا جسے اس نے مستقر بنایا تھا۔ اس نے یہاں اسی حویلی میں قیام کیا جو سیوا نے تعمیر کرائی تھی۔

پونا میں قیام کے دوران امیر الامراء نے سیوا کو گرفتار کرنے کے لیے چاروں طرف فوجیں پھیلادیں۔

پونا فوجی نگرانی میں تھا اس لیے بادشاہی ملازموں کے سوا کسی شخص کو شہر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ خاص طور پر مرہٹوں کو تو قطعی اجازت نہیں تھی۔ انہیں تو یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ شاہی ملازمت بھی اختیار کریں۔

سیوا سخت پریشانی اور بدحواسی میں پہاڑوں میں آوارہ گردی کررہا تھا۔ جہاں پہنچتا تھا شاہی فوجی اس کے تعاقب میں پہنچ جاتے تھے۔

پھر ایک چال چلی گئی۔ مرہٹوں کی ایک جمعیت کے آدمی جو پیدل دستوں میں ملازم تھے، کوتوال کے پاس حاضر ہوئے اور اس سے یہ بہانہ کیا کہ باہر سے ایک برات آئی ہے۔ اس برات کو اندر آنے دیا جائے۔ کوتوال کو بہلا پھسلا کر دو سو آدمیوں کا اجازت نامہ لے لیا۔

برات فرضی تھی، مقصد کچھ اور تھا۔ ایک فرضی دولہا بنایا اور ڈھول نقارے بجاتے ہوئے رات کے اول حصے میں شہر میں داخل ہوگئے۔ اس سے پہلے شام کو ان مرہٹوں نے دوسرے مرہٹوں کے ایک گروہ کو اسیر بنا کر شہر میں داخل کردیا تھا اور یہ بہانہ کیا تھا کہ یہ غنیم کے آدمی ہیں جنہیں مختلف تھانوں سے گرفتار کرکے لایا گیا ہے۔ پھر یہ سارے مرہٹے شہر کے ایک محلے میں جمع ہوگئے اور ہتھیار باندھ لیے، اوپر سے یہ برات آگئی۔

جب دو تہائی رات کی نوبت بجی تو مرہٹے چھپتے چھپاتے اندھیرے میں محل کی طرف بڑھے۔ باورچی خانہ محل کی دیوار سے متصل تھا۔ وہ نقب لگا کر باورچی خانے میں داخل ہوگئے۔ اس وقت رمضان کا مہینا تھا اس لیے چند باورچی سحری کے انتظام کے لیے جاگ گئے تھے اور کچھ لوگ سو رہے تھے۔ مرہٹوں نے اندر گھستے ہی ان پر حملہ کردیا اور اس پھرتی سے قتل کیا کہ انہیں شور مچانے کی فرصت بھی نہ ملی۔ محل کا ایک آدمی جس کا حجرہ باورچی خانے کی دیوار کے ساتھ ہی تھا، جاگ گیا۔ اس نے امیر الامراء کو

آواز دے کر اس شور کی بابت آگاہ کیا۔
"باورچی خانے کی جانب سے شور کی آوازیں آرہی ہیں جیسے کوئی حملہ ہوا ہے۔"
امیر الامراء نیند میں تو تھا ہی، یہ کہہ کر ٹال دیا کہ باورچی سحری پکانے کے لیے اٹھے ہوں گے۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ چند کنیزیں دیوار میں نقب لگنے کی اطلاع لے آئیں۔ اب امیر الامراء کے کان کھڑے ہوئے۔ کمان کندھے پر ڈالی اور برچھی ہاتھ میں لے کر باہر نکل آیا۔ باہر آتے ہی اس نے کمان میں تیر جوڑا لیکن اسی وقت ایک مرہٹے نے اس پر تلوار سے حملہ کر دیا۔ امیر الامراء کا انگوٹھا کٹ کر گر گیا۔ اس کے باوجود اس نے برچھی مار کر دو مرہٹوں کو گرا دیا۔ اسی وقت چند کنیزوں نے امیر الامراء (شائستہ خاں) کو وہاں سے ہٹا کر محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔
اب مرہٹوں کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مرہٹوں کے ایک گروہ نے چوکی خانے پر اچانک حملہ کر کے سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ایک گروہ کے چند آدمی نقار خانے میں پہنچے اور امیر الامراء کی طرف سے نقارچیوں کو حکم دیا کہ زور زور سے نوبت بجائی جائے۔ نقارچی پوری آواز سے نقارہ پیٹنے لگے۔ ایسا شور ہوا کہ کسی کو کسی کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ مرہٹوں نے محل کے تمام دروازے بند کر دیے۔ شائستہ خاں کا بیٹا چند آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں پہنچا۔ چند مرہٹوں کو قتل کیا مگر خود بھی شہید ہو گیا۔ مرہٹوں نے حرم خاص کی دو عورتوں کو بھی شہید کر دیا۔
اس خون خرابے کے بعد مرہٹے محل سے باہر نکل گئے۔
اس حادثے کی خبر بادشاہ تک پہنچی تو اس نے امیر الامراء کو ذمے دار ٹھہرایا اور دکن کی صوبہ داری کی مہم پر شہزادہ معظم کا تقرر کر دیا گیا۔ بادشاہ خود کوچ پہ کوچ کرتے ہوئے کشمیر کی طرف روانہ ہو گیا۔
سیوا کی فتنہ انگیزیاں اب پہلے سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ بادشاہی قصبوں اور علاقوں پر برابر حملے کر رہا تھا۔ اس نے چند بندرگاہوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ یہ اطلاعات برابر مل رہی تھیں کہ جو جہاز وہاں سے گزرتے ہیں، وہ ان کو لوٹ لیتا ہے۔ قلعہ راج گڑھ میں اس نے تانبے کا سکہ اور ہون بھی اپنے نام سے جاری کر دیا تھا۔
عالمگیر نے کشمیر سے واپس آ کر سیوا کے استیصال کے لیے مزید فوجیں مختلف افسروں کی کمان میں روانہ کیں اور سختی سے حکم دیا کہ ہر حال میں سیوا کو گرفتار کیا جائے۔

راجا جے سنگھ جسے سیوا کی مہم پر مقرر کیا گیا تھا، پونا کی طرف کوچ کر گیا اور نظم و نسق سنبھال لیا۔ قدم جمانے کے بعد خود "پوند ہرو" اور "رود مال" نامی دو قلعوں کو فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ دونوں قلعے ایک دوسرے سے متصل تھے، درمیان میں پہاڑ کھڑے تھے۔
ہراول دستے کو روانہ کرنے کے بعد جے سنگھ خود بھی اپنے بیٹے کیسر سنگھ کے ساتھ محاذ پر پہنچ گیا اور قلعوں پر چاروں طرف سے حملے کر کے محصورین کا ناطقہ بند کر دیا۔
سخت جدوجہد اور جانی نقصان اٹھانے کے بعد یہ دونوں قلعے فتح ہو گئے۔
راجا جے سنگھ نے دونوں قلعوں کی فتح کے بعد سات ہزار سوار سیوا کے مقبوضہ دوسرے مقامات پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔
دونوں طرف سے سخت لڑائیاں ہوتی رہیں۔ یہ معرکے پانچ ماہ تک جاری رہے۔ ان معرکوں میں سیوا کا آباد کردہ سیواپور ایسا تباہ ہوا کہ اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔
مرہٹے بھی نچلے نہیں بیٹھے تھے۔ سامنے آ کر لڑنے کی ہمت نہیں تھی لیکن راتوں میں شب خون مارتے رہتے تھے گھنے جنگلوں میں آگ لگاتے پھرتے تھے تاکہ شاہی لشکر پیش قدمی نہ کر سکے۔
شاہی لشکر متعدد قلعے فتح کرتا ہوا راج گڑھ پہنچ گیا۔ یہ قلعہ سیوا کا حاکم نشین قلعہ تھا۔ محاصرے کے وقت سیوا اس قلعے میں موجود تھا۔ اس کے قبیلے کے افراد کی بڑی تعداد بھی یہاں موجود تھی۔ محاصرے کی خبر سنتے ہی سیوا کو ان افراد کی جان کے لالے پڑ گئے۔ سیوا کو مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے ہزار یہ چاہا کہ قبیلوں کو وہاں سے نکال کر دوسرے دشوار گزار مقامات پر پہنچا دے مگر محاصرہ اتنا سخت تھا کہ اسے کامیابی نہ مل سکی۔
جب اس نے دیکھا کہ قلعہ بس فتح ہونے والا ہے۔ شاہی لشکر کو اندر آنے سے کوئی نہ روک سکے گا تو اس نے عیاری کا پرانا ہتھیار استعمال کیا۔ ندامت کو قلم بنایا اور عاجزی کی روشنائی میں ڈبو کر راجا جے سنگھ کی خدمت میں درخواست لکھی۔
"میں اپنے تمام قصوروں کی معافی چاہتا ہوں۔ یہ قلعہ بصورت معافی آپ کے حوالے کر دوں گا۔ باقی ماندہ قلعے بھی آپ کے سپرد کرنے میں دیر نہیں کروں گا۔ مجھے آپ سے ملاقات میں دیر نہیں کرنی چاہیے لیکن آپ کی

اجازت کے بغیر یہ قدم کیسے اٹھا سکتا ہوں۔ اگر آپ ملاقات کی اجازت فرمائیں تو میں پاؤں پکڑ کر معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

وہ اپنی عیاری اور مکاری میں اتنا بدنام ہو چکا تھا کہ راجا نے اس درخواست کو بھی اس کی مکاری سے تعبیر کیا اور قلعے کا محاصرہ اور سخت کر دیا۔

سیوا بھی ایک ڈھیٹ تھا۔ اجازت کی پروا نہیں کی اور تنہا قلعے سے نیچے اتر آیا۔ اس کے فرستادہ برہمنوں نے بڑی عاجزی سے قسمیں کھائیں۔ راجا کو مجبور ہونا پڑا اور اس شرط پر ملاقات کے لیے تیار ہو گیا کہ وہ دربار میں حاضری کے لیے جائے گا۔ سیوا تو اس وقت ہر شرط ماننے کو تیار تھا۔ جب وہ ننگے پاؤں، ادب سے ہاتھ باندھے راجا سے ملاقات کے لیے آگے بڑھا تو راجا نے اسے راستے ہی میں روک دیا اور یہ پیغام اس کے پاس بھیجا۔

''اگر تم صدقِ دل سے اطاعت و فرماں برداری قبول کر لو اور قلعوں کو سپرد کرنے اور بادشاہی احکام تسلیم کرنے میں پوری اطاعت کرو تو ملاقات کرنے کا کچھ فائدہ ہے ورنہ اب بھی وقت ہے کہ واپس چلے جاؤ اور مقابلے کی تیاری کرو۔'' سیوا نے اس کا نہایت مثبت جواب بھجوایا۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔

''میں بخوبی جانتا ہوں کہ میری جان و مال، عزت و آبرو صرف اطاعت و تابعداری ہی میں محفوظ رہ سکتی ہے۔''

اس پیغام کے بعد راجا جے سنگھ نے اپنے چند بلند مرتبہ افسروں کو بھیج کر اسے اعزاز و اکرام کے ساتھ اپنے پاس بلایا۔ جب وہ حاضر ہوا تو راجا نے اٹھ کر معانقہ کیا اور اپنے قریب بٹھایا۔ سیوا نے بڑی عاجزی اور خجالت کے ساتھ دست بستہ عرض کیا۔

''میں ذلیل غلاموں اور ادنیٰ مجرموں کی طرح اس بارگاہ میں حاضر ہو گیا ہوں۔ اب تمہارے ہاتھوں میں ہے چاہو تو مجھے قتل کر دو چاہو تو میری جان بخشی کر دو۔ میں اپنی جاں بخشی کے صلے میں اپنے بڑے بڑے قلعوں کو بادشاہی امراء کے حوالے کر دوں گا۔ اپنے بیٹے کو بادشاہی جرگے میں خدمت گزاری کے لیے دے دوں گا۔''

اس جواب پر راجا نے اسے تسلی دی اور اسے امیر دلیر خاں کے پاس بھجوا دیا۔

دلیر خاں نے بھی اس کی معافی کو قبول کیا اور اسے اپنی جانب سے ایک مرصع تلوار اور دو عربی گھوڑے ہدیہ اور اسے راجا کے پاس لا کر اس کا ہاتھ راجا کے ہاتھ میں دے دیا اور اس کی طرف سے راجا کو مطمئن کر دیا۔

سیوا سے بڑا گھاگ کون ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنی وفاداری کا مزید یقین دلانے کے لیے کمر سے تلوار کھول کر رکھ دی۔

''میں غیر مسلح خادموں کی طرح خدمت میں رہوں گا۔''

جس وقت سیوا نے امان کے لیے رجوع کیا تھا، راجا نے ساری کیفیت حضور میں لکھ بھیجی تھی اور اس کے لیے معافی کے فرمان اور خلعت کی سفارش کی تھی۔

سیوا اس وقت راجا کے پاس بیٹھا تھا اور اپنی وفاداری کا یقین دلا دیا تھا کہ گرز بردار فرمان اور خلعت لے کر پہنچ گیا۔

سیوا نے آداب و تسلیمات بجا لا کر جاں بخشی کا فرمان اور خلعت حاصل کی۔ یہ خلعت یونہی نہیں مل گئی تھی بلکہ اس سے پہلے ایک معاہدہ ہوا تھا۔ طے پایا تھا کہ وہ اپنے مقبوضہ 35 قلعوں میں سے 23 قلعے دے دے گا اور بطور محصول چالیس لاکھ روپے جمع کرائے گا اور بارہ چھوٹے کم آمدنی والے قلعے اس کے قبضے میں رہیں گے۔ اس کا آٹھ سالہ بیٹا سنبھا لشکر کے ساتھ بادشاہ کے حضور جائے گا۔ یہ بھی طے ہوا کہ جس وقت بھی اسے بادشاہی کام پر طلب کیا جائے گا وہ حاضر ہو جائے گا۔

☆☆☆

شاہ جہاں بادشاہ بیمار تھا اور نظر بند تھا۔ عالم گیر نے باپ کو نظر بند کر کے خود حکومت سنبھال لی تھی۔ جب معلوم ہوا کہ بادشاہ (شاہجہاں) کی بیماری شدت اختیار کر گئی ہے اور اب وہ آخری منزلوں میں ہے تو عالمگیر نے اسی دن شہزادہ محمد معظم کو بہ طریق یلغار عیادت و دریافت حال کے لیے اکبر آباد روانہ کر دیا۔

ابھی شہزادہ راستے ہی میں تھا کہ شاہجہاں کے رحلت کر جانے کی اطلاع ملی۔ یہ اطلاع عالمگیر تک پہنچی تو وہ بھی روانہ ہو گیا۔ اس عرصے میں تدفین عمل میں لائی جا چکی تھی۔ عالمگیر قبر پر گیا اور بڑی دیر تک آنسو بہاتا رہا۔

عالمگیر نے چند دن تک اکبر آباد میں ٹھہرنے کے بعد داروغہ تخت کو حکم دیا کہ تخت مرصع کو جشن کے لیے اکبر آباد سے دہلی منتقل کر دیا جائے اور اس کے ساتھ محل کی بعض خواتین کو بھی دہلی بھجوا دیا گیا۔

☆☆☆

عالمگیر کے جشن جلوس کا نواں سال تھا کہ اسی جشن کے موقع پر سیوا کے دربار میں پہنچنے کی اطلاع ملی۔ جو قول و

قرار راجا جے سنگھ اور سیوا کے درمیان ہوئے تھے، اس کے مطابق سیوا کو دربارِ شاہی میں پیش ہونا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے خزانے کو شاہجہاں آباد کے قلعے سے اکبر آباد کے قلعے میں منتقل کرانے کے احکام دیے گئے تھے چنانچہ جب سیوا دربار میں تھا تو اسی کی موجودگی میں یہ خزانہ وہاں پہنچا۔ خزانہ کیا تھا اشرفیوں کا شہر تھا۔ ایک ہزار سے زیادہ بیل گاڑیاں اشرفیوں، طلائی برتنوں اور مرصع سازوسامان سے لدی ہوئی تھیں۔ یہ خزانہ دیکھ کر لالچی سیوا کی آنکھیں حیرت سے پتھرا گئیں اور اس نے اپنے دل میں طرح طرح کی امیدیں باندھ لیں۔ جب بادشاہ کے پاس اتنا کچھ ہے تو انعام میں مجھے نہ جانے کیا کیا ملے گا۔

سیوا اپنے آٹھ سالہ بیٹے کے ساتھ حاضرِ بارگاہ ہوا۔ اس وقت اس کے چہرے پر ندامت نہیں غرور دیکھا جاسکتا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی میری گردن پر سر موجود ہے اور میں قیدی نہیں، انعام کا مستحق سیوا ہوں اور بادشاہ کے سامنے کھڑا ہوں۔

سیوا نے قانون درباری کے مطابق نذر پیش کی۔ بادشاہ کے اشارے سے اسے پانچ ہزاری منصب داری کی صف میں کھڑا کیا گیا۔ اس کے بیٹے کو بھی غائبانہ پانچ ہزاری کا منصب عطا ہوا تھا اس لیے وہ سات ہزاری منصب کی توقع کررہا تھا۔ اب جو اسے پانچ ہزاری منصب کا لائق سمجھا گیا تو اس کے غرور نے اس پر طنز کیا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔

بادشاہ کا دل اس کی طرف سے پوری طرح صاف نہیں تھا اس لیے اس کے خیال کے مطابق راجا جے سنگھ اسے جن امیدوں کے ساتھ یہاں لایا تھا، اس پر وہ عنایات نہیں ہوئیں۔ اس کا استقبال بھی اس کے شایانِ شان نہیں ہوا تھا۔

ان سب باتوں کو سوچتے ہوئے اس کی عیاری نے اسے یہی راہ سجھائی کہ وہ ان عنایات کو ٹھکرا کر دربار سے نکل جائے اور اپنے لیے اسی راستے کا انتخاب کرے جس پر وہ اب تک چلتا آیا تھا۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیے اور کمزور قدموں سے چلتا ہوا ایک گوشے میں چلا گیا اور فرش پر گر کے تڑپنے لگا اور زور زور سے ”ہائے دل ہائے دل“ چلانے لگا اور پھر بے ہوش ہوگیا۔

شاہی حکیم کو طلب کیا گیا۔ اس نے نبض دیکھی۔ دل کی رفتار بالکل ٹھیک تھی۔

”فکر کی کوئی بات نہیں۔ یہ خود ہی ہوش میں آئے گا۔“

حاضرین نے سمجھ لیا کہ یہ نمائشی دورہ تھا، سیوا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ طبیب نے ٹھیک کہا تھا۔ جب کوئی خاص تشویش نہیں ہوئی اور اسے فرش پر ہی پڑا رہنے دیا تو تقریباً گھنٹا بھر بعد وہ خود ہوش میں آگیا۔ اس وقت تک دربار برخاست ہوچکا تھا اور بادشاہ اٹھ کر دیوان خانے میں جاچکا تھا۔

سیوا نے ہوش میں آتے ہی اپنے قریب کنور رام سنگھ کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ اسے دیکھتے ہی سیوا پھٹ پڑا۔

”جو سلوک میرے ساتھ ہوا تم نے دیکھ لیا۔ میں اسی قابل تھا کہ مجھے پنج ہزاری منصب دیا جاتا؟ میرا سب کچھ چھین کر مجھے معمولی سے منصب پر ٹرخا دیا۔ میں نے جتنے قلعے حاصل کیے تھے اپنے زورِ بازو سے حاصل کیے تھے۔“

”تم اس وقت دل چھوٹا مت کرو۔ ایک مرتبہ قدم تو جماؤ، مناصب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔“

”ایسے جینے کا کیا فائدہ۔ اس سے تو اچھا ہے میں خودکشی کرلوں۔“

”بہادروں کو یہ کلمات زیب نہیں دیتے۔ میں کسی مناسب موقع پر بادشاہ سے تمہارے لیے سفارش کروں گا۔“

جب اس کی فرضی بیماری کی اطلاع بادشاہ کو ہوئی تو بادشاہ نے بے رخی اختیار کی۔ جو شاہانہ عنایات عمل میں آنے والی تھیں، موقوف کردی گئیں اور اسے دربار سے رخصت کرنے کا حکم جاری کردیا۔

”سیوا کو ایک الگ مکان میں ٹھہرا کر پہرا لگا دیا جائے اور آئندہ مجرے کے لیے دربار میں نہ لایا جائے البتہ اس کا بیٹا مجرا تسلیمات کے لیے آتا رہے۔“

رام سنگھ کی تجویز پر شہر سے باہر اسے مکان میں ٹھہرا کر پہرا لگا دیا گیا۔ گویا اب وہ قید میں تھا۔

سیوا کا داؤ الٹا پڑ گیا تھا۔ وہ اس اجنبی تنہا مکان میں اترا تو اپنے گزشتہ افعال اور موجودہ اندیشناک صورتِ حال نے اسے سراسیمہ کردیا۔ بادشاہوں کے عتاب کے قصے اس کے لیے نئے نہیں تھے۔ آج نظر بند کرایا گیا ہے کل کو قتل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس پر تھرتھری طاری ہونے لگی۔

اس نے اس مکان میں پاؤں پھیلا تو لیے تھے لیکن برابر اس دُھن میں تھا کہ کسی طرح یہاں سے فرار کا موقع مل جائے۔ وہ جتنا بہادر تھا، اتنا ہی عیار بھی تھا۔ آخر اس کی تدبیروں نے انگڑائی لی۔ اس نے درباری امراء

اور رام سنگھ کو دکن کے تحائف بھیجنے شروع کیے اور ان سے دوستی بڑھانے لگا۔ رام سنگھ اور دوسرے امراء اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ اس طرح اس کی تنہائی بھی بہلنے لگی اور ایسے لوگ بھی میسر آ گئے جو وقت آنے پر اس کی مدد کر سکتے تھے۔

جب وہ سب کے دلوں میں ہمدردی پیدا کر چکا تو اس نے ایک منصوبے کے مطابق خود کو بیمار ڈال دیا اور صاحبِ فراش ہو گیا۔ جگر کے درد کی شدت ظاہر کر کے تڑپنے لگا۔ اس بیماری نے اسے یہ موقع دے دیا کہ طبیبوں اور معالجوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔ اس نے ان طبیبوں کو بھی گرانقدر تحائف دے کر شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ یہ طبیب اس کی بیماری کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے لگے۔

چند دن بعد اس نے صحت پا جانے کا بہانہ کیا اور فقیروں اور محتاجوں کو اناج اور دوسری اشیا دان کیں۔ بڑے بڑے پٹاروں پر کاغذ منڈھ کر قسم قسم کی شیرینی سے ان کو بھرا اور امیروں کے گھروں پر، فقیروں کی خانقاہوں پر یہ پٹارے بھجوا دیے مگر اندر ہی اندر اپنی تیاریوں میں لگا رہا۔ دو تین تیز رفتار گھوڑے تیار کرائے اور یہ شہرت دی کہ وہ یہ گھوڑے برہمنوں کو دان دینا چاہتا ہے۔ بعد میں ان گھوڑوں کو اپنے چند ہم رازوں کے ساتھ شہر سے چودہ کوس پر ایک مناسب جگہ پر ٹھہرا دیا۔

یہ سب انتظامات کرنے کے بعد اس نے فرار کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن اس نے اپنے ایک جاں نثار ہمراہی کو جو شکل و صورت میں اس سے مشابہ تھا اپنے پلنگ پر سلا دیا۔ جڑاؤ طلائی کڑا جو خود پہنا کرتا تھا، اس کے ہاتھ میں پہنا دیا۔ اسے تاکید کر دی کہ اس کے جانے کے بعد وہ باریک کپڑے کی چادر اپنے سر پر ڈال لے اور اپنی کلائی کو اس طرح رکھے کہ سونے کا کڑا نظر آتا رہے۔

مٹھائی کے دو ٹوکرے تیار رکھے تھے۔ مٹھائی کی جگہ ایک میں وہ خود بیٹھ گیا، ایک میں اپنے بیٹے کو بٹھا لیا۔ اوپر سے کاغذ لپیٹ دیا گیا اور یہ مشہور کر دیا کہ متھرا کے برہمنوں اور فقیروں کے لیے مٹھائی جا رہی ہے۔ اس کے آدمی یہ ٹوکرے اٹھا کر باہر لے آئے۔

وہ اکبر آباد سے نکلا اور اس مقررہ مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کے دو گھوڑے تیار کھڑے تھے اور جن کے بارے میں اس نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ اس نے برہمنوں کو دان دینے کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔

یہاں سے وہ متھرا پہنچ گیا۔

سیوا کے فرار کے بعد دوسرے دن مخبر نے اطلاع پہنچائی کہ سیوا بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے یہ اطلاع ملتے ہی کوتوال کو طلب کر لیا۔ کوتوال کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے کس سانحے کی باز پرس کے لیے بلایا گیا ہے۔ پھر بھی یہ غیر معمولی بات تھی کہ بادشاہ اسے طلب کرے۔ وہ ڈرتے ڈرتے بادشاہ کے حضور پہنچا۔ یہاں پہنچ کر اس نے جو کچھ سنا، اسے سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

''حضور! میری حقیر دانست میں یہ کیسے ممکن ہے۔ اس کے گھر کے اطراف چوکی پہرا برابر لگا ہوا ہے۔'' بادشاہ نے اس اصرار پر مخبر کی طرف دیکھا۔

''حضور! میری اطلاع سو فیصد درست ہے۔ تحقیق کے بعد ثابت ہو جائے گا کہ میں سچا ہوں۔'' بادشاہ نے تحقیق کا حکم دے دیا۔

کوتوالی کے آدمی اندر گئے اور مخبر کو جھوٹا ثابت کر دیا۔

''سیوا تو سو رہا ہے اور چادر کے نیچے سے اس کی کلائی کا سونے کا کڑا دکھائی دے رہا ہے۔''

''تم نے چادر ہٹا کر شناخت کیوں نہیں کیا؟''

''اس نے باریک چادر اوڑھی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ جھلک رہا تھا۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں وہ سیوا ہی ہے۔''

مخبر نے پھر اصرار کیا۔

''اگر سیوا اس وقت تک چالیس پچاس کوس نہ نکل گیا ہو تو میری گردن اڑا دی جائے۔ یہ تحقیق ادھوری ہے۔''

یہ تحقیق واقعی ادھوری تھی۔ کوتوالی کے آدمی پھر اندر گئے۔ چادر ہٹا کر دیکھا تو سیوا کی جگہ کوئی اور لیٹا ہوا تھا۔ کوتوال کو گرفتار کر لیا گیا۔ الزام رام سنگھ پر بھی آیا۔ اسے منصب سے معزول کر دیا گیا اور مجرا تسلیمات کی ممانعت کر دی۔ بادشاہی حکم صادر ہوا کہ گرز بردار دکن کے اطراف و اکناف کے صوبے داروں اور فوج داروں کے پاس احکام لے کر جائیں کہ جہاں بھی مفرور سیوا کی اطلاع ملے اسے گرفتار کر کے حضور میں روانہ کر دیں۔

ایک خط راجا جے سنگھ کی طرف بھی روانہ کیا گیا جو بے جاپور کی مہم سے فارغ ہو کر اورنگ آباد پہنچ چکا تھا۔

''سیوا کے فرار کی شہرت ہونے سے پہلے ہی اس کے داماد نتھوجی کو قید کر کے حضور میں روانہ کر دیے اور اس کے بعد اس مفرور کو تلاش کر کے اس کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ

دوبارہ جمعیت اکٹھی کر کے کہیں بیٹھ جائے۔''
سیوا کے احمد آباد اور برار کے راستے سے جانے کا زیادہ امکان تھا اس لیے پہلے زیادہ تر گرز بردار اسی طرف بھیجے گئے۔ پھر تمام صوبوں میں ان کو مقرر کر دیا گیا۔

☆☆☆

راجا جے سنگھ نے بادشاہ کے حکم سے بے جاپور کا محاصرہ اٹھالیا۔ یہ یقینی بات تھی کہ بادشاہی لشکر کے واپس جانے کے بعد مفتوحہ قلعوں کا قبضے میں رہنا محال ہو جاتا اور دکنی لازماً ہجوم کر کے قلعوں پر قبضہ کر لیتے۔ اس لیے اس نے یہی مناسب سمجھا کہ قلعوں کو خالی کر کے باقی ماندہ سامان لشکریوں کی تاراج کے لیے چھوڑ دے۔ جو برج اور فصیل مسمار کی جاسکتی ہو، اسے منہدم کر دیا جائے۔
ان کارروائیوں کے بعد راجا وہاں سے کوچ کر کے اورنگ آباد چلا گیا۔ وہ وہاں پہنچا ہی تھا کہ اسے بادشاہ کا خط موصول ہوا۔ اس نے پہلی فرصت میں نتھوجی کو گرفتار کر لیا۔
اس کی گرفتاری اس لیے مشکل نہیں تھی کہ وہ راجا جے سنگھ کے ساتھ معرکہ بے جاپور میں شامل تھا۔ اس معرکے میں وہ اور سیوا دونوں شامل تھے۔ سیوا کو چونکہ دربارِ شاہی سے طلبی کے احکام آگئے تھے۔ اس لیے اسے بارگاہِ شاہی کے لیے رخصت کر دیا گیا تھا اور نتھوجی بے جاپور کے محاصرے میں شامل رہا۔
(سیوا دربار میں پہنچا۔ نظر بند ہوا پھر فرار ہو گیا اور اب اس کی تلاش کی جا رہی تھی)
بادشاہی حکم کے مطابق نتھوجی کو گرفتار کر لیا گیا۔ جب راجا جے سنگھ کے آدمیوں اور بادشاہی گرز برداروں کی تحویل میں وہ حضورِ شاہی میں پہنچا تو اسے سخت نگرانی میں قید کر دینے کا حکم ہوا۔ نتھوجی نے رہائی کی خاطر منافقانہ طور پر اسلام قبول کر لینے کی غرض سے عرض داشت بھیجی۔ نتھوجی عیار جانتا تھا کہ دیندار بادشاہ کس چیز سے خوش ہو گا حالانکہ وہ مخلص نہیں تھا۔ یہ بھی اس کی چال تھی۔ بادشاہ اس کی چال میں آ گیا اور اس کی درخواست قبول کر لی اور کلمہ پڑھوانے کے بعد اسے محمد قلی خاں کا خطاب دے کر تین ہزاری دو ہزار سوار کے منصب پر بحال کر دیا۔

☆☆☆

سیوا کی تلاش ہوتی رہی۔ وہ اور اس کے ساتھی متھرا پہنچے اور متھرا سے بھیس بدل کر آگے کی طرف روانہ ہوئے۔ سب نے بھبوت مل رکھے تھے۔ کوئی بیراگی بن گیا تھا تو کوئی سائیس اور کوئی آواسی بنا ہوا تھا۔ سیوا کے پاس جو قیمتی جواہرات اور اشرفیاں تھیں ان کو اس نے دستی لاٹھیوں میں کھوکھلا کر کے چھپا دیا تھا۔ بعض چیزیں پرانے جوتوں میں سی کر رکھ لی تھیں۔ قیمتی الماس اور یاقوت کے دانے موم میں لپیٹ کر لباسوں میں سی لیے تھے۔
اس کے ساتھی اس خوف سے کہ اگر گرفتار ہوں تو ایک ساتھ نہ ہوں، تین ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ فوج داروں کو اس کی گرفتاری کے لیے باخبر کر دیا گیا تھا لہٰذا شاہی عمال حرکت میں آ گئے تھے۔ جب یہ لوگ سفر کرتے ہوئے ایک مقام پر پہنچے تو فوج دار علی قلی نے ان تینوں ٹکڑیوں کو گرفتار کر لیا۔ پوچھ گچھ کے دوران ظاہر ہے سیوا نے سیوا ہونے سے انکار کر دیا اور یہی کہا کہ وہ یاترا کے لیے بنارس جا رہے ہیں لیکن فوج دار کے آدمی مطمئن نہیں ہوئے اور انہیں تفتیش کے لیے قید کر دیا گیا۔
یہ لوگ ایک دن اور ایک رات قید میں رہے۔ سیوا جیسے عیار کے لیے یہ مدت کوئی ترکیب سوچنے کے لیے بہت تھی۔ وہ دوسرے دن دوپہر کے وقت فوج دار علی قلی کے پاس پہنچ گیا اور اس سے تنہائی میں ملنے کی درخواست کی۔ اس کے آدمیوں نے یہ اطمینان کرنے کے بعد وہ غیر مسلح ہے، اسے فوج دار کے پاس جانے دیا۔ اندر پہنچنے کے بعد اس نے اقرار کر لیا کہ وہ ہی سیوا ہے۔
''میں ہی سیوا ہوں۔ وہی سیوا جس کی تلاش میں شاہی کارندے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ میں تمہارے ہاتھ لگ گیا۔''
''اس اقرار کا مطلب جانتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے تمہیں کیا سزا ہو سکتی ہے؟''
''میں ہر سزا کے لیے تیار ہوں لیکن اس سے پہلے میری وہ بات سن لو جو میں تم سے کہنے آیا ہوں۔''
''کہو کیا کہنا چاہتے ہو اور یہ بھی سن لو کہ مجھ سے کسی سفارش کی توقع مت رکھنا۔''
''میرے پاس الماس اور یاقوت کے دو دانے ہیں جن کی قیمت ایک لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔'' سیوا نے فوج دار کی بات کو نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم مجھے قتل کر دو گے یا زندہ گرفتار کر کے بھجوا دو گے تو یہ دو قیمتی پتھر تمہیں نہیں مل سکیں گے۔ یہ پتھر میں نے کہاں چھپائے ہیں، مجھے قتل کرنے کے بعد بھی تم نہیں ڈھونڈ سکو گے۔ اگر ایک لاکھ کا فائدہ منظور ہے تو مجھے اور میرے ساتھیوں کو جانے دو۔ میں وہ دونوں قیمتی پتھر تمہارے حوالے

کردوں گا۔“

علی قلی کو معلوم تھا کہ سیوا کی گرفتاری کے صلے میں اسے انعام ضرور ملے گا لیکن کب ملے اور کیا خبر نہ بھی ملے۔ اس وقت جو فائدہ ہو رہا ہے، اس سے فائدہ اٹھالے۔ وہ لالچ میں آگیا اور رہائی کے وعدے پر اس سے دونوں پتھر لے لیے اور کاغذات پر یہ ظاہر کر کے کہ گرفتار ہونے والوں میں کوئی سیوا نہیں تھا، اسے اور اس کے ساتھیوں کو رہا کر دیا۔

سیوا نے اسے اپنی دوسری زندگی تصور کیا اور بنارس کی طرف بھاگ نکلا۔

سیوا تیز رفتاری کے ساتھ میلوں پیدل چلنے کا عادی تھا مگر اس وقت اس کے ساتھ اس کا خوردسال بیٹا بھی تھا جس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور اب اس سے مزید چلا نہیں جا رہا تھا۔ سیوا اسے چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ چھوڑتا بھی تو کہاں۔ اس سفر میں اس کے بعض ساتھی بھی اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ سوچتے سوچتے اسے اپنے خاندانی پروہت کا خیال آیا جو الٰہ آباد میں رہتا تھا۔ اس کے بزرگ بھی بنارس آتے تھے تو اس برہمن یا اس کے بزرگوں کو انہوں نے اپنا پروہت بنایا تھا۔ ہندوؤں میں یہ طریقہ تھا کہ معزز ہندو جب کسی مقام پر جاتے تھے تو جو برہمن ان کی خدمت کرتا تھا اسے تصدیق نامہ لکھ دیا کرتے تھے۔ وہ ان کا خاندانی پروہت کہلاتا تھا۔

الٰہ آباد پہنچنے کے بعد سیوا نے اس برہمن پروہت کو ڈھونڈ نکالا اور جواہرات اور اشرفیوں کے ساتھ بیٹا بھی اس کے حوالے کر دیا اور اسے تاکید کر دی۔

”میرے بیٹے سنبھا کو اپنے پاس رکھ۔ اگر میں زندہ رہا اور صحیح سلامت اپنے مقام پر پہنچ گیا تو میں تجھے خط لکھوں گا۔ اس وقت تو سنبھا کو لے کر جس راستے اور جس انتظام سے میں کہوں گا سفر کرنا اور میرے پاس پہنچ جانا۔ یہ یاد رکھ کہ میرا خط آنے تک تو اپنی جگہ سے ہرگز حرکت نہ کرنا خواہ سنبھا ہی چلنے پر اصرار کرے۔“

برہمن کو اور کیا چاہیے تھا۔ بے تحاشا دولت جو مل گئی تھی۔ اس نے عہد کر لیا کہ وہ اپنی جان سے زیادہ سنبھا کی حفاظت کرے گا۔

سیوا الٰہ آباد سے نکل گیا۔

جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا ہوا وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ ایک گاؤں میں داخل ہوا۔ ان کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ جوگی بیراگی نظر آ رہے تھے۔ گاؤں والے تو عقیدت کی آنکھیں ان کے قدموں پر رکھ رہے تھے۔ اس بات پر لڑائی ہو رہی تھی کہ یہ سادھو کس کے گھر ٹھہریں گے۔ آخر گاؤں کے چودھری نے قرعہ اندازی کرنے کا حکم دیا۔ ایک پرچی اس بات پر ڈالی گئی کہ یہ لوگ کھانا کس کے گھر کھائیں گے۔ دوسری پرچی اس بات پر ڈالی گئی کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ اس کے لیے دو گھروں کا انتخاب ہوا۔ ایک گھر اس کے ساتھیوں کے لیے طے ہوا اور دوسرا سیوا کے لیے۔

سیوا کے وہاں پہنچتے ہی گاؤں والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لوگ اسے سچ مچ کا سادھو سمجھ رہے تھے۔ اپنی حاجتیں بیان کر رہے تھے۔ طرح طرح سے خاطر مدارات کر رہے تھے۔ وہ بھی خود کو وہی ظاہر کر رہا تھا جو گاؤں والے سمجھ رہے تھے۔ لوگوں کی قطار لگی ہوئی تھی جو آتا تھا اس کے پاؤں چھو کر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

جب رات ہوئی تو ایک کوٹھری میں اس کا بستر لگا دیا گیا۔ وہ بھی اتنا تھکا ہوا تھا کہ اندر پہنچتے ہی بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن ضرور تھی لیکن نیند آنکھوں سے اڑ گئی تھی۔ ہر آہٹ پر یوں لگتا تھا جیسے شاہی کارندے اس کی گرفتاری کے لیے آ گئے۔ پھر وہ آنکھیں بند کر کے یہ سوچنے لگا کہ صبح اسے یہاں سے کب نکلنا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی گاؤں والے اسے گھیر لیں گے اس لیے رات ہی کے کسی پہر یہاں سے نکل جائے مگر مصیبت یہ تھی کہ اس کے ساتھی دوسرے مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں کیسے آگاہ کرتا۔ آخر یہی سوچا کہ دن چڑھے ہی کسی وقت نکلا جا سکے گا۔ یہی سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ سرہانے رکھے مٹی کے دیے کی روشنی میں اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک کوٹھری کے دروازے کی چرچراہٹ سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر دو لڑکیوں پر پڑی جو اس کے پلنگ کے قریب پہنچ گئی تھیں۔

”مہاراج!“ ایک نسوانی آواز نے سرگوشی میں اسے پکارا۔

”کیا ہے...... کون ہو تم؟“

”میں اوشا ہوں اور یہ چندا۔“

”یہاں کیا لینے آئی ہو؟“

”آپ کی خدمت کے لیے۔ اس گاؤں کا یہی رواج ہے۔ جو بھی سادھو سنت یہاں آتا ہے کوئی نہ کوئی کنیا اس کی خدمت کے لیے مقرر کی جاتی ہے۔ آج اس کے لیے ہمارا نام نکلا ہے۔ دوسری لڑکیاں منہ تکتی رہ گئیں۔“ دونوں کھلکھلا

کر ہنس پڑیں۔

''اس میں اتنا خوش ہونے کی کیا بات ہے۔''

''لو آپ بھی یہ پوچھ رہے ہیں۔ آپ کی سیوا نہیں کریں گے تو ہمیں ''بر'' (رشتہ) کیسے ملے گا۔''

''مجھے معلوم ہے، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔''

سیوا کا یہ کہنا گویا سیوا کی طرف سے اجازت تھی۔ وہ دونوں اس کے بستر پر بیٹھ گئیں اور اس کے پاؤں دابنے لگیں۔ ہاتھ لگتے ہی سیوا کو پھریری آ گئی۔ وہ واقعی اس رواج سے واقف نہیں تھا لیکن اب سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا رواج ہے۔

کچھ دیر بعد سیوا نے ان سے کہا۔ ''اب جاؤ۔ بہت ہو چکی خدمت۔''

یہ سنتے ہی وہ دونوں رونے لگیں۔

''مہاراج! اگر آپ نے ہمیں یونہی بھیج دیا تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ گاؤں والے کہیں گے کہ ہمارے پاپ ایسے تھے کہ مہاراج نے ہمیں قبول نہیں کیا۔ ہماری تو کہیں شادی بھی نہیں ہو سکے گی۔ ہمارا سر منڈوا کر گاؤں سے باہر بھیج دیا جائے گا۔''

''تم باہر جا کر کہہ دینا کہ تم قبول کر لی گئیں۔''

''کسی کو نہ معلوم ہو ہمیں تو معلوم ہوگا۔ ہم زندگی بھر اس آگ میں جلتے رہیں گے۔ شا کر دو مہاراج اور ہمیں قبول کر لو۔'' لڑکیوں نے کہا اور پلنگ پر اس کے دائیں بائیں لیٹ گئیں۔ یہ پلنگ نہایت چوڑا تھا اور شاید اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔

ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھایا اور چراغ بجھا دیا۔

صبح دن چڑھے سیوا کی آنکھ کھلی تو دونوں لڑکیاں جا چکی تھیں۔ وہ کچھ دیر رات کے واقعے پر غور کرتا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ابھی پلنگ سے پاؤں نیچے نہیں رکھے تھے کہ وہی لڑکیاں ناشتے کی تھالیاں ہاتھوں میں اٹھائے اٹھلاتی ہوئی کوٹھری میں داخل ہوئیں۔

''مہاراج! کلی مسواک کر لیا ہو تو ناشتا کر لیں۔ باہر جا کر دائیں مڑ جائیں تو غسل خانہ ہے۔''

سیوا گیا اور کلی کر کے آ گیا۔

''میرے ساتھیوں کا کیا حال ہے؟''

''وہ تو رات ہی کو کسی طرف چلے گئے تھے۔''

''کس طرف چلے گئے؟''

''انہیں شاید متھرا جانے کی جلدی ہو۔''

''مجھے بھی اب چلنا ہوگا۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ہم آپ کو گھاٹ پر لے کر چلیں گے۔ وہاں اشنان کرنا ہوگا۔''

''نہیں، میں اب چلوں گا۔ میرے ساتھی ابھی زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔''

دونوں لڑکیوں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور اسے مجبور کر کے گاؤں سے باہر ندی پر لے گئیں۔ سیوا کوئی ایسا موم کا پتلا نہیں تھا کہ کسی کے اشاروں پر ناچتا لیکن دونوں لڑکیوں کی دلکش ادائیں اسے نچا رہی تھیں۔ اس وقت بھی وہ ان کے ساتھ ندی پر چلا گیا۔

وہ پانی میں اتر گیا اور لڑکیوں نے اس کے کپڑے دھو کر ایک پتھر پر سوکھنے کے لیے ڈال دیے اور خود کپڑوں سمیت پانی میں اتر گئیں۔

سیوا نے رنگین زندگی ضرور گزاری تھی لیکن ایسے تجربے کبھی نہیں ہوئے تھے۔ وہ یہ بھول ہی گیا کہ اسے کہاں جانا تھا، لڑکیاں اسے روکتی رہیں اور وہ اپنے پاؤں سمیٹے رہا۔ یہاں تک کہ تین دن اور تین راتیں وہ وہاں ٹھہرا رہا۔ اس کے ساتھی اسے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اب وہ اکیلا تھا۔

تین دن اور تین راتیں گزر گئی تھیں۔ اب سیوا یہاں سے جانے کی سوچ رہا تھا۔ وہ دونوں اسے لے کر جنگل کی طرف چلی گئیں۔ وہیں انہوں نے سیوا کو یہ بتایا کہ اب وہ ''پوتر'' ہو گئی ہیں۔ اب ہماری شادی کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ اب ہمیں دیوی سمجھا جایا کرے گا۔ آپ کا شکریہ کہ آپ ہمارے گاؤں میں پدھارے۔ آپ چلے جائیں گے لیکن آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر رہے گا۔

وہ لڑکیاں اور سیوا واپس آئے۔ اس وقت شام ہو گئی تھی۔ سیوا اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ لڑکیاں گھر کے اندر چلی گئیں۔ سیوا خوش ہو رہا تھا کہ تین دن عیش بھی کر لیا اور چھپنے کی جگہ بھی مل گئی۔ ڈھونڈنے والے آگے بڑھ گئے ہوں گے یا مایوس ہو کر پلٹ گئے ہوں گے۔

وہ لڑکیاں رات کا بھوجن لے کر آئیں تو اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں اور باتیں شروع کر دیں۔

''مہاراج! یہ سیوا کون ہے۔''

سیوا کا منہ کا نوالہ منہ میں ہی رہ گیا۔ تو ان لوگوں کو آخر معلوم ہو ہی گیا، اس نے سوچا۔

''میں کیا جانوں سیوا کون ہے۔ ہم جنگلوں میں پھرنے والے لوگ ان باتوں سے سروکار نہیں رکھتے۔''

''کوئی بڑا مجرم ہوگا جو اس کی اتنی تلاش ہو رہی ہے۔''

ان میں سے ایک لڑکی نے کہا۔

''تم نے یہ نام کہاں سے سن لیا۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''ہم لوگ جب گئے ہوئے تھے تو زمیندار کا آدمی گاؤں کے چودھری کے پاس آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ بڑی گڑبڑ مچی ہوئی ہے۔ پوری شاہی فوج اسے ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔''

''تو کیا وہ بھی سیوا کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن کہہ وہ یہی رہے تھے کہ ذرا ہوشیار رہیں۔ کسی اجنبی کو یہاں سے گزرتے ہوئے دیکھیں تو زمیندار کو خبر کریں۔''

''تو بڑی بھولی ہے۔'' سیوا نے کہا۔ ''سیوا تیرے سامنے بیٹھا ہے اور تو کہہ رہی ہے سیوا کہاں ہے۔''

''مہاراج! میں جانتی ہوں آپ بھگوان کے اوتار ہیں۔'' اس نے کہا اور کھانے کے برتن اٹھا کر دونوں باہر نکل گئیں۔

ان کے جاتے ہی وہ نہایت آرام سے اٹھا، باہر جھانک کر دیکھا۔ صحن میں اندھیرا تھا۔ گھر سے باہر جانے کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ وہ پھر کوٹھری میں آیا۔ اس کی گٹھری سرہانے رکھی تھی۔ اس نے گٹھری اٹھائی۔ وہ لاٹھی لی جس میں قیمتی پتھر رکھے ہوئے تھے۔ گٹھری میں رکھے ہوئے کپڑوں میں بھی کچھ ''پتھر'' تھے ان کا بھی جائزہ لیا اور ایک مرتبہ پھر اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد گھر سے باہر آ گیا۔ ایک دن پہلے ہی اس نے اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا کہ گاؤں سے باہر نکلنے کا راستہ کون سا ہے۔ وہ اسی راستے پر چل پڑا اور جلد ہی گاؤں سے نکل کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آتی رہیں اور پھر سناٹا ہو گیا۔

☆☆☆

بنارس کے گھاٹ پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ابھی پوری طرح صبح نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اِدھر اُدھر برہمن لڑکے یاتریوں کی خدمت کے لیے گھوم پھر رہے تھے۔

ہندو قوم کا دستور تھا کہ غریب اور بے سروسامان برہمن لڑکے پڑھنے کے لیے بنارس چلے جاتے تھے اور وہاں کسی برہمن کے شاگرد بن جاتے تھے۔ ان کے خرچ کی یہ صورت مقرر تھی کہ استاد، شاگردوں کو صبح شام دریا کے گھاٹ پر بھجوا دیتا تھا کہ وہ ان لوگوں کو جو وہاں غسل کے لیے آتے تھے، اشنان کرائیں۔ اس کے صلے میں جو نذرانہ ملتا تھا، وہ استاد کو دے دیا کرتے تھے۔ اس سے ان طالب

حکیم بطلیموس کہتے ہیں

☆انسان زندگی میں اس شمع کے مانند ہے جو ہوا میں رکھی گئی ہو۔

☆حکمت ایک ایسا درخت ہے جو دل سے اگتا ہے اور زبان سے پھل دیتا ہے۔

☆اگر کوئی چیز تمہارے قبضے سے نکل کر دوسرے کے پاس چلی جائے تو یہ مت کہو کہ میرا مال میرے پاس سے چلا گیا بلکہ یہ کہو کہ عاریتاً تھی جو چند روز مجھے فائدہ پہنچا کر چلی گئی۔ اگر درحقیقت یہ میرا مال ہوتا تو دوسروں کے پاس سے مجھ تک نہ آتا اور میرے پاس سے دوسروں تک نہ جاتا۔

☆جو شخص دوسروں کے واقعات سے نصیحت حاصل نہیں کرتا، دوسرے اس کے واقعات سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

☆ضروریات کو کم کرنا سب سے بڑی مالداری ہے۔

☆عالم کی ایک گھنٹے کی گفتگو دس برس کے مطالعے سے زیادہ مفید ہوتی ہے۔

☆جو شخص بقائے حیات کو دوست رکھتا ہے، اس کو چاہیے کہ دل کو شدائد و مصائب کے تحمل کے لیے آمادہ رکھے۔

(مرسلہ: ریاض بٹ۔ حسن ابدال)

انمول موتی

☆اپنے دشمن کو کئی مواقع دو کہ وہ تمہارا دوست بن جائے لیکن اپنے دوست کو ایک بھی موقع نہ دو کہ وہ تمہارا دشمن بن جائے۔

☆سجدے کی سب بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ زمین سے کی جانے والی سرگوشی آسمانوں پر گونجتی ہے۔

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

اقوالِ زریں

ہر کوئی روزانہ چین کی نیند سو جاتا ہے پر یہ نہیں سوچتا کہ آج جس کا دل دکھایا ہے، وہ سویا ہوگا کہ نہیں۔

بندہ جب منافقت کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کر دیتا ہے تو جھوٹ کی عادت ہو جاتی ہے۔

(مرسلہ: محمد شہباز ناز، ضلع سرگودھا)

علموں کی خوراک اور پوشاک وغیرہ کا خرچ پورا ہوتا تھا۔

سیوا بھی بنارس پہنچنے کے بعد غسل کرنے اور دوسری ہندووانہ رسومات ادا کرنے کے لیے گھاٹ پر پہنچا۔ اس نے اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے لڑکوں میں سے ایک کو روکا اور مٹھی بھر جواہرات اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

''بس انہیں چھپالو اور مجھے جلدی سے اشنان سے فارغ کرادو۔''

لڑکا تو اتنے جواہرات دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوگیا۔ جلدی جلدی اس کی ڈاڑھی مونڈی اور اسے غسل کرادیا۔ ابھی یہ لڑکا غسل کرا کے فارغ ہی ہوا تھا کہ پکڑو پکڑو کا شور بلند ہوا۔ شاہی گرز برداروں کے شور سے ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ہر طرف سیوا کے فرار اور گرز برداروں کے پہنچنے کا چرچا ہورہا تھا۔ طالب علم اس شور کی طرف متوجہ ہوا۔ پھر کر جو دیکھا تو جس شخص کی اس نے خدمت کی تھی، وہ اس کے سامنے سے غائب تھا۔ یہی سیوا تھا۔ وہ طالب علم بھی سمجھ گیا یہی سیوا تھا ورنہ بھاگتا کیوں۔

اس طالبِ علم نے اپنی کمائی پر نظر ڈالی تو نو جواہرات، نو اشرفیاں اور نو سوہون تھے۔ اب وہ پاگل نہیں تھا کہ اتنی دولت لے کر استاد کے پاس جاتا۔ وہ بھی گھاٹ سے فرار ہوا اور ''سورت'' پہنچ گیا جہاں اس کا گھر تھا۔

سیوا بنارس سے نکلا اور جس طرف منہ اٹھا چل دیا۔ اس وقت یہ سوچنے کا وقت نہیں تھا کہ کہاں جانا ہے۔ اس کا حلیہ اب اتنا بدل گیا تھا کہ کوئی اسے نہیں پہچان سکتا تھا۔

وہ بہار، پٹنہ اور چاندہ کوہ کی راہ روانہ ہوا۔ اس نے یہ سفر شہروں سے گزر کر نہیں کیا بلکہ گھنے جنگلوں میں زمینداروں کی سرحد سرحد ہوتا ہوا دشوار گزار راستوں پر چلتا رہا۔ جس علاقے میں پہنچتا ایک نیا بھیس بدل لیتا۔

دن اور رات سمٹتے رہے۔ چکر دار راستے پھیلتے رہے۔ خطرے اب بھی منڈلا رہے تھے لیکن کم ضرور ہوگئے تھے۔ گرز برداروں کی بھیڑ کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہوگئی تھی۔ وہ جہاں جاتا ایک آدھ دن کسی سرائے میں تھکن اتارتا اور کوئی نشان چھوڑے بغیر آگے بڑھ جاتا۔

کئی مہینوں کے پراسرار سفر کے بعد وہ حیدرآباد پہنچ گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے چند قلعے عادل شاہی بادشاہوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان قلعوں کو واگزار کرالے۔ سیوا کو اس کی اس کمزوری کا علم تھا لہٰذا اس نے اسی کمزوری کو بنیاد بنا کر عبداللہ قطب شاہ سے ملاقات کی اور اپنی چکنی چپڑی باتوں کا جال اس پر پھینکا۔

''اگر مجھے ایک فوج اور قلعہ گیری کا سامان فراہم کردیا جائے تو میں چند ہی دنوں میں ان کو فتح کرکے آپ کے مقرر کردہ افسروں کے حوالے کردوں گا اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے وہ قلعے بھی فتح کرلوں گا جو عالمگیر بادشاہ کے تصرف میں آگئے ہیں۔ اس کے بعد میں عمر بھر آپ کی اس مدد اور احسان کو نہیں بھولوں گا اور حکم کا بندہ بن کر رہوں گا۔''

عبداللہ قطب شاہ کو اس کی بری شہرت کا علم تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مطلب نکل جانے کے بعد کیسے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ اس کے باوجود اس پر سیوا کی باتوں کا جادو چل گیا۔ اس نے دور اندیشی کو بالائے طاق رکھا اور ایک فوج مرتب کرکے قلعہ گیری کا ساز و سامان مہیا کردیا اور فوج کے ساتھ اپنے چند قابلِ ذکر افسروں کو بھی متعین کردیا۔

عبداللہ قطب شاہ نے اس کی سابقہ شہرت کے باوجود یہ نہیں سوچا کہ سیوا عادل شاہیوں سے تو قلعے چھڑوا لے گا، پھر سیوا سے قلعے کون خالی کرائے گا۔ اگر وہ قبضہ جما کر بیٹھ گیا تو کیا ہوگا؟ جبکہ ان دنوں وہ ضرورت مند بھی تھا۔ مکار جب ضرورت مند ہو تو بڑا خطرناک ہوتا ہے۔

سیوا کے آباؤ اجداد کو سنائی گئی پیش گوئی مسلسل سفر میں تھی۔ وہ گرتے گرتے سنبھل گیا تھا۔ اس نے عالمگیر جیسے طاقتور بادشاہ کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے اور عبداللہ قطب شاہ کو لوٹنے میں مشغول تھا۔

وہ یہ فوج لے کر نکلا اور اپنی مکاریوں اور حیلہ سازیوں سے مختصر مدت میں چند ایک قلعے فتح کرلیے لیکن نیت صاف نہیں تھی۔ اس نے کوئی بھی قلعہ عبداللہ قطب شاہ کے افسروں کے حوالے نہیں کیا۔ وہ جب بھی کسی قلعے کی چابی مانگتے انہیں یہ کہہ کر چپ کرادیتا کہ آپ لوگ میری قوتِ بازو ہیں، میں اس سے اچھا قلعہ آپ کو دے دوں گا۔ وہ ایسا چرب زبان تھا کہ یہ افسر اس کی باتوں میں آ ہی جاتے تھے۔ باتوں کے علاوہ اس مالِ غنیمت سے بھی ان کا منہ بند کرادیا کرتا تھا جو ان قلعوں سے حاصل ہوتا تھا۔

اس نے مختصر سی مدت میں دس بارہ مشہور بیجاپوری قلعے فتح کرلیے۔ اب اس کے پاس اتنی دولت آگئی تھی کہ وہ اپنی فوج رکھ سکتا تھا۔ اس نے عبداللہ شاہ کی فوج کی مدد سے ''راج گڑھ'' کے قلعے پر بھی قبضہ جمالیا۔ یہی وہ قلعہ تھا جو اس کا مستقر تھا اور جس کی چابیاں خود اپنے ہاتھوں سے راجا جے سنگھ کے حوالے کی تھیں۔

اب اسے عبداللہ شاہ کے آدمیوں سے پیچھا چھڑانا تھا۔ اس نے انہیں ایک دو قلعے دے کر رخصت کر دیا اور خود پہلے کی طرح راج گڑھ کے قلعے میں جم کر بیٹھ گیا۔

اب اسے عبداللہ قطب شاہ کے پاس جانے کی ضرورت نہیں تھی۔

عبداللہ شاہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس کے قلعے ایک ہاتھ سے نکلے دوسرے ہاتھ میں چلے گئے۔

جب سیوا کا ستارہ گردش سے نکل آیا تو مرہٹے اس کے گرد جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جو ساتھی ساتھ چھوڑ گئے تھے وہ بھی لوٹ آئے۔ غارت گروں کی ایک جماعت پہلے کی طرح پھر اس کے ساتھ ہو گئی۔ جب ایک خاطر خواہ تعداد اس کے ساتھ آ گئی تو اس نے لوٹ مار شروع کر دی۔ اسی لوٹ مار کے دوران اس نے بندرگاہ سورت کو لوٹ لیا۔ وہاں سے وہ نقد رقم، چاندی سونا اور کئی ہزار مردوں اور عورتوں کو قید کر کے لے آیا جن سے وہ مزید قلعوں کی تعمیر کا کام لیتا رہا۔

اس غارت گری کی اطلاع جیسے ہی بادشاہ تک پہنچی اس نے سورت کے اطراف شہر پناہ اور فصیل تعمیر کرنے کا حکم دے دیا لیکن یہ بعد از خرابی بسیار والا معاملہ تھا۔

سیوا کی سرکوبی کے لیے ایک مرتبہ پھر دلیر خاں اور خان جہاں بہادر کو متعین کیا گیا۔

گرفتار و رسوا ہونے سے پہلے اس نے سمندر میں جن قلعوں کی بنیادیں رکھی تھیں، ان کو بھی اس نے تعمیر کرا دیا۔ جنگی کشتیاں تیار کرا کے سمندر کی ناکا بندی کر دی۔ پہلے کی طرح ولایت اور بیت اللہ کو جانے والے جہازوں کو لوٹنے لگا۔

ایک مرتبہ اسے تجربہ ہو چکا تھا کہ راج گڑھ زیادہ محفوظ مقام نہیں۔ اب اسے فکر ہوئی کہ اپنی رہائش کے لیے راج گڑھ سے زیادہ دشوار گزار پہاڑ پر قلعہ تعمیر کرائے۔ اس نے گھوڑا سنبھالا اور چند ساتھیوں کے ہمراہ کسی ایسے پہاڑ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ آخر بڑی تلاش کے بعد اس کی نظر ''کوہ راہیری'' پر پڑی۔ اس پہاڑ کی بلندی دامن سے چوٹی تک تین کوس تھی۔ اگر غنیم سمندر کے راستے حملہ آور ہوتا تو یہ بھی اس کے لیے مشکل ترین تھا کیونکہ سمندر یہاں سے چوبیس کوس پر تھا۔ بندرگاہ سورت کو جانے والی سڑک خشکی کے راستے سے دس بارہ کوس تھی البتہ راج گڑھ وہاں سے چار پانچ منزل پر ہی تھا یعنی یہاں بیٹھ کر وہ راج گڑھ کی حفاظت کا بندوبست بھی کر سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یہاں پانچ ماہ تک مسلسل بارش ہوتی تھی۔ اگر کوئی محاصرہ کرتا تو چار پانچ ماہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہتا۔

اس دشوار گزار پہاڑ پر اس نے ایک نہایت مضبوط قلعہ بنایا جس کے دروازے اور برج نہایت دشوار گزار اور پیچ دار تھے۔ ایک قسم کی بھول بھلیاں تھیں۔ ان میں داخل ہو کر وہی شخص اندر پہنچ سکتا تھا جو راستے سے واقف ہو، اجنبی آدمی گھوم پھر کر باہر نکل آتا اور گھنٹوں بھٹکتا رہتا تھا۔

جب قلعہ تیار ہو گیا، توپیں نصب کر دی گئیں تو تمام راستے بند کر کے صرف ایک دشوار گزار راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا اور ایک دن اپنی ساری جمعیت کو جمع کیا اور ایک تھیلی بھر سونا، طلائی کڑے اور سیکڑوں ہون سامنے رکھ کر اعلان کیا کہ مقررہ راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے جو شخص بھی زینہ اور کمند کے بغیر جھنڈا لے کر قلعے پر چڑھ جائے گا اس کو یہ سارا مال بخش دوں گا۔ سب کے سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ زینے اور کمند کے بغیر کوئی شخص قلعے پر چڑھ جائے۔ آخر ایک شخص آگے بڑھا۔

''اگر حکم ہو تو میں جھنڈا لے کر پہاڑ پر جاتا ہوں اور اسے نصب کر کے واپس آ جاتا ہوں۔''

''اجازت ہے۔'' سیوا کی آواز گونجی۔

اجازت ملتے ہی وہ شخص جھنڈا لے کر اوپر گیا اور وہاں اسے نصب کر کے واپس آ گیا۔ سیوا سمیت سب کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

سیوا نے حسبِ وعدہ سونے کی وہ تھیلی، طلائی کڑا اور جتنی دولت تھی وہ اس کو دے دی مگر حکم دیا کہ اس کا پاؤں جوڑ سے کاٹ دیا جائے اور جس راستے سے وہ اوپر گیا تھا، اسے بند کر دیا جائے۔

☆☆☆

راہیری (جہاں سیوا نے اب قلعہ بنا لیا تھا) کا تعلق کسی زمانے میں نظام الملکی کوکن سے تھا۔ بعد میں شاہجہاں نے نظام الملک کے اس علاقے اور بیجاپور کے بعض تعلقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب عادل خاں سے تعلقات بحال ہو گئے اور اتحاد و یگانگت کے روابط پیدا ہو گئے تو عادل خاں نے گزارش کی کہ بیجاپور کے چند محلات کے عوض جو بادشاہی قبضے میں آ گئے تھے، کوکن کے بعض تعلقے جو نظام الملک کے ماتحت تھے، اسے دے دیے جائیں لہٰذا کوکن کا علاقہ عادل شاہ کو مرحمت کر دیا گیا تھا۔

عادل شاہ نے فتح خاں نامی ایک پٹھان سردار کو اس ضلع کا حاکم مقرر کیا تھا۔ اس کا حاکم نشیں مقام قلعہ دندا راج پوری تھا جو نصف سمندر میں تھا نصف خشکی پر۔ اس کے قریب ہی سمندر میں ایک جزیرہ تھا۔ اس جزیرے پر ایک قلعہ بنا ہوا تھا جسے قلعہ جزیرہ کہتے تھے۔ جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تھا، فتح خاں اسی قلعہ جزیرہ میں پناہ لے لیا کرتا تھا۔

راہیری کے مقام سے دنداراج پوری بیس کوس پر تھا۔ جب سیوا نے راہیری کو اپنا مرکز بنالیا اور خوب اچھی طرح قدم جمالیے تو اس کی نظریں دنداراج پوری پر پڑنے لگیں۔ فتح خاں اس کے خوف سے قلعہ جزیرہ میں جا کر ٹھہر گیا۔ سیوا نے قلعہ جزیرہ کو فتح کرنے کے لیے حملے کرنا شروع کردیے۔

سیوا کی قوت اور دبدبہ اتنا ہوگیا تھا کہ فتح خاں چند حملے برداشت کرنے کے بعد اس قدر تنگ آ گیا کہ اپنی جان بچانے کی فکر میں لگ گیا اور یہی صورت نظر آئی کہ قلعہ سیوا کے حوالے کرکے اپنی جاں بخشی کرالے۔

فتح خاں کے تین غلام اس کے ساتھ تھے۔ ان تینوں میں سے ہر ایک کے ماتحت ان کے تربیت یافتہ دس دس حبشی غلام تھے۔ یہ غلام ہی دراصل فتح خاں کی طاقت تھے۔ جزیرے کا تمام انتظام وانصرام انہی کے ہاتھ میں تھا۔ فتح خاں نے ان تینوں غلاموں کو بلایا اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی۔

''سیواجی مرہٹہ کچھ دنوں سے ہماری جانوں کے درپے ہے۔ کئی حملے کرچکا ہے اور اب اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم قلعہ اس کے حوالے کردیں۔ بیجاپور کے حکمران جن کی میں نمائندگی کررہا ہوں، بے بس ہیں۔ وہ ہماری مدد کو نہ آسکیں گے اور ہمیں دفاع کرنا مشکل ہوجائے گا۔ اب اسی میں عافیت ہے کہ ہم قلعہ سیوا کے حوالے کرکے اپنی شرطیں منوالیں بصورتِ دیگر ہم اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈالیں گے اور ہمارا مال واسباب بھی تلف ہوجائے گا۔''

ان تینوں غلاموں نے اسے اس بزدلی سے باز رہنے کی تلقین کی اور اس کی خاطر اپنی جان دینے پر آمادہ ہوئے لیکن فتح خاں اتنا ڈر گیا تھا کہ ان کی بات ماننے کو تیار نہ ہوا۔

یہ تینوں اس وقت تو خاموش رہے لیکن جب اکیلے ہوئے تو فتح خاں کی بزدلی پر دیر تک ماتم کرتے رہے۔

''حاکم نشیں تو وہ ہی ہے۔ ہم اس کے غلام ہیں۔ ہم کیا کرسکتے ہیں۔''

''ہم فتح خاں کی طرح بزدل نہیں۔ ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔''

''آہستہ بولو۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

اس کے بعد وہ تینوں سر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

''کافروں کے قبضے میں قلعے کے چلے جانے کے بعد نہ معلوم ہمارا کیا حشر ہو اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم فتح خاں کو گرفتار کرکے قید کردیں اور اس کی جگہ سیدی سنبل کو سردار مان لیں۔''

''اس پر مزید سوچ لیا جائے تو بہتر ہے۔''

''بس ہمارے پاس کل رات تک کا وقت ہے۔''

دوسرے دن پھر انہوں نے اجلاس کیا اور پھر رات ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شام ہوتے ہی فتح خاں کی خواب گاہ میں چھپ گئے۔

فتح خاں جب تمام کاموں سے نمٹنے کے بعد بستر آرام پر دراز ہوا اور کچھ دیر میں اس کے خراٹوں نے اس کے سونے کا اعلان کردیا تو وہ دونوں اپنی جگہ سے نکلے اور دروازہ اندر سے کھول دیا۔ ان کا تیسرا ساتھی اور بقیہ غلام باہر انتظار کررہے تھے۔ یہی لوگ اس کے پہرے پر بھی مقرر تھے لہٰذا خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ بلاخوف اندر آگئے اور سوتے سوتے فتح خاں پر قابو پاکر اسے زنجیروں میں جکڑ دیا اور نیچے تہ خانے میں لے جاکر قید کردیا۔

اس تکلیف دہ کام سے نمٹنے کے بعد عادل شاہ بیجاپوری اور صوبہ دار دکن کو اپنی کارگزاری کی اطلاع بھجوادی اور خان جہاں کو امداد کے لیے خط لکھا۔ اس خط میں درخواست کی گئی تھی کہ بندرگاہ سورت سے سمندر کے راستے ان کے لیے مدد بھجوائی جائے۔

خان جہاں اور دلیر خاں کو بادشاہ نے سیوا کی سرکوبی کے لیے متعین کیا تھا۔

خان جہاں نے عنایت آمیز جواب لکھا اور نقد پانچ ہزار روپے مدد کے لیے بھجوائے اور بندرگاہ سورت میں ایک سیر حاصل جاگیر بھی عطا کی۔ اس نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ اس نے سیدی سنبل کے لیے چار صدی دو سو سوار، سیدی یاقوت کے لیے تین صدی سو سوار اور سیدی خیریت کے لیے دو صدی دو سو سوار کے مناصب کی سفارش بھیج دی ہے۔

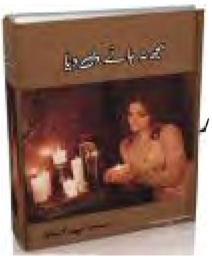
نقد روپیہ پہنچتے ہی سیدی سنبل (جو اب سردار بن چکا تھا) کی ہمت بندھ گئی۔ اس نے تمام ناکارہ کشتیوں کو جو قلعے

عہدِ وفا



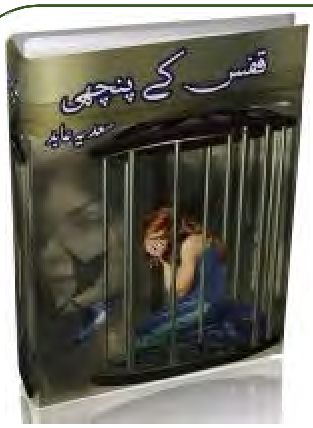
ایمان پریشے کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا منفرد ناول، محبت کی داستان جو معاشرے کے رواجوں تلے دب گئی، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

بُجھ نہ جائے دِل دیا



سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، محبت، نفرت، عداوت کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

قفس کے پنچھی



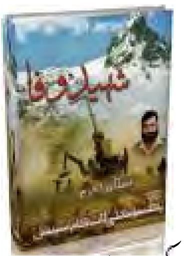
سعدیہ عابد کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا شاہکار ناول، علم و عرفان پبلشرز لاہور کے تعاون سے پاکستان انٹرنیشنل بک فیئر میں (3 تا 7 اگست 2017)، **کتابی شکل** میں جلوہ افروز ہو رہا ہے، خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔ آن لائن پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

جہنم کے سوداگر



محمد جبران (ایم فل) کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ایکشن ناول، پاکستان کی پہچان، دُنیا کی نمبر 1 ایجنسی آئی ایس آئی کے اسپیشل کمانڈو کی داستان، پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

شہیدِ وفا



مُسکان احزم کا پاک سوسائٹی کے لیے لکھا گیا ناول، پاک فوج سے مُحبت کی داستان، دہشت گردوں کی بُزدلانہ کاروائیاں، آرمی کے شب و روز کی داستان پڑھنے کے لئے یہاں کلک کریں۔

آپ بھی لکھیے:

کیا آپ رائٹر ہیں؟؟؟۔ آپ اپنی تحاریر پاک سوسائٹی ویب سائٹ پر پبلش کروانا چاہتے ہیں؟؟؟
اگر آپکی تحریر ہمارے معیار پر پُورا اُتری تو ہم اُسکو عوام تک پہنچائیں گے۔ مزید تفصیل کے لئے یہاں کلک کریں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام، پاکستان کی سب سے زیادہ وزٹ کی جانے والی کتابوں کی ویب سائٹ، پاکستان کی ٹاپ 800 ویب سائٹس میں شُمار ہوتی ہے۔

کے گھاٹ پر مرمت طلب پڑی ہوئی تھیں، درست کرالیا اور مزید جنگی کشتیوں کا انتظام کر کے اس نے قلعہ دنداراج پوری کی کشتیوں پر حملہ کر کے ان کو مع خلاصیوں اور سپاہیوں کے جن کی تعداد دو سو تھی گرفتار کرلیا۔ اسیروں میں ایک سو مرہٹے تھے جو سیوا کی طرف سے ابھی ابھی مقرر کیے گئے تھے۔ سیدی سنبل نے ان کے پاؤں میں پتھر بندھوا کر سمندر میں پھنکوا دیا۔

اس دن سے حبشیوں اور سیوا کے درمیان بڑی شدید دشمنی پیدا ہوگئی۔ اس نے اس ہزیمت کا بدلہ لینے کے لیے قلابہ اور گندیری کے سمندر میں قلعوں کو جو اس کے اپنے تعمیر کردہ تھے، مزید مستحکم کر کے جنگی کشتیوں کا بیڑا تیار کیا اور قلعہ جزیرہ پر قبضہ کرنے کی سعی کرنے لگا۔

دونوں فریقین کے درمیان بحری جھڑپیں ہوتی رہیں جن میں اکثر حبشی غلام ہی غالب اور فاتح رہے۔ اس موقع پر سیدی سنبل طبعی موت مرگیا اور ان جھڑپوں کا منطقی نتیجہ نہ دیکھ سکا۔

مرنے سے پہلے اس نے سیدی یاقوت کو اپنا قائم مقام مقرر کیا۔

جزیرے کی حکومت سنبھالتے ہی اس نے پہلے سے زیادہ بہتر طریقے پر جنگی بیڑا تیار کرایا۔ برج اور فصیل کو مستحکم کیا کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ سیوا ہمیشہ سمندر میں نہیں رہے گا، قلعہ جزیرہ کے سامنے بھی آئے گا لہٰذا ابھی سے پیش بندی کرلی جائے۔

اس کے بعد بھی وہ سکون سے نہیں بیٹھا بلکہ سیوا کو مشغول رکھ کر تھکانے کے لیے رات دن سمندر کی طلایہ گردی کرتا رہا۔ مسلح ہو کر اپنی جنگی کشتیوں کو سمندر میں دور تک لے جاتا اور دشمن سے چھیڑ چھاڑ کے بعد واپس چلا آتا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ سیوا دن رات مسلح رہنے لگا۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی خلوت میں ہوتا اس وقت بھی ہتھیار نہ کھولتا۔ ہر وقت کی یہ پابندی بذاتِ خود تکلیف دہ عمل تھا۔

سیدی یاقوت نے سیوا کے جنگی بیڑے پر کئی زبردست حملے کیے اور اس کی بہت سی کشتیوں پر قبضہ کرلیا اور مرہٹوں کی بہت بڑی تعداد کو قتل کر کے ان کے سر بندرگاہ سورت میں بھجوا دیے۔

اس وقت تک قلعہ دنداراج پوری سیوا کے قبضے میں آچکا تھا۔ سیدی یاقوت برابر اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس قلعے کو سیوا کے قبضے سے نکال لیا جائے۔

سیوا بھی قلعہ جزیرہ کو فتح کر لینے کی تدبیروں میں لگا ہوا تھا۔ دونوں طرف ایک کشمکش جاری تھی۔

سیوا اس کشمکش سے تنگ آچکا تھا۔ اس کی طبیعت میں جلد بازی تھی اور یہاں دیر پر دیر ہوئی جارہی تھی بالآخر اس نے فیصلہ کن معرکے کا ارادہ کرلیا۔ اپنے بڑے بڑے سرداروں کو جمع کیا۔ یہ وہ سردار تھے جو قلعہ کشائی کے فن میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ ان کو ایک من سونا اور دوسرا سازوسامان انعام میں مقرر کر کے اس مہم پر مامور کردیا اور خود قلعہ راہیری سے تین کوس کے فاصلے پر اپنا مرکز قائم کر کے حملہ کرنے کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا۔

حبشی غلام بھی حملہ کرنے کے لیے موقع تلاش کررہے تھے۔ یہ موقع انہیں اس وقت مل گیا جب انہی دنوں ہولی کا تہوار آگیا۔ دنداراج پوری میں مرہٹوں نے یہ تہوار نہایت اہتمام سے منایا۔

طلایہ گردوں نے اطلاع دی کہ مرہٹے ہولی کھیل کر اور شرابیں پی کر مست پڑے ہوئے ہیں۔ سیدی یاقوت پہلے ہی اس صورتِ حال کے لیے تیار تھا۔ اس نے دن ہی میں سیدی خیریت کو چار پانچ سو کی جمعیت اور قلعہ گیری کا سامان دے کر خشکی کی طرف سے حملہ کرنے کے لیے متعین کردیا تھا۔ رات ہوئی تو خود ہتھیار بند ہو کر جنگی کشتیوں کا بیڑا لے کر سمندر کے راستے قلعہ دندا کے نیچے پہنچ گیا۔

سیدی یاقوت اور سیدی خیریت نے حملہ کرنے کے لیے خاص اشارہ مقرر کرلیا تھا چنانچہ سیدی یاقوت کی طرف سے اشارہ ملتے ہی سیدی خیریت نے خشکی کی طرف سے حملہ کردیا۔ مرہٹے نشے میں مست ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے۔ حملے کی اطلاع ملتے ہی ہتھیار باندھے اور یہ سوچے بغیر کہ حملہ سمندر کی طرف سے بھی ہوسکتا ہے سب کے سب خشکی کی طرف دوڑ پڑے۔ دوسری جانب سے بالکل ہی غافل ہوگئے۔ سیدی یاقوت کے سامنے میدان صاف تھا۔ اس نے برق رفتاری سے زینے لگا کر قلعے پر چڑھائی کردی اور اپنے بہادر ساتھیوں کو لیے ہوئے قلعے میں داخل ہوگیا۔

قلعے میں کھلبلی مچ گئی۔ مرہٹے دونوں طرف سے گھر چکے تھے۔ خشکی کی طرف سیدی خیریت تھا اور یاقوت قلعے میں داخل ہوچکا تھا۔ سیکڑوں ادھر کے شہید ہوئے، سیکڑوں اُدھر کے مارے گئے۔

یہ مارا کاٹی چل ہی رہی تھی کہ عین اسی وقت ایک اتفاقی حادثہ ہوگیا۔ سیدی یاقوت کے آدمی بارود خانے تک پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے بارود خانہ کھولا اور بارود اپنے

ساتھیوں میں تقسیم کرنے لگے۔ اسی وقت کوئی چنگاری گری یا کیا ہوا، ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکے کے ساتھ ہی بارود خانہ اڑ گیا۔ ایک بڑی تعداد جو وہاں جمع تھی، ہلاک ہوگئی۔ سارے قلعے میں دھواں بھر گیا۔ زخمیوں کی چیخ وپکار سے قیامت کا شور مچا ہوا تھا۔

سیدی یاقوت چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔ ”میں زندہ ہوں۔ میں یہاں ہوں۔“ اس کے ساتھی جو یہ سمجھے ہوئے تھے کہ یاقوت بھی اس حادثے میں کام آ گیا، اس کی آواز سن کر مطمئن ہوئے اور اس کے گرد جمع ہوگئے۔

اس آپا دھاپی میں سیدی خیریت کو بھی موقع مل گیا اور کمند لگا کر قلعہ پر چڑھنے میں کامیاب ہوگیا۔ دونوں نے مل کر بوکھلائے ہوئے مرہٹوں میں سے کسی کو زندہ نہ چھوڑا۔

سیوا اپنے مرکز پر تھا کہ زوردار دھماکے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے اختیار چیخ اٹھا۔ ”ڈنداراج پوری پر کوئی آفت نازل ہوئی ہے۔“

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ اس کے اندیشوں کی تصدیق ہوگئی۔ ہرکاروں اور جاسوسوں نے قلعہ فتح ہوجانے کی بری خبر سنا دی۔

ڈنداراج پوری کے اطراف چھ سات قلعے اور بھی تھے۔ ان سب پر سیوا نے قبضہ کر رکھا تھا۔ قلعہ ڈندا کے فتح ہوتے ہی مرہٹوں پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سیوا کے قلعہ داروں نے ان قلعوں کو بھی یاقوت کے حوالے کر کے اپنی جان بچائی۔

سیوا کی ذاتی فوج بندرگاہ سورت کی طرف لوٹ مار کے لیے گئی ہوئی تھی اس لیے وہ ان قلعوں کو نہ بچا سکا۔

سیوا اس شکست اور عظیم نقصان سے بہت دن تک نہ سنبھل سکا اور نہ اتنی جرأت ہوسکی کہ کسی قلعے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا۔

☆☆☆

جب ڈنداراج پوری کا قلعہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی جمعیت بھی آدھی سے زیادہ کٹ چکی اور وہ قلعہ راہیری تک محدود ہو کر رہ گیا تو اسے اپنے بیٹے سنبھا کی یاد آئی جسے وہ الٰہ آباد میں ایک برہمن کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ اب تو وہ جوان ہو چکا ہوگا۔ میرا دست وبازو بنے گا۔

اس نے اس برہمن کو خط لکھا کہ تم میرے نام خط لکھ کر یہاں بھیجو جس میں سنبھا کے مرنے کی خبر درج ہو چنانچہ اس برہمن نے الٰہ آباد سے اس مضمون کا خط اس کے نام لکھ بھیجا۔

اس خط کے آتے ہی اس نے سنبھا کے مرنے کا اعلان کرادیا اور اس کا ماتم کرنے لگا۔ اطراف کے زمینداروں اور دکن میں متعینہ بعض بادشاہی امیروں اور راجپوت سرداروں نے بھی جو سیوا سے خفیہ مراسلت کرتے رہتے تھے، اس کے پاس اس کے بیٹے کی تعزیت کے خط لکھے۔

بندرگاہ سورت کے وقائع نگاروں اور خبرنویسوں نے بادشاہ تک خبریں پہنچادیں کہ سیوا کے بیٹے سنبھا کا انتقال ہوگیا۔

بادشاہ کے گرز بردار جواب تک سنبھا کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے، مطمئن ہوگئے۔ سیوا کا اس خبرِ بد پھیلانے کا مقصد پورا ہوگیا۔

اس بات کو جب چار پانچ ماہ گزر گئے اور ہر مرنے والے کی طرح سنبھا کو بھی لوگ بھول گئے تو سنبھا اچانک اس برہمن کے ساتھ الٰہ آباد پہنچ گیا۔

سیوا نے اس کے آنے کی خوشی میں شادیانے بجوائے۔ کئی دن تک کھانے پکوان پکتے رہے۔ اب وہ یہ شہرت دے رہا تھا کہ سنبھا زندہ سلامت میرے پاس پہنچ گیا ہے۔

اس کی بیوی اور دوسرے عزیز اس کی اس حکمتِ عملی کو سمجھنے سے قاصر تھے لیکن اس کی منطق اپنی جگہ درست تھی۔

”اگر میں سنبھا کی موت کو شہرت دے کر بادشاہ کو غافل نہ کردیتا تو بادشاہی علاقے میں سنبھا کی تلاش کی سرگرمیاں ختم نہ ہوتیں اور سنبھا کا یہاں تک پہنچنا مشکل ہوجاتا۔“

سنبھا کی واپسی کے بعد مرہٹوں کی کارروائیوں میں ایک مرتبہ پھر تیزی آ گئی۔

☆☆☆

مہابت خاں کابل کا صوبہ دار چلا آ رہا تھا۔ عالمگیر کا بہادر ترین امیر آغر خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ادھر دکن میں خان جہاں کے ہمراہ دلیر خاں سیوا کی سرکوبی پر متعین تھا۔

سیوا کے فتنہ وشورش کی مسلسل خبریں دربار میں پہنچ رہی تھیں۔ بادشاہ نے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مہابت خاں اور آغر خاں کو دکن طلب کرلیا۔ آغر خاں، دلیر خاں کے ساتھ مل کر مرہٹوں کو نیست ونابود کرنے میں مشغول ہوگیا۔

مرہٹہ قوم کے لڑنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مقابلے میں پہلے تھوڑی سی فوج لے کر آتے تھے۔ پھر ہزیمت اٹھا کر

بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور جب مقابل فوج ان کا تعاقب کرتی تھی تو پہلے سے چھپے ہوئے مرہٹے چاروں طرف سے نکل آتے تھے اور تعاقب کرنے والوں کو گھیر لیتے تھے۔

دلیر خاں کی سرکردگی میں جب بادشاہی لشکر نے پیش قدمی کی تو حسب دستور مرہٹے صرف چار پانچ سو کی جمعیت لے کر سامنے آئے۔ آغر خاں بہت قلیل تعداد کے ساتھ ہر اول میں تھا۔ مرہٹوں کے نمودار ہوتے ہی آغر خاں نے ان پر حملہ کر دیا اور انہیں شکست دے کر بھگا دیا۔ وہ ان کی چال کو نہ سمجھ سکا اور برابر ان کے تعاقب میں لگا رہا۔ وہ فتح کے نشے میں تین چار کوس نکل گیا۔ یہاں تک کہ مرہٹوں کا علاقہ آ گیا۔ مرہٹے بھی یہی چاہتے تھے۔ وہ اچانک پلٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی غنیم کے سات آٹھ ہزار سوار اطراف سے نکل آئے اور یکبارگی آغر خاں پر حملہ کر دیا مگر وہ بھی شیر دل آغر خاں تھا۔ ذرا نہ گھبرایا۔ اس طرح ڈٹ کر مقابلہ کیا کہ ان کی کثرت، قلت میں بدل گئی۔ جب دو تین نامی گرامی سردار خون میں نہا گئے تو مرہٹہ فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ اتنے میں دلیر خاں بھی وہاں پہنچ گیا۔ پھر تو مرہٹوں میں بھگدڑ سی مچ گئی اور وہ بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔

سیوا پھر بچ نکلا۔

آغر خاں نے سیوا کے مرکزی شہر پونا تک فوج کشی کی اور بے شمار مالِ غنیمت پر قبضہ کر لیا جس کو اکٹھا کرنا تک محال ہو رہا تھا۔

ابھی یہ معرکہ آرائیاں مزید طول پکڑتیں کہ بادشاہ کو اطلاع ملی کہ پشاور اور کابل کے درمیان منزل غریب خانہ پر کابل کے صوبہ دار محمد امین خاں کا مقابلہ افغان ایمل خاں اور دوسرے پٹھانوں سے ہوا جس میں شاہی فوج کو ہزیمت ہوئی اور امین خاں کا تمام خزانہ اور مال و اسباب تباہ ہو گیا۔

ایمل خاں ... خطبہ و سکہ اپنے نام کا کر کے ایمل شاہ کے نام سے بادشاہ بن بیٹھا۔

بادشاہ کے لیے یہ اطلاع تشویش ناک تھی۔ اس نے بذاتِ خود کابل کا رخ کیا اور دکن سے آغر خاں کی طلبی کے احکام صادر کر دیے۔

طلبی کا حکم ملتے ہی آغر خاں نے تمام مال و اسباب دکن میں چھوڑا اور اس تیزی سے دکن سے نکلا کہ چار ماہ کا سفر چالیس دن میں طے کر کے بادشاہ کے حضور پہنچ گیا۔

بادشاہ نے بھی جلدی دکھائی اور چار پانچ ہزار سواروں کے ہمراہ افغانوں کی سرکوبی کے لیے اسے آگے روانہ کر دیا۔ جب آغر خاں پشاور پہنچا تو اس پر شب خون مارا گیا۔ یہ حملہ اچانک ہوا تھا لیکن آغر خاں نے بڑی دلیری سے اس کا مقابلہ کیا اور وہ مقابلہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ آغر خاں نے بڑی تعداد میں مغلوں کو قتل کیا اور ان کا تعاقب کر کے انہیں ان کے اصل ٹھکانے تک پہنچا دیا۔

آغر خاں فتح کے جھنڈے گاڑتا ہوا پشاور واپس آ گیا۔ بادشاہ نے اسے اس کی اس کارکردگی پر خلعت عطا کیا اور اسے درۂ خیبر پر حملہ کر کے افغانوں کا قلع قمع کرنے کا حکم دیا۔

یہاں بھی اس پر شب خون مارا گیا لیکن وہ زخمی ہونے کے باوجود اپنی فوج کو لڑاتا رہا یہاں تک کہ افغان شکست کھا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

آغر خاں نے فتح کا عریضہ مقتولوں کے بے شمار سروں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔

اس عظیم الشان فتح کے باوجود پٹھانوں کو پوری طرح شکست نہ ہو سکی۔ ان کے مسلسل حملوں کے سبب فدائی خاں صوبہ دار، خیبر کو عبور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ فدائی خاں کی بے بسی دیکھ کر آغر خاں نے فدائی خاں کے ہراول کی کمان سنبھال لی اور فدائی خاں صوبہ دار کو مختلف جگہوں پر جھڑپیں کرتے ہوئے پشاور سے جلال آباد تک پہنچا دیا' یہاں سے وہ کابل چلا گیا۔

جب فدائی خاں کابل سے پشاور لوٹ کر آ رہا تھا، پٹھانوں نے ایک بڑی تعداد میں جمع ہو کر دوبارہ اس کا راستہ روک لیا۔ اس وقت بھی بڑی سخت لڑائی ہوئی۔

آغر خاں کے حاسدوں کے بہکاوے میں آ کر فدائی خاں نے آغر خاں کو کمک کے لیے نہیں بلایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مال و اسباب اور عزت و آبرو کو پٹھانوں نے تباہ و تاراج کر دیا۔ بہ مشکل قلب لشکر کو پٹھانوں کی دست برد سے بچایا جا سکا۔ اب فدائی خاں کو ہوش آیا۔ اس نے تیز رفتار قاصدوں کو بھیج کر آغر خاں کو طلب کیا۔ اس کے پہنچتے ہی نقشہ بدل گیا اور پٹھانوں کو ہزیمت اٹھا کر بھاگنا پڑا۔

بادشاہ نے دارالخلافہ کی طرف مراجعت کی۔

آغر خاں نے پشاور پہنچنے کے بعد پٹھانوں کی سرکوبی کے انتظامات کیے اور قلعہ آغر باد کی تعمیر شروع کرا دی۔ پٹھانوں میں جب قلعے کی تعمیر کی خبر پھیلی تو ان کو بڑا خطرہ محسوس ہوا۔ وہ ہر طرف سے لمغان کے مقام پر آغر خاں پر فوج کشی کرنے کے لیے جمع ہو گئے۔

آغر خاں نے بھی حملے کی خبر سن کر فوج مرتب کر لی۔

ایمل خاں لمغانی سرداروں کے ساتھ مقابلے پر آیا۔ یہ اس کی بقا کی جنگ تھی۔ ایسی جانبازی سے لڑا کہ کئی مرتبہ مغلوں کے قدم اکھڑ گئے لیکن آغر خاں کی دلیری نے انہیں ہر بار سنبھال لیا۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے چٹانیں پٹھانوں کو اگل رہی تھیں۔ مختلف دروں سے نکل نکل کر مغلوں پر آفت ڈھا رہے تھے۔ بالآخر جب مغلوں نے قید نامی گرامی افغان سرداروں کو مار گرایا..... تو ان میں سراسیمگی پھیل گئی اور پھر بھاگنے ہی میں عافیت سمجھی۔ اس فتح نے آغر خاں کے مناصب اور قدر افزائی میں بے پناہ اضافہ کیا۔

☆☆☆

اورنگ زیب عالمگیر کی ہندوستان سے غیر حاضری اور آغر خاں کے چلے جانے سے سیوا کی ہمت دراز ہوگئی تھی اور ایسے ہاتھ پاؤں نکالے تھے کہ سب کا ناطقہ بند ہوگیا تھا۔ دکن کا کوئی راستہ ایسا نہیں تھا جو ان کی لوٹ مار سے محفوظ ہو۔ ان کی ہمتیں اتنی بڑھ گئی تھیں کہ انہوں نے قلعہ سالیر کے قلعہ دار سید نور علی پر بھی ہاتھ صاف کر دیا۔

قلعہ دار سید نور علی کا خاندان ''سالیر'' (دکن) جا رہا تھا۔ راستے میں مرہٹوں کے آوارہ گرد دستوں نے اس قافلے پر حملہ کر دیا۔ محافظوں کو شہید کر دیا اور قلعہ دار کے گھر والوں کو قید کر لیا۔ قلعہ دار کی عورتوں کو لے کر قلعہ سالیر پہنچے اور نور علی کو پیغام دیا۔ ''قلعہ کو جلد از جلد خالی کر دو ورنہ ہم تمہارے خاندان کو بے آبرو کریں گے۔ تمہاری عورتیں مرہٹوں کے بچے پیدا کریں گی۔''

اس پیغام کے موصول ہوتے ہی نور علی نے بھی اپنے آدمیوں کو قلعے کے نیچے بھیجا۔ منت سماجت کے ساتھ مرہٹوں کو نقد رقم کی بھی پیشکش کی لیکن مرہٹے اسیروں کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوئے۔

اس کے آدمی قلعے میں واپس چلے گئے۔

نور علی نے اپنے افسروں کو جمع کیا اور ان سے ان کی رائے طلب کی۔ کسی نے یہ رائے دی کہ قلعہ سے باہر نکل کر حملہ کیا جائے اور عورتوں، بچوں کو چھڑا لیا جائے لیکن نور علی نے اس کی مخالفت کی۔

''اگر ہمیں شکست ہوئی تو قلعہ بھی ہاتھ سے جائے گا اور خاندان کی آبرو بھی جاتی رہے گی لہٰذا کوئی اور راستہ نکالا جائے۔''

''کوئی اور راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم مرہٹوں کا مطالبہ مان کر قلعہ ان کے حوالے کر دیں تاکہ وہ قلعہ دار کے خاندان کے لوگوں کو رہا کر دیں۔''

''اس صورت میں کیا ہم بادشاہ کے عتاب کا شکار نہیں ہو جائیں گے؟''

''کوئی اور صورت ہو بھی تو نہیں ہو سکتی۔ مرہٹوں نے عورتوں کو ڈھال بنا لیا ہے۔''

''ہم لوگ کوئی رائے دینے سے معذور ہیں۔'' افسروں نے ہاتھ کھینچ لیے اور معاملہ قلعہ دار پر چھوڑ دیا۔

سید نور علی نے بادشاہ کے اعتراض اور منصب سے برطرفی پر خاندان کے ناموس و آبرو کو ترجیح دی اور امان طلب کر کے قلعہ خالی کر دیا۔

صوبہ خاندیس کا یہ مشہور سربلند قلعہ بلا کسی تردد اور لڑائی کے مرہٹوں کے قبضے میں چلا گیا۔

اس اہم قلعے کے چلے جانے کے بعد نہ صرف مرہٹوں کی ہمتیں بلند ہوئیں بلکہ اس قلعے کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد مرہٹوں کی تاخت و تاراج کا سلسلہ بہت وسیع ہوگیا چنانچہ وہ بندرگاہ سورت سے اورنگ آباد اور برہان پور تک قزاقی کرتے پھرتے تھے اور قافلوں کی آمد و رفت کا راستہ بالکل مسدود ہوگیا تھا۔

بادشاہ نے سید نور قلعہ دار ''سالیر'' کو برطرف کر کے اپنے حضور طلب کر لیا۔ دلیر خاں کے نام فرمان بھیجا کہ قلعہ سالیر پر فوج کشی کر کے دشمن کے قبضے سے نکال لے۔

دلیر خاں ایک بھاری توپ خانہ اور فوج لے کر روانہ ہوا اور قلعہ سالیر کا محاصرہ کر لیا۔ توپوں کے دہانے کھل گئے لیکن قلعہ ایسا مضبوط تھا کہ دیواروں کو جنبش نہ ہوتی تھی۔ محلِ وقوع ایسا تھا کہ اوپر سے آنے والے تیر اور گولے پوری شدت سے اثر انداز ہو رہے تھے۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دلیر خاں کے کئی نامی گرامی آدمی شہید ہوگئے تھے۔ دلیر خاں کی بہادری اور حکمت عملی میں کوئی کلام نہیں تھا لیکن قلعہ تھا کہ فتح ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس ضلع کی آب و ہوا بھی ایسی تھی کہ بہت سے لوگ اس ناموافق آب و ہوا کا شکار ہو کر مرنے لگے۔

جب محاصرہ طویل ہوگیا تو بادشاہ نے دلیر خاں کو محاصرہ اٹھا دینے کی اجازت دے دی۔

☆☆☆

راجپوتوں کی شورشیں حد سے بڑھنے لگی تھیں۔ بادشاہ تک یہ اطلاعات پہنچیں تو اس نے خود قدم باہر نکالا اور اجمیر کی طرف کوچ کیا کیونکہ چتوڑ کے رانا نے جزیہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

جن دنوں قلعہ سالیر کا محاصرہ جاری تھا، عالمگیر نے یہ

حکم جاری کیا تھا کہ مسلمانوں اور حربی کافروں میں امتیاز کے لیے ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جائے۔ تمام صوبوں میں جزیہ کی وصولی کے احکامات جاری کر دیے گئے۔

اس قانون کے نفاذ سے ہندو بہت پریشان ہوئے۔ چتوڑ کے رانا نے تو... بانگِ دہل جزیہ دینے سے انکار کر دیا۔

بادشاہ نے اجمیر پہنچتے ہی رانا کو تہدید آمیز فرمان بھیجا کہ وہ جزیہ قبول کر لے اور سرکش راجپوتوں کی سرکوبی کے لیے بادشاہی افواج کو متعین کر دیا۔ رانا کو مقابلے کی تاب نہیں تھی۔ اس نے معتبر وکیلوں کو نذرانوں وغیرہ کے ساتھ خدمتِ شاہی میں بھیجا اور اپنی عرضداشت میں اس نے جزیہ کو قبول کرنے بلکہ جزیہ کی رقم کے لیے اپنے ملک کے دو تین پرگنے مخصوص کر دینے کا اقرار کیا اور معافی چاہی۔

بادشاہ نے اس کی معافی قبول کر لی اور خان جہاں کو بندوبست پر چھوڑ کر خود دارالخلافہ روانہ ہو گیا۔

بادشاہ کے روانہ ہوتے ہی رانا اپنے عہد سے پھر گیا۔ اس نے سرکشی اختیار کی اور خان جہاں کو بندوبست سے روک دیا۔

وہ سمجھ رہا تھا کہ بادشاہ اب دوبارہ دور دراز کا سفر گزار کے یہاں نہیں پہنچ سکے گا لیکن رانا کی بدعہدی نے اس کی آتشِ غضب کو بھڑکا دیا۔ وہ الٹے پاؤں روانہ ہوا اور اجمیر پہنچ گیا۔ اجمیر کے قریب چھاؤنی لگائی اور شہزادہ اکبر کو ایک فوج کے ساتھ رانا کی سرکوبی کے لیے متعین کیا۔ شہزادہ معظم کے نام فرمان جاری ہوا کہ وہ دکن سے اجین پہنچے اور احکام شاہی کا منتظر رہے۔ شہزادہ اعظم کو بھی جو بنگالہ ہی میں تھا، طلبی کے احکام بھیج دیے۔

رانا کو جب ان تیاریوں کی اطلاع ملی تو اس نے خوفزدہ ہو کر اودے پور خالی کر دیا اور پہاڑوں پر چلا گیا۔

بادشاہ نے شہزادہ اکبر کو بھی پیغام بھجوا دیا کہ وہ کوہستان کے درّوں میں داخل ہو جائے اور کافروں کا قلع قمع کر دے۔

شہزادہ معظم اجین پہنچ چکا تھا۔ اسے حکم صادر ہوا کہ وہ رانا کے تعلقہ اناساگر میں آ کر ٹھہر جائے۔ یہ تعلقہ اجمیر سے سات آٹھ کوس کے فاصلے پر تھا۔

شہزادہ اعظم کے پہنچتے ہی اسے حکم ہوا کہ وہ راجپوتوں کے قتل و غارت اور ان کو اسیر بنانے کا سلسلہ شروع کر دے۔

دوسری طرف تمام راجپوتوں نے رانا کا ساتھ دیا اور اس کے پاس 25 ہزار سوار جمع ہو گئے اور بادشاہی رسد اور غلہ پر چھاپے مارنے لگے۔ اس کے جواب میں بادشاہی لشکر نے سارے ملک کو روند دیا۔ ان کے بت خانے اور بڑی بڑی عمارتیں مسمار کر دیں۔

خان جہاں کوکلتاش کو بدستور سابق دکن کا صوبہ دار مقرر کر کے روانہ کر دیا اور تاکید کی کہ وہ قلعہ سالیر پر فوج کشی کر کے اس کو فتح کر لے۔

جب راجپوت چاروں طرف سے گھر گئے تو حسبِ عادت مکر و تدبر سے کام لینا شروع کر دیا۔ پہلے انہوں نے شہزادہ معظم کے گرد سازشوں کے جال پھیلائے اور اسے بغاوت پر اکسانے کی کوششیں کیں لیکن جب وہ ان کے دام میں نہ آیا تو انہوں نے شہزادہ محمد اکبر پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ شہزادے سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے باریابی کا موقع دے دیا۔ راجپوتوں میں سے ایک چرب زبان شخص درگا داس نے اسے بالکل ہی شیشے میں اتار لیا۔ اس کے ہمراہیوں نے بھی لالچ میں آ کر اسے بہکانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

شہزادہ معظم کی نظروں سے راجپوتوں سے اس کی راہ و رسم چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے بادشاہ کے نام عرضداشت روانہ کی جس میں اس معاملے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ بادشاہ نے اس عرضداشت کو پڑھا ضرور لیکن اس پر یقین نہیں کیا اور جواب میں لکھ دیا۔

''یہ ایک بہتانِ عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو راہِ راست کی توفیق دے اور بدخواہوں کی باتوں سے محفوظ رکھے۔''

لشکر میں طرح طرح کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ افواہ تھی کہ درگا داس کی سرداری میں تیس ہزار راجپوت شہزادے سے مل گئے ہیں۔ محمد اکبر نے تخت پر بیٹھ کر اپنے نام کا سکہ جاری کرا دیا ہے۔ امراء کو اضافے اور ترقیاں دے کر ان کے منہ بند کر دیے ہیں۔ ایک دن یہ خبر اڑی کہ اس نے تیاری مکمل کر لی ہے اور فاسد ارادوں سے بادشاہ کی طرف رخ کرنے والا ہے۔

ان افواہوں کی گونج دربارِ شاہی تک پہنچ رہی تھی۔ یہ افواہیں بادشاہ کو مشکل میں ڈالنے کے لیے بہت تھیں کیونکہ ساری فوجیں شہزادہ اکبر کے ساتھ متعین کر دی گئی تھیں۔ رکابِ شاہی میں جتنی فوج رہ گئی تھی، وہ خواجہ سراؤں اور اہلِ دفتر کو ملا کر سات آٹھ سو سوار بھی نہیں تھی۔

ان افواہوں میں کچھ سچائی ضرور تھی۔ یہ سچائی اس وقت ثابت ہو گئی جب وہ راجپوتوں کے بل بوتے پر بڑے رعب داب سے فوج لے کر بادشاہ کے مقابلے پر نکلا۔

اس کی تقدیر ہی خراب تھی۔ راجپوتوں کے لشکر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ شہزادہ اکبر نے حسن وخوبی سے راجپوتوں کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے اور بادشاہ کو خبر کر دی ہے کہ میں راجپوتوں کو ہراول بنا کر آگے بڑھا لاؤں گا۔ اس طرح وہ دونوں طرف کی تیراندازی کی زد میں آجائیں گے۔ اس افواہ کے پھیلتے ہی راجپوتوں میں تفرقہ پھیل گیا اور وہ راستے ہی میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اب جو شہزادے نے پلٹ کر دیکھا تو میدان خالی تھا۔ درگاداس اور رانا کے ایک دو معتمد آدمیوں کے سوا جو تین ہزار کی معمولی فوج کے ساتھ اس کے پاس رہ گئے تھے، کوئی رفیق اور فوج نظر نہ آئی جو اس کے لیے سینہ سپر بن جاتی۔ اس کا اپنا لشکر بھی اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اس نے اس بے جا ہزیمت پر اپنا سر پیٹ لیا۔ اب وہ نہ تو راجپوتوں کے پاس جا سکتا تھا، نہ باپ کے حضور۔

اس نے فرار ہی میں عافیت سمجھی۔

بادشاہ نے اس کے تعاقب میں شہزادہ محمد معظم کو مامور کر دیا۔

☆☆☆

سیوا اب کوہ راہیری کے قلعے میں گوشہ نشیں ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ صرف ڈوریاں ہلانے پر متعین تھا۔ ان فوجوں کے ساتھ جو ملک میں تاخت وتاراج کرنے کے لیے وہ بھیجتا تھا، کم ہی نکلا کرتا تھا لیکن ایک مرتبہ جب خان زماں برہان پور کا صوبہ دار تھا' وہ خلاف معمول ایک بھاری فوج لے کر نکلا اور خاندیس کے علاقے میں داخل ہو کر'' قصبہ دہرن گانو'' پر حملہ کیا جو اس ضلع کا آباد اور مشہور مقام تھا۔ یہاں بندرگاہ سورت کے تاجروں کے قیمتی مال واسباب ذخیرہ رہتے تھے۔ سیوا نے اس قصبے کو لوٹ لیا اور اس کے بعد اس نے پرگنہ چوپرہ اور دوسرے پرگنوں کو لوٹ لیا۔ اس قصبے کو اس نے جاتے جاتے آگ لگا دی اور پرگنہ جالنہ کی طرف نکل گیا جو بالا گھاٹ کا تجارتی مرکز تھا اور جہاں تاجروں کا مالِ تجارت بڑی مقدار میں جمع رہتا تھا۔

سیوا کی لوٹ مار کی داستانیں'' جالنہ'' والوں کے لیے نئی نہیں تھیں۔ انہوں نے جو سنا کہ سیوا کی نیت جالنہ پر خراب ہوئی ہے تو وہ یہاں کے ایک بزرگ سید جان محمد کی خانقاہ کی طرف دوڑے۔

'' حضرت! کافر سیوا ہمارے مال وآبرو کا دشمن بن کر'' جالنہ'' کے دروازے پر دستک دینے والا ہے۔''

'' تم کیوں ڈرتے ہو۔''

'' ڈرنے کی تو بات ہی ہے۔ ہم اس کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔''

'' مت کرو مقابلہ۔''

'' برسوں کی کمائی ہم اس کے حوالے کیسے کر دیں۔''

'' تو ہمارے حوالے کر دو۔''

'' حضرت ہم سمجھے نہیں۔''

'' جن چیزوں کا تمھیں خدشہ ہے، وہ لے کر یہاں چلے آؤ۔''

ان بزرگ کے حکم پر جتنے مال دار اور صاحب سرمایہ اشخاص تھے، نقد وجنس لے کر اس درویش کے تکیے پر آ گئے۔ سیوا جب شہر میں داخل ہوا اور اسے معلوم ہوا تو وہ سیدھا حضرت جان محمد کی خانقاہ پر پہنچا۔ سید صاحب اس کا انتظار ہی کر رہے تھے۔ سیوا گھوڑے پر سوار تھا۔ آٹھ دس سوار اس کے ساتھ تھے۔

'' سیوا! تو ہماری خانقاہ لوٹنے آیا ہے اور اتنے کم لوگوں کے ساتھ۔''

'' میرا ایک شیر تمہارے دس گیدڑوں پر بھاری ہے۔''

'' بات شیروں اور گیدڑوں کی نہیں۔ تو بھی خدا کا بنایا ہوا انسان ہے اور یہ غریب بھی جن کو تو بے آبرو کرنے آیا ہے۔ کیوں خدا کے غضب کو آواز دے رہا ہے۔ چلا جا یہاں سے۔''

'' ان لوگوں سے کہو جو مال ودولت لے کر یہاں چھپ گئے ہیں، وہ میرے سامنے ڈھیر کر دیں۔''

'' کیا تجھے ہمارا پاس ولحاظ بھی نہیں۔ ہم تجھ سے کہہ رہے ہیں ہماری خانقاہ کا احترام کر۔''

سیوا ابھی ان بزرگ سے بات چیت کر ہی رہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے حملہ کر دیا اور لوٹ مار شروع کر دی۔ اس آپا دھاپی میں سیوا کے آدمیوں نے سید صاحب کو بھی دھکے دیے۔

جب سیوا اس کارروائی کے بعد وہاں سے رخصت ہونے لگا تو سید صاحب نے اس کو جتایا۔'' میرے خدا نے چاہا تو کسی مسلمان پر یہ تیرا آخری حملہ ہوگا۔''

اس کے جانے کے بعد سید صاحب کمرا بند کر کے معتکف ہو گئے۔

کچھ دن بعد خبر آئی کہ سیوا اپنی جمع کردہ عورتوں کے ہجوم میں گھرا بیٹھا تھا کہ اچانک ایک ہچکی سی آئی اور اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

وہ طبعی موت مر گیا۔

سید صاحب کے مریدوں نے یہ خبر سید صاحب تک پہنچائی۔ بے اختیار آپ کی زبان سے نکلا۔

''کافر بہ جہنم رفت۔''

سید صاحب کی بددعا شاید سیوا کے بیٹے سنبھا تک پہنچنے والی تھی کہ سیوا کے مرنے کے بعد سنبھا گدی نشین ہوا۔ نیا نیا جوان ہوا تھا فطرتاً بھی بدکردار تھا۔ اس نے ایسے ہاتھ پاؤں نکالے کہ خود اس کے ہم قوم کہنے لگے کہ اس سے اچھا تو سیوا تھا کہ اگر وہ مارتا بھی تھا تو چھاؤں میں ڈالتا تھا۔ اسے نہ دوسروں کا خیال ہے، نہ ہم قوموں کا۔ سیوا باغی تھا، قافلوں کو لوٹ لیتا تھا، مردم آزاری کرتا تھا لیکن گھٹیا اور رکیک اعمال اس سے ظاہر نہ ہوتے۔

سنبھا باپ کی روش کے خلاف دوسری قوم کی عورتوں کو جمع کرنے اور اپنی ہی مقامی رعیت کے ناموس و آبرو پر ہاتھ ڈالنے لگا۔

راہیری کا علاقہ سخت گرم تھا۔ زمین پہاڑی اور سنگین تھی۔ گرمیوں میں پانی کی شدید قلت ہو جاتی تھی۔ سیوا نے اپنے مکان سے متصل ایک باؤلی کھدوائی تھی۔ یہاں سے پانی لینے کی سب کو اجازت تھی۔ اس باؤلی کے ساتھ ہی ایک جھروکا بنا دیا تھا۔ گرمی میں وہ اس جھروکے میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب غریب عورتیں اس باؤلی سے پانی لینے کے لیے آتی تھیں تو سیوا نے کبھی ان پر بری نظر نہیں ڈالی بلکہ ان عورتوں سے بہن کہہ کر بات کرتا تھا۔

جب سنبھا کا زمانہ آیا تو وہ بھی اس جھروکے میں بیٹھنے لگا لیکن اس کی روش باپ سے مختلف تھی۔ جس وقت کوئی عورت پانی بھر کر گھڑا سر پر رکھ لیتی اور ایک ہاتھ گھڑے پر دوسرا کمر پر رکھ لیتی اور جھروکے کے قریب سے گزرتی تو وہ عورت سے دست درازی کرتا اور گھڑی دو گھڑی تک اسے جانے نہ دیتا۔

سیوا اگرچہ مشہور اور آباد پرگنوں کو لوٹنے میں کوئی کمی نہیں کرتا تھا مگر اس نے کبھی بھی اورنگ آباد اور برہان پور پر جو بادشاہوں کے پایۂ تخت کہلاتے تھے، دست درازی کی ہمت نہیں کی تھی۔ اگر اس کے رفیق و مشیر اسے مشورہ دیتے بھی تھے تو وہ اسے قبول نہیں کرتا تھا اور صاف لفظوں میں کہتا تھا کہ اگر ہم نے ان دو شہروں کو لوٹنے کی کوشش کی تو عالمگیر بادشاہ کی غیرت بھڑک اٹھے گی۔ میں بادشاہوں سے ٹکر لینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔

سنبھا نے باپ کی اس نصیحت کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور برہان پور پر حملہ آور ہو گیا۔ برہان پور پر کاکر خاں صوبہ دار تھا۔ اس کے پاس دو تین سو سواروں سے زیادہ جمعیت نہیں تھی۔ سنبھا تقریباً بیس ہزار سوار لے کر نکلا اور صوبہ برار کے اطراف میں لوٹ مار کرتے ہوئے پچیس کوس تک یلغار کرتے ہوئے نکل گیا اور پھر وہاں سے پلٹ کر اچانک اس نے بہادر پور پہنچ کر حملہ کر دیا۔ یہ حملہ اتنا اچانک تھا کہ کوئی شخص بھی اپنی اور اپنے اہل و عیال کی جان و آبرو اور مال و متاع کو بچا کر نہ نکل سکا۔ پورے شہر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ صوبہ دار کے پاس اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ باہر نکل کر مرہٹوں کا مقابلہ کر سکتا اس لیے وہ محصور ہو گیا اور برج اور فصیلوں کو مضبوط کرنے کی تدبیر کرتا رہا۔ مرہٹوں نے جب دیکھا کہ کوئی روکنے والا نہیں تو ان کی ہمت بڑھ گئی۔ انہوں نے شہر پناہ سے متصل جتنی بستیاں تھیں، انہیں لوٹ لیا اور آگ لگا دی۔ یہ ساری بستیاں تاجروں اور صرافوں کے لاکھوں کی مالیت کے ساتھ سامان سے بھری ہوئی تھیں۔

یہ لوٹ مار تین دن تک جاری رہی۔ اس کے بعد سنبھا نے زینے تیار کروا کے شہرِ پناہ پر بھی یورش کی مگر منصب داروں کی ایک جمعیت نے مورچوں پر، دروازوں اور فصیلوں پر ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں اندر داخل نہ ہونے دیا۔

مرہٹے سونے چاندی کے ذخیرے اور جڑاؤ زیورات لے کر چلے گئے۔ یہ ذخیرہ اتنا تھا کہ ان کے لیے اس کا اٹھانا محال ہو رہا تھا۔

دکن کا صوبہ دار خان جہاں کوکلتاش اورنگ آباد میں تھا کہ اسے اس یورش کی اطلاع ملی۔ وہ کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر لشکر لے کر نکلا اور اس تیزی سے چلا کہ چار دن کا راستہ ایک دن اور ایک رات میں طے کر لیا اور بیس کوس پر فردا پور کی تلہٹی میں پہنچ گیا مگر وہاں پہنچ کر خلافِ توقع ٹھہر جانے کا فیصلہ کیا۔ یا تو اس تیزی سے چلا تھا یا یہاں آ کر ٹھہر گیا۔ یہ تعجب خیز بات تھی۔

یہ خبر پھیلتے دیر نہیں لگی کہ سنبھا کے وکیل نے خان جہاں کو بھاری رشوت دے کر درخواست کی تھی کہ وہ چار پانچ گھڑی اسی جگہ توقف کرے۔

وہ چار گھڑی وہاں گزارنے کے بعد روانہ بھی ہوا تو طویل راستے سے روانہ ہوا اور غنیم کو اتنا موقع مل گیا کہ وہ اپنے ٹھکانے تک بہ آسانی پہنچ گیا۔

برہان پور کے علما و مشائخین نے بادشاہ کے نام عرضداشت بھیجی جس میں خان جہاں کی شکایت کی گئی تھی۔ اس کے جواب میں بادشاہ نے خان جہاں کے نام سخت

فرمان بھیجا جس میں اس کی روش پر اعتراض کیا گیا تھا اور یہ اشارہ بھی تھا کہ بادشاہ کافروں کی سرکوبی کے لیے دکن کا ارادہ رکھتے ہیں۔

☆☆☆

شہزادہ اکبر کو راجپوتوں کی غداری نے تنہا کردیا تھا۔ اس کے قدیم ملازم اور راجپوت بس تین چار سو کی تعداد میں رہ گئے تھے۔ نہ کوئی فوج تھی نہ جمعیت۔ اس سا بے گھر کون ہوگا۔ شہزادہ معظم اس کے تعاقب میں تھا اور وہ راجپوتوں کے پاس جا نہیں سکتا تھا۔ دونوں طاقتیں اسے اپنا مجرم سمجھے ہوئی تھیں۔

اس نے اجمیر کی راہ لی لیکن راستے کے زمینداروں کے پاس احکامات پہنچ چکے تھے۔ پھر اس نے ایران جانے کا ارادہ کیا لیکن کسی جگہ سے بھی سرحد پار نہ کرسکا بالآخر بعض زمینداروں کی مہربانی سے دشوار گزار کوہستانی علاقے عبور کرکے دکن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس دوران دکن کے صوبہ دار کے پاس شاہی احکام پہنچ چکے تھے کہ اکبر جس جگہ بھی پایا جائے، اس کو زندہ گرفتار کرلیا جائے۔

وہ کوہستان میں چھپتا چھپاتا خطرناک سفر کرتا رہا اور بالآخر کسی نہ کسی طرح سنبھا کے تعلقہ راہیری کی سرحد پر پہنچ گیا۔ سنبھا نے اس کا استقبال کیا اور اسے راہیری سے تین کوس پر واقع ایک قلعے میں ٹھہرا دیا۔

☆☆☆

جن دنوں شہزادہ اکبر صحرا میں بھٹک رہا تھا، بادشاہ عالمگیر دکن کے لیے روانہ ہوا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ شہزادہ کس کی پناہ میں پہنچ چکا ہے، وہ برہان پور پہنچ گیا۔ یہاں تین چار ماہ قیام کے بعد اورنگ آباد آگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے شہزادہ معظم کو قلعوں کی تسخیر اور کافروں کی سرکوبی کے لیے متعین کیا۔

شہزادہ محمد اعظم کو قلعہ ''سالیر'' کی تسخیر کے لیے مامور کیا گیا۔

یہ قلعہ (سالیر) ایسا دشوار گزار تھا کہ اس کا محاصرہ ناممکن نہیں تو بے انتہا مشکل ضرور تھا کیونکہ اس کے اطراف سمندر کے کنارے بڑے گہرے غار تھے۔ ایک لاکھ سوار بھی گھیرا ڈال دیں تو کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سالیر سے چھ کوس کے فاصلے پر ''ملہیر'' کا علاقہ تھا جو بادشاہ کے قبضے میں تھا۔ نیک نام خاں اس ضلع کا بندوبست بڑی عمدگی سے سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود کہ سالیر دشمن کے قبضے میں تھا قلعہ دار سے نیک نام خاں کے تعلقات بہت اچھے تھے۔

نیک نام خاں کو جب معلوم ہوا کہ شہزادہ اعظم کو قلعہ سالیر کی فتح پر مامور کیا گیا ہے تو وہ فکر میں پڑ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس قلعے کی فتح تک شہزادہ اعظم کو کتنے پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور فائدہ شاید پھر بھی کچھ نہ ہو۔ اس نے ایک ترکیب نکالی۔ قلعہ دار سالیر کو ہدیے تحائف اور نامہ و پیام بھیج کر اپنی جانب مائل کرلیا، حرف مقصد زبان پر لایا اور اس حد تک کوشش کی کہ قلعہ دار، قلعہ سپرد کرنے پر تیار ہوگیا چنانچہ محمد اعظم جب وہاں پہنچا تو قلعہ کسی لڑائی کے بغیر ہی شاہی کارگزاروں کے قبضے میں آگیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ یہ سب نیک نام خاں کی کارستانی ہے تو سخت غصہ آیا۔ اس نے اسے اپنی توہین قرار دیا۔ وہ قلعہ کو بزور شمشیر فتح کرکے اپنا کارنامہ دکھانا چاہتا تھا۔ اس نے نیک نام خاں کی شکایت لکھ کر بادشاہ کے پاس روانہ کردی۔

بادشاہ کو نیک نام خاں کی مساعی پسند آئی لٰہذا شہزادے کی شکایت پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔

مرہٹوں کا ایک اور قلعہ ''رام سیج'' تھا۔ قلعہ سالیر کے قبضے میں آنے کے بعد بادشاہ نے شہاب الدین خاں کی کمان میں رام سیج کے قلعے کی تسخیر کے لیے فوج متعین کی۔ کمال یہ ہوا کہ یہ معمولی سا قلعہ بھی نہایت محنت و کوشش کے باوجود فتح نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت رام سیج کا قلعہ دار تمام مرہٹہ سرداروں میں سب سے زیادہ تجربہ کار و ہوشیار تھا۔

جب شہاب الدین ناکام رہا تو بادشاہ نے اسے واپس بلالیا اور خان جہاں کوکلتاش کو قلعے کی تسخیر کے لیے مقرر کرکے بھیجا۔

خان جہاں نے بھی پوری کوشش کرلی مگر قلعہ فتح نہیں ہوا۔ خان جہاں کو بھی واپس بلالیا گیا۔

سنبھا، رام سیج کے قلعہ دار کی اس کارگزاری پر بہت خوش ہوا۔ اس نے اسے خلعت سے نوازا اور نقد رقم بھی بھیجی اور اس کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اسے ایک مشہور اور بڑے قلعے پر مقرر کردیا۔ بس یہی اس سے غلطی ہوئی۔ دوسرا قلعہ دار اتنا تجربہ کار نہیں تھا۔ نیک نام خاں نے رام سیج کے اطراف کے ایک زمین دار کو اپنے ساتھ ملالیا اور اس کی مدد سے قلعہ رام سیج کو نئے قلعہ دار کے قبضے سے نکال لیا اور بادشاہی افسروں کے سپرد کردیا۔

☆☆☆

بادشاہ عالمگیر کا مفرور بیٹا شہزادہ محمد اکبر سنبھا کے

پاس مقیم تھا لیکن وہ یہاں خوش نہیں تھا۔ سنبھا کا بے جا تکبر اسے مارے ڈال رہا تھا۔ اس کے طنزیہ جملے شہزادے کے سینے کو چھلنی کررہے تھے۔ پھر جب یہ خبر پہنچی کہ بادشاہ قلعہ راہیری کی فتح کے لیے ایک فوج تیار کررہا ہے تو اسے اپنی گرفتاری کا خدشہ ہوا لہٰذا ان سب باتوں کے پیشِ نظر اس نے ایران جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس نے دو چھوٹے جہاز تیار کرائے اور ان جہازوں میں چالیس دن کی خوراک کا ذخیرہ رکھ کر جہاز پانی میں ڈال دیے۔

اس وقت شہزادے کے ساتھ چالیس پچاس بھروسے کے آدمی رہ گئے تھے۔

وہ یہاں سے تو بچ کر نکل گیا لیکن بیچ سمندر میں ناموافق موسم نے اس کے جہاز کو گھیر لیا۔ تیز لہروں نے اس کے جہاز کو امام مسقط کے ماتحت جزیرے پر پہنچا دیا۔ وہ ابھی جہاز سے اترا بھی نہیں تھا کہ امام مسقط کے آدمی اس کے جہاز پر چڑھ گئے اور اسے گرفتار کر کے امام کے پاس لے گئے۔

شہزادے نے اپنی شناخت کرائی اور اس خود ساختہ جلاوطنی کی وجوہات بھی بتائیں۔ امام مسقط قلم روایران کا زمیندار اور شاہ ایران کی طرف سے مستقل حاکم تھا۔ اس نے بہ ظاہر شہزادے کی آؤ بھگت کی مگر عملاً اسے نظر بند کردیا اور عالمگیر کو اطلاع کردی۔

”آپ کا نافرمان بیٹا جس کی آپ کو تلاش بھی ہے اس وقت میرے پاس ہے۔ اگر دو لاکھ روپے نقد دیا جائے اور مسقط کا جو سامان جہازوں پر بندرگاہ سورت جاتا ہے، اس پر ”عشر“ کی معافی کی سند دی جائے تو میں شہزادے کو آپ کے حوالے کردوں گا۔“

اس اثنا میں شاہِ ایران کو بھی اطلاع مل گئی کہ محمد اکبر کو امام مسقط نے گرفتار کررکھا ہے۔ اس نے اپنا حکم نامہ امام کے پاس روانہ کیا۔

”ہمارے مہمان کو بلا تاخیر شایانِ شان اہتمام کے ساتھ روانہ کردو ورنہ ایران کی فوج اس پر حملہ کردے گی۔“

امام کے دل میں لالچ آ گیا تھا کہ وہ شہزادے کو بادشاہِ ہند عالمگیر کے حوالے کر کے بھاری رقم وصول کرے گا اس لیے اس نے اس حکم نامے کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پھر اس مضمون کے کئی خط اس کے پاس پہنچے لیکن وہ سب کو نظر انداز کرتا رہا۔

شاہِ ایران کو زمیندار کی اس نافرمانی پر سخت غصہ آیا۔ اس نے امام کے خلاف فوج کشی کے احکام جاری کردیے۔

اب زمیندار کو اپنی فکر پڑ گئی۔ اس نے شہزادہ اکبر کو اعزاز و اکرام کے ساتھ شاہ سلیمان کے آدمیوں کے حوالے کردیا۔

جب شہزادہ اصفہان سے تین کوس کے فاصلے پر پہنچا تو اسے شاہی باغ میں ٹھہرایا گیا اور شاہ سلیمان نے خود باغ تک آ کر اس کا استقبال کیا۔

ناشتا تناول کرنے کے بعد دونوں میزبان اور مہمان گھوڑوں پر سوار باتیں کرتے ہوئے روانہ ہوئے۔ شاہِ ایران کا گھوڑا نہایت ہموار چال چل رہا تھا لیکن شہزادے کے گھوڑے نے کچھ دور چل کر شوخی دکھانی شروع کردی۔ اس کے چابک سوار نے فوراً دوسرا گھوڑا اس کے پاس پہنچایا۔ شہزادے نے اس مہارت سے گھوڑے کی سواری بدلی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔

اب وہ دونوں آرام سے چلے جارہے تھے کہ اچانک شاہ نے اس کے گھوڑے کے سامنے اپنی سواری روک لی۔

”برادر عزیز! یہاں سے ہمارے اور تمہارے راستے جدا ہورہے ہیں۔ آپ کو دائیں جانب جانا ہے۔“

”کاش! یہ راستہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ ہم اسی طرح چلتے رہتے۔“ شہزادے نے کہا۔

”راستہ کوئی بھی ہو، ختم ہونے کے لیے ہوتا ہے۔ اصل چیز تو منزل ہے جہاں آپ کو لے جایا جارہا ہے اور جہاں کل میں آپ سے ملاقات کے لیے آؤں گا۔“

وعدے کے مطابق دوسرے دن شاہِ ایران شہزادے سے ملنے کے لیے گیا اور دل بستگی کی باتیں کرتا رہا اور پھر نئی مجلسیں اور محفلیں جمتی رہیں۔

انہی ملاقاتوں کے بیچ موسم بہار رخصت ہوگیا اور موسم خزاں آ گیا۔ درختوں کے پتے جھڑ گئے تھے اور درخت نیا لباس پہننے کے لیے عریاں ہوگئے تھے۔ شاہ ایران اپنے مہمان شہزادے کی دل بستگی کے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے خزاں میں جشنِ خزاں منانے کا خیال آیا۔ شاہ سلیمان کے حکم پر شاہی باغ کے درختوں میں مروارید کے شگوفے اور پھل لگائے گئے اور تمام درختوں کی آرائش کی گئی۔ جب باغ آراستہ ہوگیا تو ملاحظے کے لیے شہزادے کو وہاں لایا گیا۔ شہزادہ یہ منظر دیکھ کر بے حد خوش ہوا۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مروارید کے دریا آپ کے تصرف میں ہیں کہ سارا باغ مروارید کی کلیوں اور پھول پھلاری سے جگمگا رہا ہے، ویسے ہندوستان کے جواہر خانے

میں بھی اتنے جواہرات موجود ہیں کہ اگر چاہیں تو مختلف جواہرات سے باغ کی آرائش کر سکتے ہیں۔"

بہرحال اسی طرح جشن و تقریبات میں دن گزر رہے تھے کہ شہزادے کو احساس ہوا کہ یہاں رہ کر وہ اپنے اصل مقصد سے ہٹتا جا رہا ہے۔ اس کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ وہ باپ کے خلاف جنگ آزما ہو اور تخت پر قبضہ کر لے۔ اسی لیے وہ ایران آیا تھا کہ شاہ ایران سے مدد کی درخواست کرے گا۔ اس نے شاہ سلیمان سے فوج کشی کے لیے امداد اور کمک کی درخواست کی لیکن اس وقت اسے سخت مایوس ہوئی جب اسے یہ جواب ملا۔

"اپنے باپ کی زندگی تک آپ ہمارے مہمان ہیں۔ اگر تمہارے بھائیوں سے کبھی کوئی معاملہ درپیش ہوا تو جو کچھ ہم سے ہو سکے گا، ہم تمہاری مدد کریں گے۔"

☆☆☆

شہزادہ معظم کو بادشاہ نے رام درہ کے قلعوں کی تسخیر کے لیے مامور کیا تھا۔ یہ قلعے سنبھا کے قبضے میں تھے اور ابھی تک شاہی فوجوں کا اس طرف گزر بھی نہیں ہوا تھا۔ راستے دشوار گزار تھے۔ قلعوں تک پہنچنے سے پہلے تنگ دروں سے گزرنا پڑتا تھا۔ ان تنگ دروں پر کافی سپاہی کام آ گئے مگر آخرکار شاہی لشکر نے دشمن کو مار بھگایا۔

ان دروں سے گزر کر شاہی لشکر ایک گاؤں کے قریب سے گزرا۔ اس کا نام ہی سانپ گاؤں تھا کیونکہ یہاں کثرت سے سانپ پائے جاتے تھے۔ لشکر کے کئی آدمی سانپ کے ڈسنے سے ہلاک ہو گئے۔ اس گاؤں کے قریب ایک دشوار گزار بلند ترین قلعہ تھا۔ شہزادے نے محاصرے کا حکم دے دیا۔ چند ہی دن میں یہ قلعہ فتح ہو گیا۔

اس کے بعد شاہی لشکر رام درہ میں داخل ہوا۔ یہ درہ سخت دشوار گزار تھا۔ یہاں کی آب و ہوا بھی موافق نہیں آئی۔ اس پر غضب ہوا کہ مرہٹوں نے ہر طرف سے نکل کر رسد کو منقطع کر دیا۔ ہر طرف زہریلے درخت تھے اور سانپ تھے۔ ایک طرف سمندر تھا دوسری جانب پہاڑ تھے جو زہریلے درختوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں میں سانپ بھی بہ کثرت تھے۔

جب رسد پہنچانے کے خشکی کے راستے دشمن نے بند کر دیے اور.... بادشاہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو اس نے بندرگاہ سورت کے متصدی (وزیر مالیات) کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو جہازوں پر غلہ بار کرا کے سمندر کی راہ پہنچا دے۔ غنیم کو بھی اس کی خبر ہو گئی۔ سمندر میں ہر جگہ مرہٹوں نے قلعے بنائے ہوئے تھے۔ غلہ لے جانے والی کشتیاں بھی لٹ گئیں۔ غلے کی کمی کے باعث یہ ممکن نہ رہا کہ جنگ جاری رہتی لہٰذا بادشاہ نے واپسی کے احکام صادر کر دیے۔

لشکر ہر جگہ جنگ کرتے ہوئے بادشاہ کی خدمت میں واپس آ گیا۔

لشکر واپس پہنچ گیا تھا اور اب اس شکست کے اسباب پر غور کیا جا رہا تھا۔ نہایت چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ حیدرآباد کا فرماں روا ابوالحسن تانا شاہ قلعوں کی فتح و تسخیر کے لیے سنبھا کی مالی مدد کرتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ بھی حیدرآباد کے حالات اچھے نہیں تھے۔ اس نے وکالت کا عہدہ اور سلطنت کے اختیارات دو کافروں کے سپرد کیے ہوئے تھے۔ مسلمانوں پر مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ فسق و فجور اعلانیہ ہو رہا تھا۔ شراب نوشی عام تھی۔

ان وجوہ سے بادشاہ نے حیدرآباد دکن کی فتح اور ابوالحسن کی سرکوبی کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح مرہٹوں کے ایک سرپرست کا خاتمہ ہو جائے گا۔

محل میں اس وقت سناٹا تھا۔ اس اندھیرے میں ایک مشعل بردار مرزا محمد داروغہ غسل خانہ کے محل کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کچھ دور جا کر اسے احساس ہوا اور اس نے مشعل بجھا دی۔ اب کچھ معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ کون ہے اور کس طرف جا رہا ہے۔

اندھیرے میں ایک آواز گونجی۔ "کون ہے؟ شناخت کراؤ۔"

"میں ظلِ سبحانی کا پیغام لے کر آیا ہوں۔"

"کس کے نام ہے؟"

"مرزا محمد داروغہ غسل خانہ کے نام۔"

"کیا پیغام ہے؟"

"یہ میں انہی کو بتا سکتا ہوں۔"

"ٹھہرو! اس کے لیے اجازت کی ضرورت ہو گی۔"

اتنی دیر میں ایک پہرے دار نے مشعل روشن کر دی۔ روشنی ہوتے ہی وہ آنے والے کو پہچان گیا۔

"تم تو ابوالبرکات ہو۔ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

"ہم سب صرف اتنا بتاتے ہیں جتنا کہا جاتا ہے۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔"

اتنی دیر میں اجازت آ گئی اور ابوالبرکات کو مرزا محمد کے پاس پہنچا دیا گیا اور اس نے عالمگیر کے حضور طلبی کا پیغام

مرزا محمد تک پہنچا دیا۔ مرزا محمد نے استفسار بھی کیا کہ اتنے ناوقت بلانے کا مقصد کیا ہے لیکن ظاہر ہے اس معمولی مشعل بردار کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

مرزا محمد بہ عجلت گھوڑے پر سوار ہوئے۔ ابوالبرکات اندھیرے میں راستہ بناتا ہوا پیچھے پیچھے چل دیا۔

شاہی محل کے پہرے داروں کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ کس کو آنا ہے اور کیوں آنا ہے۔ یہاں شناخت کا مسئلہ نہیں تھا۔ مرزا محمد کو سب جانتے تھے لیکن بادشاہ کی اجازت کی ضرورت تھی۔

''یاد آوری کا شکریہ لیکن بندہ فکر مند بھی ہے کہ اس فقیر سے کیا خطا ہوئی جس کی سرزنش کے لیے طلب کیا گیا ہے؟''

''ہم تمہیں حیدرآباد دکن بھیجنے کے خواہاں ہیں۔''

''بندے کی مجال ہے جو انکار کرے۔''

''تم وہاں جا کر ابوالحسن سے ملاقات کرو گے اور اس سے کہو گے تمہارے پاس نہایت شفاف اور خوش قطع دو الماس ہیں جن کا وزن ڈیڑھ سو سرخ ہے۔ یہ الماس واجب الادا بقیہ نذرانوں کے ساتھ روانہ کردو۔''

مرزا محمد یہ مطالبہ سن رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیسا مطالبہ ہے جو میرے ذریعے کہلوایا جا رہا ہے۔ اس کی پریشانی بادشاہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ انہوں نے اس کی وضاحت کی۔

''ہم تجھے پتھر کے بے جان ٹکڑوں کے لیے نہیں بھیج رہے ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ تو اس بہانے سے وہاں جا کر ابوالحسن کی بداعمالیوں کی تحقیق کرلے جن کی اطلاعات ہم کو ملتی رہی ہیں۔ تجھ سے یہ بھی امید ہے کہ تو دوسروں کی طرح مال و اسباب پر فریفتہ ہو کر اس سے خوشامدانہ بات نہیں کرے گا بلکہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ تو اس کے پاس جانے کے بعد نہایت درشتی اور سختی سے پیش آتا رہ تاکہ وہ بھی تیرے ساتھ سخت کلامی کرے۔ اس طرح اس کی گوشمالی اور سرکوبی کے لیے ہمارے ہاتھ ایک حجت آجائے۔ بس تیرا یہ کام ہے کہ جس قدر بھی ممکن ہو تو اس کے ساتھ الجھتا اور بگڑتا رہ۔ قطعاً اس کے آداب کا خیال نہ کر۔''

مرزا محمد نے جب بادشاہ کے مطالبے کا ذکر کیا اور دو الماس طلب کیے تو ابوالحسن کو حیرت ہوئی کہ اس کے پاس الماس کہاں جو وہ نذر کرے۔ وہ تو اپنی جان کی قسمیں کھانے لگا۔

''ایسے الماس میرے پاس نہیں ہیں۔ اگر ہوتے تو بلاحکم ہی میں اپنے لیے باعثِ سعادت جان کر حضور میں بھجوا دیتا۔''

مرزا محمد صاف جواب سننے کے باوجود وہاں ٹھہرا رہا اور اسے غصہ دلانے کے لیے برابر تقاضے کرتا رہا۔ دورانِ گفتگو اور بھی باتیں نکل آئی تھیں۔ مرزا محمد بادشاہ کے حکم کے مطابق ابوالحسن کی حرف گیری کرتا رہتا تھا۔ غرض اس نے ابوالحسن کی زبانی چند ایسی باتیں اگلوا لیں جو بادشاہ کی شان میں گستاخی کے مترادف تھیں۔

وہ جب روانہ ہونے لگا تو یہی ظاہر کیا جیسے وہ ابوالحسن سے ناراض ہو کر جا رہا ہے۔

مرزا محمد جس انداز میں رخصت ہوا تھا، اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ مرزا محمد کے رخصت ہوتے ہی اس نے اجلاس بلایا تھا۔ اس کے مقرب ابراہیم خاں عرف حسینی بیگ، شیخ منہاج اور رستم راؤ شریک ہوئے۔ سب کی رائے یہ تھی کہ مرزا محمد کا آنا خالی از علت نہیں تھا۔ اس کے جاتے ہی عالمگیر نے جنگ کی تیاریاں شروع کردی ہوں گی۔

ابوالحسن نے اپنے جاسوسوں کو اورنگ آباد کی طرف روانہ کیا اور خود لشکر کی تیاری پر لگ گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ جاسوسوں نے آکر اطلاع دی کہ شہزادہ معظم اور خان جہاں کی سرداری میں بادشاہی فوجیں حیدرآباد پر حملہ آور ہونے والی ہیں۔

ابوالحسن نے بھی چالیس ہزار سواروں کی فوج بادشاہی لشکر کے مقابلے کے لیے روانہ کی۔

شہزادہ معظم چاہتا تھا کہ کسی طرح جنگ ٹل جائے۔ اس نے ابوالحسن کے سپہ سالار خلیل اللہ خاں کے پاس پیغام بھیجا کہ ابوالحسن ان پرگنوں سے لادعویٰ ہو جائے جن پر اس نے بے جا قبضہ کرلیا ہے۔ خراج اور نذرانہ بلاتوقف دربار میں روانہ کردے اور معافی کی درخواست دے۔

جس وقت وہ یہ درخواست بھیج رہا تھا وہ بے جاپور اور حیدرآباد کی سرحد پر کھڑا تھا۔ اس کے باوجود ابوالحسن کے وزراء نے جنگ کو ٹالنے کی کوشش نہیں کی۔

دونوں فریقوں نے اپنی اپنی فوجیں مقابلے کے لیے بڑھا دیں۔

یہاں فریقین کے درمیان کئی جنگیں ہوئیں اور بالآخر دکن کی فوج کو ہزیمت ہوگئی۔ خان جہاں نے فتح کا شادیانہ بجوا دیا اور اسی جگہ خیمہ لگا دینے کا حکم دیا۔ بہت سامانِ غنیمت اور بے شمار ہاتھی گھوڑے بادشاہی فوج کے

ہاتھ آگئے۔

فتح کی عرضداشت بادشاہ تک پہنچی ضرور لیکن اس نے شہزادے کے اس فعل کو سخت ناپسند کیا کہ دکن کی شکست خوردہ فوج کا اس کی لشکر گاہ تک تعاقب کیوں نہیں کیا گیا۔

بادشاہ نے سخت ناراضگی کا اظہار کیا اور شہزادے کے نام غضب آلود فرمان صادر ہوا۔ خان جہاں کو تو یہ تک لکھ دیا کہ یہ سب تیرا کیا دھرا ہے۔

شہزادہ معظم کو جب عتاب آمیز خط موصول ہوا تو وہ سخت رنجیدہ ہوا۔ اس کے تو جیسے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔

اس نے اسی وقت اجلاس منعقد کیا اور دشمن کی سرکوبی کے لیے مشورہ کیا تاکہ بادشاہ کی خفگی کو کم کیا جائے۔ خان جہاں چونکہ بادشاہ کی طرف سے رنجیدہ تھا اس لیے اس نے جنگ کے مشورے کی سختی سے مخالفت کی۔ کچھ امراء جنگ کے حق میں تھے۔ یہ معاملہ چونکہ اختلافِ رائے کا شکار ہو گیا تھا اس لیے مجلسِ مشاورت کو اس دن ملتوی کر دیا گیا۔

اجلاس ملتوی ہو چکا تھا۔ خان جہاں کی مرضی کے برخلاف کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ شہزادہ معظم سخت فکرمندی کی حالت میں اپنی خلوت گاہ میں بیٹھا تھا کہ اس کے ایک امیر سید عبداللہ خان نے باریابی کی اجازت طلب کی۔ شہزادے نے اسے طلب کرلیا۔

''عبداللہ خاں! خیریت تو ہے؟''

''آپ کے حضور ایک مشورہ لے کر آیا ہوں اگر میرے مشورے کو پذیرائی حاصل ہو۔''

''تمہیں جو کہنا تھا اجلاس میں کہتے۔''

''یہ بات ایسی تھی کہ میں خان جہاں کے کانوں تک پہنچانے کے حق میں نہیں تھا۔''

''تم جو کچھ کہو گے اسے میں اجلاس میں ضرور بیان کروں گا۔''

''شاید اس کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ خان جہاں اس کی مخالفت ضرور کریں گے۔''

''کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''حضور! مجھے اس سے انکار نہیں کہ خان جہاں بہادر بادشاہ کا خیرخواہ سردار ہے لیکن میری صلاح یہ ہے کہ اس معاملے میں خان جہاں کے مشورے پر عمل نہ کیا جائے۔''

''یعنی؟''

''یعنی یہ کہ بادشاہ کی مرضی کے خلاف عمل نہ کیا جائے اور اس حیلہ باز دشمن پر جو صلح کی درخواستیں کر کے مہلت حاصل کرنا چاہتا ہے، فوراً حملہ کر دیا جائے۔''

''خان جہاں ہراول پر جانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔''

''یہ بندہ تیار ہے کہ ہراول پر جائے اور اپنی جان قربان کردے۔''

''اچھا مجھے سوچنے کا موقع دو۔'' شہزادے نے سید عبداللہ خاں کو رخصت کردیا۔

سید عبداللہ خاں کے روانہ ہوتے ہی شہزادے نے سپہ سالار حیدرآباد محمد ابراہیم کو خفیہ پیغام بھیجا۔

''میں نے تمہاری طرف سے جو اغماض برتا تھا اور رعایت کی تھی، اس کے سبب میں بادشاہ کے عتاب میں آگیا ہوں۔ اب طرفین کی بھلائی اور تمہاری سلطنت کی آبرو اسی میں ہے کہ تم ان تمام سرحدی محلات پر سے جو بادشاہی قبضے میں آچکے تھے، دست بردار ہوجاؤ۔ اگر تم نے ایسا کرلیا تو میں اس بات کو ابوالحسن کے قصوروں کی معافی اور سفارش کے لیے بہانہ بنا کر عرضداشت بھیج دوں گا۔''

سپہ سالار، حیدرآباد کو کیا پڑی تھی کہ باپ بیٹوں کو قریب آنے کا موقع دیتا۔ اس نے نہایت بے ہودگی سے شہزادے کے پاس یہ جواب بھیج دیا۔ ''ہم جنگ کے لیے تیار ہیں۔''

ابھی یہ پیغام بھیجا ہی تھا کہ مرہٹوں کی طرف سے ''بان'' پھینکے جانے لگے۔ ایک بان تو ایسا گستاخ نکلا شہزادے کے سراپردہ کے اندر تک چلا آیا۔ اسی دن یہ بھی ہوا کہ ابوالحسن کے پاس سے ایک بڑا توپ خانہ اور تازہ دم فوج آگئی اور گولے داغے جانے لگے۔

اب خاموش رہنا بزدلی بھی تھی اور بے غیرتی بھی۔ شہزادے نے بھی صف بندی کرا کے خان جہاں کو حسبِ سابق ہراول پر مقرر کیا۔

دکن والوں نے بھی تیز رفتاری دکھائی اور ہر طرف سے بادشاہی لشکر پر حملہ کردیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک خوں ریز جنگ چھڑ گئی۔

اس خوں ریز جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ دوسرے دن جب سورج طلوع ہوا تو ہرکاروں نے خبر پہنچائی کہ ابوالحسن کے سردار حیدرآباد کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ شاہ عالم نے حکم دیا کہ فتح کا شادیانہ بجاتے ہوئے دشمن کے تعاقب میں حیدرآباد کی طرف کوچ کردیا جائے۔

بادشاہی لشکر کوچ پر کوچ کرتا ہوا حیدرآباد پہنچ گیا۔ ابھی شہزادے نے سانس بھی نہیں لی تھی کہ محمد ابراہیم سپہ سالار حیدرآباد اس کی خدمت میں پہنچ گیا اور ہتھیار اتار کر شہزادے کے قدموں میں رکھ دیے۔

''مجھ سے سخت غلطی ہوئی کہ میں نے جنگ کا مشورہ دیا۔ اب جن لوگوں نے مجھ سے جنگ کا مشورہ دلوایا تھا وہی مجھے قتل کرنے کی سازشوں میں شریک ہیں۔''

''آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟''

''پناہ...... اور اگر وقت پڑا تو آپ کی جانب سے لڑائی میں حصہ لینے کی اجازت۔''

شہزادے نے اس کی معافی قبول کی اور اسے عنایات وانعامات سے نوازا۔

اس خبر سے ابوالحسن بدحواس ہوگیا۔ اس نے اراکینِ حکومت سے بھی مشورہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور چپکے سے رات کے کسی حصے میں اپنے محل کی عورتوں اور جواہرات کے صندوقوں کے ساتھ قلعہ گولکنڈہ میں چلا گیا۔

اس کے چلے جانے کی خبر جیسے ہی شہر میں پھیلی غنڈوں کی بن آئی۔ اوباشوں کی فوج ظفر موج گھروں میں داخل ہوگئی۔ روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ مال واسباب بھی لٹا، عزت و آبرو بھی لٹی، جوان لڑکیاں سڑکوں پر دوڑی چلی جاتی تھیں۔ جس کے ہاتھ پڑیں پامال ہوئیں۔ عورتیں ننگے سر ننگے پاؤں گولکنڈہ کی طرف بھاگ رہی تھیں۔

جب تک شہزادے کو خبر ہوتی پورا شہر لٹ چکا تھا بالآخر بادشاہی فوج بلا روک ٹوک شہر میں داخل ہوگئی۔ شہزادے نے فوج کے جوانوں کو نگرانی پر مامور کردیا تھا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ فتنے کی آگ دب ضرور گئی لیکن پوری طرح شہر کا بندوبست نہ ہوسکا۔ اسی اثنا میں ابوالحسن کا ایلچی صلح کا پیغام اور معافی کی درخواست لے کر حاضر ہوا۔

عام حالات میں شاید شہزادہ کبھی اس درخواست پر غور نہ کرتا لیکن شہر کا حال اتنا برا تھا کہ اسے ابوالحسن پر بھی رحم آگیا۔ اس نے چند کڑی شرائط کے ساتھ بادشاہ سے اس کی معافی کی ہامی بھرلی۔

خان جہاں اور شہزادہ معظم کی جانب سے بادشاہ کی ناراضی ابھی دور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس صلح کے پیغام سے بھی خوش نہیں ہوا اور خان جہاں کو دربار میں طلب کرلیا گیا۔

خان جہاں نہایت بہادر اور تجربہ کار سردار تھا لیکن بادشاہ کے دل میں اس کی طرف سے بال آگیا تھا اور بادشاہ نے اس پر دوسروں کو ترجیح دینی شروع کردی تھی اور خاص طور پر دو نوجوانوں کے بارے میں خان جہاں کو خط لکھتے ہوئے یہ فقرہ بھی لکھ دیا۔

''یہ خانہ زاد کہ ابھی ان کے منہ سے دودھ کی بو تک

نہیں گئی اس سال خوردہ (یعنی خان جہاں) کے مقابلے میں کہیں بڑھ کر فدا کاری اور جاں فشانی دکھا رہے ہیں۔''

یہ فقرہ ایسا نہیں تھا جسے خان جہاں آسانی سے برداشت کرلیتا۔ وہ بادشاہ کی طرف سے بھی مایوس ہو چکا تھا۔ اس نے خفیہ طور پر سنبھا کو لکھا کہ میں لشکر میں گرانی اور عسرت کی اطلاع بادشاہ کو بھیج کر ان نوجوانوں اعتقاد خاں خواجہ ابو المکارم اور تہور خاں کو رسد اور غلہ لانے پر مامور کردوں گا۔ تم ایک بڑی فوج لے کر ان پر حملہ کردو اور ان کو اپنا اسیر بنا لو یا قتل کرادو۔

اس خط نے ابھی چند منزلیں بھی طے نہیں کی تھیں کہ سعادت یار خاں داروغہ کو شک ہو گیا۔ اس نے قاصد کا پیچھا کیا اور اسے جا لیا۔

''تمہیں خان جہاں نے کہاں بھیجا ہے؟''

''میں حیدر آباد کی طرف جا رہا ہوں۔''

''کس واسطے؟''

قاصد کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کی خاموشی سے سعادت خاں کا شک یقین میں بدل گیا۔

''مجھے سچ سچ بتا معاملہ کیا ہے۔''

''مجھ سے تو یہ کہا گیا تھا کہ میں حیدر آباد پہنچ جاؤں۔ وہاں کیا ہونے والا ہے مجھے نہیں معلوم۔''

سعادت خاں نے جھپٹ کر اس کی پگڑی اتار دی۔ اندازہ ٹھیک نکلا۔ ایک خط پگڑی کے اندر چھپا ہوا تھا۔ سعادت خاں نے اس خط کو پڑھا تو اس کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

یہ خط اگر سنبھا تک پہنچ جاتا تو قیامت آجاتی۔

سعادت خاں کا خان جہاں سے پرانا تعلق تھا مگر اس وقت بادشاہ کا حقِ نمک زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ اس نے بظاہر تو سارا معاملہ وہیں دبا دیا اور اس راز کو افشا نہ ہونے دیا لیکن خفیہ طور پر شہزادہ معظم کو اس سے مطلع کر دیا۔

ان نازک حالات میں شہزادے نے مناسب نہ سمجھا کہ اس موقع پر خان جہاں سے دشمنی مول لے۔ اس نے سعادت خاں کو بھی اعتماد میں لے لیا۔

''آپ اب بالکل خاموشی اختیار کرلیں۔ خان جہاں جب بھی اعتقاد خاں کو بھیجنے کے لیے عرض کرے گا، ہم اس کی درخواست قبول کرلیں گے۔ آپ اعتقاد خاں کو ہماری طرف سے یہ بتا دیں کہ وہ اس کے پاس جانے سے انکار کردے۔''

اس کے انکار نے تو جیسے سوکھی گھاس میں آگ لگا دی۔ خان جہاں آگ بگولا ہو کر شہزادے کی خدمت میں آیا اور اعتقاد خاں کی نافرمانی کی شکایت کی۔ جب اس نے دیکھا کہ شہزادہ دلچسپی نہیں لے رہا ہے تو نہایت بدتمیزی سے یہ کہہ کر اٹھ گیا۔

''اب فوج فاقوں سے مرے یا تلواروں سے، مجھے اس کی پروا نہیں۔''

جب شہزادے کے لشکر میں غذا کی قلت بڑھ گئی اور گرانی ہو گئی تو یہ ارادہ کیا گیا کہ بعض امور کے متعلق جوابات کے ملنے تک قصبہ کوہیر میں قیام کیا جائے اور وہیں بادشاہ کے حکم کا انتظار کرتے ہیں۔

بادشاہ تک یہ اطلاعات برابر پہنچ رہی تھیں کہ بے جا پور کے والی نے مرہٹوں سے ساز باز کررکھی ہے۔ سنبھا پسِ پردہ رہ کر اس کی مدد کررہا ہے اسی لیے قلعے کی تسخیر میں اتنی دقت پیش آرہی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے عالمگیر نے خود بے جا پور جانے کا ارادہ کرلیا۔

کسی مہم پر بادشاہ کا بذاتِ خود روانہ ہونا غیر معمولی بات تھی لہٰذا یہ خبر سنتے ہی محصورین کے ہوش اڑ گئے۔ شاہی فوج میں بھی ایک نئی روح آگئی۔ تمام امیر اور شہزادے قلعے کو تسخیر کرنے کے لیے مورچے باندھنے، نقب لگانے اور یورش کرنے میں مصروف ہو گئے۔

مرہٹوں کے ہاتھ اٹھاتے ہی محصورین پر حالات تنگ ہو گئے۔ قلعے میں غلہ اور چارا نہ پہنچنے کے باعث دکنیوں کی ایک کثیر تعداد بھوک سے تلف ہو گئی تو محصورین مجبور ہو گئے۔ سکندر شاہ والی بے جا پور کی طرف سے امان طلب کی گئی اور قلعے کی کنجی بادشاہ کی خدمت میں پیش کردی گئی۔

بادشاہ نے سکندر کو دولت آباد بھیج دیا اور وہاں کے قلعہ دار کو اس کی حفاظت کے لیے تاکیدی احکام بھیج کر گلبرگہ کی طرف کوچ کر گیا۔ یہاں سے اسے حیدر آباد کی طرف کوچ کرنا تھا جہاں سے کچھ عرصہ پہلے ابوالحسن تانا شاہ سے صلح کے بعد شہزادہ معظم کو واپس بلا لیا گیا تھا۔ ابوالحسن اپنے وعدوں سے پھر گیا تھا اور خراج دینا بند کردیا تھا۔

حیدر آباد روانگی سے قبل بادشاہ نے حیدر آباد کے حاجب (ریذیڈنٹ) سعادت خاں کے نام فرمان جاری کیا۔

''ما بدولت نے حیدر آباد کی تسخیر کا قطعی ارادہ کرلیا ہے اور بہت جلد ہماری سواری اس طرف پہنچنے والی ہے لہٰذا تم خراج اور نذرانے کی رقم کی وصولی میں پوری شدت اور سختی سے کام لو۔ بس سمجھ لو اس خدمت کی ادائیگی پر تمہارے مجرا اور تسلیمات کا دارومدار ہے۔''

یہ فرمان ہی ایسا تھا کہ سعادت خاں سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ وہ اب تک ابوالحسن سے رقم کی وصولی کے تقاضے کرتا رہا تھا لیکن اب تو اس کی موت وزندگی کا سوال تھا۔ وہ ابوالحسن سے تقاضے کرتا رہا تھا لیکن اب اس تقاضے میں سختی آ گئی۔

جب اس سختی سے بھی کام نہیں نکلا تو شاہی عنایات و توجیہات کی امیدیں دلائی گئیں۔

''اگر آپ رقم کا بندوبست کردیں تو میں آپ کی سفارش بادشاہ کے حضور کرسکوں گا۔ آپ کی حکومت بھی باقی رہے گی اور بادشاہ کی عنایات سے جو رقم خرچ کریں گے اس سے زیادہ مل جائے گی۔ بصورتِ دیگر بادشاہ کے عتاب کا نشانہ بنیں گے۔ یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ آپ شاہی افواج کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔''

ابوالحسن کی سمجھ میں یہ بات آ گئی لیکن اسے ضمانت درکار تھی۔ اس نے سعادت خاں سے کھل کر بات کی۔

''ایسا نہ ہو کہ میں رقم کا بندوبست بھی کردوں اور بادشاہ پھر بھی مجھ پر حملہ آور ہو جائے۔ آپ مجھے ضمانت دیں۔''

''بادشاہوں کے وعدے اٹل ہوتے ہیں۔''

''بادشاہوں کی نیت بدلتے بھی دیر نہیں لگتی۔ مجھے آپ کی ضمانت درکار ہے۔''

''میں کوشش کروں گا کہ حیدر آباد پر حملہ نہ ہو اور آپ کو ضمانت دیتا ہوں کہ آپ کی عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔''

ابوالحسن مطمئن تو ہو گیا لیکن اب وہ زرنقد کے نہ ملنے کا عذر کررہا تھا۔

''میں زرنقد فراہم کرنے سے معذور ہوں۔ اس لیے جتنے بھی جواہرات اور زیورات محل میں عورتوں کے پاس ہیں، بھجوا دیتا ہوں۔ آپ اپنے کسی کم عمر خواجہ سرا کو بھجوا دیں تاکہ زیورات اس کے حوالے کردوں۔''

سعادت خاں نے خواجہ سرا کو بھجوانے سے انکار کردیا۔ دوسری جانب سے بھی کچھ زیادہ اصرار نہیں ہوا۔

اتنے میں یہ خبر عام ہو گئی کہ اورنگزیب عالمگیر گلبرگہ پہنچ گیا ہے۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد وہ حیدر آباد کا رخ کرے گا۔

اس خبر نے ابوالحسن کو سخت پریشان کردیا۔ بادشاہ کے عتاب سے بچنے کا اب بھی ایک ہی راستہ تھا کہ نذرانے کی رقم اس تک پہنچا کر اس کے غصے کو کم کیا جائے۔ اس نے سعادت خاں کے آدمیوں کو بلا کر جواہرات، زیورات وغیرہ کے تھال سعادت خاں کے گھر پہنچا دیے کہ وہ اسے امانت کے طور پر اپنے پاس رکھے اور اس کی عرضداشت اس کے قصوروں کی معافی کی التجا کے ساتھ بادشاہ تک پہنچا دی جائے۔

ابھی اس عرضداشت کے پہنچنے کی اطلاع نہیں ملی تھی کہ بادشاہ کے گلبرگہ سے گولکنڈہ پہنچنے کی اطلاع آ گئی۔

بادشاہ کے گولکنڈہ فتح کرلینے کے قطعی ارادوں کا ہر طرف چرچا ہو رہا تھا۔ ابوالحسن کی پریشانی، غصے میں تبدیل ہو گئی۔ اس نے سعادت خاں کو پیغام بھیجا۔

''ہم نے جواہرات اور زیور اس توقع سے بھجوائے تھے کہ بادشاہ رحم کھا کر ہمارے ناموس و آبرو کو بحال رہنے دے گا لیکن اب مایوس کن خبریں مل رہی ہیں۔ اب قصوروں کی معافی قبول کرلینے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ ہمارے امانت رکھے ہوئے تھال واپس بھجوا دیے جائیں کیونکہ جب جنگ ٹھہری تو پھر جنگ سہی۔''

سعادت خاں نے کہلوا بھیجا۔

''مجھے تحقیق سے معلوم نہیں تھا کہ بادشاہ سلامت اس طرف آنے کا ارادہ کرچکے ہیں اس لیے میں نے نمک حلالی کے ساتھ وہ تھال حضور شاہ میں روانہ کردیے تھے۔ اب تو وہ تھال جاچکے۔ ان کے عوض میرا سر حاضر ہے۔''

ابوالحسن اس جواب سے قطعی مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے یہی سمجھا کہ سعادت خاں کے دل میں بے ایمانی آ گئی ہے۔ وہ کچھ دن تو تقاضے کرتا رہا اور پھر سعادت خاں کے گھر پر پہرا بٹھا دیا۔ گویا اب وہ اس کی قید میں تھا۔ سعادت خاں نے اس چوکی پہرے سے نجات پانے کے لیے اس کے پاس نہایت منطقی پیغام بھیجا۔

''اس معاملے میں تم حق بجانب ہو مگر میں نے صرف بادشاہ کے حکم کے مطابق ان تھالوں کو بادشاہ کے پاس روانہ کرنے ہی میں اپنی خیریت دیکھی تھی۔ اب جبکہ وہ جاچکے بحث وتمحیص کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی لیکن اب جو صورت درپیش ہے اس میں مجھے قتل ہونے کے لیے راضی رہنا چاہیے مگر تم یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ میرا قتل، بادشاہ کو تمہارے استیصال کا بہانہ فراہم کرسکتا ہے اور اگر میں زندہ رہا تو تمہاری خطاؤں اور قصوروں کی معافی کی امید بہرحال باقی رہتی ہے۔ میں حتی المقدور تمہاری بھلائی اور نجات کے لیے کوشاں رہوں گا۔''

ابوالحسن اس وقت اکیلا بھی تھا اور مشکل میں بھی تھا۔ سعادت خاں اس سے پہلے بھی بادشاہ کی مرضی کے خلاف

ابوالحسن کے حق میں کچھ کام کر چکا تھا۔ ابوالحسن نے یہی بہتر سمجھا کہ اس وقت اسے اپنے خلاف نہ کیا جائے۔ شاید وہ اب بھی میرے کسی کام آ جائے۔

اس نے کچھ سوچ کر سعادت خاں کی مزاحمت ترک کر دی۔ اس کے گھر سے پہرا اٹھا لیا۔ اسے اپنے دربار میں بلایا اور اسے خلعت وغیرہ سے فیض یاب کیا اور یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ جس قدر ممکن ہوگا اس کے حق میں بادشاہ کے حضور سفارش کرے گا۔

ابھی یہ گفت و شنید جاری تھی کہ اورنگ زیب عالمگیر نے حیدرآباد کی جانب پیش خانہ شاہی کو بڑھانے کا حکم دیا۔ ابوالحسن کو جب یہ تشویش ناک خبر ملی تو اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کے دن تاریک ہو گئے۔ مال بھی گیا اور سلطنت کا زوال بھی سر پر آ گیا۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر ایک عریضہ خدمتِ شاہی میں روانہ کیا جس میں اظہارِ اطاعت کیا گیا تھا اور قصوروں کی معافی مانگی گئی تھی۔

اس عریضے کے جواب میں بادشاہ نے سعادت خاں کے نام یہ فرمان جاری کیا۔

''اس بدعافیت کے قصور ایسے نہیں جو معاف کیے جا سکیں۔ کہاں تک بیان کروں۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے اپنے ملک کے اختیارات ایک ظالم کافر کے ہاتھ میں دے دیے اور علما کو اس کے ہاتھوں ذلیل و خوار کرایا۔ فسق و فجور کو کھلم کھلا رواج دیتا رہا۔ مرہٹوں کی اعانت میں سرگرم رہا۔ کافروں کی اعانت کی ممانعت میں کلام مجید کی واضح نص موجود ہے۔ اس نے حکم الٰہی کی سرتابی کی۔ اسے بارہا نصیحت کی گئی مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگی۔ حال ہی میں یہ اطلاع بھی ملی ہے کہ اس نے سنبھا کے پاس ایک لاکھ ہون بھجوائے ہیں۔''

جب ابوالحسن قطعی مایوس ہو گیا تو اس نے مقابلے کے لیے لشکر ترتیب دیا۔ دکن کے جنگجو سرداروں کو مقابلے پر مقرر کر کے رخصت کیا۔

حیدرآباد سے دو منزل کے فاصلے پر بادشاہی لشکر نے پڑاؤ ڈالا۔

دکن کے سردار چالیس پچاس ہزار سوار لے کر نمودار ہوئے اور انہوں نے دور دور سے لشکر کے اطراف دائرہ بنا لیا۔ جب موقع ملتا، چھاپے مارتے اور لشکریوں کو نقصان پہنچاتے۔ جب امرائے لشکر نے ان چھاپوں کا جواب دینا چاہا تو زبردست مقابلے شروع ہو گئے۔ قلعے سے بھی توپیں داغی جانے لگیں۔

ابوالحسن برابر اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ شاہی فوجوں کو مقابلے میں الجھائے رکھے اور خود شہزادہ معظم کی خدمت میں تحفے تحائف بھیج کر اسے اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں اس کی سفارش کر سکے۔

شہزادے کی نیت یہ تھی کہ معاملہ صلح پر ختم ہو یا جنگ پر۔ دونوں صورتوں میں یہ مہم اس کی وساطت سے انجام پائے۔ اسی لیے وہ ابوالحسن کے محبت آمیز پیغامات کے جوابات محبت کے ساتھ دینے لگا اور یہ بھول گیا کہ اس کے حاسد قدم قدم پر کان لگائے آنکھیں کھولے کھڑے ہیں۔

بے جاپور کے محاصرے کے دوران بھی اس سے یہی حرکت سرزد ہوئی تھی اور بادشاہ اس سے سخت بدگمان ہو گیا تھا۔ اب وہ ایک مرتبہ پھر اسی روش پر چل رہا تھا۔ یہ سوچے بغیر کہ یہ حرکت اس کے لیے وبالِ جان بننے والی ہے۔

ابوالحسن کی بے احتیاطی نے یہ راز جلد ہی آشکار کر دیا۔ رات کے وقت روشنی کی ایک لکیر بھی بھانڈا پھوڑنے کے لیے بہت ہوتی ہے۔ یہاں تو قلعے سے مشعل بردار پیغام بر باہر آیا اور شہزادے کے خیمے میں داخل ہوا۔ فوج کے کئی سرداروں نے یہ منظر دیکھا۔ خیمے سے نکل کر قلعے میں جاتے ہوئے بھی دیکھا۔ یہ باتیں چل نکلیں تو درمیان میں لگائی بجھائی کرنے والوں کی بن آئی۔ اس نامہ و پیام کی ٹوہ ملتے ہی بادشاہ کے سامنے بڑی رنگ آمیزی سے اس معاملے کو پیش کیا۔

''حضور کے روبرو آنکھوں کی برائی پلکوں کے سامنے کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔'' ایک مغل سردار بادشاہ کے حضور بیٹھا شہزادے کی کارگزاریوں کو بیان کر رہا تھا۔

''کیا بات ہے اتنا ہچکچا کیوں رہے ہو۔''

''حضور! بات ہی کچھ ایسی ہے۔ شہزادہ معظم اور ابوالحسن کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے۔''

''کیا کہا تم نے۔'' عالمگیر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''جی حضور! ان گناہ گار کانوں نے بہت کچھ سنا ہے۔''

''شہزادے کی جانب سے کون ہے جو یہ جرأت کر رہا ہے۔''

''یہ فریضہ کوئی اور نہیں شہزادے کی محل خاص نور النسا بیگم انجام دے رہی ہیں۔ وہ بھیس بدل کر قلعے کے اندر جاتی ہیں اور صلح کی کوششوں میں لگی ہوئی ہیں۔ مجھے تو یہ کہتے

ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے عصمت و حیا کو بھی بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ یہاں تک کہ عہد و پیمان ہوئے ہیں کہ اگر بادشاہ ابوالحسن سے صلح کی تجویز قبول نہ کرے گا تو شہزادہ ابوالحسن کا ساتھ دے گا۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ اگر یہ باتیں غلط ثابت ہوئیں تو ہم تمہارے ساتھ کیا سلوک کر سکتے ہیں؟"

"یہ جان حضور کے قدموں پر قربان ہونے کے لیے بے تاب ہے۔"

اسی عرصے میں یہ خبریں آنے لگیں کہ شہزادے نے زنانہ سواریاں دولت خانے کے قریب بلالی ہیں تا کہ موقع ملتے ہی قلعے میں منتقل ہو جائے حالانکہ قصہ صرف اتنا تھا کہ زنانہ کیمپ دولت خانے سے کافی دور تھا اور اب یہ خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ زنانہ کیمپ پر حملہ نہ ہو جائے لہٰذا اسے دولت خانے کے قریب لایا جائے۔

ان سب باتوں نے بادشاہ کو مشتعل کر دیا۔ اس نے اسی وقت شہزادے کے غسل خانے کے داروغہ حیات خاں کو خلوت میں طلب کیا اور ابوالمکارم کو بھی طلب کر لیا کہ وہ شہزادے کا رازدار تھا۔

"تم لوگ شہزادے کے قریب رہتے ہوئے اس کے رازوں سے یا تو واقف نہیں یا شہزادے کی وفاداری میں بادشاہ کے حقِ نمک کو فراموش کر رہے ہو۔"

"عالم پناہ! آپ کن رازوں کی بات فرما رہے ہیں۔ ہم کیا چھپا رہے ہیں؟"

"کیا تم نہیں جانتے کہ شہزادہ ابوالحسن سے مل چکا ہے اور اب تو وہ قلعے میں منتقل ہونے کی بابت سوچ رہا ہے۔ اس نے اپنا زنان خانہ اپنے قریب بلا لیا ہے۔"

"جہاں تک زنان خانے کو دولت خانے کے قریب بلانے کا سوال ہے تو ایسا صرف حملے سے بچاؤ کے لیے کیا گیا ہے۔ رہی بات نامہ و پیام کی تو اس سے شہزادے کی غرض صرف یہی ہے کہ اس کی سفارش پر یا تو ابوالحسن کے قصور بادشاہ معاف فرما دیں یا ان کی کوششوں سے بزورِ شمشیر قلعہ فتح ہو جائے۔"

"ہم تک تو یہ باتیں دوسری طرح پہنچ رہی ہیں۔"

"یہ صرف افواہیں ہیں جو شہزادہ معظم کے حاسد آپ کے گوش گزار کر رہے ہیں۔"

ان دونوں نے بہت کوشش کی کہ شہزادے کی صفائی میں جو کچھ کہہ سکتے ہیں کہیں لیکن بادشاہ کے دل میں جو کھٹک پیدا ہو گئی تھی وہ نہیں نکلی۔ بادشاہ نے ابوالمکارم کو جانے دیا لیکن حیات خاں کو روک لیا۔

"حیات خاں! ہم نے تمہیں اس لیے روکا ہے کہ تم ایک فوج لے کر جاؤ اور شہزادے کو ہمارے حضور پیش کر دو۔"

"حضور! اس کے لیے فوج کی کیا ضرورت ہے۔ اگر بادشاہ حکم دیں تو بارگاہ والا سے ایک چیلا جا کر شہزادے کو اپنے ساتھ لے آئے گا کیونکہ بہ جز اطاعت شہزادے کے دل میں کوئی دوسرا ارادہ نہیں۔"

بادشاہ کو شہزادے کی وفاداری پر پھر بھی یقین نہ آیا۔ اس نے ایک چیلے کو حکم دیا کہ شہزادہ معظم کو اس کے منجھلے بیٹے محمد عظیم کے ہمراہ خدمتِ شاہی میں حاضر کر دے۔

شہزادے کے دل میں کوئی کھوٹ اور فتور نہیں تھا لہٰذا حکم ملتے ہی خدمتِ شاہ میں حاضر ہو گیا لیکن بیٹھتے ہی اسے احساس ہوا کہ وہ غلط آ گیا۔ کیونکہ بادشاہ نے اسے دیکھتے ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ وہ لمحہ بھر بھی نہیں بیٹھا تھا کہ ایک امیر اسد خاں شہزادے کے قریب آیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"شہزادہ مکرم! بادشاہ کے حکم سے چند باتیں آپ سے خلوت میں کہنی کی ہیں۔"

شہزادہ اور اس کا بیٹا محمد عظیم خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیے۔ اسد خاں انہیں اس مقام پر لے گیا جو پہلے ہی مقرر ہو چکا تھا۔

"بادشاہ نے حکم دیا ہے کہ آپ چند دن دنیا کے کاروبار سے الگ ہو کر عبادت الٰہی میں مشغول ہو جائیں۔ فقیروں کو ہتھیار زیب نہیں دیتے لہٰذا ہتھیار اتار دیں۔"

"کیا مجھے نظر بند کیا جا رہا ہے؟"

"آپ یہاں سے باہر نہیں جا سکتے۔"

شہزادے کے لیے حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ابھی اسد خاں شہزادے کو نظر بند کرنے کے بعد پلٹا بھی نہیں تھا کہ بادشاہ کے حکم کے مطابق یاقوت خواجہ سرا شہزادے کی بیوی نورالنسا بیگم کے پاس پہنچ گیا۔

"مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کے تن پر جو کپڑے ہیں، ان کے سوا آپ کے پاس کچھ نہ رہنے دوں۔" یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے وہ زیور اتارنے شروع کر دیے جو وہ پہنے ہوئی تھی اور اس قدر درشتی کا مظاہرہ کیا اور ایسی نامناسب باتیں سنائیں کہ نورالنسا بیگم کو غصہ آ گیا۔

"بادشاہ میرے باپ کی جگہ ہے۔ جو بھی عزت و دولت ہمارے پاس ہے، وہ اسی کی عطا کردہ ہے۔ اب

اگر وہ لینا چاہتا ہے تو اسے اس کا اختیار ہے مگر تجھے میرے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے اور سختی برتنے کا کوئی حق نہیں۔''

جب وقت بگڑتا ہے تو چیونٹی کے بھی پر نکل آتے ہیں۔ یاقوت خواجہ سرا تھا۔ کل تک بیگم کی خدمت کرتا پھرتا تھا۔ اس وقت یہ باتیں بھی اسے اپنی توہین معلوم ہوئیں۔ اس نے نہ معلوم کس انداز میں یہ باتیں بادشاہ تک پہنچائیں کہ بادشاہ کا غیظ وغضب اور بڑھ گیا۔

''نور النسا بیگم کو قیام گاہ سے منتقل کردیا جائے اور ایسے خیمے میں جس میں قیدیوں کے رکھنے کے قابل فرش ہو، پوری ذلت کے ساتھ بند کردیا جائے۔ اس کی غذا اور دوسری ضروریات کا انتظام بھی معمولی طریقے سے کیا جائے۔''

☆☆☆

گولکنڈہ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تین ماہ ہوگئے تھے۔ اب لشکریوں کا ضبط ختم ہونے لگا تھا۔ ہر حال میں چاہتے تھے کہ یا تو قلعہ فتح ہو یا محاصرہ ختم کرکے واپس چلا جائے۔ لشکر میں غلہ اور چارے کی کمی ہونے لگی تھی اور رسد پہنچنے کی کوئی امید نہیں تھی کیونکہ سنبھا کی جمعیت نے لشکر کے اطراف ناکابندی کررکھی تھی۔ حال یہ ہوگیا تھا کہ بہت سے لشکری بھوک کی تاب نہ لاکر ابوالحسن کے پاس چلے گئے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سپہ سالار غازی الدین خاں نے اپنے مورچوں سے شب خون مارنے کا منصوبہ بنایا۔ تہیہ یہی کیا تھا کہ یا تو قلعہ فتح ہوجائے گا یا میں اپنی جان دے دوں گا۔

جب تین گھڑی رات گزر گئی اور یہ اطلاع مل گئی کہ قلعے کے محافظ گہری نیند سو رہے ہیں تو کمندوں اور زینوں کے ذریعے چڑھائی کردی اور دو جانباز قلعے کے کنگرہ کے قریب پہنچ گئے۔ منصوبہ یہی تھا کہ یہ دونوں اندر جاکر دروازہ کھول دیں گے۔ ان دونوں کے پیچھے اور لوگ بھی اوپر چڑھنے لگے۔ اب یہ قسمت کی خرابی کہ جس وقت اگلے دو آدمی فصیل پر چڑھنے لگے تھے، اسی وقت ایک کتا فصیل پر چڑھ کر نیچے کودنے کی فکر میں تھا۔ اس نے دو آدمیوں کو دیکھا تو بھونک بھونک کر قلعہ سر پر اٹھالیا۔ کتے کے بھونکنے سے قلعے کے محافظ جاگ گئے اور جو لوگ اوپر پہنچ گئے تھے، انہیں تہ تیغ کردیا۔ کچھ لوگ نیچے گر کر ہلاک ہوئے۔

ایک شخص حاجی محراب نے صرف اتنا دیکھا تھا کہ دو جانباز اوپر پہنچ گئے ہیں۔ اس نے یہی سمجھا کہ قلعہ فتح ہوگیا۔

پیاری باتیں

بچوں کی یہ عادتیں بہت پسند ہیں۔

☆ وہ رو رو کر مانگتے ہیں اور اپنی بات منوا لیتے ہیں۔

☆ وہ مٹی سے کھیلتے ہیں یعنی غرور کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔

☆ آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اور پھر صلح کرلیتے ہیں یعنی دل میں حسد نہیں رکھتے۔

☆ مٹی کے گھروندے بناتے ہیں اور پھر گرا دیتے ہیں کہ یہ دنیا بقا نہیں بلکہ مقامِ فنا ہے۔

☆ جو مل جائے وہ کھاتے ہیں اور کھلاتے ہیں جمع اور ذخیرہ کی حرص نہیں رکھتے۔

تو آئیں ہم سب بھی مل کر بچوں کی طرح رو رو کر اللہ تعالیٰ سے اپنی بات منوائیں، اپنے غرور کو خاک میں ملا دیں۔ لڑنے جھگڑنے سے پرہیز کریں اور آپس میں مل کر ہنسی خوشی زندگی گزاریں۔

مرسلہ۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی لاہور

وہ بادشاہ تک یہ خوش خبری پہنچانے کے لیے دیوانہ وار دوڑ پڑا تاکہ کوئی دوسرا بازی نہ لے جائے۔

وہ ان حالات سے بے خبر رہا جو اس کے چلے جانے کے بعد پیش آئے تھے۔

طلوعِ صبح کا وقت تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر ابھی جائے نماز پر تھے اور اوراد و وظائف پڑھنے میں مشغول تھے۔ وہ حضور شاہی میں پہنچا اور عالمِ سرشاری میں دور ہی سے مبارک باد و تہنیت کے آوازے لگانے شروع کردیے۔

بادشاہ نے بھی کسی تحقیق کے بغیر خوش ہوکر نوبت بجانے کا اشارہ کردیا۔ جو لوگ حضور شاہی میں حاضر تھے، تسلیمات بجالائے اور مبارک بادیاں پیش کرنے لگے لیکن کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔ خبر پہنچ گئی کہ فتح نہیں بلکہ شاہی فوج کو سخت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔

قلعہ گولکنڈہ کی فتح کا خیال پھر خواب بن گیا۔ محاصرہ بدستور قائم تھا۔

ایک مہینا بہ مشکل گزرا ہوگا کہ بارش نے زور باندھا۔ دو تین دن تک اس شدت کی بارش ہوئی کہ بادشاہی

لشکر گاہ میں جل تھل ہو گیا۔ خیمے تیرنے لگے۔ مورچا بندی تہس نہس ہو گئی۔ کیچڑ ایسی تھی کہ چلنا پھرنا دشوار ہو گیا۔

قلعہ والوں نے اچھا موقع دیکھا، باہر نکلے اور لشکر پر حملہ کر دیا۔ ایسی قیامت مچی کہ کچھ دیر کے مقابلے کے بعد جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ کوئی غار میں گرا کوئی کیچڑ میں۔

بادشاہ کو خبر ملی تو اس نے فیل خانہ کے داروغہ حیات خاں کو حکم دیا کہ وہ زین پوش ہاتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ جائے جہاں معرکہ کارزار گرم ہے اور ان کی مدد کرے۔

حیات خاں وہاں پہنچ تو گیا لیکن بارش اور سیلاب کی شدت کی وجہ سے کوئی کمک نہ پہنچا سکا۔ آخر مجبور ہو کر نصف شب کو اپنے خیمے پر لوٹ آیا۔

اس حملے کے بعد شاہی فوج کے کئی افسر اور سپاہی گرفتار کر لیے گئے۔ ان اسیروں کو جب ابوالحسن کے سامنے پیش کیا گیا تو خلافِ معمول اس نے ان کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔

ان اسیروں میں سربراہ خاں عرف جلال چیلہ بھی تھا جو بادشاہ کا قدیم الخدمت محرم بارگاہ ملازم تھا۔ ابوالحسن نے اسے خلوت میں بلایا اور قلعے کے گودام میں لے گیا جہاں اناج اور بارود کے بے حساب ذخائر تھے۔

”جلال خاں! یہ ذخائر دیکھ رہے ہو؟ اگر تمہارا بادشاہ کئی سال تک بھی محاصرہ جاری رکھے تو قلعے والوں کے لیے غذا کی کمی نہ ہو گی۔“

”شاہی لشکر کو بھی رسد برابر پہنچ رہی ہے۔“

”یہ ذخائر میں نے اس لیے تمہیں دکھائے ہیں کہ اب جو کچھ میں تم سے کہنے والا ہوں، اسے میری کمزوری نہ سمجھا جائے بلکہ میں صلح کا ہاتھ اس لیے بڑھا رہا ہوں تا کہ دونوں طرف کے مسلمانوں کا ناحق خون نہ بہے۔“

جب وہ ان اسیروں کو رہا کرنے لگا تو اس نے جلال چیلہ کو ایک مرتبہ پھر اپنے پاس بلایا۔

”جلال خاں! تم نے دیکھ لیا کہ میں کسی طرح بھی کمزور نہیں۔ اس کے باوجود میں ایک معافی نامہ تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ اسے اپنے بادشاہ کے حضور پیش کر دینا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ زبانی کہنا چاہو تو کہہ دینا۔“

قلعے سے واپس آنے کے بعد جلال خاں نے یہ عرضداشت بادشاہ کے حضور پیش کر دی۔

”میں خود کو بارگاہِ والا کا عاجز اور جاں نثار بندہ سمجھتا ہوں۔ میں اپنے قصوروں کی سزا بھگت چکا، اب میں معافی اور فضل و کرم کا درخواست گزار ہوں۔ دوسری بات یہ کہ اس صورت میں کہ قلعہ حضور کے کارگزاروں کے قبضے میں آجائے، اس تباہ و برباد ملک کا انتظام آپ کسی نہ کسی شخص کے سپرد کریں گے۔ میں امیدوار ہوں کہ آپ یہ ذمے داری میرے ہی سپرد فرمائیں۔ اگر بندے کی درخواست قبول نہ کی جائے اور آپ کو زیادہ وقت منظور ہو تو پھر میں لشکر بادشاہی کی سہولت کے لیے پانچ چھ سو ہزار من غلہ جسے سرکار کے چیلے جلال خاں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، حضورِ والا کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔“

جلال خاں چیلہ نے کچھ باتیں زبانی بھی عرض کیں۔

بادشاہ نے جواب میں فرمایا۔

”اگر ابوالحسن ہمارے حکم اور فرمان کا بندہ ہے تو دست بستہ حاضر ہو جائے یا اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے پھر جو کچھ ہماری مروت کا تقاضا ہو گا، عمل میں آئے گا۔“

اس جواب کے بعد محاصرے کو مزید سخت کرنے کا حکم بھی دے دیا گیا۔ یہ حکم بھی دیا کہ بارودی سرنگیں بچھا دی جائیں اور دھماکے کر کے قلعے پر یورش کی جائے۔

ان دھماکوں کی نوعیت کچھ ایسی ہوئی کہ بارود نے جو آگ اگلی، وہ باہر کی طرف آئی۔ بادشاہی فوج کے جو بہادر قلعے کی دیوار کے نیچے جمع تھے، پلک جھپکتے ہی کوئلہ بن گئے۔

اس دھماکے نے محصورین کو سنہری موقع عطا کر دیا۔ انہوں نے جان لیوا ہتھیار سنبھالے۔ قلعہ پر سے آسمانی بلا کی طرح اتر آئے اور بادشاہی فوج کے باقی ماندہ حملہ آوروں اور توپ خانے کے عملے پر حملہ کر دیا اور مورچوں پر قابض ہو گئے۔

بادشاہ کو جب محاذِ جنگ کے حالات معلوم ہوئے تو اس نے دشمن پر سخت حملہ کرنے کے احکام صادر کیے اور پھر خود سواری طلب کر لی اور افواج خاصہ کے جلو میں محاذ پر پہنچ گیا۔ بادشاہ کی موجودگی سے سپاہیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔

کئی دن لڑائی ہوتی رہی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکل سکا۔

☆☆☆

محاصرہ بہت طویل ہو گیا تھا اس لیے اراکینِ سلطنت نے مشورہ دیا کہ ابوالحسن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ قلعے کا محاصرہ اسی طرح جاری رکھ کر بقیہ مفتوحہ علاقہ اور شہر حیدر آباد کا بندوبست اور نظم و نسق سنبھال لیا جائے۔ ابوالحسن آخر کب تک قلعہ بند رہے گا۔

بادشاہ نے اس رائے کو پسند کیا اور حیدرآباد کے تمام مقبوضہ علاقوں پر حکام کا اور عدالت کے عہدے داروں کا تقرر کر دیا۔

ابوالحسن کے بڑے بڑے سرداروں نے جب دیکھا کہ حیدرآباد کا نظم و نسق عالمگیر نے سنبھال لیا ہے تو یہ آخری امید بھی جاتی رہی کہ قلعہ حوالے کرنے کے بعد یہ ذمے داری ابوالحسن سنبھالے گا تو انہیں اپنی فکر ہوئی۔ وہ سب بادشاہی لشکر سے مل گئے اور ایک سازش کے مطابق بادشاہی لشکر کو موقع مل گیا کہ وہ زینے لگا کر فصیل پر چڑھ جائیں۔

شہزادہ محمد اعظم ہاتھی پر سوار ہوا اور دروازے پر پہنچ گیا۔

شاہی لشکر کے بہادر سپاہی فصیل کے ذریعے قلعے میں داخل ہو گئے۔ جس وقت محافظوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا ابوالحسن کا سپہ سالار عبدالرزاق لاری جاگ گیا۔ اسے ہتھیار باندھنے کا موقع بھی نہ مل سکا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ میں تلوار سنبھالی اور مقابلے پر آ گیا لیکن اس وقت تک دروازہ کھل چکا تھا اور شاہی فوج جوق در جوق قلعے میں داخل ہو رہی تھی۔

عبدالرزاق لاری نے اکیلے ہی شاہی فوج کا راستہ روک دیا۔ لیکن ہزاروں تلواروں کے سامنے وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ زخموں سے چور ہو کر سر سے پاؤں تک خون میں نہا گیا۔

جب سارا قلعہ شور و غوغا سے گونجنے لگا تو ابوالحسن نہایت اطمینان سے اپنی مسند پر بیٹھا اور آنے والے مسلح مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی فوجیں قلعے کے اندر لڑ رہی تھیں اور وہ سکون کے ساتھ اپنی مسند پر بیٹھا تھا۔ بالآخر وہ وقت آ گیا جب اسے گرفتار ہونا تھا۔ اس نے سواری کا گھوڑا طلب کیا اور بادشاہی امراء کے ساتھ سوار ہو گیا۔

شہزادہ محمد اعظم کے لیے قلعے کے دروازے پر خیمہ نصب کر دیا گیا تھا۔ ابوالحسن کو اسی خیمے میں لے جایا گیا۔ اس وقت بھی وہ بڑے اطمینان سے آگے بڑھا اور اپنے گلے سے مروارید کا ہار نکال کر شہزادے کی خدمت میں نذر پیش کی۔ شہزادہ بھی اس کے ساتھ شفقت سے پیش آیا اور اسے عالمگیر کے پاس بھجوا دیا۔ عالمگیر نے بھی اس کے شایانِ شان سلوک کیا اور اسے دولت آباد کے قلعے میں بھجوا دیا البتہ یہ احکام دیے کہ اسے تمام آسائش کا سامان مہیا کیا جائے۔

وہ خود بیجاپور کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے چل دیا اور اپنے ایک امیر مقرب خاں کو چند افسروں کے ساتھ سنبھا کی سرزنش کے لیے متعین کیا۔

مقرب خاں نے قلعہ پرنالہ کی تسخیر کے لیے فوج کشی کی اور سنبھا کے ٹھکانے کا پتا لگانے کے لیے ہوشیار جاسوسوں کو مقرر کر دیا۔

ان دنوں وہ اپنے اصل مقام راہیری سے نکل کر ”قلعہ کہلنیہ“ میں جا کر ٹھہرا ہوا تھا۔

مقرب خاں کے بھیجے ہوئے جاسوس جب یہ جان چکے کہ سنبھا اس قلعے میں موجود ہے تو وہ بھی بھیس بدل کر قریب کی پہاڑیوں میں چھپ گئے اور اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے لگے۔

ایک روز ان جاسوسوں نے دیکھا کہ سنبھا دو تین ہزار مرہٹہ سرداروں اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ قلعے سے نکلا ہے۔

یہ جاسوس بھی چھپتے چھپاتے اس قافلے کے ساتھ ہو گئے۔

سمندر سے ایک منزل پر پرگنہ سگمیز واقع تھا۔ اسی پرگنہ کی سرحد سے دریائے گنگا بہتا تھا۔ دریا کے قریب ایک دشوار گزار پہاڑ کے درّے میں سنبھا نے ایک شان دار عمارت تعمیر کروائی تھی جو نقش و نگار سے آراستہ تھی اور اطراف میں سبزہ زار اور میوہ دار درختوں کے باغ تھے۔

سنبھا اور اس کے ساتھی گنگا اشنان کے بعد اسی درّے والے محل میں ٹھہر گئے۔

مقرب خاں کے جاسوسوں کے لیے اتنی واقفیت بہت تھی۔ انہوں نے یہ اطلاع مقرب خاں کو پہنچا دی۔ مقرب خاں تو تیار ہی بیٹھا تھا۔ وہ اس وقت سنبھا کی قیام گاہ سے پینتالیس میل دور تھا۔ راستہ بھی دشوار تھا لیکن اس نے پروا نہ کی۔ دو ہزار شہ سواروں اور ایک ہزار تیر انداز پیدل فوج کو لے کر نکل کھڑا ہوا اور اس مقام کے قریب پہنچ گیا جہاں سنبھا ٹھہرا ہوا تھا۔

سنبھا کے آدمیوں نے اونچی پہاڑیوں سے دیکھ لیا کہ کوئی لشکر اس طرف آ رہا ہے۔ سنبھا اس وقت نشے میں بدمست خوبصورت عورتوں کی صحبت میں تھا کہ اس کے ہرکاروں نے فوج کے آنے کی اطلاع دی۔ سنبھا کو یہ گھمنڈ تھا کہ اس دشوار گزار مقام تک کوئی فوج آ ہی نہیں سکتی۔ اس نے نہ سواری کی فکر کی نہ مورچا بندی کا بندوبست کرایا یہاں تک کہ مقرب خاں دو تین سو سواروں کے ہمراہ اس کے سر پر آ پہنچا اور تلواریں سونت لیں۔ اب سنبھا کے پاس اتنا

وقت نہیں تھا کہ ہتھیار باندھتا۔ اس کی فوج پہلے ہی بھاگ چکی تھی۔ اس نے گھوڑے پر سوار ہونے کی کوشش کی لیکن اس قدر نشے میں تھا کہ سوار نہ ہو سکا۔ وہ پیدل بھاگا اور بت خانے کی عمارت میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے اپنی ڈاڑھی مونڈ دی اور چہرے پر بھبوت مل کر بیراگی بن گیا۔ جب شاہی فوج بت خانے میں داخل ہوئی تو یہی سمجھی کہ یہ شخص بت خانے کا خدمت گار ہے لیکن اس کے کپڑوں میں سے مروارید کا ہار لوگوں کو نظر آ گیا اور اسے پہچان لیا گیا۔ اس کے ساتھ جتنے اس کے عزیز و اقارب، عورتیں اور بچے تھے پکڑ لیے گئے۔ ان سب کو بالوں سے کھینچتے ہوئے مقرب خاں کی سواری کے پاس لایا گیا۔ اس وقت مقرب خاں ہاتھی پر سوار تھا۔

مقرب خاں نے سنبھا کو اپنے ہاتھی پر بٹھا لیا اور اس کے ساتھیوں کو طوق و زنجیریں جکڑ کر بعض کو ہاتھیوں پر اور بعض کو گھوڑوں پر سوار کرایا اور لشکرِ فتح کے نقارے بجاتے ہوئے وہاں سے لوٹا۔

ابھی مقرب خاں کی عرضداشت بادشاہ تک پہنچی نہیں تھی کہ جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے یہ خبر شاہی لشکر گاہ تک پہنچ گئی۔

مقرب خاں نے وہ کارنامہ انجام دے دیا تھا جو بڑے بڑے امیروں اور شہزادوں سے نہ ہو سکا تھا۔ جب خبر پہنچی کہ مقرب خاں اسیروں کو لے کر قریب پہنچ چکا ہے تو بادشاہ نے نائب کوتوال کو اس کے استقبال کے لیے روانہ کیا۔

جب ان اسیروں کو لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا تو بادشاہ نے ان کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا۔ دربار میں امراء و حکام جمع تھے۔

سنبھا جیسے موذی دشمن کو زنجیروں میں جکڑے ہوئے دیکھ کر عالمگیر نے تخت سے اتر کر دو رکعت نفل شکرانہ ادا کیے۔

اس کے بعد بادشاہ نے اسے قید خانے میں ڈالنے کا حکم دیا۔ ابھی یہ فیصلہ باقی تھا کہ سنبھا کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔

دربار کے بعض خیر خواہوں نے بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ سنبھا کو جان کی امان دے دی جائے اور اس کے مقرر کردہ قلعوں کی کنجیاں طلب کر لی جائیں اور ہر جگہ قلعہ داروں کو مقرر کر کے ان قیدیوں کو کسی قلعے میں قید کر دیا جائے۔

یہ خبریں سنبھا تک بھی پہنچ رہی تھیں کہ اس کی جان بخشی کے مشورے ہو رہے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو خوش ہوتا لیکن وہ سنبھا تھا۔ پوری زندگی عیش و عشرت میں بسر کی تھی۔ جرائم اتنے تھے کہ جانتا تھا کہ پوری زندگی قید میں گزارنی پڑے گی۔ وہ روز مرے گا اور روز جیے گا۔ اس سے تو اچھا ہے ایک ہی مرتبہ زندگی کی قید سے رہائی مل جائے۔ سوال یہ تھا کہ بادشاہ کو کیسے آمادہ کیا جائے کہ وہ اسے پھانسی پر لٹکا دے۔ اب یہ ایک ہی صورت میں ممکن تھا کہ بادشاہ کو طیش دلایا جائے۔ سوال یہ بھی تھا کہ کس طرح ... ممکن ہو۔ اس کی ترکیب اس نے یہ نکالی کہ محافظوں کے سامنے اس نے بادشاہ کو گالیاں دینی شروع کر دیں۔ جب کوئی کھانا دینے یا کسی اور کام سے اندر آتا تو وہ بے ہودہ گوئی شروع کر دیتا اس کی شکایتیں برابر دربار میں پہنچ رہی تھیں۔ بالآخر بادشاہ کا غیظ و غضب بھڑک اٹھا۔ اس نے مشیروں کے مشوروں کو بالائے طاق رکھا اور حکم جاری کیا کہ پہلے اس کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے تاکہ بے ہودہ گوئی کا سلسلہ ختم ہو۔ بعد میں اس کی آنکھیں نکلوا دی جائیں اور پھر ہر طرح کا عذاب دے کر اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کی کھوپڑی میں گھاس بھر کر دکن کے تمام شہروں اور مشہور بستیوں میں ساز و نقارے کے ساتھ تشہیر کرائی جائے۔

عالمگیر کے حکم پر من و عن عمل کیا گیا۔

اس کے سات سالہ بیٹے ساہو کی جاں بخشی کر دی۔ اس کے لیے حکم ہوا کہ اسے بادشاہی احاطے میں نظر بند رکھیں اور اس کی تربیت کے لیے سمجھدار اتالیق بھی مقرر کر دیے اور سات ہزاری کا منصب مرحمت فرمایا۔

سیواجی سے شروع ہونے والا یہ سفر سنبھا پر ختم ہوا۔

مرہٹہ گردی مغلوں کے لیے اب بھی آزار بنی رہی لیکن مرہٹوں کا دورِ عروج سنبھا کی موت کے بعد رخصت ہو گیا۔

ماخذات

مغلیہ دورِ حکومت، خافی خاں، تاریخِ فرشتہ، محمد قاسم فرشتہ، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، ہاشمی فرید آبادی، تاریخِ اسلام، اکبر شاہ خاں، منتخب التواریخ، عبدالقادر بدایونی (ترجمہ)



دخل در معقولات

تنویر ریاض

اکثر و بیشتر دیکھنے میں آیا ہے کہ زیادہ کریدنے سے زخم ہرے ہوجاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اس کے ساتھ بھی درپیش تھا جو ماضی کی دبی چنگاری کو ہوا دے کر بڑی ہوشیاری سے اپنے حریف کے گرد جال بُن رہا تھا مگر اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب اس کا اپنا پیر بھی اسی جال میں الجھ گیا اور یوں معاملہ اس پر الٹ گیا جیسے اصل مجرم وہ خود ہی ہو کیونکہ ... دخل در معقولات سے کچھ ایسے ہی حالات کا سامنا کرنا پڑجاتا ہے۔

ماضی کی کیچڑ میں پتھر پھینکنے والے ایک دوست کی چالاکی کا نتیجہ

میں نے سن رکھا تھا کہ حسد بعض اوقات خطرناک ہوسکتا ہے اور اس کا نتیجہ تباہی یا نقصان کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی بات نہیں کہ میں نے اس پر یقین نہیں کیا لیکن مجھے کبھی اس کے انتہائی مضر اثرات محسوس نہیں ہوئے۔ پہلی بار میں نے اس جذبے کو اپنے اوپر غالب آتے اس وقت دیکھا جب مجھے شک گزرا کہ میرے میڈیکل اسکول کا ساتھی اور پرانا دوست ایک قتل کا ذمے دار ہے جو اس سے کافی سال پہلے سرزد ہوا تھا۔ اصولاً مجھے اس معاملے میں

دخل نہیں دینا چاہیے تھا لیکن حسد کے جذبے سے مغلوب ہوکر میں نے اس کی ٹوہ لی اور ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ اس ثبوت کی مجھے اتنی بھاری قیمت ادا کرنا ہوگی۔ اگر میں اپنے کام سے کام رکھتا تو یہ نوبت نہ آتی۔

2008ء کے موسم خزاں میں مجھے ایک ڈنر میں شرکت کرنے کا دعوت نامہ ملا جس میں کئی دوسرے ڈاکٹرز اور ان کی بیگمات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر دل کی بیماریوں کے حوالے سے ایک کنونشن میں شرکت کی غرض سے جمع ہوئے جو پورے ہفتے جاری رہا۔ اس میں مرکزی مقرر میرے اسکول کا ساتھی ڈاکٹر رچرڈ شیرمن تھا۔ اس کا شمار امراضِ قلب کے ماہر سرجنوں میں ہوتا تھا۔ اس کنونشن میں اس نے اپنی ٹیم کے ساتھ مل کر نصف درجن ایسے طریقے روشناس کرائے جن سے کئی زندگیاں بچائی جاسکتی تھیں۔ میں صرف ان کی بنیادی باتیں ہی سمجھ سکا کیونکہ میں ڈاکٹر نکولس فنچ، مشی گن کے ایک چھوٹے سے قصبے ایلسی میں ایک معمولی ڈاکٹر تھا۔

میں جانتا تھا کہ اس کنونشن میں ہونے والی گفتگو میرے سر سے گزر جائے گی لیکن میں اور میری بیوی سارہ کافی عرصے سے کہیں نہیں گئے تھے اور اس طرح مجھے شیرمن سے ملنے کا بھی موقع مل جاتا۔ گو کہ وہ اب بڑا آدمی بن چکا تھا۔ لہٰذا میں نے یہ دعوت نامہ قبول کرلیا اور ہم دو گھنٹے کی مسافت طے کرکے کنونشن میں شرکت کرنے چلے آئے۔

شیرمن اور میں نے بوسٹن کے میڈیکل اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی اور ہمارا شمار کلاس کے ذہین طالب علموں میں ہوتا تھا۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ہم دونوں کا مستقبل بہت شاندار ہے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ صرف شیرمن کو ہی یہ موقع مل سکا کہ وہ سرجری کی تعلیم حاصل کرسکے جبکہ مجھے پڑھائی مکمل کرتے ہی کام شروع کرنا پڑا۔ وہ سرجن بننے کیلی فورنیا چلا گیا اور اس نے اپنی ٹیم بنائی جبکہ میں مشی گن واپس آکر نزلہ، زکام اور بخار کا علاج کرنے لگا۔

اس رات ڈنر کے موقع پر تمام ڈاکٹرز اور ان کی بیویاں ایک مخروطی میز کے گرد بیٹھے ہوئے تھے اور شیرمن ان سب کی توجہ کا مرکز تھا۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح جاذبِ نظر اور پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ میں بھی سینتیس سال کی عمر میں خاصا خوش شکل تھا لیکن میرے دائیں جانب بیٹھی ہوئی سارہ سب پر حاوی تھی۔ گو کہ وہاں دوسرے ڈاکٹرز کی خوب صورت بیویاں بھی تھیں لیکن میری بیوی ان سب میں ممتاز و منفرد تھی۔

سب لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اپنے زمانۂ طالبِ علمی کے قصے سنا رہے تھے۔ جب میری باری آئی تو میں نے بڑی ہوشیاری سے اس کا رخ شیرمن کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔

”یہ واقعہ میرے اور شیرمن کے ساتھ پیش آیا جب ہم میڈیکل اسکول میں پڑھتے تھے۔ مجھے کہانی سنانی نہیں آتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اسے رچرڈ بہتر طریقے سے بیان کرسکے گا۔ شیرمن! تم انہیں ڈاکٹر کوئسٹ کے بارے میں بتاؤ۔“

وہ تھوڑا سا حیران ہوا۔ پھر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ 1992ء کی بات ہے۔ ہم ٹم وک کی سائیکل ریس میں حصہ لے رہے تھے، جو فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے منعقد کی گئی تھی۔ یہ ریس بوسٹن سے شروع ہوئی اور اسے سان فرانسسکو پر ختم ہونا تھا۔ اس میں حصہ لینے والوں کی تعداد سو کے قریب تھی جس میں فنچ اور میری ہونے والی بیوی الزبتھ بھی شامل تھی۔ اس وقت تک ہم دونوں نے ڈیٹنگ شروع نہیں کی تھی۔

”وک میڈیکل کے تیسرے سال میں تھا اور اس نے علاقے کے تمام میڈیکل طالب علموں کو اس ریس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی چند برس قبل خون کے کینسر میں مبتلا ہونے کے سبب وفات پاچکا تھا اور وہ ایسے ہی مریضوں کی مدد کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے اس ریس کا انعقاد کیا کرتا تھا۔ ان میں زیادہ تعداد لڑکوں کی تھی جبکہ کچھ لڑکیاں بھی ریس میں حصہ لے رہی تھیں۔ ان میں سرخ بالوں اور ڈاڑھی والا یہ شخص بھی شامل تھا اور اس کی شکل کارٹون فلم جونی کوئسٹ کے ڈاکٹر کوئسٹ سے ملتی تھی۔ اس لیے سب نے اسے ڈاکٹر کوئسٹ کہنا شروع کردیا لیکن اسے یہ اچھا نہیں لگا۔ سب نے اس کی ناراضی کو دیکھتے ہوئے اسے تنہا چھوڑ دیا۔

”وہ ہماری نویں یا دسویں رات تھی جب ہم نے ایریزونا میں ہائی وے بتیس پر کیمپ لگایا۔ یہ طویل سڑک صحرا کے درمیان سے گزرتی تھی۔ تقریباً نصف شب کے قریب ڈاکٹر کوئسٹ اپنے خیمے سے شور مچاتا ہوا باہر آیا۔ مجھے اس کا اصل نام یاد نہیں آرہا۔“

”ایڈم کین۔“ میں نے کہا۔

”ہاں وہی۔ وہ اپنے بازو پھیلائے جارہا تھا کہ کسی

نے اس کا ایمی گرانٹ کا کیسٹ کاٹ ڈالا ہے۔ وہ مسلسل شور مچاتا رہا۔ تب کسی نے کہا...... بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ کوئی تمہارے ساتھ ایسا کیوں کرے گا۔ دوسرے لوگوں نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی تو وہ سب کو گالیاں دینے لگا پھر اس نے اپنا سامان باندھا اور سائیکل پر مغرب کی جانب روانہ ہوگیا۔

''اگلی صبح اس کی غیر حاضری کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔ ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ بس کے ذریعے گھر چلا گیا ہوگا لیکن جب ہم سان فرانسسکو میں وک کی بہن کے گھر پہنچے تو وہاں پولیس والے پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے ہم سب سے پوچھا کہ اس رات کیا ہوا تھا جب کین وہاں سے روانہ ہوا۔ تقریباً سب نے ایک ہی بات بتائی اور انہوں نے ہمیں جانے دیا۔

''بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہاں سے روانہ ہونے کے بعد کین ایک اجاڑ گیس اسٹیشن پر رکا اور اپنی ماں اور بہن کو فون کیا کہ وہ اسے کچھ پیسے بھیجیں تاکہ وہ گھر واپس آسکے لیکن وہ رقم اس نے کبھی وصول نہیں کی۔ اسے پھر کبھی کسی نے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ سنا گیا۔ سو دوستو! یہ ہے ڈاکٹر کوئسٹ کی گمشدگی کی کہانی۔''

میں نے میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں کے تاثرات دیکھے۔ ان میں سے کچھ کا منہ کھلا ہوا تھا۔ تبھی شیرمن کی خوب صورت بیوی الزبتھ بولی۔ ''اس کے اوپر ٹیلی ویژن سیریز...... ''غیر حل شدہ مسٹریز'' کی ایک قسط بھی تیار کی گئی اور انہوں نے کچھ سائیکل سواروں کے انٹرویوز بھی کیے لیکن وہ اسے تلاش نہ کرسکے اور یہ فرض کرلیا گیا کہ وہ جنگل میں بھٹک گیا ہوگا۔''

کھانا لگ چکا تھا اور ہم آپس میں خوش گپیاں کررہے تھے۔ شیرمن باتھ روم گیا تو اس کی بیوی الزبتھ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''مجھے اب بھی اس احمق کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے۔ جس سے ہماری آنکھ کھل جاتی ہے اور ہم خوف زدہ ہوجاتے ہیں۔''

''ہم سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''ہاں۔ میں اور لنڈا جوائس۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا تو وہ بولی۔ ''کیوں، اس میں حیران ہونے والی کیا بات ہے؟''

''میرا خیال تھا کہ تم اور شیرمن اس رات اکٹھے تھے۔''

اب حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ وہ بولی۔

''کیا تم مجھ سے مذاق کررہے ہو؟ اس واقعے کے ایک سال بعد میں نے اس کے ساتھ باہر جانا شروع کیا، تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟''

گوکہ میں اس خیال کی وجۂ نزول اچھی طرح جانتا تھا تاہم میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس بحث میں نہیں الجھنا چاہیے۔ اس لیے میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ تاہم کھانے کے دوران مسلسل یہ کیڑا مجھے تنگ کرتا رہا۔

اس رات میں اور شیرمن دیر تک باتیں کرتے رہے۔ گوکہ اس نے ظاہر نہیں کیا لیکن میں محسوس کرسکتا تھا کہ اسے میرے اور میرے نام نہاد کیریئر کے بارے میں کتنی تشویش ہے۔ بس یہ کہنے کی دیر تھی کہ تم اپنے آپ کو ضائع کررہے ہو۔ گوکہ اس نے یہ بات نہیں کہی لیکن اس کے انداز سے یہی ظاہر ہورہا تھا۔

''کیا تم اب بھی دوربین کا استعمال کرتے ہو؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کس جانب ہے۔ میں نے فخریہ انداز میں کہا۔ ''میں نے آج صبح ہی درمیانے سائز کا ایک شکر خورا دیکھا ہے۔ کیا تمہیں کبھی پرندے دیکھنے کا اتفاق ہوا؟''

''پرندے اور میں؟ شاید وہ دن بیت گئے۔ میں ان دنوں اپنی ٹیم کے ساتھ اتنا مصروف ہوں کہ میرے پاس سونے کے لیے بھی وقت نہیں ہے۔ کوئی مشغلہ کیسے اختیار کرسکتا ہوں۔''

اس کے جواب سے یہ تاثر ملتا تھا کہ میرے پاس فالتو کاموں کے لیے کافی وقت ہے کیونکہ میں اس کی طرح لوگوں کی بھلائی کے لیے کچھ نہیں کررہا۔ جب ہم گھر واپس آرہے تھے تو راستے میں سارہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا کوئی پریشانی ہے؟''

''نہیں، کچھ نہیں۔'' میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''کچھ تو ہے۔ تمہارا چہرہ بتارہا ہے۔''

''ایک بات مجھے پریشان کررہی ہے۔ الزبتھ کا کہنا ہے کہ وہ اس رات اپنی دوست لنڈا کے ساتھ اس کے خیمے میں تھی جب ایڈم کین غائب ہوا۔''

''ہاں۔ میں سمجھ سکتی ہوں۔''

''اس رات شیرمن ہمارے خیمے میں نہیں آیا اور اس کی واپسی صبح پانچ بجے ہوئی۔ اس وقت میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ رات بھر کہاں رہا۔ اس نے ٹالنا چاہا لیکن میں اس کے پیچھے پڑگیا۔ بالآخر اس نے اعتراف کرلیا کہ وہ الزبتھ کے ساتھ

اس کے خیمے میں تھا۔ وہ اس کے پیچھے کافی دنوں سے لگا ہوا تھا اور میں نے یہی سمجھا کہ وہ اسے رام کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے لیکن آج الزبتھ نے جو کچھ بتایا، وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔''

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟'' وہ بولی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ شیرمن نے جھوٹ کیوں بولا؟''

''تم بلاوجہ پریشان ہو رہے ہو۔ یہ پندرہ سال پرانی بات ہے۔ اسے یاد نہیں رہا یا تم سے سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے الجھن ہو رہی ہے۔ لگتا ہے کہ دماغ میں کوئی کیڑا گھس گیا ہے۔''

''تم خبطی ہو لیکن میں پھر بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ میری طرف جھکی اور میری گردن پر بوسہ دیا۔ میں نے بھی تمام خیالات کو جھٹک کر ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کر دی۔

کچھ عرصے سے جمعہ میرے لیے ہفتے کا مصروف ترین دن ثابت ہو رہا تھا۔ میری سیکریٹری مارگریٹ کی عموماً یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ویک اینڈ سے پہلے زیادہ سے زیادہ مریضوں کو بک کرے اور جمعے کے دن شام چھ بجے تک بھی میں مریضوں میں گھرا رہتا ہوں لیکن یہ جمعہ قدرے مختلف تھا۔ اس روز میں نے اپنے آپ کو ایک ایسی سوچ میں گھرا ہوا محسوس کیا جس کا میرے معمول سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ وہی خیال تھا جو مجھے گزشتہ شب ڈیٹرائٹ میں پریشان کرتا رہا تھا اور اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو بھی میرے ذہن میں یہی بات تھی۔ میں یہی سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ رچرڈ شیرمن نے اپنے ٹھکانے کے بارے میں جھوٹ کیوں بولا تھا جس رات ایڈم کین لاپتا ہوا تھا۔

سارہ، ایلسی ہائی اسکول میں پڑھاتی تھی۔ جب اس نے وقفے کے دوران مجھے فون کیا تو میں اس وقت شیرمن کے مسئلے میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ اسے پوری توجہ نہ دے سکا چنانچہ اس نے بھی دو منٹ بعد فون رکھ دیا۔ آدھا دن گزر چکا تھا اور اس بارے میں میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی پھر میرے دماغ میں بُرے بُرے خیالات سر اٹھانے لگے۔ میں نے انہیں جھٹکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور چھ بجے ستائیسویں مریض کو دیکھنے کے بعد میرے دماغ میں یہ خیال جڑ پکڑ چکا تھا کہ کئی سال پہلے میرے دوست رچرڈ شیرمن نے ہی ایریزونا میں ایڈم کین کو قتل کیا تھا۔

اگلے چند روز تک میں یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ اس رات شیرمن نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور بات بھی پریشان کر رہی تھی۔ اس نے ایڈم کین کی گمشدگی کے بارے میں جو کہانی سنائی، وہ نامکمل تھی۔ گو کہ میں نے اس وقت انگلی نہیں اٹھائی لیکن میں جانتا تھا کہ شیرمن نے اس رات لوگوں کو جو کہانی سنائی، وہ اس سے زیادہ جانتا تھا۔ ایک ایسی خاص بات جو صرف اسے ہی معلوم تھی۔

چند راتیں گزرنے کے بعد جب سارہ اپنے بستر پر سونے چلی گئی تو میں نے کالج کے زمانے کی پرانی تصویریں نکالیں اور کوئی ایسی تصویر تلاش کرنے لگا جو ٹم وک کی سائیکل ریس کے موقع پر لی گئی ہو۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ تصویریں مجھے مل گئیں۔ ان کی تعداد تیرہ تھی۔ میں نے ہر تصویر کو بڑے غور سے دیکھا۔ پہلے تو مجھے ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی لیکن پھر میری توجہ تین تصویروں پر مبذول ہو گئی اور میں کافی دیر تک انہیں دیکھتا رہا اور پھر مجھے وہ چیز مل ہی گئی جس سے میرے شبہے کو تقویت مل سکتی تھی۔ میں نے وہ تصویریں پکڑیں اور دوڑتا ہوا سارہ کے بیڈ تک گیا۔

''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔'' میں نے پُرجوش آواز میں کہا۔

''اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟'' وہ تعجب سے بولی۔

''تم ان تصویروں کو غور سے دیکھو۔'' میں نے وہ فوٹو اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''پہلی تصویر میں تم، مجھے اور شیرمن کو کیمرے کا سامنا کرتے ہوئے دیکھ سکتی ہو جب ہم سائیکل کا سفر شروع کرنے والے تھے۔ ہم اپنی سائیکلوں کے پاس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ اب دوسری تصویر کو دیکھو۔ یہ تقریباً آدھا راستہ طے ہونے پر لی گئی تھی۔ ایک بار پھر سائیکلوں کو غور سے دیکھو۔ اب آخری تصویر پر نظر ڈالو۔ یہ سان فرانسسکو پہنچنے کے چند لمحات بعد لی گئی تھی۔ ایک دفعہ پھر سائیکلوں کو دیکھو، کیا تمہیں ان تینوں تصویروں میں کوئی فرق نظر آیا؟''

اس نے تصویروں کا غور سے معائنہ کیا اور بولی۔

''مجھے افسوس ہے کہ مجھے ایسی کوئی .... خاص بات نظر نہیں آ رہی۔''

مجھے اس پر کوئی حیرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ بہت چھوٹی اور غیر نمایاں چیز تھی۔ میں نے کہا۔ ''تم شیرمن کے کیریئر پر

سامان دیکھو۔ ایک سلیپنگ بیگ، خیمہ، ایک اور بیگ۔ ان سب کے اوپر فوجی طرز کا فولڈنگ بیلچہ، اب دوسری تصویر دیکھو۔ اس میں بھی یہ سب چیزیں موجود ہیں لیکن تیسری تصویر میں بیلچہ نہیں ہے۔''

''ہاں۔ اب میں نے اس پر غور کیا لیکن اس سے تم کیا ثابت کرنا چاہ رہے ہو؟''

''اس نے اپنا بیلچہ کھو دیا۔ کیسے...... وہ کہاں گیا؟''

''نک! تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''میں یہ کہہ رہا ہوں سارہ کہ اس سے پتا چلتا ہے کہ اس رات ایریزونا میں کیا واقعہ پیش آیا۔''

''وہ کیا؟''

''یہی کہ رچرڈ نے ایڈم کین کو ممکنہ طور پر اسی بیلچے کے ذریعے قتل کیا ہے۔''

''تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔'' اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''یہی بات بتانے کے لیے تم نے میرے مطالعے میں خلل اندازی کی۔ تمہارے دماغ میں یہ باتیں کب سے گردش کر رہی ہیں؟''

میں نے مزید بات کرنے میں شرمندگی محسوس کی لیکن اتنا کچھ کہہ چکا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اپنے سارے پتّے شو کر دیے جائیں۔

''ڈنر پارٹی کے بعد سے ہی یہ بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اسی نے یہ قتل کیا ہے۔ اس نے مجھ سے جھوٹ بولا کہ وہ اس رات کہاں تھا اور اب اس کے بیلچے کی گمشدگی بھی سامنے آ گئی ہے۔ اسی نے یہ قتل کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ ہے جو میں ابھی تک نہیں جان سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ میں اس بارے میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔''

اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں کوئی مفرور ذہنی مریض ہوں پھر اس نے خاموشی سے کتاب بند کی اور اسے سرہانے کی میز پر رکھ دیا۔ اس نے اپنا چشمہ اتارا اور میرا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔

''نکولس! میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ بات تمہارے دماغ میں کیسے آئی۔ تم ہمیشہ سے ہی رچرڈ سے حسد کرتے ہو اس لیے کہ اس کے پاس وہ سب کچھ ہے جو تمہارے پاس نہیں۔ میں جانتی ہوں کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔ تمہارے ڈیڈی کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کے بعد تمہیں ہی فارم اور ماں کی دیکھ بھال کرنا پڑی۔ تم سرجری کی تعلیم حاصل نہ کر سکے اور محض ایک عام ڈاکٹر بن کر رہ گئے لیکن یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ تم ایک اچھے ڈاکٹر ہو اور تم نے کئی لوگوں کی بہت مدد کی ہے۔ اس لیے تمہیں بھی اپنا سر اونچا رکھنا چاہیے اور اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو پھر بھی رچرڈ شیر من سے حسد مت کرو کیونکہ وہ تم سے آگے نکل گیا ہے۔ لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ تم اپنی فکر کرو اور اس حماقت سے باز آ جاؤ۔''

اس نے میرے ماتھے پر بوسہ دیا۔ کروٹ لے کر لیمپ بجھایا اور کمرا تاریکی میں ڈوب گیا۔ اس کے بعد ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم تقریباً اسے بھول چکے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو کام میں الجھانے کی کوشش کی اور مارگریٹ سے کہہ دیا کہ وہ ایسا نظام ترتیب دے کہ میں ایک دن میں زیادہ سے زیادہ مریض دیکھ سکوں اور ہفتے میں ایک دن لانسنگ میں فری کلینک کے لیے دستیاب ہو سکوں۔ یہ ایک نئی دنیا تھی اور میں نے اسے بہت زیادہ چیلنجنگ پایا۔ یہ کلینک اسپارٹن برڈ امپوریم سے صرف ایک بلاک کے فاصلے پر تھا۔ یہ سرکلر کے زیرِ انتظام چلنے والا ادارہ تھا جہاں ہر قسم کے پرندے موجود تھے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا، میں وہاں ضرور پہنچ کرتا۔

اس کے علاوہ میں نے گھر کی تزئین و آرائش بھی شروع کر دی تھی اور پہلے سے کہیں زیادہ مصروف ہو گیا تھا لیکن اس تمام مصروفیت کے باوجود اپنے دماغ سے ایریزونا کو نہیں نکال سکا اور میں یہی سوچتا رہا کہ کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو رہی جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ ثابت کر دے کہ میں پاگل نہیں ہوں۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ شاید میں بھی وہ بات نہ جان سکوں۔

وہ 2009ء کے موسم گرما کی ایک رات تھی۔ میں کرسی پر بیٹھا ٹی وی کے چینل بدل بدل کر دیکھ رہا تھا کہ غیر حل شدہ مسٹریز کے نشر مکرر نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لی۔ میں وہ دیکھنے لگا اور مجھے وہ قسط یاد آ گئی جو ایڈم کین کے بارے میں بنائی گئی تھی۔ مجھے یاد تھا کہ میں نے کئی برس پہلے یہ قسط ریکارڈ کر لی تھی۔ اب میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کہاں رکھی ہے۔ دس منٹ بعد میں ان بکسوں کی تلاشی لے رہا تھا جو تہ خانے میں رکھے ہوئے تھے۔ پانچ بکسوں میں ڈھونڈنے کے بعد وہ ٹیپ مجھے مل گئی اور میں نے اسے اپنے پرانے وی سی آر پر لگا دیا۔ میں اسے غور سے دیکھ رہا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ میں جو چیز تلاش کر رہا ہوں شاید وہ نظر آ جائے لیکن

کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ اس کے باوجود میں نے اسے دوبارہ اور سہ بارہ دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ بالآخر پانچویں بار دیکھنے پر مجھے وہ بات معلوم ہوگئی۔ شو میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ ایڈم کین کی بہن فون کال ریسیو کررہی ہے۔ کہا جاتا تھا کہ ایک ویران گیس اسٹیشن سے دو فون کیے گئے اور اس کی ماں ویسٹرن یونین کے ذریعے پیسے بھیجنے پر رضامند ہوگئی تھی لیکن اس میں بہن کو فون کرنے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا جبکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شیرمن نے اس کی بہن اور ماں دونوں کو فون کرنے کے بارے میں بتایا تھا۔ کیا یہی کانٹا مجھے عرصے سے چبھ رہا تھا؟ اگر یہی وہ بات ہے تو اس کی کیا اہمیت تھی؟

میں نے وہ پوری رات کمپیوٹر پر بیٹھ کر گزاری اور اس کہانی کے ہر پہلو کا جائزہ لیتا رہا لیکن اس میں کہیں بھی بہن کو فون کرنے کا تذکرہ نہیں تھا۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شیرمن غلطی پر تھا یا اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ کین نے اپنی بہن کو فون کیا تھا۔ کیا یہ سچ تھا اور کیا میں اسے ثابت کرسکوں گا؟

مجھے اپنا منصوبہ ترتیب دینے میں ایک گھنٹا لگ گیا جس کے ذریعے مجھے اپنے غیر حل شدہ معمے کا جواب مل سکتا تھا۔ میں نے ایریزونا اسٹیٹ پولیس کو ایک خط لکھا جس کا متن کچھ یوں تھا۔ ''شاید میں بتاسکوں کہ پندرہ برس قبل ہائی وے 32 سے ایڈم کین کی گمشدگی میں کس کا ہاتھ تھا۔ اگر آپ ایک اطلاع کی تصدیق کرسکیں تو میں اس شخص کا نام بتادوں گا۔ براہِ کرم ڈیٹرائٹ فری پریس کے ہفتے والے ایڈیشن میں لائم گرین فریزر برائے فروخت کے عنوان سے اشتہار دیں اور بتائیں کہ جس رات ایڈم کین لاپتا ہوا تو اس نے اپنی بہن کو فون کیا تھا یا نہیں اور یہ بھی بتائیں کہ کیا کبھی یہ معلومات عام کی گئیں؟''

مجھے بہت کم توقع تھی کہ پولیس والے اس خط کو کوئی اہمیت دیں گے لیکن میں نے ایک موہوم امید کے سہارے ہفتے کا اخبار کھولا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس عنوان سے اشتہار موجود تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا۔

''ہاں۔ اس نے بہن کو فون کیا تھا لیکن سراغ رسانوں کے علاوہ صرف دو لوگوں کو یہ بات معلوم تھی۔ براہِ کرم ہم سے فوراً رابطہ کریں۔''

یہی وہ ثبوت تھا جس سے میرے شبہات کی تصدیق ہوگئی۔ اسی نے ایڈم کین کو قتل کیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ میں اس کو کس طرح ہینڈل کرتا ہوں۔ میں چاہ رہا تھا کہ اس معاملے میں براہِ راست ملوث نہ ہوا جائے بلکہ اپنی تحقیقات کے نتائج پولیس کے حوالے کرکے اس سے الگ ہوجاؤں لیکن یہ کس طرح ممکن تھا۔ بہرحال شیرمن کو اتنا اندازہ تو ضرور ہوجائے گا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنی قابلیت اور حیثیت کے بل بوتے پر لوگوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہوجائے گا کہ وہ بے قصور ہے اور الٹا لوگ مجھے ہی برا بھلا کہیں گے کہ میں نے اتنے بڑے آدمی پر الزام لگایا اور میرے لیے ایک نئی پریشانی کھڑی ہوجائے گی۔

ان تمام امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک ہی راستہ رہ جاتا تھا کہ میں حکام کے سامنے ایڈم کین کی موت کا ثبوت پیش کروں جو کہ ناممکنات میں سے تھا۔ میں اس کی لاش کہاں تلاش کرسکتا تھا لیکن کچھ دنوں بعد میں نے سوچنا شروع کردیا کہ یہ اتنا ناممکن بھی نہیں جیسا کہ میں سمجھ رہا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شیرمن نے ضرور اس کی لاش کہیں دفن کی ہوگی۔ اسی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ٹم وک کو فون کیا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے کئی سال پہلے سائیکل سواری کا انتظام کیا تھا۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

''میرے اور شیرمن کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ سن بانوے میں ہونے والی سائیکل سواری میں ہم دونوں میں سے کس نے زیادہ رقم اکٹھی کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے مجھے شکست دی تھی جبکہ میرا خیال ہے کہ میں جیت گیا تھا۔ تمہارے پاس سارا ریکارڈ تو ہوگا۔''

مجھے یاد تھا کہ وہ سواری شروع کرنے اور ختم ہونے پر ہمارے اوڈومیٹر چیک کیا کرتا تھا جن سے پتا چل جاتا تھا کہ ہم نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ اگر میرا خیال درست تھا کہ شیرمن نے ہی کین کو مارا تھا تو اس کے اوڈومیٹر سے پتا چل جاتا کہ اس نے اس رات کین کو قتل کرنے کے لیے کتنے میل مزید سائیکل چلائی۔

''مجھے دیکھنا پڑے گا نک۔ میرا خیال ہے کہ وہ ریکارڈ جس بکس میں تھا وہ چند برس قبل میرے گیراج میں جل گیا تھا پھر بھی میں چیک کرلوں گا۔''

اس گفتگو کو مزید ایک سال گزر گیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ اسے کچھ نہیں ملا ہوگا لیکن اچانک ہی ایک روز اس کی جانب سے مجھے ایک بڑا لفافہ ملا۔ میں نے اسے کھولا تو اس میں تین کاغذ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ہاتھ سے لکھا ہوا خط تھا۔

''میں نے یہ گزشتہ ہفتے اپنے بھائی کے کباڑ خانے سے تلاش کیے ہیں اور تمہیں ان کی کاپیاں بھیج رہا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم شرط ہار جاؤ گے۔ بہر حال، یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔ تمہارا دوست ٹم۔''

وہ ہماری مسافت کا ریکارڈ تھا اور اس کی رو سے رچرڈ شیر من فاتح تھا۔ اس نے میرے مقابلے میں دگنی رقم اکٹھی کی۔ میری سمجھ میں اس کی اضافت کا معما نہیں آیا۔ پورے ٹرپ کے دوران ہم دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور کبھی بھی علیحدہ روٹ اختیار نہیں کیا۔ صرف ایک امکان تھا کہ وہ کسی ایسی جگہ گیا ہو جس کا مجھے علم نہیں تھا اور اگر میرا حساب کتاب درست تھا تو وہ جگہ کیمپ سے سات اعشاریہ تین میل کی مسافت پر تھی۔ اس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس نے ایڈم کین کو قتل کیا اور کیمپ سے سات اعشاریہ تین میل کے فاصلے پر مغرب میں ہائی وے بتیس پر دفن کر دیا۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ میرے دل میں ایڈم کین کے قاتل کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کی خواہش جڑ پکڑتی گئی۔ چار ماہ بعد مارگریٹ نے اپنے کمپیوٹر پر مجھے نوبل انعام کے لیے نامزد ہونے والوں پر ایک مضمون دکھایا۔ اس میں میرا پرانا میڈیکل اسکول روم میٹ بھی نوبل پرائز کے لیے نامزد ہوا تھا۔ اسے پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

چند روز بعد میں نے سارہ کو بتایا کہ ڈینور میں ایک سیمینار ہو رہا ہے اور میں اگلے ہفتے اس میں شرکت کرنا چاہتا ہوں۔ وہ اپنی مصروفیت کی وجہ سے میرے ساتھ نہیں جا سکتی تھی لہٰذا اس نے معذرت کر لی۔ میں نے اپنا سامان باندھا، اسے خدا حافظ کہا اور ڈینور جانے کے بجائے فونیکس کے لیے روانہ ہو گیا۔

وہاں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں ہائی وے بتیس کے کنارے کھڑا ہوا اس جگہ کو دیکھ رہا تھا جہاں ہم نے اس رات کیمپ لگایا تھا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں لوگ اب بھی وقتاً فوقتاً قیام کرتے رہتے ہیں۔ دو ایکڑ کے رقبے پر جگہ جگہ کیمپ فائر کے نشانات نظر آ رہے تھے۔ میں چلتا ہوا اس مقام پر پہنچ گیا جہاں ہم نے اپنے خیمے لگائے تھے۔ میں وہاں بیٹھ کر مغرب کی جانب دیکھنے لگا۔ سات اعشاریہ تین میل کے فاصلے پر وہ جگہ تھی جہاں میں ایڈم کین کی باقیات کے ملنے کی توقع کر رہا تھا۔

میں واپس اپنی گاڑی پر آیا جو میں نے کرائے پر لی

شگوفے

ایک مکھی گنجے کے سر پر جا بیٹھی۔ دوسری مکھی بولی۔ ''واہ! کیا گھر ڈھونڈا ہے۔''

پہلی بولی۔ ''چل ہٹ پاگل...... گھر کہاں، ابھی تو صرف پلاٹ خریدا ہے۔''

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

☆☆☆

ایک لڑکا اپنے دوست سے بولا۔ ''یار! ورزش کی وجہ سے میری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں۔''

دوست۔ ''تم ورزش چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔''

لڑکا۔ ''ورزش میں نہیں سامنے گرلز ہاسٹل میں لڑکیاں کرتی ہیں۔''

☆☆☆

گاما: بابا جی ایسی بیوی کو کیا کہتے ہیں جو گوری ہو، لمبی ہو، خوبصورت ہو، شوہر کو سمجھے اور کبھی جھگڑا نہ کرے۔

بابا جی: وہم کہتے ہیں بیٹا وہم!

☆☆☆

ڈاکٹر: یہ کوئی پرانی بیماری ہے جو اندر ہی اندر آپ کی صحت اور ذہنی سکون کو تباہ کر رہی ہے۔

مریض: آہستہ بولیں...... باہر ہی بیٹھی ہے!

☆☆☆

ایک شخص نے لوگوں سے کہا۔ ''اس پنکھے کے نیچے آ کر بیٹھو، اس کی ہوا لینا ثواب کا کام ہے۔''

ایک صاحب بولے۔ ''وہ کیسے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''یہ مسجد سے اتار کر لایا ہوں۔''

☆☆☆

ایک شخص کو پھانسی کی سزا ہوئی۔

جج نے پوچھا۔ ''کوئی آخری خواہش؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میری جگہ تم لٹک جاؤ۔''

(مرسلہ: محمد یونس چودھری۔ سلطان پورہ، لاہور)

☆☆☆

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ''تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟''

دوسرا دوست۔ ''بی اے۔''

پہلا دوست۔ ''کمال کرتے ہو یار...... صرف دو لفظ پڑھے اور وہ بھی الٹے......!''

(مرسلہ: بسنعیہ منظور۔ یوحنا آباد، لاہور)

تھی اور اس کی میٹر ریڈنگ نوٹ کر کے مغرب کی جانب سفر شروع کر دیا۔ چھ میل کے فاصلے پر ایک ویران گیس اسٹیشن تھا۔ سات اعشاریہ تین میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اپنا ٹرک بڑے بڑے ٹیلوں کے درمیان اس طرح کھڑا کر دیا کہ سڑک سے نظر نہ آسکے۔ اس وقت صبح کے دس بج رہے تھے۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا اور دیکھا کہ چٹانوں کی ایک لمبی قطار صحرا سے شمال تک اس جگہ کو تقسیم کر رہی تھی۔ مزید یہ کہ وہاں پندرہ فٹ گہرائی میں ایسی جگہ ہے جہاں کسی بھی لاش کو بہ آسانی دفن کیا جاسکتا ہے۔

میں واپس اپنی گاڑی پر آیا۔ اس کی ڈکی کھولی اور اس میں سے میٹل ڈیٹیکٹر اور بیلچہ نکال لیا پھر میں ڈھلان سے اترتا ہوا چپٹی زمین پر پہنچا۔ بیلچہ زمین پر رکھا۔ ہیڈ فون کانوں سے لگائے اور اپنا کام شروع کر دیا۔ میں نے چٹانوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ شمال کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ تین بجے کے قریب سورج بادلوں میں چھپ گیا۔ میں چٹان کی دیوار پر بیٹھ کر اپنا پسینا خشک کرنے لگا اور پانی کی بوتل منہ سے لگالی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے شیر من کو ایڈم کین کی قبر کھودتے دیکھا پھر مجھے خیال آیا کہ اسے کیوں قتل کیا گیا؟ وہ ایسی کیا بات تھی جس کی وجہ سے شیر من جیسا بردبار شخص یہ حرکت کرنے پر مجبور ہو گیا؟ میرے ذہن میں بہت سی باتیں آئیں لیکن ان میں کوئی بھی قابلِ قبول نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے اسے دماغ سے نکال دیا اور دوبارہ کام میں مصروف ہو گیا۔

سوا چھ بجے کے قریب میں کام ختم کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے کم از کم تین ایکڑ رقبہ چھان مارا لیکن کچھ نہیں ملا۔ میں نے اس جگہ نشانی کے لیے اپنی چھڑی گاڑ دی اور ٹرک کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ جیسے ہی میں چٹان کی دیوار تک پہنچا، مجھے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں۔ میرے عقب میں ایریزونا اسٹیٹ پولیس کی کار کھڑی تھی اور اس میں سے ایک شخص باہر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر میں بالکل نہیں گھبرایا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ ایک چھوٹی سی وضاحت اسے مطمئن کر دے گی۔

”تم کیا تلاش کر رہے ہو؟“ نوجوان افسر نے پوچھا۔

”ایک سال پہلے میرے باپ کی گھڑی کھو گئی تھی اور میں وہ تمام جگہیں دیکھ رہا ہوں جہاں کیمپ لگایا گیا تھا۔“

”کیا میں تمہارے شناختی کاغذات دیکھ سکتا ہوں؟ اس کے بعد تم اپنا کام شروع کر دینا۔“

”یقیناً۔“ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا لائسنس اور گاڑی کے کرائے کی رسید اسے دکھا دی۔ وہ دونوں چیزیں لے کر اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ میں خاموشی سے اس کے انتظار میں پانی کے گھونٹ حلق سے اتارتا رہا۔ چند منٹ بعد وہ واپس آیا اور کاغذات واپس کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے امید ہے کہ تمہیں اپنی گھڑی مل جائے گی لیکن محتاط رہنا۔ سورج ڈوبنے کے بعد یہ صحرا بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا سانس لیا اور سوچا کہ صرف ایک گھنٹا اور اپنی تلاش جاری رکھوں گا۔ میں واپس اس جگہ آیا جہاں میں نے چھڑی کی مدد سے نشانی لگائی تھی۔ دس منٹ بعد ڈیٹیکٹر سے آنے والی آواز نے بتا دیا کہ یہاں کوئی بڑی چیز دفن ہے۔ میں نے زور و شور سے کھدائی شروع کر دی۔ چار فٹ گہری کھدائی کرنے کے بعد میرا بیلچہ کسی دھات سے ٹکرایا۔ میں نے اس جگہ سے مٹی ہٹانا شروع کی تو وہاں سے ایک سائیکل کا ڈھانچا برآمد ہوا۔ میں نے جیب سے ٹارچ نکال کر اس پر روشنی ڈالی۔ اس کے فریم پر ابھی تک اورنج رنگ کے دھبے موجود تھے۔ ایڈم کی سائیکل بھی اسی رنگ کی تھی۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ اس فریم کے گرد سے مٹی ہٹاتا رہا۔ یہاں تک کہ میں پوری سائیکل کو باہر نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ جیسے ہی میں نے اسے اٹھایا تو میری نظر اس کے پچھلے پہیے پر گئی۔ اس کی تیلیوں پر ابھی تک کپڑے کی دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور اس کے نیچے ایک انسانی پاؤں کی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایڈم کین کا پاؤں ہے۔ اس طرح مجھے ایک ناقابلِ تردید ثبوت مل گیا تھا۔ میں قریبی چٹان پر بیٹھ کر اس شخص کی قبر کو دیکھنے لگا جسے مرے ہوئے کافی برس ہو چکے تھے۔

میں کافی دیر وہاں بیٹھا رہا پھر میں نے ایک ایسا فیصلہ کیا جس پر میں شاید ساری زندگی پچھتاتا رہوں گا۔ میں نے اپنا فون نکال کر شیر من کا نمبر ملایا اور رابطہ قائم ہونے پر کہا۔ ”میں نے تمہیں صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کیا دیکھ رہا ہوں۔“

”اچھا بتاؤ...... میں سن رہا ہوں۔“

میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس کیمپ...... سائٹ سے مغرب میں ٹھیک سات اعشاریہ تین میل کے فاصلے پر ہوں جہاں ہم نے اس رات قیام کیا تھا جب ایڈم کین لاپتا ہوا تھا۔ میں ہائی وے بتیس سے تقریباً پینتیس گز کے فاصلے پر ایک گڑھے کے

کنارے پر بیٹھا ہوا ہوں جسے میں نے کھودا ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس میں کیا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم!"

"یہاں اس شخص کی باقیات ہیں جسے تم نے قتل کیا تھا۔" میں نے لمحہ بھر توقف کیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا۔ "یقیناً میں پولیس کو فون کروں گا لیکن اس سے پہلے میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

اس نے شکست خوردہ آواز میں جواب دیا۔ "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اور میں تمہیں یا کسی اور کو جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔"

"ذاتی معاملہ...... یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم نے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ اس کا کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔"

"تم کچھ بھی کہو لیکن تمہیں حقیقت کا علم نہیں ہے لہٰذا جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ مجھے یہ دھمکی مت دینا کہ تم پولیس کو فون کرنے والے ہو۔ میں صرف یہ سوچ سکتا ہوں کہ تم نے اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں کتنا وقت ضائع کیا۔"

"مجھے برا بھلا مت کہو۔ قتل تم نے کیا ہے، میں نے نہیں۔"

"ٹھیک ہے نک۔ پہلے تم مجھے بتاؤ کہ تم نے یہ سب کیوں کیا پھر میں تمہیں اس کی وجہ بتاؤں گا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"یہی جو تم کرتے پھر رہے ہو۔ اس سے تم کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئے۔ میں کیا چاہوں گا؟"

"تم مجھے قاتل ثابت کرنا چاہ رہے تھے۔ اسی لیے تم نے وہ جگہ کھودی اور مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا کہ تم بالآخر جیت گئے۔ ہاں، تم نے مجھ سے ہمیشہ حسد کیا۔ تم میری کامیابی سے جلتے تھے اور مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے اور اب تمہیں موقع مل گیا ہے کہ مجھے سزا دلوا سکو۔ یہی سچ ہے اور میرے خیال میں تمہیں اپنا علاج کروانے کی ضرورت ہے۔"

"یہ مت سمجھنا کہ دوسرے لوگوں کی طرح میں بھی تمہاری باتوں میں آجاؤں گا۔ تم اعتراف کیوں نہیں کر لیتے کہ تم نے ایک آدمی کا قتل کیا ہے۔"

"پہلے تم اعتراف کرو کہ جو کچھ میں نے کہا وہی سچ ہے۔"

اس سے کچھ اگلوانے کے لیے ضروری تھا کہ میں اس کی بات سے اتفاق کرلوں۔ گو کہ میں جانتا تھا کہ یہ پورا سچ نہیں ہے پھر بھی میں نے کہہ دیا۔ "ہاں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں بھی تمہاری طرح کامیاب ہونے کا خواہش مند تھا۔"

اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم واحد شخص ہو جسے میں یہ بات بتا رہا ہوں۔ یہ ہمارا خاندانی راز ہے اور کوئی بھی اس بارے میں نہیں جانتا۔ بوسٹن جانے سے پہلے ہم چھ سال تک واشنگٹن میں رہے۔ جب میں سولہ سال کا تھا تو میری چھوٹی بہن درخت سے گر کر بے ہوش ہوگئی۔ اس وقت وہاں پڑوس کے لڑکے کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ اسے گھسیٹتا ہوا ہمارے شیڈ کے پیچھے لے گیا اور اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ اس وقت وہ صرف تیرہ سال کی تھی۔ اس کی چیخیں سن کر میری ماں گھر سے باہر نکل آئی۔ اس نے فوراً ایمبولینس بلائی اور پولیس کو فون کر دیا۔ انہوں نے اس لڑکے سے برائے نام پوچھ گچھ کی لیکن اسے گرفتار نہیں کیا کیونکہ اس کا باپ کاؤنٹی کا سرکاری وکیل تھا اس لیے اس معاملے کو دبا دیا گیا۔

"میری بہن کا کئی سال تک علاج ہوتا رہا اور وہ اب بھی بحالی کے مرکز میں ہے۔ اس حادثے نے ہمارے گھر کو بری طرح متاثر کیا۔ جانتے ہو وہ لڑکا کون تھا......؟ ایڈم کین۔ اسی نے میری بہن کو ہوس کا نشانہ بنایا تھا۔ جب میں نے اسے کیمپ میں دیکھا تو فوراً پہچان لیا پھر میں نے اس کا پیچھا کیا اور جو کچھ ہوا، وہ تمہارے سامنے ہے۔"

اچانک ہی مجھے شیرمن اور اس کے خاندان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "مجھے بہت افسوس ہے رچرڈ۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم کس کرب سے گزر رہے ہو۔"

"مجھے امید ہے کہ وہ ... جہنم کی آگ میں جل رہا ہوگا۔" وہ روتے ہوئے بولا۔

"جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ اور میں بھی ماضی کو دفن کردوں گا۔"

"یہ میرے لیے بہت اچھا ہوگا۔ اب ہمارے درمیان کوئی عداوت نہیں رہی۔"

"میں تم سے کبھی حسد نہیں کروں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے بعد میں نے بیلچے سے اس گڑھے کو بھرا اور گھر روانہ ہوگیا۔

کافی عرصے بعد میری زندگی معمول پر آئی تھی۔ میں دلجمعی سے پریکٹس کر رہا تھا پھر تقریباً ایک سال بعد سارہ نے مجھے حاملہ ہونے کی خوش خبری سنائی۔ میری زندگی میں پیش آنے والے خوش گوار واقعات نے میری آنکھیں کھول دی

تھیں اور مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ ایڈم کین کے معاملے میں پڑ کر میں نے کتنا نقصان اٹھایا۔

پھر ایک دن مجھے ٹم وک نے فون کر کے ڈاکٹر رچرڈ شیر من کے متعلق خبر دی۔ اس کا جہاز ایک دن پہلے سان فرانسسکو کے ساحل کے نزدیک کریش ہو گیا تھا۔ اس کی آخری رسومات تین دن بعد بوسٹن میں ادا کی جانی تھیں۔ میں نے سارہ کو یہ بری خبر سنائی اور ہم وہاں جانے کا پروگرام بنانے لگے۔

رچرڈ کے بھائی ایلن نے اس موقع پر روایت کے مطابق اپنے مرحوم بھائی کی صفات بیان کیں۔ وہ خود بھی دماغی امراض کا ڈاکٹر تھا اور بوسٹن میں پریکٹس کر رہا تھا۔ اس نے اپنے خاندان کی مختصر تعریف بتائی اور کہا کہ رچرڈ اس خاندان کا واحد فرد تھا جو بوسٹن چھوڑ کر چلا گیا اور اسی لیے سب لوگ اسے مذاق میں کالی بھیڑ کہا کرتے تھے۔ اس کی یہ بات سن کر میں تھوڑا سا حیران ہوا اور میں نے سوچا کہ اس سے بعد میں گفتگو کروں گا۔

ڈنر کے موقع پر میں نے اس سے رسماً تعزیت کی اور پوچھا۔ ”کیا کبھی تمہارا خاندان واشنگٹن ڈی سی میں رہائش پذیر تھا؟“

”نہیں۔ ہم دو سو سال سے بوسٹن میں ہی رہ رہے ہیں۔“

”کیا تمہاری کوئی بہن بھی ہے؟“

”نہیں۔ ہم چھ بھائی ہیں لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہاری کوئی بہن کئی سالوں سے بحالی کے مرکز میں ہے۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ تمہیں کہاں سے یہ اطلاع ملی۔ شاید تم کسی اور فیملی کی بات کر رہے ہو۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“ میں نے خجالت آمیز لہجے میں کہا اور اپنی میز پر واپس آ گیا۔

اب میں شیر من اور اس کی فیملی کے بارے میں کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ میں نے اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس نے ایڈم کین کو کیوں قتل کیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے مجھے بے وقوف بنایا تھا اور ایک جھوٹی کہانی سنا کر میری ہمدردی حاصل کر لی تاکہ میں پولیس کو اطلاع نہ دے سکوں۔ اب یہ قتل ہمیشہ میرے لیے معما ہی رہے گا۔ میں اور سارہ اسی رات بوسٹن واپس آ گئے۔

2013ء کے موسم خزاں میں ہم تعطیلات گزار کر واپس آ رہے تھے کہ ریڈیو پر نشر ہونے والی ایک خبر نے مجھے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ اس کے مطابق فونیکس، ایریزونا ..... میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئی تھیں۔ یہ مظاہرین پرانی ہائی وے بتیس کی تعمیر نو پر احتجاج کر رہے تھے۔ اس کی تعمیر دو ماہ پہلے شروع ہوئی تھی اور اب تک ستر میل سڑک مکمل ہو چکی تھی جبکہ حکومت مزید ساٹھ میل کی تعمیر نو کرنا چاہ رہی تھی۔ اس طرح دو کی جگہ چار لین اور دونوں جانب پچاس گز کھلی جگہ ہوتی۔

میں نے فوراً ہی محسوس کر لیا کہ جس جگہ سڑک کی تعمیر ہو رہی ہے، وہیں ایڈم کین کی لاش بھی دفن ہے اور یہ بہت بری بات ہے۔ یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ میں نے راستے بھر یہی کوشش کی کہ سارہ یہ نہ جان پائے کہ اس خبر کو سننے کے بعد میں کتنا پریشان ہو گیا ہوں۔

تمام امکانات پر غور کرنے کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ شاید لاش دریافت نہ ہو سکے اور وہ اس جگہ سے ہٹ کر ہو۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ جس پولیس آفیسر نے مجھے وہاں دیکھا تھا ممکن ہے کہ اب وہ ریاست کی ملازمت میں نہ ہو یا وہ اس واقعے کو بھول گیا ہو لیکن ان تمام امکانات کے باوجود مجھے ایک خوف نے گھیر رکھا تھا۔ جب اس آفیسر کو معلوم ہوگا کہ وہاں سے ایک لاش برآمد ہوئی ہے تو اسے فوراً مجھ سے ہونے والی اتفاقی ملاقات یاد آ جائے گی اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ اس نے ڈاکٹر نکولس قنیچ کو ایک بیلچے سمیت اس جگہ دیکھا تھا جہاں سے لاش ملی ہے۔

ان حقائق کے ہوتے ہوئے میری گرفتاری کے امکانات بہت زیادہ تھے اور اگر میں پولیس والوں کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ میں نے ایڈم کین کو قتل نہیں کیا، تب بھی اعانتِ جرم کی بنا پر مجھے گرفتار کیا جا سکتا تھا کہ میں نے رچرڈ شیر من کے بارے میں اپنی تحقیقات سے پولیس کو آگاہ کیوں نہیں کیا۔ اب مجھے صرف یہ انتظار تھا کہ لاش کب برآمد ہوتی ہے۔

تین ماہ بعد میں اپنے برڈ امپوریم میں تین نئے پرندوں کو دیکھ رہا تھا کہ تین پولیس کی گاڑیاں وہاں آ کر رکیں اور ان میں سے چار پولیس آفیسر برآمد ہوئے۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کی جانب بڑھ گیا۔ میری بیوی نے سمجھایا تھا کہ مجھے ایڈم کین والے واقعے کو بھول کر اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔ کاش میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا ہوتا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اس وقت شاید میں چار یا پانچ برس کی تھی۔ جب پاپا نے مجھے ایک چھوٹا سا ویڈیو گیم لا کر دیا تھا۔ اس کی خوبی یہ تھی کہ اس میں بہت دلکش دھنیں بھری ہوئی تھیں اور جب کوئی گیم کھیلنے کے لیے بٹن دبایا جاتا تو خوبصورت موسیقی چاروں طرف بکھر جاتی۔ میں اس تحفے کو لے کر بہت خوش تھی۔

چھوٹے سے اس گھر میں خوشیوں کا راج تھا۔ میرے پاپا، میری امی اور سب سے بڑھ کر دادا ابو بہت کمال کے آدمی تھے۔

ان کو بچوں کی بہت سی کہانیاں یاد تھیں۔ میں ہر رات ان کے بستر میں گھس جاتی۔ ”دادو! پلیز کہانی سنائیں نا۔“

اس وقت کمرے میں امی داخل ہو جاتیں۔ ”ابو، یہ آپ کو تنگ تو نہیں کر رہی۔“

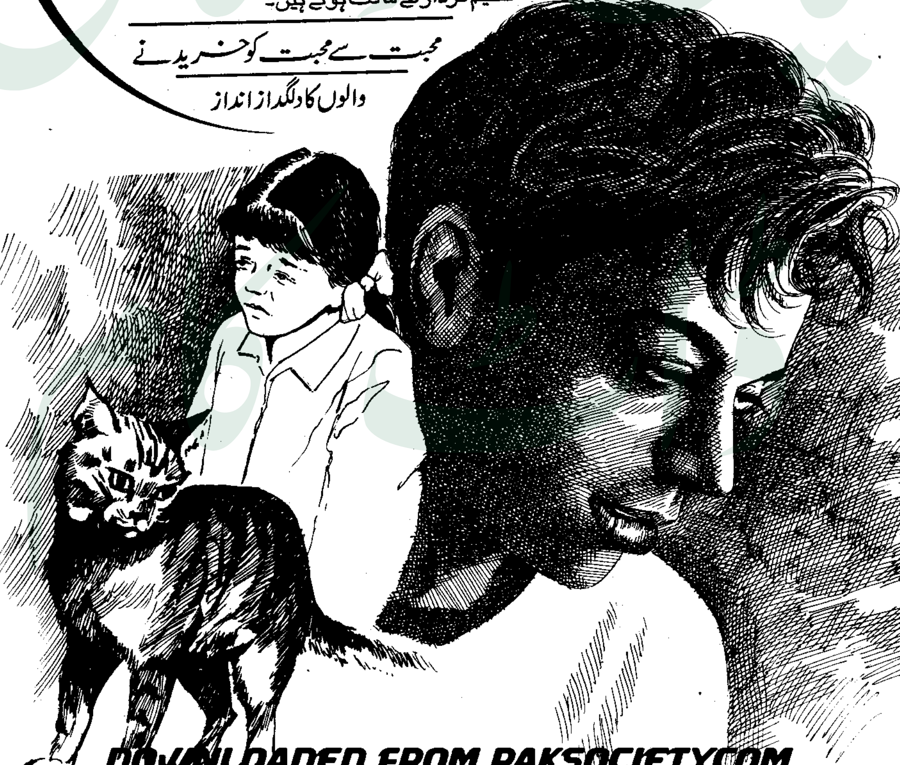
”ارے نہیں بیٹا۔ یہ کیا تنگ کرے گی۔ اس کے آنے

سہارا

منظر امام

تمام انسان اپنی زندگی اپنے لیے تو جیتے ہی ہیں مگر... کچھ لوگ اپنی زندگی کے کچھ دن دوسروں کے لیے بھی جی لیتے ہیں... یعنی دوسروں کے دکھ میں شامل ہونا اگرچہ کسی عبادت سے کم نہیں لیکن اپنی ذات کو کسی کے لیے تیاگ دینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی ... اور جو ایسا کرتے ہیں وہ یقینا بڑے عظیم کردار کے مالک ہوتے ہیں۔

محبت سے محبت کو خریدنے والوں کا دلگداز انداز



سے تو زندگی میں بہار آ گئی ہے۔ اچھا بیٹا...''

''میں سمجھ گئی۔'' امی ان کی بات کاٹ دیتیں۔ ''آپ چائے کی فرمائش کریں گے لیکن میں آپ کو چائے نہیں دوں گی۔ دودھ لا کر دے رہی ہوں۔ وہ پینا ہے۔''

دادا ابو بے بسی سے ہنس دیتے۔

امی اور ابو، دادا ابو سے بہت پیار کرتے تھے۔ دادا ابو بھی کم نہیں تھے۔ ان کو جس دن پنشن کے پیسے ملتے، اس دن ہم بچوں کے لیے ڈھیروں چیزیں لے کر آ جاتے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ میرا ویڈیو گیم خراب ہو گیا۔ اس میں گیم تو آتے تھے لیکن آواز نہیں آتی تھی۔ موسیقی کی خوبصورت تانیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس دفعہ بہت روئی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد پاپا نے دوسرا گیم لا کر دے دیا تھا لیکن اس پہلے والے کو یاد کرتی رہی تھی۔ اس کی موسیقی اس کی تانیں یاد آتی رہی تھیں مگر دوسرے والے سے میرا دل بہل گیا تھا۔ ایک دن ایک آنٹی ہمارے گھر آ گئیں۔

وہ پاپا کی کوئی بہن ہوتی تھیں۔ میں نے پہلی بار ان کو دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا کہ دادا ابو، پاپا اور امی ان سے چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ مجھے یہ سب بہت بُرا لگا تھا۔ میں ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں آ گئی۔

کچھ دیر بعد میں ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ اکیلی بیٹھی تھیں۔ اس وقت وہ ویڈیو گیم میرے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ میں ان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''یہ کیا ہے؟'' انہوں نے ویڈیو گیم کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ ویڈیو گیم ہے آنٹی۔'' میں نے بتایا۔ ''اس میں بہت اچھا میوزک بھی ہے۔ میں آپ کو سناتی ہوں۔''

میں نے گیم آن کر دیا۔ موسیقی گونجنے لگی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''آنٹی! میوزک کیسا لگا؟''

انہوں نے اشارے سے بتایا کہ میری بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے دوبارہ پوچھا۔ اس بار بھی ان کا یہی ردِعمل تھا۔ تیسری بار میں نے چیخ کر پوچھا۔

اس دوران امی ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ ''ارے بیٹا! کیوں شور کر رہی ہو، یہ سن نہیں سکتیں۔''

''سن نہیں سکتیں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔ ان کے دونوں کان خراب ہیں۔ اس لیے تو ہم ان سے چیخ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔''

پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ گھر والے ان کے سامنے کیوں شور کر رہے تھے۔ آنٹی اسی دن چلی گئی تھیں۔ ایک دن امی نے مجھ سے پوچھا۔ ''بیٹا! ایک بات بتاؤ۔ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کون سا ہوتا ہے؟''

مجھے وہ آنٹی یاد آ گئیں جو بے چاری آوازیں سننے سے محروم ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں نے فوراً جواب دے دیا۔

''امی، کان بہت اہم حصہ ہوتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا! دنیا میں لاکھوں ایسے لوگ ہیں جو بالکل بھی نہیں سن پاتے پھر بھی وہ زندہ ہیں اور ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔''

''تو پھر؟''

''بیٹا! تم ذہین ہو گئی ہو۔ اس سوال کا جواب تم خود ہی دو گی۔ آج نہیں کچھ دن بعد۔ ایک سال بعد۔ خوب سوچ کر جواب دینا۔''

پھر بہت دن گزر گئے۔ شاید کئی مہینے۔ ان کے اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔

ایک دن میں اسکول سے گھر واپس آ رہی تھی کہ میں نے ایک آدمی کو دیکھا جس کے ہاتھ میں سفید چھڑی تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر چلا جا رہا تھا۔ وہ چھڑی سے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی چھڑی فٹ پاتھ سے نہیں ٹکرائی جبکہ وہ بے چارہ خود ٹکرا گیا۔ اس کو شاید چوٹ بھی آئی تھی اور اس وقت مجھے پتا چلا کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کیا ہوتا ہے۔

میں نے گھر آ کر امی سے کہا۔ ''امی! مجھے آپ کے سوال کا جواب مل گیا ہے۔''

''کس سوال کا؟''

''وہی کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کیا ہوتا ہے۔''

''چلو بتاؤ۔''

''آنکھیں۔ جن کے بغیر دنیا اندھیری ہو جاتی ہے۔''

''ہاں بیٹا! آنکھیں بہت اہم حصہ ہیں۔'' امی نے کہا۔

''لیکن بیٹا! تمہارا جواب اب بھی نامکمل ہے اس دنیا میں لاکھوں افراد نابینا ہیں۔ ان کی آنکھیں نہیں ہیں لیکن وہ زندگی گزار رہے ہیں۔''

''اوہو، تو پھر کون سا حصہ ہے؟''

''اس کا جواب میں نہیں دوں گی۔'' امی نے کہا۔ ''اس کے لیے تمہیں خود اپنی ذہانت سے کام لینا ہوگا۔ اندر کے انسان کو بیدار کرنا ہوگا۔ تب سمجھ میں آئے گا۔''

پتا نہیں امی کیا کہہ رہی تھیں۔ میری سمجھ میں تو نہیں آ رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے ایسے لوگ دیکھے جن کی ٹانگیں نہیں

تھیں یا جن کے بازو نہیں تھے لیکن امی ہر بار میرے جواب کو غلط بتاتی چلی گئیں۔

پھر بہت دن گزر گئے۔ میں بڑی ہوگئی۔ میں نے کالج جانا شروع کر دیا اور ایک دن ہمارے گھر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ میں اسے قیامت ہی کہوں گی۔

دادا ابو کا انتقال ہوگیا تھا۔ وہ کچھ دنوں تک بیمار رہے تھے۔ اس کے بعد اللہ نے انہیں اپنے پاس بلالیا۔

دادا ابو کی موت ہم سب کے لیے ایسی تھی جیسے ہمیں توڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔ روتے روتے ہمارا برا حال ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے ابو کو پہلی بار روتے دیکھا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ یہی حال امی کا تھا اور خود میں رو رو کر بے حال ہوگئی تھی۔

میں بھی ابو سے لپٹ کر روتی اور کبھی امی سے۔

کئی دنوں تک ہمارے گھر میں اداسیاں رہی تھیں۔ ماتم کی سی فضا تھی پھر جب ہم ایک دن کچھ سنبھلے تو امی نے پوچھا۔

''بیٹا! تمہیں یاد ہے کہ میں تم سے ایک سوال کیا کرتی تھی کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کیا ہوتا ہے۔''

''جی امی! مجھے اچھی طرح یاد ہے اور میں آپ کو بتاتی رہتی تھی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن وہ سب غلط ہوتا تھا مگر اب وہ وقت آگیا ہے کہ تمہیں بتادوں کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کیا ہوتا ہے۔''

''جی امی بتائیں۔'' میں پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوگئی تھی، کیونکہ برسوں کے بعد وہ راز کھل رہا تھا۔

''بیٹا! وہ اہم حصہ تمہارا شانہ ہے... کاندھا'' امی نے بتایا۔ ''اس لیے کہ یہی وہ حصہ ہے جس پر کوئی دوسرا سر رکھ کر رو سکتا ہے۔ اپنا دکھ ہلکا کر سکتا ہے۔ تم نے دیکھا دادا ابو کی موت کے بعد ہم سب ایک دوسرے کے شانوں پر سر رکھ کر روتے رہے تھے۔ کتنا سکون ملا تھا ہمیں... ہیں نا۔''

''ہاں امی۔''

''تو بیٹا یہ یاد رکھنا کہ تم اپنے جسم کے جس حصے کو کسی اور کے دکھوں کو کم کرنے کے لیے استعمال کرتے ہو، وہی حصہ سب سے اہم ہے۔ کسی کی آنکھیں نہ ہوں یا کسی کا کان نہ ہو، پاؤں نہ ہوں پھر بھی وہ کسی نہ کسی طرح زندہ رہ لیتا ہے لیکن جب کسی کو کوئی ایسا شانہ میسر نہ ہو جس پر وہ سر رکھ کر رو سکے تو پھر زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔''

ذرا سی دیر میں سمجھ میں آگیا تھا کہ انسانی جسم کا سب سے اہم حصہ کیا ہے۔



باغی

محمد طاہر عمیر

ضد ہو یا بغاوت . . . ہمیشہ غیر متوقع حالات اور نظریات کے خلاف جنم لیتی ہے۔ جہاں بے اصولی کا راج ہو وہاں بغاوت جنگ کرتی ہے اور جنگی صورت حال میں پھول نہیں بنتے بلکہ زخم لگتے ہیں . . . کبھی اپنوں کو اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی دشمن کو دشمن کے ہاتھوں مگر . . . مشترکہ مفاد دشمن کو بھی دوست بنا کر خونی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے . . . جس طرح وہ باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مقابل اپنے حصے کا کردار ادا کررہے تھے . . . وہ جو معاشرتی ناسوروں کا علاج کرنے نکلا تھا جب جانے پہچانے رستوں پر چلتے چلتے اپنے ہی پیروں کے آبلوں کو دیکھا تو روح تک زخمی ہوگئی اور پھر اندر کی وحشتوں نے اسے باغی بناکر اپنوں کی نظروں میں ہی مجرم ٹھہرادیا جبکہ دوسری جانب اس کا دل اس نازک اندام حسینہ کی اداؤں پر اس طرح آیا کہ اس کے کردار کی کالک اس کی گھنی زلفوں میں مدغم ہوکر رہ گئی مگر . . . کب تک . . . پھر وقت کا وار ایسا چلا کہ ہر رنگ اپنی الگ شناخت کرا گیا۔

عشق کی جنوں خیزیوں میں پیار بھرے رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کتھا



سفید پتھروں سے بنے فرش پر خون کے سرخ قطرے ایک قطار کی صورت میں لاؤنج کے اندر داخل ہورہے تھے۔ میں کسی روبوٹ کی طرح ان قطروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ لاؤنج کا ادھ کھلا دروازہ میں نے ہاتھ بڑھا کر پورا کھول دیا۔ تیز میوزک کی لہر میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میری نظریں خون کے قطروں پر ہی جمی تھیں جو کریم کلر کے قالین پر آگے بڑھتے ہوئے صوفوں اور گلاس ٹیبل پر سے ہوتے ہوئے سامنے کی دیوار کی طرف جارہے تھے۔ سفید دیوار پر ایک ہفت رنگ آسٹریلین طوطے کی لاش چپکی تھی۔ اس کے دونوں پروں کو پھیلا کر چاقوؤں کی مدد سے دیوار پر اس طرح گاڑا گیا تھا جیسے اسے صلیب چڑھا گیا ہو۔ اس کے جسم سے بہنے والا خون لکیروں کی صورت میں دیوار پر سے نیچے اترتا ہوا اب جم کر سیاہ ہوچکا تھا۔ میوزک کی آواز کانوں کے رستے میرے رگ وپے میں اتر رہی تھی۔ جن خون کے قطروں کا میں پیچھا کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا وہ اس دیوار سے اور آگے بڑھ رہے تھے۔ اب کی بار ان کا رخ سیڑھیوں کی طرف تھا۔ میرے دل کی دھڑکن خوف سے تیز ہوتی جارہی تھی اور میں ان قطروں کا پیچھا کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ اوپر پہنچ کر یہ خون کے قطرے ایک بند دروازے کے نیچے سے اندر جارہے تھے۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا، اندر تاریکی تھی۔ میں نے بائیں جانب دیوار پر لگے پینل پر سے تمام بتیاں روشن کردیں اور اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک منظر میرے سامنے تھا۔ میری سیامی بلی کو باقاعدہ پھانسی دی گئی تھی۔ اس کا بے جان جسم پنکھے کے ساتھ ایک رسی کے ذریعے جھول رہا تھا۔ چند لمحے میں گم صم سا اسے دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے جیسے ہوش آگیا۔ میں بھاگتا ہوا سامنے کی الماری کی طرف آیا۔ جیسے ہی میں نے اس کے پٹ کھولے ایک گیلا سا رومال میری ناک سے ٹکرایا۔ ناگوار سی مہک میرے احساسات کو اندھیرے میں دفن کرتی چلی گئی۔ بے ہوشی کے بے بس کردینے والے احساسات کے پردے پر کچھ تصویریں تھیں۔ ایک چہرہ جس کے ہونٹوں سے قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ نیم تاریکی میں ڈوبا ایک ہال نما کمرا...... ہانپتا ہوا ایک گھوڑا جس کا بدن پسینے سے بھیگا ہوا تھا...... آگ کے شعلوں میں گھرا ایک گھر...... سفید دیوار پر مصلوب کیے گئے آسٹریلین طوطے کی لاش......

☆☆☆

سپرا ایکسپریس کے ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی میرے ہونٹوں سے بے اختیار سیٹی بجنے لگی۔ باہر کا درجۂ حرارت چالیس کے آس پاس تھا لیکن یہاں بے حد پُرسکون ماحول تھا۔ ایک تو اے سی چل رہا تھا اور دوسرا سارے ڈبے میں محض چار پانچ افراد ہی سوار تھے اور وہ بھی ایک دوسرے سے دور دور بیٹھے تھے۔ میں نے بھی اپنے دونوں بیگ اوپر بنے خانوں میں ٹھونسے اور سرخ رنگ کی سیٹ پر دھپ سے گر گیا۔ دروازے سے یہاں آتے آتے پسینا بھی سوکھ گیا تھا، اب میں چند لمبی لمبی سانسیں لے کر اپنے ہم سفر لوگوں کا مشاہدہ کرنے لگا۔ ایک سیٹ پر ایک خاتون انگلش میگزین کا مطالعہ کررہی تھیں...... اور اس کے دو چھوٹے چھوٹے بچے دوڑتے پھر رہے تھے۔ دوسری جانب دو طالب علم لڑکے بیٹھے تھے۔ کمپارٹمنٹ کے آخری اور قدرے سنسان کونے میں ایک نو بیاہتا جوڑا بیٹھا تھا...... نوجوان کچھ کھسر پھسر کررہا تھا اور بیوی منہ میں دوپٹا دیے ہنسی کو روکنے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ ان کی اس حرکت سے وہ شخص بے حد محظوظ ہورہا تھا جوان کے عقب میں بیٹھا تھا۔ ہر بندہ اپنی اپنی دنیا میں مست تھا۔ میں نے سوچا سفر سکون کی نیند میں گزرے گا لیکن پھر چونک گیا۔ سارے مشاہدے میں میں اپنی سیٹ کو نظرانداز کر گیا تھا...... میرے سامنے لگے ٹیبل پر ایک قیمتی لیڈیز ہینڈ بیگ اور انگریزی اخبار پڑا تھا۔ اس کی مالکہ شاید واش روم میں تھی۔ میں نے سوچا چلو اچھا ہے سفر خوشگوار گزرے گا۔ جیسے ہی واش روم کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی میں نے سامنے پڑا اخبار اٹھا کر چہرے کے سامنے کیا اور دل ہی دل میں وہ کلمات دہرانے لگا جو اکثر ایسے موقع پر کام آتے ہیں۔

جوتوں کی ٹک ٹک کی آواز دور سے نزدیک آتی محسوس ہوئی۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ دلفریب مہک میرے حواس پر چھانے لگی اور پھر ہوا میں جیسے کانچ کے ٹکڑے سے بکھر گئے......

''ایکسکیوزمی...... یہ اخبار میرا ہے......'' میں نے فوراً جواب تیار کیا اور چہرے سے اخبار سرکاتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ ہفت اقلیم کی مسکراہٹ سجاتے ہوئے میں نے اس ماہ جبیں کی طرف دیکھا اور شہزادہ پتھر کا بن کر رہ گیا۔ سوال دوبارہ کیا گیا۔

''اوہ...... مم...... مجھے گمان نہیں تھا کہ اس اخبار کے مالکانہ حقوق کوہ قاف کی کسی چڑیل کے پاس ہوسکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو کسی لڑکی کے ساتھ بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''میں اپنی تمیز بالخصوص لڑکیوں کے لیے ہی سنبھال کے رکھتا ہوں......''

''کیا بکواس ہے...... میرا اخبار واپس کرو۔''

اس نے عینک کے پیچھے سے جھانکا تو اس کی آنکھیں اسکواش کی گیند جتنی موٹی نظر آنے لگیں۔ سیاہ رنگ مارے حدت کے جامنوں جیسا ہو گیا۔ خطرناک حد تک اوپر اٹھی ناک کے دہانے کسی غار کے مانند لگ رہے تھے اور ہونٹوں سے باہر جھانکتے سامنے والے دونوں دانت مزید باہر سرک آئے۔ ''بی بی...... یہ لو اپنا اخبار...... اور خدا کے لیے اپنے دانت اندر کرلو......'' میں نے قدرے سہم کر کہا تو اس نے نخوت سے اخبار اٹھا کر اپنے چہرے کے آگے تان لیا اور میں نے یوں محسوس کیا جیسے ''ایول ڈیڈ'' دیکھتے ہوئے وقفہ آ گیا ہو...... میں اٹھنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بار پھر اس کی مدھر آواز گونجی۔

''سنیے......'' کم بخت کی آواز واقعی جھرنے کی گنگناہٹ جیسی تھی۔

''جی کہیے۔''

''آپ سگریٹ پیتے ہیں......؟'' میرا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

''جی ہاں...... لیکن آپ کو پیش نہیں کرسکتا کیونکہ اس وقت میرے پاس بھرے ہوئے نہیں ہیں اور سادہ شاید آپ کو پسند نہ آئیں......'' میں نے جل کر کہا۔

''آپ شروع سے ہی ایسے ہیں یا کوشش کر کے بدتمیز بن رہے ہیں؟'' وہ بھنا کر بولی۔

''جی میرے اندر ایک آٹو سینسر لگا ہوا ہے جو مخاطب کو دیکھ کر میری تمیز کو کنٹرول کرتا ہے۔''

''پتا نہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں...... مجھے سگریٹ نہیں چاہیے...... صرف ماچس کی ضرورت تھی۔'' وہ پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

میں نے ماچس دیا اور اٹھ کر بائیں جانب کھڑکی کے ساتھ لگی اکلوتی سیٹ پر جا بیٹھا...... لیکن وہ بھی اٹھ کر بالکل میرے سامنے والی خالی سیٹ پر آ بیٹھی۔

''تم یہاں کیوں آ گئیں؟'' میں نے چڑ کر پوچھا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے......'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اور تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' میں نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ''او بی بی...... جان چھوڑو میری...... میں برملا اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد کبھی نہیں کہوں گا کہ جن بھوت اور چڑیلیں نہیں ہوتیں...... بس مجھے معاف کردو...... جانے کس مشن پر نکلی ہو۔''

''بے وقوف آدمی...... اتنی دیر لگا دی کوڈ بتانے میں۔'' وہ یک لخت بھوکی شیرنی کی طرح غرائی اور پھر میں نے اپنی زندگی کا حیرت انگیز منظر دیکھا...... اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اپنی عینک اتار دی...... منہ کے اندر رکھے کاٹن کے چند ٹکڑے نکالنے سے چہرے کی ہیئت ہی بدل گئی...... اور پھولی ہوئی ناک میں سے اسپرنگ نکالنے کے بعد اس کے نقوش اعتدال پر آ گئے۔ پرس سے ایک چھوٹی سی ڈبیا میں سے بھیگی ہوئی روئی نکال کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر پھیری تو ساری سیاہی اترتی چلی گئی۔

جگنو جیسی اس کی آنکھیں تھیں...... گوری رنگت میں ہلکا سا سنہرا پن تھا، سردیوں کی ہلکی سنہری دھوپ جیسا اور تیکھے سے نقوش...... ہونٹوں کے کنارے دائیں بائیں یوں کھنچے تھے جیسے بنا مسکرائے ہی مسکرا رہے ہوں۔ میرا منہ کھلا تھا، آواز گنگ...... اور آنکھیں بار بار پٹپٹا رہی تھیں۔ اپنی کایا پلٹنے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا اور بالکل ایسا ہی منہ بنایا جیسا میں نے اسے پہلی حالت میں دیکھ کر بنایا تھا۔

''اپنا منہ بند رکھو...... ساری ٹرین کی مکھیاں اندر گھس رہی ہیں۔'' آواز وہی تھی...... کانوں میں جھنجھناہٹ پیدا کردینے والی۔

''حق نواز نے تمہیں ٹھیک سے بریف نہیں کیا شاید......'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں تو نام بھی نہیں جانتا۔'' میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''نام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ویسے تم مجھے میڈم کہہ سکتے ہو۔'' وہ بے نیازی سے بولی۔

''نہیں، میں حق نواز کی بات کر رہا ہوں...... میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا۔'' میں نے وضاحت کی۔

''مجھے معلوم ہے وہ تمہیں کسی اور نام سے ملتا ہوگا...... میں تمہارے باس کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ بولی۔

''او ہیلو...... تمہیں کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے...... جاؤ جا کر اپنے منہ پر پھر سے سیاہی ملو اور صحیح بندے کا انتظار کرو۔'' میں نے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔

''سارے طے شدہ کوڈ بول کر اب بکواس کر رہے ہو۔ میرے پاس فضولیات کے لیے وقت نہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ لوگ میرے پیچھے ٹرین میں بھی پہنچ گئے ہیں۔ اس لیے اپنی بکواس بند کر کے میری بات غور سے سنو۔'' وہ غصے سے بولی۔

''تمہیں غور سے سننے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں......

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم مجھے جو سمجھ رہی ہو میں وہ نہیں ہوں۔''

میں نے کہا تو اس نے بے اختیار اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیے جن سے ان کی سرخی مزید بڑھ گئی۔ اس کی غصیلی نظریں مجھ پر ہی گڑی تھیں۔

''تو تم وہ نہیں ہو......؟'' اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں...... میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہی ہو لیکن وہ ہو سکتا ہوں جو تم نہیں سمجھ رہی ہو۔'' میں نے شرارتی انداز سے کہا تو اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے چلے گئے۔

''جو میں نہیں سمجھ رہی وہ تم ہو سکتے ہو...... اور تم نے تو میری مشکل ہی حل کر دی۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے بیگ کے اندر اپنا ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس میں پسٹل تھا۔

''اگر تم حق کے بھیجے بندے نہیں ہو تو پھر یقیناً دشمن ہو۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''قتل کرنے کے لیے پسٹل کی کیا ضرورت تھی...... تمہارے ابرو کا ایک اشارہ ہی کافی تھا۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بڑے رومینٹک انداز میں کہا تو وہ جھنجلا گئی اور اسی لمحے میری دائیں ٹانگ اٹھی اور اس کے کندھے پر یوں جم گئی کہ وہ سیٹ سے چپک کر رہ گئی۔ پسٹل کیچ کرتے ہی میں نے ٹانگ بھی واپس کھینچ لی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ صورتِ حال بدل گئی۔ اب پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور نشانے پر وہ حسینہ...... جو اپنے شانے پر ہاتھ رکھے خونخوار نظروں سے مجھے گھور رہی تھی......

''اسلحہ تاننے سے پہلے معلوم کر لینا چاہیے کہ سامنے والے بندے کے پاس بلیک بیلٹ تو نہیں ہے۔ ویسے میں نے تو بڑے دوستانہ انداز میں بات کی تھی...... اور ہاں ایک وضاحت اور بھی کر دوں...... اگر میرا تعلق تمہارے دوستوں سے نہیں ہے تو دشمنوں سے بھی نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے پسٹل کا میگزین نکال کر اپنی جیب میں رکھا اور پسٹل اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے پسٹل پکڑا...... مجھے حیرانی سے دیکھا اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ میں نے سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

''باوجود اس کے کہ ہم اجنبی ثابت ہو چکے ہیں لیکن تم نے میرے دماغ میں بہت سے سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ یہ حلیہ بدل کر کسی کا انتظار کرنا اور اسلحہ تان کر کسی کی جان لینے کا عندیہ ظاہر کرنا بتاتا ہے کہ تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔'' میں نے کہا لیکن وہ خاموش بیٹھی اپنے ہونٹ کاٹتی رہی۔ اسی وقت میری نظریں اس کے عقب میں گئیں اور میں نے دیکھا...... چند لوگ کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ ایک تو ان کا حلیہ سطحی سے بدمعاشوں جیسا تھا...... دوسرے ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ دبے پاؤں چل رہے ہوں اور تیسرے انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی کمپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر دیا تھا۔ ابھی چند لمحے قبل اس اجنبی حسینہ نے مجھ سے کہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے وہ لوگ میرے پیچھے ٹرین میں بھی پہنچ گئے ہیں۔'' اگر یہ بات سچ تھی تو یقیناً یہ وہی لوگ تھے۔

''آہم......'' میں نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارے میکے والے تم کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ ہی گئے ہیں۔''

اب کی بار اس نے جھٹکے سے پیچھے دیکھا۔ اسی لمحے انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا اور ''وہ رہی'' کا نعرہ لگاتے ہوئے ہماری طرف لپکے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ابھی یہ لڑکی گھبرا کر میری طرف مدد طلب نظروں سے دیکھے گی لیکن ایسا ہوا نہیں۔

لڑکی نے میری طرف دیکھا ضرور تھا لیکن ان آنکھوں میں مدد کی درخواست نہیں تھی۔ ''اپنی آنکھیں بند کر لو بے بی۔'' پتا نہیں اس کے ہونٹوں نے یہ فقرہ ادا کیا تھا کہ آنکھوں نے...... لیکن اس کے بعد وہاں ایک ایکشن فلم ضرور شروع ہو گئی...... جس میں غنڈوں کی دھلائی ہیروئن کر رہی تھی۔

سب سے پہلے پہنچنے والا بدمعاش اس کی کک کھا کر سامنے کی سیٹ کے نیچے یوں دھنس گیا کہ شاید سیٹ اکھاڑے بغیر اسے باہر نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ دوسرے نے ہاتھ میں تھامی ہاکی کو گھمایا...... اس نے ذرا سا سر کو پیچھے کر کے اس کا وار خالی کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا گھٹنا دے مارا۔ اس کی آنکھیں مخالف سمت میں مڑتی چلی گئیں اور وہ بنا چیخے یوں سجدے میں گرا جیسے سارے گناہوں سے توبہ کر رہا ہو۔ تیسرا اور چوتھا آدمی ایک ساتھ آگے بڑھے۔ لڑکی نے چھت کو سہارا دینے والا ڈنڈا تھاما اور کسی بازی گر کی طرح دائرہ بناتی ہوئی ان دونوں سے جا ٹکرائی۔ ان میں سے ایک زمین پر منہ کے بل گرا اور اپنے ٹوٹے ہوئے دانت گننے لگا...... جبکہ دوسرا لڑکھڑا کر کمپارٹمنٹ کی دیوار سے جا ٹکرایا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا، اس کی گردن پر ایسی کک پڑ چکی تھی کہ وہ فوراً ہی لمبا لیٹ گیا۔ میں نے بے اختیار سیٹی ماری ''گڈ شو...... ویل ڈن!'' مگر وہ میری طرف دیکھنے کے بجائے اس پانچویں بدمعاش کو گھور رہی

تھی...... جس کی حالت اس سپہ سالار جیسی تھی جو بڑے دھڑلے سے دشمن پر حملہ کرنے آیا تھا لیکن پہلے ہی ہلے میں اس کی ساری فوج ماری گئی اور وہ اکیلا کھڑا رہ گیا ہو۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر فیصلہ کیا کہ ایک زنانی سے مار کھالی جائے یا بدمعاشی پر لعنت بھیج کر کھسک لیا جائے۔ لڑکی نے ایک قدم اس کی طرف مزید بڑھایا تو اس نے دوسرا راستہ اختیار کرنے میں عافیت سمجھی اور پیچھے مڑ کر دروازہ کھول کر بھاگ گیا۔ لڑکی نے آگے بڑھ کر دروازہ پھر سے لاک کر دیا۔ کمپارٹمنٹ کے سارے مسافر دم بخود بیٹھے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے نیازی سے واپس آئی۔

''واہ واہ...... کیا شاٹ دیا ہے...... بروس لی کی خالہ جان!''

اس نے کھا جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''شرم نہیں آتی...... بجائے مدد کرنے کے یہاں بیٹھ کر سیٹیاں بجاتے رہے۔''

''معاف کیجیے گا محترمہ، میں غنڈوں کی مدد نہیں کرتا۔''

''میں غنڈوں کی بات نہیں کر رہی...... ایک لڑکی کو غنڈوں نے گھیر رکھا تھا اور تم بیٹھے تماشا دیکھتے رہے۔''

''جب ایک لڑکی پانچ معصوم سے غنڈوں کی دھلائی کر رہی ہو تو مدد کے حقدار وہ غنڈے ہوتے ہیں...... نا کہ بروس لی کی خالہ۔''

وہ جھنجلا کر نیم مردہ سے بدمعاشوں کی جیبیں کھنگالنے لگی۔

''اب ان غریبوں کی جیبوں سے پیسے کیوں نکال رہی ہو؟'' میں نے ہانک لگائی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، کمپارٹمنٹ کے دونوں اطراف کے دروازے جو دوسرے ڈبوں سے لنک کرتے تھے دھڑادھڑ بجنے لگے۔ ہم نے چونک کر دیکھا۔ شیشے کے گول حصوں میں سے کئی خطرناک صورتیں جھانک رہی تھیں۔

''لو پوری برات ہی آگئی......'' میں نے اونچی آواز میں کہتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پہلی بار اس کی نظروں میں پریشانی کے آثار ابھر آئے...... آخری رو میں بیٹھے آدمی نے اٹھ کر دروازہ کھولنا چاہا مگر میں نے اسے آواز دے کر منع کر دیا۔

''سنو کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' اس نے آج کی تاریخ میں پہلی بار التجائیہ انداز میں مجھے پکارا اور ساتھ ہی اپنے بالوں میں لگا ایک سفید ہیئر کلپ اتار کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

''کیا تم اسے میری امانت سمجھ کر کچھ دن اپنے پاس رکھ سکتے ہو؟ مجھے یہاں سے نکلنا ہے...... لیکن لگتا ہے شاید اس افراتفری میں، میں اسے کھو دوں گی۔''

''یہ ہے کیا......؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ تمہارے کام کی چیز نہیں ہے...... تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کہاں رہتے ہو......؟'' اس نے جلدی جلدی کہا۔

''مراد آباد...... پاکپتن سے آگے تقریباً......'' میں بتانے لگا کہ اس نے میری بات کاٹ دی۔

''ٹھیک ہے میں سمجھ گئی...... میں تین دن بعد شاہ مراد کے مزار پر تمہیں ملوں گی...... اپنی امانت واپس لینے......'' اس نے کہا۔ عین اسی لمحے شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا ہوا۔

''لیکن اگر تم تین دن بعد وہاں نہ آئیں تو......؟'' میں نے پوچھا تو وہ جلدی جلدی کہنے لگی۔

''پھر میں ہر جمعرات کی شام کو تمہارا وہیں پر انتظار کروں گی۔''

''کاش تم نے یہ فقرہ تھوڑا سا رومینٹک ہو کر کہا ہوتا......'' لیکن اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور باہر دروازے کی طرف بھاگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ چلتی ٹرین کے کھلے دروازے سے باہر نکل گئی۔ میں نے بے اختیار کھڑکی میں سے جھانکا...... وہ چلتی ٹرین سے کودی نہیں تھی بلکہ دروازے کے ساتھ موجود ڈنڈے کو پکڑ کر چھت پر چڑھ گئی تھی۔ لنک ڈور کھل چکے تھے اور کئی بدمعاش بھاگتے ہوئے دروازے کی طرف آئے مگر انہیں بھی یہی محسوس ہوا کہ وہ لڑکی ٹرین سے کود گئی تھی۔ ہیئر کلپ میں پہلے ہی جیب میں ڈال چکا تھا۔ وہ سارے بدمعاش کچھ دیر تیز تیز بولنے کے بعد واپس جانے لگے مگر پھر اچانک ان میں سے ایک نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ وہ چہرہ انجانا نہیں تھا۔ سیاہ خم دار اور گھنی مونچھیں...... کندھوں تک جھولتے بال...... دائیں کان کی لو کٹی ہوئی تھی...... بائیں ابرو سے ایک زخم کا نشان آنکھ کے پپوٹے سے ہوتا ہوا گال اور پھر ناک پر سے گزرتا ہوا دائیں ہونٹ تک چلا گیا تھا۔ وہ شکل ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو چکی تھی۔

☆☆☆

ساہیوال تک پہنچتے پہنچتے گاڑی نے تین بار اسٹاپ کیا تھا۔ میں نے تینوں بار گاڑی سے اتر کر دیکھا لیکن وہ لڑکی کہیں نظر نہیں آئی۔ البتہ کان کٹا بدمعاش اور اس کی پلٹون ضرور دکھائی دی۔ ساہیوال ریلوے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں نے پوری گاڑی کا چکر لگایا...... لیکن وہ بروس لی کی خالہ جانے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ میں گنگناتا ہوا اسٹیشن

کی عمارت سے باہر نکلا ہی تھا جب کسی نے مجھے بازوؤں میں بھرلیا۔ یہ جواد تھا۔ میرا پھوپی زاد کزن اور سب سے اچھا دوست...... صرف اسے ہی خبر تھی کہ میں واپس آرہا ہوں...... اسی لیے وہ جیپ لیے پہلے سے موجود تھا۔ میل ملاپ سے فارغ ہوکر ہم جیپ میں بیٹھ کر مراد آباد کی جانب روانہ ہوگئے۔

''اور سنا، وڈی بھرجائی اور نازو کا کیا حال ہے......؟''

''تیرے کان کھینچنے کو بے تاب ہیں...... پچھلی بار تو کسی سے ملے بغیر ہی بھاگ گیا تھا۔'' اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے کہا۔

''تو اور کیا کرتا...... آدھی رات کو تو نکلنا پڑا...... صبح تک کا انتظار کرتا تو چودھری صاحب نے ٹانگ دینا تھا مجھے سولی پر......''

''ہوا کیا تھا......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔

''یہ تجھے واقعی معلوم نہیں کہ بن رہا ہے؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا تو وہ مسکرادیا۔

''نہیں سرسری سا علم ہے۔ شاید ماما جی تمہاری شادی کی بات طے کررہے تھے۔''

''جی ہاں میری شادی...... اور کس سے بھلا......؟''

''میں کیا جانوں؟'' وہ بے نیازی سے بولا۔

''یا تو تیری یادداشت کمزور ہوگئی ہے بچہ یا پھر تو مجھے بے وقوف سمجھ رہا ہے۔'' میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

''تم مہتاب آراء کی بات کررہے ہو نا؟''

''آراء کے بجائے...... آرا کہو...... یا پھر نواب زادی...... پتا نہیں آج کے دور میں کہاں سے ٹپک پڑے یہ نواب شبیر احمد اور دختر نیک اختر مسماۃ نواب زادی مہتاب آراء...... ساری دنیا کے سامنے نارمل انسان بنی رہتی ہے اور جب بھی میرے سامنے آجائے تو اس کے اندر سے لکھنؤ کی گاڑھی اردو پھوٹنے لگتی ہے۔''

وہ میری بات پر محض مسکراتا ہی رہا۔ پاکپتن سے شاہو بلوچ اور قادر پور کو کراس کر کے جب ہم مراد آباد پہنچے تو شام ڈھل رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

''ویسے حویلی کا ماحول کیسا ہے آج کل؟''

''خود ہی دیکھ لینا...... پہنچ تو گئے ہیں۔'' اس نے گاڑی کو ایک پرائیویٹ راستے کی طرف موڑتے ہوئے کہا جس کے دونوں اطراف میں دور دور تک مونجی کی فصلیں لہرارہی تھیں اور سامنے ایک قدیم اور پُرشکوہ حویلی کا بارعب چہرہ نظر آرہا تھا۔ حویلی کے پھاٹک کے اندر داخل ہوکر جواد نے جیپ سامنے جاتے راستے کے اس حصے میں کھڑی کردی جہاں ایک راستہ دائیں طرف جارہا تھا اور دوسرا بائیں طرف۔ بائیں جانب بنی ایک عمارت میں جواد اور پھوپی رہتے تھے لیکن اب تو پھوپی بھی نہیں رہی تھیں ...... دائیں جانب حویلی کی اصل عمارت تھی۔

''میرے ساتھ چل نا۔'' میں نے کہا۔

''قبر اور قیامت کے علاوہ بھی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کوئی کسی کی مدد نہیں کرسکتا اور وہ جگہ ہے چودھری حشمت علی کا وڈا کمرا...... البتہ میری دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔'' اس نے کہا تو میں بیگ اٹھا کر جیپ سے باہر نکل آیا۔ وہ مسکراتا ہوا اپنے پورشن کی طرف بڑھ گیا اور میں بائیں جانب مڑگیا۔ سامنے سے داخل ہونے کا مطلب تھا کہ چودھری صاحب کی نظروں میں آنا کیونکہ دروازے سے آگے مردانے کے لیے پورشن مخصوص تھا جہاں ایک وسیع ہال میں چودھری صاحب کا دربار لگتا تھا اور میرا بغیر معلومات لیے اس دربار میں حاضری کا فی الحال کوئی موڈ نہیں تھا۔ لہٰذا میں گھوم کر عقبی طرف آیا اور لان میں سے گزرتا ہوا پچھلے دروازے تک جا پہنچا اور بڑے اطمینان سے اندر داخل ہوگیا۔ ڈیوڑھی پار کرکے میں اندرونی صحن میں پہنچ گیا تھا جس کے چاروں اطراف میں بڑے بڑے ستونوں والے برآمدے تھے۔ داہنے ہاتھ پر کونے میں بنی سیڑھیاں دوسری منزل پر واقع میرے کمرے کی طرف ہی جاتی تھیں لیکن ابھی میں نے پہلی سیڑھی پر پاؤں ہی رکھا تھا کہ کسی نے میرا کان پکڑلیا۔

''گیا تھا کھڑکی کے راستے اور آیا ہے پچھلے دروازے سے...... تو آدمی ہے کہ چور؟''

''بھرجائی میرا کان تو چھوڑ...... ٹوٹ گیا تو کوئی کن ٹٹے سے بیاہ بھی نہیں کرے گا۔'' میں نے کراہ کر کہا۔

''بیاہ ہی تو کرنے جارہے تھے تیرا...... کوئی پھندا تھوڑی ڈالنے لگے تھے جو ملے بغیر بھاگ گیا تھا۔'' انہوں نے خفگی سے کہہ کر کان چھوڑدیا۔

''پھندا ڈال دیتے تو نہ بھاگتا مگر وہ نواب زادی ...... پتا ہے برتن توڑنے کی کتنی شوقین ہے وہ...... بیاہ ہوجاتا تو میرے سر پر پورا ڈنر سیٹ پھوڑ ڈالتی...... پھر خوش رہتے آپ لوگ؟''

''میں سب جانتی ہوں ...... اسے بھی اور تمہیں بھی ...... پر ابھی یہ بتا شہر جاکے کھانے کو کچھ نہیں ملتا کیا۔ کتنا کمزور ہوگیا ہے...... اتنی سی بوتھی (شکل) نکل آئی ہے۔''

وہ ممتا بھری فکر مندی سے بولیں۔

''منہ میں جھانک کر دانت بھی پورے دیکھ لو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے یہ چودھری صاحب کا موڈ کیسا ہے؟''

''کتنی بار کہا ہے ''اباجی'' کہا کر۔ بیٹھے ہیں مردانے میں۔ جا جا کر مل آ...... میں جب تک کھانا لگواتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔

''چودھری صاحب سے تو میں بھائی شفیق اور عمران کی موجودگی میں ہی ملوں گا۔'' میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''وہ دونوں تو شہر گئے ہیں۔ تو اکیلا ہی مل آ...... باپ ہیں کوئی کھا تھوڑی جائیں گے۔'' وہ سرزنش کرتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئیں اور میں کچھ دیر سر کھجاتا رہا اور پھر جل تو جلال تو کا ورد کرتے ہوئے مردانے کے وڈے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سامنے والے برآمدے کے ایک بے مصرف کمرے میں سے گزر کر بندہ مردانے میں پہنچ جاتا تھا جس کے ہال کمرے کو وڈا کمرا کہا جاتا تھا۔

وڈا کمرا اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ میرے سامنے تھا۔ نیم تاریکی میں دو رویہ کرسیوں کی روش...... دبیز قالین...... دیواروں پر بنگال ٹائیگر کی کھالیں اور بارہ سینگھے کا سر...... قدیم خنجروں کا سیٹ...... اور کونے میں بھس بھرا چیتا اور عقاب...... سامنے چبوترے پر تخت بچھائے چودھری حشمت علی اور چند ملازم۔ حقے کی گڑگڑاہٹ اور تمباکو کی مہک اس کمرے کا ایک اہم جز تھی۔ میں نے سلام کیا لیکن جواب نہ ملا۔ میں نے گھوم کر منشی کرم دین کو سلام کیا تو انہوں نے آہستہ سے وعلیکم السلام کہہ دیا۔

''شکر ہے، میں سمجھا شاید آج سب نے چپ کا روزہ رکھا ہے۔'' میری زبان میں بے اختیار کھجلی ہوئی۔

''یہی بات...... یہی بات ہے جو مجھے غصہ دلاتی رہتی ہے۔ تیرے نزدیک تو ہر شے ایک مذاق ہی ہے نا؟'' اباجی ناراضگی سے بولے۔

''میں نے کیا کیا ہے؟''

''اوئے ناک کٹوادی میری اور پوچھتا ہے کیا کیا ہے تو نے......؟ نواب صاحب کے سامنے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا۔ وہ تو شکر ہے وہ خاندانی بندے ہیں جو انہوں نے خود ہی معاملہ سلجھا دیا۔ ورنہ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی زبان سے پیچھے ہٹنا پڑتا۔''

''اباجی! وہ میری زندگی کا سب سے اہم معاملہ تھا۔ بجائے مجھ سے کچھ پوچھنے کے آپ نے سیدھا حکم جاری کر دیا۔'' میں نے کہا۔

''حکم نہیں...... مان تھا پگلے...... ایک باپ کا مان اپنی اولاد پر...... باپ نے زبان دی تھی تو اولاد کو چاہیے تھا کہ سر جھکا دے۔ پر افسوس میں بھول گیا تھا کہ تو تو میرا باغی پتر ہے۔'' وہ بدستور خفگی سے بولے۔

''جان دے سکتا ہوں باپ کے حکم پر لیکن کیا اولاد کی خواہش کو نہیں دیکھا جا سکتا؟''

''بس...... بہت بول چکا تھا تو اس دن...... تیرے بھاگ جانے کے بعد بھی میں نے اور نواب صاحب نے تیرا اور مہتاب آراء کا رشتہ پکا کر دیا ہے۔ اگر تو اس مہینے بھی نہ آتا تو تجھے میں شہر سے اٹھوا لیتا۔'' انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''آپ پھر غلطی کر رہے ہیں اباجی۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''میں تیری کی گئی غلطی سدھار رہا ہوں۔''

''میں یہ شادی نہیں کر سکتا۔''

''تجھے یہ شادی کرنی ہوگی۔''

''میں پھر بھاگ جاؤں گا۔'' میں نے دھمکی دی۔

''یہ سوچ ذہن سے نکال دے۔'' وہ بولے۔ ''آخر کیا کمی ہے مہتاب آراء میں؟''

''کمی اس میں نہیں مجھ میں ہے۔'' میں چلّایا۔

''اس کے لیے یہاں بڑا اعلیٰ سے اعلیٰ حکیم پڑا ہے۔'' اب کی بار انہوں نے جو حملہ کیا میں اس کا جواب دیے بغیر بھناتا ہوا باہر نکل آیا۔

کھانے کی میز پر نازو برتن رکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔

''تشریف آوری ہوگئی جناب کی...... آنے سے پہلے ایک فون نہیں کر سکتے تھے...... کتنا کچھ منگوانا تھا مجھے...... اور یہ منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟ اباجی نے فیصلہ سنا دیا؟''

''جہاں تمہارے جیسے نکھے وکیل ہوں وہاں بے گناہوں کو سولی پر ہی چڑھنا پڑتا ہے۔''

''تم مہتاب آراء کو سولی سمجھتے ہو......؟'' اس نے شرارتی انداز سے کہا۔

''نازو...... نازو...... کوئی اور سمجھے نہ سمجھے لیکن تمہیں تو سمجھنا چاہیے۔ تو چھوٹی بھابی اور جواد کی بہن کم اور میری دوست زیادہ ہے...... پھر کیوں تو نے میری حمایت نہ کی۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''لو اباجی نے پوچھا کس سے ہے؟ بس حکم جاری کر دیا...... ہم کیا بولتے۔'' اس نے کہا۔

''سچ کہہ رہی ہے یہ...... اباجی سے کون اختلاف کرسکتا ہے لیکن سچ پوچھو تو مہتاب آراء ہمیں بھی بہت پسند ہے۔'' بھرجائی نے گرم روٹی میرے آگے رکھتے ہوئے کہا اور میں اپنا سارا غصہ بھول کر دیسی مرغے کے سالن سے انصاف کرنے لگا۔ کھانے سے فارغ ہونے تک مینا اور احسن اسکول سے آگئے اور ''چاچو آگئے'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مجھ پر پل پڑے۔

☆☆☆

رات دیر سے آنکھ لگی اور نیند میں بڑا فلمی سا خواب بھی شامل رہا۔ ایک الھڑ مٹیار کو کئی غنڈوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس کے بعد ایک اندھا دھند سی دیسی لڑائی میں وہ سب میرے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔

اور پھر وہ یکدم اپنا دوپٹا پھینک کر کراٹے کے انداز میں مجھ سے بھڑ جاتی ہے۔ میں چلاتا ہوں...... تبھی وہ جیب سے خنجر نکال کر میری طرف پھینکتی ہے۔ میں بچنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن خنجر میری انگلی میں جالگتا ہے۔ ''اوئے میں مرگیا......'' میں کراہتا ہوا بیدار ہوا تو معلوم ہوا نازو نے میری انگلی گرم چائے کی پیالی میں ڈبو رکھی ہے۔

''یہ اٹھانے کا کون سا طریقہ ہے؟'' میں نے انگلی منہ میں ڈالتے ہوئے اسے گھورا۔

''پچھلے دس منٹ سے انسانی طریقے ہی آزما رہی تھی۔ اٹھ جا...... تیرے بھرا (بھائی) آگئے ہیں۔'' اس نے چائے میز پر رکھی اور واپس چلی گئی۔ میں جس وقت ناشتے کی میز پر پہنچا تو وہ دونوں ناشتا کرچکے تھے۔ سلام دعا کرکے میں بھی ناشتے میں جت گیا۔

''چاچو...... ہمارے گفٹ تو دو نا۔'' مینا نے بے قراری سے کہا۔

''میرے کمرے میں نیلا بیگ پڑا ہے، اس میں گفٹ ہیں۔ سب کے نام لکھے ہیں۔'' میری بات سن کر وہ اور احسن میرے کمرے کی طرف بھاگ گئے۔

''اباجی سے ملاقات ہوگئی؟'' بھائی شفیق نے پوچھا۔

''جی ہوگئی اور قطعاً اچھے ماحول میں نہیں ہوئی۔''

''ماحول تو، تو خود خراب کرلیتا ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور ویسے بھی...... اباجی کے حکم کے علاوہ ہمیں بھی ماہی (مہتاب آراء) تیرے لیے پسند ہے...... اور تجھے اسی سے شادی کرنی ہوگی۔''

''یہ کیا ہوگیا ہے سارے گھر والوں کو؟''

''وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' عمران نے کہا۔

میں ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور جواد کے پورشن کی طرف آگیا۔ وہ کہیں جانے کی تیاری کررہا تھا۔ میں دھپ سے اس کے بیڈ پر گر گیا۔

''کہاں جارہا ہے جگر؟''

''ماماجی نے بلوایا ہے...... زمینوں کا کوئی کام ہوگا۔''

''یہ تم دونوں بھائی زمینوں کے چکروں میں ہی زندگی گزار دوگے۔ وہ جو ملازموں کی ایک فورس بھرتی کررکھی ہے اسے بھی حلال کرکے کھانے کی عادت ڈلواؤ۔''

''تجھے کیا پتا کامی...... بچپن تیرا شہر میں، جوانی تیری ولایت میں گزری...... تجھے کیا پتا جاگیر کے کیا بکھیڑے ہوتے ہیں۔'' وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

''مجھے جان کر کرنا بھی کیا ہے۔ میں نہیں رہنے والا یہاں...... تو مجھے یہ بتا تو نے بی کام اس لیے کیا تھا کہ ساری عمر زمینوں کے چکر میں گزار دے گا۔ ایم بی اے کرتا یار! شہر میں موج سے رہتا۔''

''اچھا اور تو نے کرمنالوجی کی ڈگری اس لیے حاصل کی تھی کہ تو صحافی بن جائے؟'' وہ مجھے گھورنے لگا۔

''ہاں تو صحافت میں حرج ہی کیا ہے...... من موجی سا کام ہے۔ ایک دم آزاد اور بڑا ہی دلچسپ۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں لاہور ایک کام سے گیا تھا تو تب تیرا بڑا چرچا سنا تھا۔ کسی ایس پی کے خلاف تو نے لکھ مارا تھا۔'' اس نے ڈھیر سارا پرفیوم خود پر چھڑکتے ہوئے بتایا۔

''ایسا کچھ تھا تو لیکن چھوڑ اسے...... یار جودی! ایک بات تو بتا، یہ ماکھا آج کل کہاں ہے...... نظر نہیں آرہا۔'' میں نے بات بدلتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی کل ہی تو تو آیا ہے اور ماکھے سے کیا کام پڑگیا تجھے...... تو تو اس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔''

''نہیں کل رات خواب میں مجھے اس کا منحوس چہرہ نظر آیا تو پوچھ لیا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''چودھری کامران! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ ایک طرف تو شادی سے انکار کررہا ہے اور دوسری طرف تجھے خواب میں ماکھے جیسے مرد نظر آنے لگے ہیں۔ کہیں ولایت جاکے......'' اس کی بات مکمل کرنے سے پہلے ہی میں نے کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔ وہ قہقہہ لگاتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں اپنے کمرے میں آیا اور بیگ کھول کر اسے بیڈ پر الٹ دیا۔ اسی بیگ میں، میں نے وہ کلپ رکھا تھا لیکن اب وہ اس میں موجود نہیں تھا۔ میں نے کئی بار تلاشی لی اور

پھر پورے کمرے کو کھنگال مارا لیکن وہ ہیئر کلپ غائب تھا۔ میں بیڈ پر گر کر سوچنے لگا کہ وعدے کے مطابق مجھے کل مزار پر اس کی امانت لوٹانی ہے مگر کیسے......؟

☆☆☆

نیم تاریکی میں سیاہ پتھروں سے بنی یہ سیڑھیاں بڑی بھیانک تھیں۔ گول دائرے میں گھومتی ہوئی یہ سیڑھیاں زمین کے پاتال میں اترتی جارہی تھیں۔ خدا خدا کر کے یہ چکر ختم ہوئے اور میں ہموار زمین پر پہنچا جو کہ انہی جیسے سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی تھی۔ زرد بلب کی ہلکی روشنی میں میرے سامنے ایک چوڑا سا راستہ تھا جس کے اختتام پر ایک وسیع وعریض کمرا تھا۔ یہ ہماری خاندانی حویلی کے تہ خانے تھے جہاں پرانے دور میں سلاخیں لگا کر نجی جیل خانے بنائے گئے تھے اور ان میں وہ غریب لوگ قید ہوتے تھے جن کی انا ذرا سی بھی بلند ہو کر اپنے حق کے لیے لڑنا چاہتی تھی لیکن اب یہاں جیل خانہ نہیں تھا۔ چودھری حشمت علی نے اپنا جیل خانہ یہاں سے دور اپنے فارم ہاؤس کے نیچے منتقل کر دیا تھا اور یہاں تمام کوٹھڑیوں کو ملیا میٹ کر کے ایک وسیع ہال کمرا بنا دیا گیا تھا۔ میں اس ہال میں داخل ہوا تو یہاں گھپ اندھیرا تھا لیکن دیوار پر لگے سوئچ پینل کے سارے بٹن دبا دیے تو روشنی ہوگئی۔ میرے سامنے ہال کمرے میں ایک عجیب منظر تھا۔ قدم قدم کے فاصلے پر شفاف شیشے کے ستون تھے۔ یہ روشنیاں ان ستونوں کے اندر سے پھوٹ رہی تھیں اور ان کا مقصد کمرے کو روشن کرنا نہیں تھا بلکہ یہ روشنی ان قیمتی نوادرات پر پڑ رہی تھی جو ان ستونوں کے اندر گول پلیٹ پر رکھے گئے تھے۔ ہر ستون میں صرف ایک ہی پیس رکھا گیا تھا۔ نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث دیگر افراد کی طرح خود چودھری حشمت علی کو بھی شاہکار پیس جمع کرنے کا شوق تھا جس کی تکمیل کے لیے یہ جدید اور نہایت قیمتی میوزیم بنایا گیا تھا۔ اس میوزیم کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں صرف گندھارا کلیکشن کے آرٹ پیس رکھے گئے تھے۔ ان میں بدھا کے مختلف ادوار کے مجسمے اور اسٹوپے نمایاں تھے۔ یہ پتھر، تانبے اور چونے اور بعض سونے سے بھی بنے ہوئے تھے۔ چودھری حشمت علی کا یہ ذخیرہ زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن نایاب ضرور تھا۔ میں نے کئی مجسمے پہلی بار دیکھے۔ ایک جگہ میں نے بدھا کا ہیڈ (سر) رکھا ہوا دیکھا۔ یہ سونے کا تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ میں ان سب کو بغور دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ہوا ڈھال کے آخری حصے میں پہنچا تو

یہاں ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ آخری دیوار کے ساتھ شیشے کے پار ایک قدرے طویل سا اسٹوپا رکھا ہوا تھا۔ پتھر کی سل پر ایک پورے منظر کی کھدائی کو اسٹوپا کہتے ہیں۔ اس کی سیاہی مائل رنگت سفید روشنی میں عجیب سی پراسراریت لیے ہوئے تھی۔ میں نے ہمیشہ ان تمام مجسموں اور اسٹوپاز کو الگ الگ اور ایک دوسرے سے دور دور دیکھا تھا لیکن یہاں میرے سامنے شہزادے سدھارتھ کی ساری زندگی ایک ہی اسٹوپے پر ترتیب سے کھدی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس چار فٹ لمبے اسٹوپا پر مایا ملکہ کا خواب...... شہزادے سدھارتھ کا محل کو چھوڑ کر جانے کا منظر...... سلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا لارڈ بدھا...... شدید فاقے کی حالت میں ہڈیوں کا پنجر بنے فاسٹنگ بدھا تک کی اشکال موجود تھیں۔ آخری منظر کے بعد اس اسٹوپا کے کناروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس سے آگے ابھی کچھ حصہ باقی تھا لیکن وہ شاید ٹوٹ گیا تھا مگر میں جانتا تھا کہ اس شاہکار کا ٹوٹا ہوا حصہ کہاں ہے؟ کچھ عرصہ قبل میں نے نوادرات پر ریسرچ کی خاطر دور دور تک سفر کیا تھا۔ ہڑپہ سے لے کر موہن جوڈرو تک اور شمالی علاقہ جات...... خاص طور پر ٹیکسلا جو کہ گندھارا آرٹ کا مرکز ہے۔ نیشنل میوزیم میں، میں نے وہ اسٹوپا دیکھا تھا جس پر لارڈ بدھا کی موت کی کہانی ثبت تھی، وہ اسی کہانی کا اینڈ تھا جس کا آغاز اس وقت میرے سامنے پڑا تھا۔ وہ ٹکڑا اسی کا ایک حصہ تھا اور بجا طور پر یہ مکمل اسٹوپا ایک ایسا شاہکار تھا جس کا کوئی بدل ابھی تک کہیں اور نہیں دیکھا تھا لیکن افسوس کی بات یہ تھی کہ دونوں ٹکڑے ایک دوسرے سے سیکڑوں میل دور تھے اور یہی نہیں مجھے یاد آیا کہ سونے کے ہیڈ والا پیس بھی اسی میوزیم میں دیکھا تھا۔ اب پتا نہیں یہ وہی تھا یا اس جیسا کوئی اور تھا۔

میں نے اپنا جدید اور طاقتور لینس والا کیمرا نکالا اور اس کی کئی تصاویر لیں۔ کلائی کی گھڑی دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ کافی دیر ہوگئی ہے...... لہٰذا میں بتیاں بجھا کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

جمعرات کی اس شام کو مزار پر رونق اپنے عروج پر تھی۔ اس ہجوم میں اس بردس لی کی خالہ کو تلاش کرنا آسان کام نہ تھا۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے مزار کے اندرونی اور بیرونی حصوں میں کئی بار گھوم پھر کر اب صحن میں لگے برگد کے درخت تلے کھڑا تھا۔

''بابو...... تیرے ماتھے پر مجھے روشنی نظر آرہی ہے۔'' ایک ملنگ جو پہلے کچھ دیر تک مجھے گھورتا رہا تھا

اچانک قریب آکر بولا تو میں چونک گیا۔

"تجھ سے قدرت بڑے کام لے سکتی ہے اگر تو نے اپنی راہ کھوٹی نہ کی ...... یہ لے برکت کے لیے ...... اصیل گیدڑ سنگھی رکھ......" بابا نے ایک پوٹلی نکال کر میری طرف بڑھائی۔

"گیدڑ سنگھی...... یہ کیا ہوتی ہے؟" میں حیران ہوا۔

"جب ایک گیدڑ ہزار سال تک رب کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہوتا ہے تو اس کی پیشانی کی ہڈی میں بہت برکت والی طاقتیں آجاتی ہیں۔ اسی ہڈی کو گیدڑ سنگھی کہتے ہیں۔ یہ اپنے پاس رکھ تاکہ برکت ہو۔" باباجی نے کہا تو میں نے خوامخواہ ہی پوٹلی تھام لی۔

"کمال ہے۔ اچھا باباجی، ایک بات تو بتائیں...... یہ گیدڑ کی عمر کتنی ہوتی ہے؟"

"بالک! بابوں سے معرفت کی باتیں پوچھتے ہیں، فضول سوال نہیں...... رکھ اسے۔"

بابا نے مایوسی سے کہا اور ایک طرف چل دیا لیکن کمال کی بات یہ تھی کہ اس نے پوٹلی بھی واپس نہ لی۔ میں نے یونہی اسے کھولا تو چونک گیا۔ اندر ایک پتھر تھا...... عام سا پتھر اور اس کے ساتھ ایک پرچی تھی جس پر لکھا تھا۔

"مزار کے عقبی طرف کھنڈر میں تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔" میں کچھ دیر پرچی کو گھورتا رہا پھر ٹہلتا ہوا مزار سے باہر نکل آیا۔ عقبی طرف ایک پرانے مندر کے کھنڈرات تھے۔ یہ مندر کبھی آباد تھا لیکن بابری مسجد کو شہید کرنے پر مسلمانوں نے یہاں پاکستان میں ایسے کئی مندروں کو توڑ ڈالا تھا۔ میں بنا کواڑ کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔ صحن کا فرش کوڑے کرکٹ سے بھرا ہوا تھا اور ایک مفلوک الحال لڑکی بڑا سا بورا اٹھائے کاغذ وغیرہ چن رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ وہ کون ہو سکتا ہے جس نے مجھے یہاں بلایا ہے۔

"تو تم آگئے۔" آواز سن کر میں مڑا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ وہ کاغذ چننے والی سانولی سی لڑکی ہی تھی۔

"تم کون ہو......؟" میں نے بغور اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں وہی ہوں جس کی امانت تم لوٹانے یہاں آئے ہو...... پلیز میرا ہیئر کلپ دے دو۔" اس نے سنجیدگی سے کہا تو میں آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ مسلے ہوئے پرانے کپڑوں میں وہ کوئی مفلوک الحال لڑکی نظر آرہی تھی جس کے سر کے بالوں میں مٹی اور گھاس کے تنکے 'بہار' دکھا رہے تھے۔ چہرے پر بھی گرد کی تہ جمی ہوئی تھی...... البتہ آنکھیں وہی تھیں۔

"یہ اس صدی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے...... کہاں تم، کہاں وہ...... وہ پیرس کا ایفل ٹاور اور تم اجڑا ہوا ہرن مینار...... میں نہیں مانتا کہ وہ تم ہی ہو۔" میں نے اس کے نین نقش پہچاننے کے باوجود بے رخی سے کہا۔

"وقت برباد مت کرو...... تم جانتے ہو کہ میں کسی خاص وجہ سے میک اپ میں ہوں۔ اگر بالفرض میں وہ نہ ہوتی تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ میں نے تمہیں ہیئر کلپ ہی دیا ہے......؟"

"دیکھو میں یہ سب نہیں جانتا...... میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ امانت اسے ہی لوٹائی جاتی ہے جس کی ہو...... اور اگر تم وہی ہو تو اسی روپ میں ملو ورنہ میں چلا۔" میں نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

"تم وہ امانت دیے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتے۔" اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"اچھا، کون روکے گا مجھے؟ تم یا تمہارا وہ سنیاسی بابا جو مجھے یہاں آنے کا پیغام دے کر گیا ہے۔"

"اس وقت یہاں میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ ٹرین میں تمہیں اس بات کا اندازہ بھی ہو گیا ہوگا کہ میں مارشل آرٹ کی ماہر ہوں؟"

"میں نے کہا نا مجھے یقین نہیں ہے کہ تم ہی ٹرین میں مجھ سے ملی تھیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"تو تم ایسے نہیں مانو گے۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہا اور پھر یک لخت اس کا مکا میرے چہرے کی طرف آیا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے سر کو ذرا سا بائیں جانب موڑ لیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ میرے کان کے پاس سے گزرا میں نے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر پر ڈال کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ وہ لڑکھڑا کر مجھ سے آ ٹکرائی۔

"بری بات ...... ہمارے خاندان میں عورتیں مردوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتیں۔" میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ وہ تڑپ کر مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

"تمہارے پسٹل کا میگزین اب بھی میری جیب میں ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا کہ وہ ٹرین میں بھی میرے سامنے بے بس ہو گئی تھی۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" ایک گہری سانس لے کر اس نے پوچھا۔

''تمہارا چہرہ...... جسے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔''
میں نے گہری سانس لے کر اسے چھیڑا تو وہ بے بسی سے بولی۔
''دیکھو مجھے پریشان نہ کرو۔ تسلی تو تمہاری ہو چکی۔ لو یہ چہرہ بھی صاف کر لیتی ہوں۔ لاؤ میرا کلپ مجھے واپس کر دو...... تم نہیں جانتے یہ میک اپ ختم کرنے کے بعد میں کتنی بڑی مشکل میں پھنس سکتی ہوں۔'' اس نے کہا۔
''یقیناً یقیناً...... مجھے یقین آ گیا کہ وہ تم ہی تھیں ...... لیکن تمہیں نہیں لگتا میرے پاس کچھ ایسے سوال ہوں گے جن کا جواب مجھے بھی چاہیے ہوگا۔''
''پہلے میرا کلپ واپس کرو۔'' وہ خونخوار لہجے میں بولی۔
''وہ تو میں نہیں لایا۔'' میں نے قدرے مایوس ہو کر کہا۔
''کیا......؟'' اب کی بار وہ چلّا اٹھی۔ ''کیا یہ کوئی مذاق ہے؟''
''نہیں...... دراصل تم سے ملنے کی بے تابی ہی اتنی تھی کہ میں وہ کلپ لانا بھول گیا۔''
''میں تمہاری ہڈیاں توڑ کر کلپ حاصل کر لوں گی۔'' وہ ایک بار پھر مجھ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھی لیکن تبھی دور سے ایک آواز آئی۔
''وہ رہی...... نیچے کھنڈر میں......'' ہم دونوں نے ایک ساتھ اوپر دیکھا۔ قدرے بلندی پر موجود مزار کی بڑی سی فصیل پر سے کچھ چہرے نیچے جھانک رہے تھے اور پھر وہ یک لخت غائب ہو گئے۔
''کمال ہے...... تمہارے چاہنے والے ہر جگہ کیسے پہنچ جاتے ہیں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتی کسی سوچ میں مگن رہی۔
''ہیلو...... اب کرنا کیا ہے......؟'' میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھا۔ اسی لمحے ہمیں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔
''وہ بہت زیادہ ہیں۔'' یک لخت اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور دوڑ لگا دی۔ عقبی دیوار پھلانگ کر ہم باہر نکلے اور پھر سامنے والی گلی میں گھس گئے۔ اب سامنے کچی سڑک تھی جس کے دونوں طرف دور تک کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ ہم کچی سڑک پر سیدھا جانے کے بجائے کھیتوں میں گھس گئے۔ جیسے ہی یہ اندازہ ہوا کہ ہم پیچھا کرنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہ رک گئی۔
''تمہارا گھر کہاں ہے......؟'' اس نے پھولتی سانسوں کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو......؟''
''ہم وہاں جا رہے ہیں...... چلو۔''
''ارے ارے...... یوں منہ اٹھائے تھوڑی سسرال جاتے ہیں۔ پہلے ہمارے والدین کے بیچ کچھ طے تو ہو لینے دو ...... پھر آ جانا میرے گھر...... وہیں تو رہنا ہے سدا تمہیں۔''
وہ چند لمحے میری بات کا مطلب سمجھ کر مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ ''بکواس بند کرو اپنی......'' غصے نے اسے اور بھی حسین کر دیا تھا۔ بھاگنے کی مشقت اور دھوپ کی وجہ سے اس کا سنہرا رنگ چمک اٹھا تھا۔ میک اپ کا سیاہ رنگ چہرے پر کہیں کہیں اب بھی باقی تھا...... بالکل ایسے جیسے کوئی شرارتی بچہ مٹی سے کھیل کر گرد آلود چہرہ لیے گھر آیا ہو۔
''ہم تمہارے گھر جا رہے ہیں...... مجھے وہ کلپ چاہیے۔'' اس نے دوٹوک لہجے میں کہا۔
''ہم ایک اور ملاقات کا دن طے کر لیتے ہیں...... میں ہیئر کلپ لے آؤں گا...... وعدہ کرتا ہوں۔''
''کیا مصیبت ہے...... یا تو تم مجھے نہیں سمجھ پا رہے یا میں تمہیں نہیں سمجھ پا رہی۔ میں تمہیں ابھی جانے کیسے برداشت کر رہی ہوں اور تم...... ہم ابھی اور اسی وقت تمہارے گھر جائیں گے بس......'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔
''ٹھیک ہے لیکن میری بھی ایک شرط ہوگی۔ گھر کی طرف جاتے ہوئے میں تم سے جتنے بھی سوال پوچھوں گا تمہیں ان کے صحیح صحیح جواب دینے ہوں گے۔''
''اچھا ٹھیک ہے لیکن چلو تو سہی......'' اس کا جملہ ختم ہوتے ہی ہم آگے بڑھنے لگے۔
''پہلا سوال...... تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''آشتی۔'' وہ مختصراً بولی۔
''بہت اچھا نام ہے...... لیکن تمہاری طبیعت کے بالکل برخلاف...... تم تو بات بات پر بلی کی طرح پنجے نکال لیتی ہو جبکہ نام......'' اس نے پیچھے سے مجھے ہلکا سا دھکا دیا تو میں نے فقرہ ادھورا چھوڑتے ہوئے اگلا سوال کر دیا۔ ''دوسرا سوال...... یہ تم اپنا گیٹ اپ کیوں بدلتی رہتی ہو......؟''
''کیونکہ کچھ لوگ میری جان کے دشمن ہیں۔''
''حالانکہ ٹرین میں تمہارا ایکشن دیکھنے کے بعد مجھے لگا شاید تم ان لوگوں کی جان کی دشمن ہو۔ بہرحال اگلا سوال...... وہ لوگ ہیں کون......؟''
''کہا نا دشمن ہیں۔'' ہم مکئی کی فصلوں سے باہر نکل آئے۔ ایک چھوٹا سا کھالہ پار کر کے پتلی سی پگڈنڈی پر چلنے لگے۔

''اتنا تو میں اندازہ لگا سکتا ہوں کہ تمہارے دشمنوں کو تمہاری جان نہیں بلکہ وہ ہیئر کلپ چاہیے جو اس وقت میرے پاس ہے...... لیکن یہ بتا سکتی ہو کہ آخر اس کلپ میں کیا ہے......؟''

''کچھ بھی نہیں، وہ ایک عام سا کلپ ہے۔ میں نے تمہیں ٹرین میں اس لیے دیا تھا کہ وہ لوگ میرے بجائے تمہارے پیچھے پڑ جائیں ...... لیکن ایسا نہ ہو سکا۔'' وہ اطمینان سے بولی۔

میں یکلخت رک گیا اور وہ مجھ سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

''میری شکل پر یہ لکھا ہے کہ میں ایک بے وقوف انسان ہوں؟'' میں نے پیچھے مڑ کر کہا۔

''نہیں......'' وہ بے اختیار بولی۔

''شکریہ...... تو اس کا مطلب ہے کہ تمہارا جواب غلط تھا۔'' میں آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''مطلب تم ایک بے وقوف انسان ہو......؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارے پہلے والے جواب کی بات کر رہا ہوں کہ وہ کلپ عام سا کلپ ہے۔ اگر ایسی بات ہوتی تو تم اسے دوبارہ پانے کے لیے اتنی بے تاب تو نہ ہوتیں۔''

''تمہارا گھر کتنی دور ہے......؟'' وہ بیزاری سے پوچھ رہی تھی۔

''وہ...... جو تمہیں ممٹیاں نظر آ رہی ہیں...... وہی میرا گھر ہے۔'' میں نے دور اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''چودھری حشمت علی کی حویلی......'' وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''ہاں وہی ہے...... میں ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ہوں کامران چودھری۔'' میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

''مم...... مجھے جانا ہوگا...... تم...... تم مجھے کل ملنا......'' اس کی آنکھوں میں خوف سا ابھر رہا تھا۔

''ارے ارے، ہم تو پہنچ بھی گئے۔ اب دروازے سے واپس جاتی کیا مناسب لگو گی؟''

''نن...... نہیں، میں وہاں نہیں جا سکتی۔'' وہ کہہ کر رکی۔ میں اس کے چہرے پر پھیلے تذبذب کے تاثرات سے محظوظ ہو رہا تھا۔

''تم مجھے کل ملنا...... پرانے رہٹ کے پاس...... لیکن میرا ہیئر کلپ ضرور لانا پلیز...... میں اب چلتی ہوں۔'' وہ جلدی جلدی بولی اور پھر تیزی سے سڑک کے دائیں طرف اتر کر ایک طرف بڑھ گئی...... میں نے اسے روکا نہیں کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ نہیں رکے گی۔

میں اسے اپنے ساتھ لایا تھا تو مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ میرا گھر دیکھتے ہی وہ پریشان ہو جائے گی اور کبھی بھی اندر نہیں آئے گی اور اس کی وجہ بڑی واضح تھی۔ اس کے پیچھے جو لوگ تھے میں انہیں بھی جانتا تھا۔ وہ کوئی اور نہیں...... میرے ابا یعنی چودھری حشمت علی کے ہی کارندے تھے۔ ٹرین میں جس بندے کو دیکھ کر میں ٹھٹکا تھا، وہ کریہہ صورت ''ماکھا'' چودھری صاحب کا خاص الخاص آدمی تھا اور اب بھی جو لوگ مزار سے اس کے پیچھے لگے تھے، وہ بھی ماکھے کے ہی ساتھی تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ اب مجھے ہیئر کلپ ڈھونڈنے کا تھوڑا اور وقت مل گیا تھا۔

☆☆☆

''اوہو...... کیا حال بنا رکھا ہے تو نے اپنے بالوں کا کامران...... اتنی خشکی اور ہاتھ پھیروں تو ٹوٹ ٹوٹ کے جا پڑتے ہیں نیچے...... کیا شہر میں تیل بھی نہیں ملتا؟'' وڈی بھرجائی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خفگی سے کہا۔ میں اس وقت حویلی کی چھت پر چھوٹی سی چوکی پر بنیان اور تہ بند پہنے بیٹھا تھا۔ چارپائی پر بیٹھی بھرجائی میرے سر پر سرسوں کے تیل کی مالش کرتے ہوئے بار بار یہی بات دہرائے جا رہی تھی۔

''تیل تو بہت ملتا ہے بھرجائی...... پر مساج کرنے والے توبہ توبہ...... ایک بار ایک مالشئے کو سو روپے دے کر مساج پر راضی کیا۔ کم بخت نے ایسا سر دھنا کہ میں سو گیا۔ جب آنکھ کھلی تو مالشئے کے ساتھ ساتھ جیب سے بٹوا بھی غائب تھا۔ دوسری بار بٹوا چھپا کر مساج کروایا...... پھر سے غنودگی کے سمندر میں ڈوب کر نکلے تو کلائی کی گھڑی اور موبائل غائب۔ مساج کے چکر میں، میں تو کنگلا ہوتے ہوتے بچا ہوں۔''

''کنگلے ہوں تیرے دشمن۔'' وہ فوراً بولیں۔

''جی نہیں...... نواب صاحب اتنی جلدی کنگلے ہونے والے نہیں۔'' کچھ فاصلے پر بیٹھی نازو نے چمک کر کہا۔

مالش کے بعد میں مسواک کرتے ہوئے چھت کی منڈیر کے پاس آیا۔ یہاں سے میں دور تک کا نظارہ کر سکتا تھا۔ مراد آباد بارڈر ایریا تھا۔ مجھے یہاں سے بارڈر پر لگی خاردار تاروں کا جال بھی نظر آ رہا تھا اور کنٹرول لائن کے پار بھارتی علاقہ بھی۔ دونوں جانب ایک جیسی زمینیں، ایک جیسے موسم، ایک جیسے ہی لوگ تھے لیکن دونوں کے بیچ ایک فرق جو اس وقت بالکل نظر نہیں

آ رہا تھا لیکن وہ روزِ روشن کی طرح عیاں تھا وہ فرق ''دو قومی نظریے'' کا فرق تھا۔ حویلی کے اردگرد وسیع علاقہ گھنے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ جہاں جہاں زمین نظر آتی وہاں لہلہاتی فصلوں والے کھیت تھے۔ دور افق سے میری نظریں لوٹتی ہوئی اپنی حویلی تک پہنچیں تو میں چونک گیا۔ میں نے جواد کو دیکھا۔ وہ وسیع لان کے قریب سے گزر کر مردانے کی طرف جا رہا تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ اس کے ساتھ ایک تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے ایک آدمی بھی تھا۔ اس کی ایک مختصر جھلک دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ میں اسے جانتا ہوں۔ میں نے تولیا کندھوں پر ڈالا اور نیچے اتر آیا۔ وہاں سے حویلی کی بھول بھلیوں میں گھومتا ہوا اس کمرے تک پہنچ گیا جو ''وڈے کمرے'' کے عقب میں تھا۔ ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر میں نے روشن دان سے اندر جھانکا۔ جواد کے ساتھ.... ماکھا بھی موجود تھا لیکن وہ دونوں ایک جانب خاموش کھڑے تھے۔ اباجی کی ساری توجہ کا مرکز وہ آدمی تھا جسے جواد ساتھ لے کر پہنچا تھا۔

''جی ہمایوں صاحب! کیا حال ہیں آپ کے..... سنا ہے نسیم اطہر کو کوئی مسئلہ درپیش آ گیا ہے۔'' اباجی حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

''بس چودھری جی! آپ کی توجہ ہی ہمارے لیے باعثِ اطمینان ہوتی ہے۔ نسیم صاحب کے بارے میں آپ مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' وہ خوشامد کا تڑکا لگائے بڑی انکساری سے کہہ رہا تھا۔

''مجھے دوسروں کی ٹوہ میں رہنا پسند نہیں ہے۔ بس اڑتی اڑتی ایک خبر سنی تھی۔ سنا ہے سرکاری ادارے نے پرانی فائلیں نکال لی ہیں۔ کیوں ایسا ہی کچھ ہے نا؟''

''آپ تو سب جانتے ہی ہیں چودھری جی، ان اداروں کا تو مقصد ہی بلیک میل کرنا ہوتا ہے۔ پچھلی دفعہ بھی آپ نے ہی مدد کی تھی۔''

''اوئے وہ تو اپنا ایک بچہ ادھر لگا ہوا تھا لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اتنی پرانی فائل اچانک باہر کیسے آ گئی؟'' اباجی کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

''بس جی ...... وہ حمید کرمانی ہے نا...... ڈیفنس منسٹر.....اسی کا سالا اس تفتیشی ادارے کا ڈپٹی ڈائریکٹر بن گیا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے شجاع احمد نام ہے ان کا ......بس نسیم صاحب کا کوئی جھگڑا ہو گیا تھا حمید کرمانی سے تو اس نے اپنے سالے کے ذریعے پرانے مُردے اکھاڑ دیے۔''

''چودھری جی ایسے موقعوں پر تو دوست ہی کام آتے ہیں۔'' ہمایوں مزید بولا۔

''اوئے دوستی یاری کے لیے تو جندڑی بھی قربان کرنے کو تیار ہیں لیکن یہ بات نسیم کو کون سمجھائے۔ ایک چھوٹا سا کام کہا تھا اسے، چھ مہینے ہو چکے ہیں کوئی جواب نہیں دیا۔ اتنا لمبا انتظار میں نے آج تک کسی شے کا نہیں کیا۔''

''اسی سلسلے میں تو حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی شے سرکاری میوزیم میں تھی۔ اسے وہاں سے نکالنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ ہر شے کا ایک ریکارڈ رکھا جاتا ہے لیکن پھر بھی نسیم سر اپنی پوری کوشش کرتے رہے ہیں۔''

''میرے سامنے تمہید نہ باندھا کر ہمایوں...... سیدھی سیدھی بات کر۔'' اباجی نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''وہی جی......کام میں دیر اسی لیے ہوئی تھی کہ ترکی کے وزیراعظم کا دورہ تھا......دونوں ملکوں کے درمیان ثقافت کے تحفظ و ترویج کی چند یادداشتوں پر دستخط ہونے تھے۔ اسی سلسلے میں خود پی ایم صاحب نے ترکی کے اہم منصب کے ساتھ میوزیم کا دورہ کرنا تھا۔ اس خاص پیس کا وہاں موجود ہونا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ جیسے ہی معاملات ختم ہوئے نسیم صاحب نے وہ پیس وہاں سے نکلوالیا۔ یہ بات چونکہ فون پر بتانے والی نہیں تھی اسی لیے میں خود حاضر ہوا ہوں۔ نسیم صاحب نے پیغام دیا ہے کہ کہانی کا آخری ٹکڑا مل گیا ہے، کب کہاں اور کیسے وصول کریں گے؟'' ہمایوں کی بات ختم ہوئی تو اباجی کے چہرے پر خوشی پھیل چکی تھی۔

''اوئے الو کے کن......اتنی خوشی کی خبر تو نے مجھے اتنی دیر بعد سنائی تھی؟ آتے ہی کہہ دیتا......'' وہ خوش ہو کر بولے اور پھر کہنے لگے......

''نسیم کو کہنا وہ کوئی عام پیس نہیں ہے اس لیے عام حالات میں اسے باہر بھی نہ نکالے۔ چوبیس تاریخ کو فارم ہاؤس پر میری طرف سے تمام دوستوں کو دعوت ہے۔ اسے کہنا کہ اپنی سرکاری گاڑی میں اسے لائے کیونکہ اس کی تو چیکنگ نہیں ہوگی نا......''

''اور وہ جی تفتیشی ادارے والا مسئلہ ہے''

''اسے کہو اس دعوت میں شجاع بھی آئے گا...... اس کا کام محفل ختم ہونے سے پہلے پہلے ہو جائے گا۔''

''بہت بہت شکریہ چودھری جی ...... میں اب چلتا ہوں۔'' ہمایوں اٹھتے ہوئے بولا تو اباجی نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ ہمایوں کے باہر نکلتے ہی وڈا کمرا چودھری

حشمت علی کے قہقہے سے گونج اٹھا۔

''دیکھا تو نے جواد...... اسے کہتے ہیں ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا...... یہ جس طرح ہمایوں آج ہم سے بات کررہا تھا کبھی ایسے ہی وہ نسیم بھی ہاتھ باندھے بیٹھا رہتا تھا۔ ایک کرسی نے اس کے اندر اتنی اکڑ پیدا کردی کہ میرا ایک چھوٹا سا کام کرنے سے انکاری ہوگیا۔ ڈائریکٹر آف کلچر اینڈ ہیری ٹیج ہوکر میوزیم سے ایک پیس نہیں غائب کروا سکتا تو لعنت بھیج دے اپنی کرسی پر...... ہونہہ...... ذات کا رنگڑ اور چودھری حشمت علی کو انکار...... ابھی اس کی فائل نکلوائی کہاں ہے، صرف شجاع سے ایک فون کروایا ہے۔ دیکھو کیسا کتے کے پلّے کی طرح پیاؤں پیاؤں کرنے لگا۔ کہتا ہے آپ کا پیس حاضر ہے۔ کب کہاں اور کیسے بجھواؤں؟ اوئے یہ کام تو میں وفاقی وزیر کے ذریعے بھی کروا سکتا تھا...... کیا نام ہے بھلا اس کا......'' وہ سوچنے لگے۔

''اشتیاق مرزا......'' جواد نے یاد دلایا۔

''ہاں وہی...... لیکن اتنے چھوٹے سے کام کے لیے وفاقی سطح پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مانا کہ مجسمہ بڑا نایاب ہے لیکن ان کے ہے کس کام کا...... اس کا اصل حصہ تو میرے پاس ہے۔''

ابا جی مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے خوش نظر آرہے تھے اور جہاں تک میں سمجھ رہا تھا، یہ اسی ایک ٹکڑے کی بات ہورہی تھی جو تہ خانے میں بنے چودھری حشمت علی کے ذاتی میوزیم کے ایک طویل اسٹوپے کے آخر میں غائب تھا اور میں نے اسے نیشنل میوزیم میں دیکھا تھا...... اور اب ابا جی نے نسیم اطہر کے ذریعے اسے وہاں سے چرا لینے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

''اوئے کے...... حقہ تازہ کروا...... اور ہاں بھئی تو سنا ماکھے کچھ پتا چلا اس کُڑی کا......'' وہ اب ماکھے سے مخاطب تھے۔ میں جو وہاں سے ہٹنے ہی والا تھا ٹھٹک کر رک گیا۔

''نہیں چودھری جی! وہ چھلاوے کی طرح نظر آتی ہے اور غائب ہوجاتی ہے۔'' ماکھے نے کہا۔

''بڑے افسوس کی بات ہے۔ تم لوگوں سے ایک کُڑی قابو میں نہیں آرہی۔ اوئے کون سی چکی کا آٹا کھانے لگے ہو......؟'' وہ غصے میں آگئے۔

''ماما جی! آپ فکر مت کریں، سب مجھ پر چھوڑ دیں میں سنبھال لوں گا۔'' جواد نے کہا۔

''اگر سارے کام تجھے ہی سنبھالنے ہیں تو ان ڈشکروں کا میں نے اچار ڈالنا ہے۔ انہیں تو میں آٹا گوندھنے پر بھی بٹھادوں نا تو بھی یہ کچھ نہیں کرسکتے۔ اوئے اک گل میری کن کھول کے سن لو، اس کڑی کو تین دنوں کے اندر اندر میرے سامنے پیش نہ کیا تو اس بار وڈے میلے میں کھسروں کی جگہ تم سب کا ڈانس ہوگا۔'' وہ دہاڑے پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔

میں اسٹول سے اتر گیا۔ یہ ساری بات اسی بروس لی کی خالہ کے بارے میں ہورہی تھی جس نے مجھے اپنا نام آشتی بتایا تھا۔ میں سیٹی بجاتا ہوا باتھ روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

میں نے اپنے کمرے کا چپا چپا چھان مارا لیکن وہ ہیئر کلپ نہیں ملا۔ مجھے یاد تھا کہ میں جب گھر آیا تھا تب تک وہ میری جیب میں ہی موجود تھا۔ پھر میرے ذہن میں نازو کا خیال آیا۔ میرے کمرے کی صفائی وہی کرواتی تھی۔ میں اسے آوازیں دیتا باہر نکلا تو وہ باورچی خانے میں وڈی بھرجائی کے ساتھ مصروف ملی۔

''لگتا ہے دعوت کی تیاری ہو رہی ہے..... کون آرہا ہے؟'' میں نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جناب کے متوقع امیدوار برائے سسر.....'' نازو نے کہا تو میرا منہ بن گیا۔

''اوہو، آپ تو افسردہ ہوگئے۔ ارے جناب! صرف وہی نہیں بلکہ ان کے ہمراہ متوقع امیدوار برائے سب سے چھوٹی بھابی بھی تشریف فرما ہیں۔''

''تشریف فرما ہیں؟ مطلب آچکی ہیں.....؟'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''تو اور کیا.....اور آج نواب صاحب منگنی کی انگوٹھی کے ساتھ ساتھ ڈھیر سارے محافظ بھی ساتھ لائے ہیں جنہوں نے حویلی کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے تاکہ ان کے ہونے والے داماد پھر سے گدھے کے سینگوں کی طرح غائب نہ ہوجائیں۔'' وہ بڑے مزے سے کہتی جا رہی تھی۔

''مروا دیا نازو! تم سب سے میں بعد میں نمٹوں گا۔'' میں باورچی خانے سے نکلا اور پھر کئی دروازے پار کر کے لان میں آگیا۔ یہاں سے بھی ایک کھڑکی کے ذریعے بڑے ہال میں ہونے والی گفتگو سنی جاسکتی تھی لیکن میرے ساتھ وہی ہوا جو آسمان سے گرنے والے کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ مہتاب آراء لان میں ہی موجود تھی۔ اس سے پہلے کہ میں واپس دوڑ لگاتا اس نے مجھے دیکھ لیا۔

''ارے آپ.....؟ آپ تو سیدھے ادھر ہی آگئے۔'' وہ نوابی انداز میں بولی۔ ''سلام عرض کرتی ہوں۔''

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ..... دودھوں نہاؤ پوتوں.....'' میں نے بمشکل بریک لگائی لیکن اس وقت تک اس کا گلابی چہرہ سرخ ہوچکا تھا۔

''آپ بالکل بھی نہیں بدلے، یاد ہے جب بچپن میں ہم چھپ جایا کرتے تھے تو آپ ہمیں ڈھونڈنے کے بجائے جان بوجھ کر آوازیں دیتے رہتے تھے تاکہ ہمیں باری نہ دینی پڑ جائے۔''

''تم آج بھی چھپ کر دیکھو مہتاب آراء..... بخدا میں تمہیں آج بھی نہیں ڈھونڈوں گا۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' وہ تن کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ میں بھی ایک لمبا سانس کھینچ کر سنجیدہ ہوگیا۔ ''دیکھو ماہی! ہم اچھے دوست ہیں لیکن اس سے آگے کا رشتہ مجھے قبول نہیں۔ یہ ہمارے والد صاحبان جو اندر میٹنگ فرما رہے ہیں میں اسے نہیں مانتا۔ یہ ہماری زندگی ہے اور اس کا فیصلہ ہمیں کرنا ہے ان کو نہیں ......اور اگر وہ کوئی فیصلہ خود کریں گے تو مجھے اس سے اختلاف ہوگا۔''

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگی کہ شاید میں مذاق کر رہا ہوں لیکن میں سنجیدہ تھا۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو کامی...... یہ بات تو ہمارے بچپن میں ہی طے کردی گئی تھی۔'' اس کے لہجے میں پریشانی سی در آئی۔

''اب بچپن بھی تو نہیں رہا پھر یہ بچپنا کیوں؟...... ہماری ترجیحات بدلتی رہتی ہیں۔ بچپن میں کبھی ہم کسی کی انگلی پکڑ کر چلتے تھے لیکن پھر اس سہارے کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ میں کوئی دلیل دینے کے بجائے سیدھی بات کروں گا۔ شادی کے لیے محبت ہونی ضروری ہے اور مجھے تم سے ویسی محبت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ میرے ہر لفظ پر بدلتا جا رہا تھا۔

''تم اس رشتے کو رد کردو......لیکن یہ تو مت کہو کہ تم کو مجھ سے......'' وہ روہانسے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ''مجھے درد ہوتا ہے۔''

''خوابوں کی دنیا میں رہنے والوں کو حقیقت سے تکلیف ہی ہوتی ہے لیکن اگر تم ٹھنڈے دل سے غور کرو تو میری بات سمجھ جاؤ گی۔ جس راستے پر تم نے چلنا شروع کیا ہے، وہ ابھی آغازِ سفر ہی ہے۔ پلٹ جانے کی کوشش کرو گی تو آگے مزید تکلیفوں سے بچ جاؤ گی۔'' میں نے اسے سمجھایا۔

''پلٹ جاؤں؟ یہ تم اب کہہ رہے ہو جب میں اس منزل تک پہنچ گئی ہوں جس کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھنے والا پتھر کا ہوجاتا ہے۔'' اس کی آنکھوں سے پانی کے قطرے لرزتے ہوئے نکلے۔

''پتھر میں بدل جانا...... بکھر جانے سے کہیں بہتر ہے ماہی۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور غلطی تمہاری ہے۔ کیا میں نے کبھی اس معاملے میں تمہاری حوصلہ افزائی کی تھی؟''

''تم...... کامران چودھری...... تم......'' وہ جملہ مکمل نہ کرسکی اور یک لخت مڑ کر تیز تیز قدموں سے ایک جانب بڑھ گئی۔ میں بت بنا وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا کیونکہ جب وہ

پلٹی تو مجھے اس کے بالوں پر لگا سفید ہیئر کلپ نظر آ گیا تھا...... یہ بے شک وہی ہیئر کلپ تھا۔

☆☆☆

میں مرادآباد کے شمالی طرف محض پانچ کلومیٹر دور بخت نگر میں نواب صاحب کی حویلی میں تھا۔ یہ حویلی بھی کافی پرانی اور روایتی سی تھی لیکن یہ مرادآباد میں چودھری حشمت کی حویلی سے بہت چھوٹی تھی۔ قدیم طرز کے در و بام کے اندر کی فضا بڑی مختلف تھی۔ اندر کی آسائش جدید طرز کی تھی۔ فرنیچر سے لے کر پردوں اور قالین تک نئے دور کی عکاسی کرتے تھے۔ قدیم و جدید کا یہ امتزاج بڑا بھلا نظر آ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب ماہی کا کمال ہے۔ دروازہ کھلا اور نواب صاحب نے کمرے میں قدم رکھا لیکن مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک لمحے کو ٹھٹکے پھر آہستہ سے چلتے ہوئے اپنی مخصوص شاہی کرسی پر بیٹھ گئے۔

''اب کیا کہنے آئے ہو......؟'' انہوں نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

''نواب صاحب! میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو پتا چل جائے کہ آپ کی بیٹی کا ہونے والا شوہر اسے خوش نہیں رکھ سکے گا تو کیا آپ پھر بھی اس کی شادی اسی کے ساتھ کر دیں گے؟'' وہ خاموش بیٹھے رہے۔

''میں ماہی سے مل سکتا ہوں......؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''یا تو تم ہمیں نہیں سمجھے یا ہم تمہیں......'' وہ آہستگی سے بڑبڑائے اور پھر بولے۔ ''وہ اپنے کمرے میں ہی ہے۔'' میں اٹھ کر دیوان سے باہر آ گیا۔ ہال کمرے کے کونے میں اوپر جاتی سیڑھیوں کے اختتام پر اس کا کمرا تھا۔ میں نے دستک دی۔

''آ جاؤ......'' اس کی مدھم سی آواز آئی تو میں اندر داخل ہو گیا۔ کمرا نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، اس کے باوجود ماہی کا ستا ہوا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔

''مجھے تسلی کا ایک لفظ بھی نہیں چاہیے۔ میں ابھی تک اپنی نظروں میں گری ہوئی ہوں۔ تم چلے جاؤ یہاں سے......'' وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

''نہیں، میں تو کچھ اور کہنے آیا ہوں۔'' میں واقعی پریشان تھا کہ ایک بکھرے ہوئے وجود پر نیا زخم کیسے لگاؤں۔ ''نازو نے تمہیں جو گفٹ دیا تھا...... وہ تمہارے لیے نہیں تھا، تمہارا گفٹ یہ تھا۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا اور ایک پیک شدہ گفٹ اس کی طرف بڑھایا۔ وہ کچھ دیر گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہی پھر

سخت گناہ

نمازی کے آگے سے گزرنا بہت سخت گناہ ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا...... اگر نمازی کے آگے سے گزرنے والا جانتا کہ گزرنے میں کیا گناہ ہے تو ایک قدم چلنے سے بہتر 100 برس کھڑا رہنا بہتر جانتا۔

خاموشی سے اپنے بالوں پر لگا ہیئر کلپ اتار کر میرے حوالے کر دیا۔ کلپ کو مٹھی میں لے کر ایک اطمینان سا میرے اندر اتر گیا پھر میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان گنگ ہی رہی۔ میں جانے کے لیے اٹھنے لگا تو اس نے کہا۔

''یہ تحفہ بھی لے جاؤ...... میں جانتی ہوں میرے لیے کوئی تحفہ تھا ہی نہیں تمہارے پاس۔'' میں نے گفٹ نہیں اٹھایا اور باہر آ گیا۔ مجھے نازو نے بتا دیا تھا کہ یہ کلپ اسی نے ماہی کو میری طرف سے تحفہ کہہ کر دیا تھا۔

اب میرے ہاتھ میں وہ پراسرار ہیئر کلپ تو آ گیا تھا لیکن ماہی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا، میں اس پر پریشان بھی تھا۔ اس وقت ہیئر کلپ میرے سامنے میز پر پڑا تھا لیکن میری سوچ کے دائرے ماہی سے باہر ہی نہیں نکل رہے تھے۔ اس معصوم لڑکی کے ننھے سے دل میں بچپن میں لگایا گیا ایک معمولی سا بیج اتنا تناور درخت بن چکا تھا کہ میری ایک بات پر اس کا اکھاڑ لیا جانا ممکن نہیں تھا۔ اسی سوچ میں میں کئی سگریٹ پھونک چکا تھا۔ جیسے ہی آخری سگریٹ نے میری پوروں تک انگارے کی تپش پہنچائی، میں نے سر جھٹکا اور ہیئر کلپ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دیکھنے میں یہ عام سا ہی کلپ تھا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بہت خاص ہے ورنہ اس کی خاطر اتنی بھاگم بھاگ نہ ہو رہی ہوتی۔ تقریباً چار انچ کی بالکل گول سلاخ پر کرسٹل کے پھول بنے ہوئے تھے۔ چند لمحوں تک تو میں اس میں کوئی خاص بات تلاش کرنے میں ناکام ہی رہا لیکن پھر اس پر بنے کرسٹل کے گلاب کی پتیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے پر یہ درمیان میں سے کھل گیا اور تب مجھے پتا چلا کہ درمیانی سلاخ اندر سے کھوکھلی تھی۔ میں نے کھلے حصے کو میز پر الٹا اور پھر جو کچھ اس میں سے نکلا...... اسے دیکھ کر میں کتنی ہی دیر تک ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ سب سے پہلا خیال جو مجھے آیا وہ

چودھری حشمت اینڈ کمپنی کے ناجائز دھندوں کے بارے میں تھا۔ جن کا پردہ چاک کرنے کی خاطر میں یہاں آیا تھا۔ ہاں میں...... کامران چودھری...... اس بار اس حویلی میں بیٹا بن کر نہیں بلکہ ایک انویسٹی گیٹو جرنلسٹ بن کر آیا تھا جسے کسی نے چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا۔

''اگر اتنا ہی شوق ہے دوسروں کے راز فاش کرنے کا تو جا اپنے گھر سے آغاز کر...... بتا دنیا والوں کو کہ تیرا باپ کیسے کیسے غیر قانونی کام کرتا ہے۔''

☆☆☆

چودھری حشمت پنجاب کے روایتی جاگیردار تھے۔ 47ء کی تقسیم میں ان کی سیکڑوں ایکڑ زمینیں بھارتی پنجاب میں رہ گئیں۔ صرف ایک گاؤں مراد آباد بارڈر کے اس پار رہا جس میں ان کی خاندانی حویلی تھی۔ کلیم کے ذریعے انہیں ساہیوال کے نواح میں کافی رقبہ مل گیا تھا لیکن رہائش انہوں نے مراد آباد جیسے چھوٹے سے گاؤں میں بنی اپنی وراثتی حویلی میں ہی رکھی۔ نواب شبیر احمد ان کے دیرینہ دوست تھے۔ چودھری حشمت اگر روایتی جاگیردار تھے تو نواب صاحب رکھ رکھاؤ اور اونچی انا والے نواب تھے جن کی ریاست تقسیم سے پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی۔ انہوں نے انگریزوں کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننے کے بجائے ریاست چھوڑ دینے میں ہی بہتری سمجھی۔ اس کڑے وقت میں جب وہ ایک دم اپنے تخت سے اتر کر بے سروسامانی کے عالم میں پہنچے تب چودھری حشمت علی نے ہی ان کا ساتھ دیا۔ انہوں نے کلیم کے ذریعے کچھ رقبہ ان کے لیے بھی منظور کروا دیا۔ مراد آباد کے ساتھ ہی بخت نگر کی ایک حویلی میں انہوں نے رہائش رکھی۔ نواب کی شادی بھی تقسیم کے بعد ہی ہوئی تھی لیکن ان کی بیوی مہتاب کی پیدائش کے ساتھ ہی فوت ہوگئی تھیں۔ مراد آباد اپنے ایک مزار شاہ مراد کے نام سے مشہور تھا۔ سرحدوں کا اعلان ہونے کے بعد یہاں چوکیاں بنا دی گئی تھیں۔ یہ پنجاب کا زرخیز ترین علاقہ تھا لیکن تقسیم کے ہنگاموں، سرحدوں کی کشیدگی اور پھر جنگوں کی وجہ سے زیادہ تر آبادی کوچ کر گئی تھی۔ بارڈر ایریا کی وجہ سے بہت جلد یہ علاقہ اسمگلروں کی نظر میں بھی آ گیا مگر اس علاقے میں کوئی بھی کام چودھری حشمت علی کی مرضی کے بغیر ہونا ممکن نہیں تھا مگر جب انہیں اسمگلنگ کے سلسلے میں بریف کیا گیا تو انہوں نے دو شرائط رکھیں۔ ایک تو یہ کام خود ان کے اپنے آدمی کریں گے دوسرا منشیات اور اسلحے کی اسمگلنگ نہیں ہوگی اور یوں وہ روایتی جاگیرداری کو نبھاتے ہوئے نوادرات کی اسمگلنگ میں ملوث ہوگئے۔ اسمگلنگ میں خود کو شامل کرنے کا ان کا فیصلہ اس لیے تھا کہ یہاں ان کے پاس ایک ایسا راستہ تھا جس کے ذریعے وہ سرحد پار بہ آسانی سامان بھیج سکتے تھے۔ مراد آباد کا جنگل کبھی بے حد گھنا ہوا کرتا تھا۔ تقسیم سے بہت قبل تک انگریز یہاں شکار کھیلنے آتے تھے۔ جنگل کے اندر ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس اسی مقصد کے لیے تیار کیا گیا تھا کہ شکاریوں کو ایک پناہ گاہ فراہم کی جاسکے۔

چودھری حشمت علی کی ایک چھوٹی حویلی اس علاقے سے تقریباً بیس کلومیٹر دور (بھارتی پنجاب) میں تھی۔ یہ چھوٹی حویلی صرف مہمانوں کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ شکاریوں کے طعام و قیام کا بندوبست اسی چھوٹی حویلی میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے سارے جنگل کو کراس کرنا پڑتا یا پھر ایک لمبا چکر لگا کر اس کی طرف جانا پڑتا تھا۔ اس ''تکلیف'' کا ازالہ کرنے کے لیے چودھری حشمت علی نے ریسٹ ہاؤس سے لے کر چھوٹی حویلی تک زیرِ زمین ایک ایسا خفیہ راستہ بنوایا جس میں سے کار یا جیپ آرام سے گزر سکتی تھی۔ اعلیٰ افسران شکار کے بعد اس خفیہ راستے کے ذریعے چودھری حشمت علی کی حویلی پہنچتے اور ان کی میزبانی سے لطف اندوز ہوتے...... جبکہ ان کے ماتحت اسی ریسٹ ہاؤس میں قیام کرتے۔ تقسیم کے بعد وہ چھوٹی حویلی تو سرحد پار رہ گئی البتہ ریسٹ ہاؤس اور جنگل پاکستان کے حصے میں آ گیا۔ باوجود اس کے کہ ان کی جاگیر بھارت میں تھی انہوں نے پاکستان میں رہنا اس لیے پسند کیا کہ ایک تو ان کی وراثتی حویلی مراد آباد میں تھی اور دوسرا تقسیم کے بعد انہیں حکومتِ پاکستان میں اعلیٰ عہدہ ملنے کی امید تھی لیکن بعد میں جب انہیں صوبائی حکومت کے لیے سرکاری عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ صرف وفاقی حکومت میں اعلیٰ عہدہ چاہتے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا بلکہ سیاستدانوں کو بنیادیں فراہم کرتے رہے۔ نوادرات کی اسمگلنگ کے لیے ہامی انہوں نے پیسے کمانے کے لیے نہیں بھری تھی جس طرح بعض مجرم کسی مجبوری کے بغیر محض مشغلے کے طور پر جرائم کرتے ہیں بالکل اسی طرح کئی جاگیردار غیر قانونی کام محض اپنے شوق کی تسکین یا مشغلے کے طور پر کرتے ہیں۔ نوادرات کی اسمگلنگ کے لیے انہیں اس خفیہ راستہ سے بہت آسانیاں حاصل ہوسکتی تھیں۔ مراد آباد کے اس خفیہ راستے کے بارے میں جاننے والے سارے انگریز افسران

انگلستان جا چکے تھے اور یہاں پر جن افسران کو اس کا علم تھا انہیں حشمت علی کی دوستی نے چپ کروا رکھا تھا۔ تو پھر انہیں کون روک سکتا تھا اور گزرے وقت کے ساتھ ساتھ اب شاید ہی کوئی ایسا سرکاری محکمہ ہوگا جس میں چودھری حشمت علی کے دوست موجود نہ ہوں گے...... یہی دوستیاں ان کے ہر غیر قانونی کام کی پردہ پوشی میں مصروف رہتی تھیں۔

چودھری حشمت علی کی آبائی حویلی کے ایک پورشن میں ان کا یتیم بھانجا جواد اپنی بہن نازیہ کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ شفیق اور عمران چودھری حشمت علی کے بڑے بیٹے تھے۔ تعلیم سے لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے وہ میٹرک کرنے کے بعد آگے پڑھنے کے بجائے جاگیر کے کاموں میں لگ گئے۔ شفیق کی شادی چودھری صاحب نے اٹھارہ سال کی عمر میں ہی کر دی تھی۔ بڑی بھابی بہاولپور کے ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔ جس وقت ان کی شادی ہوئی اس وقت ان کی عمر صرف سولہ سال تھی۔ عمران کی شادی جواد کی بہن نازیہ سے ہوئی۔ دونوں بھائی مراد آباد کے بجائے زیادہ تر ساہیوال میں پائے جاتے تھے۔ چودھری صاحب کا سب سے چھوٹا اور باغی بیٹا میں تھا...... کامران۔ میرا بچپن جواد، نازو اور نواب صاحب کی اکلوتی بیٹی مہتاب آراء عرف ماہی کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ اباجی کے ساتھ میرا رشتہ بڑا ہی عجیب سا تھا۔ ان کے ساتھ میری کبھی بنی ہی نہیں...... اسی لیے وہ مجھے باغی کہتے تھے۔ ان کی ہاں میرے لیے نہ ہوتی...... جس کام کا وہ حکم دیتے وہ میں ہرگز نہیں کرتا اور جس کام سے منع کرتے وہ میرے لیے سب سے اہم کام ہوتا...... اور جب وہ تنگ آکر میری پٹائی کا ارادہ باندھتے میں بڑی بھابی کا سہارا لیتا جنہوں نے مجھے ماں جیسا پیار دیا تھا...... لہٰذا میری حرکتوں سے تنگ آکر انہوں نے مجھے شہر پڑھنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ جواد میرے ساتھ ہی تھا لیکن وہ بھی گریجویشن کے بعد واپس چلا آیا اور جاگیر کے کاموں میں مصروف ہوگیا جبکہ میں مزید پڑھنے کے لیے انگلینڈ چلا گیا۔ انہوں نے مجھے بزنس ایڈمنسٹریشن کے لیے یہاں بھیجا تھا لیکن جب میں پاکستان لوٹا تو میرے پاس کرمنالوجی کی ڈگری تھی۔ اس کی ایک بڑی وجہ میرا دوست جنید تھا۔ اگر روئے زمین پر کوئی مجھ سے یہ کہتا کہ کسی ایسے شخص کا نام لو جس کے بارے میں تمہیں یقین ہو کہ یہی وہ شخص ہے جو بہت ایماندار اور سچا پاکستانی ہے تو میں بلا جھجک اس کا نام لیتا۔ میں لندن میں اس سے ملا تھا اور اس کی سوچ نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ ہمارے ملک کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کے شہری دنیا کے جس کونے میں بھی ہوں اپنی دھرتی سے مایوس اور حالات کا رونا رونے سے باز نہیں رہ سکتے لیکن جنید ایسا نہیں تھا، وہ کبھی مایوس نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا مایوس لوگوں کو مستقبل بھی مایوس ہی نظر آتا ہے۔ وہ اچھے حالات کی امید رکھتا تھا، اس لیے اسے اپنے ملک کا مستقبل بھی اچھا ہی نظر آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کئی اور لوگوں کی طرح میری سوچوں کو بھی نیا رخ دیا۔ بس وہیں سے میں نے بھی اپنے ذہن سے مایوسی کا لبادہ اتار دیا۔ جنید کی ایک خواہش تھی اسے بچپن سے ہی پولیس میں جانے کا بہت شوق تھا۔ اس کے والد ایس ایس پی کی پوسٹ پر تھے جب انہیں مجرموں نے فائرنگ کر کے شہید کر دیا۔ پاکستانی پولیس کے بارے میں میرے وہی خیالات تھے جو ایک عام پاکستانی کے ہو سکتے ہیں مگر جنید اور طرح سے سوچتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھ سے کہا۔

''کامی! قوانین غلط نہیں ہوتے انہیں استعمال کرنے والے غلط ہو سکتے ہیں۔ پولیس کا نظام وہی ہے جو ساری دنیا میں ہے۔ ہم بھی لندن پولیس جیسے ہو سکتے ہیں اگر ہم ان جیسے ایماندار اور فرض شناس ہو جائیں...... اور یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پولیس کو برا کہنے کے بجائے خود ہمت کریں۔ اس میں شامل ہو کر اپنے حصے کی ایمانداری ادا کریں تو یقیناً بہتری آسکتی ہے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے جگر!'' میں کہتا۔

''مگر یہ ناممکن بھی تو نہیں ہے۔ انسان کے لیے کبھی چاند پر جانا ناممکن تھا تو کبھی ایٹم سے چھوٹے ذرے تک پہنچنا ناممکن تھا۔ جانتے ہو اس کائنات میں ناممکن کیا ہے؟ جس شے کے لیے کوشش نہ کی جائے اور جب کوشش کی جائے تو سب کچھ ممکن ہو جاتا ہے۔'' اس کے اندر ایک سچے پاکستانی کا جذبہ تھا...... اس کی باتیں مجھے متاثر کرتی تھیں اور ویسے بھی لندن کی پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ نے پولیس کے بارے میں میرے روایتی نظریات ہی بدل ڈالے تھے لہٰذا میں کرمنالوجی کی ڈگری لے کر واپس پہنچا۔ اس وقت تک جنید مقابلے کا امتحان دے کر نہ صرف پولیس فورس جوائن کر چکا تھا بلکہ ایس پی کی پوسٹ پر ترقی بھی پا چکا تھا لیکن جس چیز نے مجھے مایوس کیا وہ یہ تھا کہ وہ بھی اسی رنگ میں رنگ چکا تھا جس میں ہماری پولیس مشہور ہے۔ جب میں نے اس سے وجہ پوچھی تو کہنے لگا...... اگر میں ایسا نہ کرتا تو آج اس کرسی پر نہ بیٹھا ہوتا جس کے لیے میں نے ساری عمر کوشش کی تھی۔

''لیکن کیا فائدہ اس کرسی پر بیٹھنے کا ...... جب تمہارے پاس وہ جذبہ ہی نہیں رہا۔'' میں نے کہا۔

''بندے کو پانی کے اندر اترنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ پانی کتنا گہرا ہے۔ یہ سسٹم اتنا طاقتور ہے کہ تم اسے بدلنے نکلو تو یہ تمہیں بدل دیتا ہے۔ پتا ہے میرے ساتھ کیا ہوا؟'' اس نے لرزتے ہاتھوں سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا تو مجھے اس کی آواز میں بھی لرزش محسوس ہوئی۔ ''میں اے ایس پی کی سیٹ پر پوسٹ ہوا تو میں اسی راستے پر چلا جو میں نے خود منتخب کیا تھا۔ شروع شروع میں، میں کامیاب رہا اور مجھے لگا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اچھے راستے پر چلنا مشکل ہے وہ غلط کہتے ہیں لیکن پھر جو ہوا وہ بہت عجیب تھا۔ ایک دن مجھے میرے ایس پی صاحب نے بلوایا اور میرے کام کو بہت سراہا اور آخر میں کہنے لگے ...... جنید! تم بہت اچھے انسان ہو۔ جب میں تمہاری پوسٹ پر تھا تو بالکل ایسے ہی سچا اور کھرا آفیسر تھا جیسے کہ تم ہو مگر جس طرح آج میں نے تمہیں بلوایا ہے اسی طرح ایک دن میرے افسر نے بھی مجھے بلوایا تھا اور میرے جذبے کی تعریف کی تھی اور پھر کہا تھا...... تم بہت اچھے ہو مگر کیا کروں کہ ہماری کچھ مجبوریاں بھی ہیں۔ ہم لوگ اپنے افسران کو خوش کیے بغیر بالکل ناکارہ پرزے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر ماہ تم اپنے تھانوں سے ایک لاکھ روپے جمع کر کے مجھے پہنچاؤ تاکہ میں اپنے اور تمہارے افسران کو بھی خوش رکھ سکوں۔ جنید! میں اس کام سے انکار کر کے وہ سیٹ نہیں گنوانا چاہتا تھا جو میں نے گلیوں میں دال چنے بیچ کر پڑھائی کر کے حاصل کی تھی۔ لہٰذا میں نے اپنے افسر کی بات مان لی۔ جانتے ہو اس وقت میرے ایس پی کون تھے؟ رضا حیات ...... یعنی تمہارے والد...... میں نے تمہارے والد کو چار سال تک اپنے تھانوں میں سے لاکھوں روپے اکٹھا کر کے دیے ہیں...... اور اب میں چاہتا ہوں کہ تم وہ پیسے سود سمیت مجھے واپس کر دو...... اس لیے اگر میں نے تمہاری رپورٹ ہائی کمان کو بھجوا دی تو تمہاری ساری محنت ضائع ہو جائے گی جو تم نے اس سیٹ کو حاصل کرنے کے لیے کی ہے۔'' وہ ایک توقف کو رکا پھر بولا۔ ''مجھے بتاؤ کامی! میں کیا کرتا؟ میرے پاس ان کی بات ماننے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

مجھے اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔ ''تم ایسے دلائل دے کر بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ یاد ہے ہمارے ایک پروفیسر نے آئیڈیل معاشرے کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا تھا کہ دنیا کے برے ترین معاشرے میں اگر ہر فرد صرف اتنا کرے کہ وہ اپنی ساری اچھائیاں معاشرے کو دے دے تو وہ برا معاشرہ بہت جلد آئیڈیل معاشرے میں تبدیل ہو جائے گا اور تب ہم سب دوستوں نے خود سے حلف لیا تھا کہ ہم اپنی اچھائیاں اپنے معاشرے کو تفویض کریں گے۔ ہم تو اپنے حالات کو سنوارنے آئے تھے جنید ...... اپنے زورِ بازو سے نئے راستے تراشنے آئے تھے...... اور آج تم مجھے کہہ رہے ہو کہ تمہارے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔ بات تو ساری حوصلے کی تھی میرے یار!'' میں نے کہا۔

''وہ سب کتابی باتیں تھیں۔ ضروری نہیں کہ ہر تھیوری کو پریکٹیکل بنانے پر ویسا ہی رزلٹ ملے جو ہم چاہتے ہیں۔ اس ملک کے تم کسی بھی ادارے میں جاؤ، اسی سسٹم کو اپنے اوپر حاکم پاؤ گے جس کا ایک پرزہ میں بھی ہوں۔ تم مقابلے کا امتحان دینے والے ہونا...... تو بن جاؤ اے ایس آئی یا پھر اسسٹنٹ کمشنر...... ایک بار اس سسٹم کا حصہ بن کر دیکھو تب میں دیکھوں گا، تمہارا حوصلہ زیادہ مضبوط ہے یا یہ سسٹم......'' وہ تلخی سے بولا۔

''مجھے تمہارا یہ چیلنج قبول ہے۔'' میں وہاں سے چلا آیا لیکن میرے ارادے بدل چکے تھے۔ میں نے سی ایس ایس کرنے کے بجائے ایک اخبار کے لیے کام شروع کر دیا اور بہت جلد انویسٹی گیٹو رپورٹر کی پوسٹ حاصل کر لی۔ میری پہلی رپورٹ چیمبر آف کامرس کے ان اعلیٰ عہدیداران کے بارے میں تھی جنھوں نے کروڑوں روپے کے ٹیکس ادا نہیں کیے تھے لیکن اوپر سے ایسا دباؤ آیا کہ مجھے نوکری سے نکال دیا گیا مگر میرے مایوس ہونے سے پہلے ہی ملک کے سب سے بڑے اخبار نے مجھے نوکری دے دی۔ اس اخبار کی یہی شہرت تھی کہ یہ بااثر افراد کے دباؤ سے آزاد تھا۔ صدیقی صاحب اس کے چیف ایڈیٹر اور مالک بھی تھے۔ ان کے لیے میری پہلی رپورٹ نے اسٹاک ایکسچینج کا ملکی تاریخ میں سب سے بڑا اسکینڈل پورے ثبوتوں کے ساتھ عوام کے سامنے لا کھڑا کیا۔ حکومت کو ایکشن لینا پڑا اور وہ لوگ گرفتار ہوئے جو اس میں ملوث تھے۔ اس واقعے کے بعد نہ صرف میری شہرت میں اضافہ ہو چکا تھا بلکہ مجھے یہ احساس بھی ہوتا جا رہا تھا کہ میں نے صحیح راستہ اختیار کیا ہے۔ صحافت مکمل طور پر نہیں لیکن بہت حد تک حکومتی دباؤ سے آزاد تھی اور میں اپنے حصے کا حق ادا کر سکتا تھا۔ میری اگلی رپورٹ مزید تہلکہ خیز ثابت ہوئی لیکن یہ رپورٹ میرے اپنے ہی دوست ایس پی جنید کے خلاف تھی۔ کچھ عرصہ قبل جنید کی زیر نگرانی ایک پولیس مقابلے میں ایسے ڈاکو کو ہلاک

ہوئے تھے جن پر انعام مقرر تھا۔ جس پر صوبائی حکومت کی طرف سے جنید کو خصوصی انعام بھی ملا تھا لیکن مجھے ان ہلاک شدہ ڈاکوؤں کی اصلی پوسٹ مارٹم رپورٹس مل گئیں جن سے انکشاف ہوا کہ ان کو لگنے والی گولیاں ایک ہی رائفل کی تھیں اور سبھی فائر ڈیڑھ فٹ کے فاصلے سے کیے گئے تھے...... اور سب سے اہم بات یہ کہ ان ڈاکوؤں کی عمریں بیس اکیس سال سے زیادہ نہیں تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ پولیس مقابلہ بھی جعلی تھا اور ڈاکو بھی جعلی تھے۔ میں نے مزید تفتیش کی اور بہت جلد میں ان تین خاندانوں تک پہنچ گیا جن کے بچے پولیس اٹھا کر لے گئی تھی اور پھر ان کا پتا ہی نہیں چلا۔ کسی بھی تھانے میں ان کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا۔ ایک خاص مخبر کے ذریعے میں نے پولیس اسٹیشن سے وہ تصویریں بھی نکلوالیں جو پولیس مقابلے کے بعد کی تھیں۔ تمام اخباروں میں ڈاکوؤں کی تصویریں بھی شائع کروائی گئی تھیں۔ ان تصویروں کے ذریعے ان کے گھر والوں نے اپنے بچوں کو پہچان لیا اور اس وقت تک میرے پاس اس واقعے کا سارا مواد آ چکا تھا۔ جیسے ہی میری رپورٹ شائع ہوئی، سب سے پہلے جنید نے مجھے فون کیا۔

''تمہیں شرم آنی چاہیے...... تم نے اپنے دوست کے خلاف اتنا بڑا جھوٹ لکھ مارا۔ کیا چاہتے ہو تم...... اپنی سستی شہرت کے لیے میرا نام کیوں بدنام کرتے ہو؟'' وہ سخت غصے میں تھا۔

''مجھے شہرت نہیں انصاف چاہیے...... اور جسے تم جھوٹ کہہ رہے ہو میرے پاس اس کے تمام ثبوت موجود ہیں۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''میں جانتا ہوں تمہیں بھی اور تمہارے ثبوتوں کو بھی...... میں اسٹاک ایکسچینج کا بے وقوف بروکر نہیں جسے تم اس طرح ڈرادو گے...... پورے ضلع کا مالک ہوں۔ دیکھ لوں گا تمہیں بھی اور تمہارے اخبار کو بھی...... میں تمہارے ''سیلف میڈ اسکینڈلز'' سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔'' وہ دھمکیاں دینے لگا۔

''وقت آ گیا ہے جنید! دیکھتے ہیں یہ سسٹم طاقتور ہے کہ میرا حوصلہ......'' میں نے سکون سے کہا اور اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا۔ صدیقی صاحب نے مجھے فوراً بلوایا اور کہا۔

''مجھ پر شدید دباؤ ہے کہ میں تمہاری رپورٹ کی تردید پیش کروں۔''

''کتنا دباؤ ہے سر......؟ کیا اس سے زیادہ دباؤ ہے جو آپ کو آپ کا ضمیر دے سکتا ہے۔'' میں نے پوچھا تو وہ مسکرائے اور عینک اتار کر آنکھیں مسلتے ہوئے کہنے لگے۔

''اگر تمہارے پاس مکمل ثبوت ہیں تو میں اس دباؤ کو رد کر سکتا ہوں۔''

''بالکل ہیں...... اور وہ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ہم اس رپورٹ کی کوئی تردید شائع نہیں کریں گے۔'' میں مطمئن ہو گیا۔ اگلے دن ہی آئی جی صاحب نے ایس پی، ڈی ایس پی اور دو تھانوں کے ایس ایچ اوز کو معطل کر کے انکوائری شروع کر دی۔ اسی رات مجھے جنید کا دوبارہ فون آیا۔

''تم نے مجھ سے کس دشمنی کا بدلہ لیا ہے کامی!'' اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔

''میری تمہاری کوئی دشمنی نہیں ہے جنید...... تم نے ایک غلط کام کیا، میں نے تو صرف اس کی نشاندہی کی ہے۔''

''مائی فٹ...... تم ہوتے کون ہو ایسا کرنے والے؟'' وہ چلایا۔ ''کیا میں نے دوسروں سے ہٹ کر کوئی کام کیا ہے؟ سیکڑوں لوگ ہیں یہاں جو لاشوں پر قدم رکھ کر آگے بڑھتے ہیں...... تمہیں ان سارے لوگوں میں ایک میں ہی نظر آیا تھا۔''

''میں نے کہا، تم سے میری کوئی دشمنی نہیں...... تمہارا غلط کام میری نظروں میں آ گیا، اس لیے میں نے رپورٹ بنا دی۔ کل کو اگر میرے پاس چیف منسٹر کے بارے میں بھی ایسی اطلاع ہوئی تو میں ڈروں گا نہیں...... اسے عوام کے سامنے لاؤں گا کیونکہ میرا حوصلہ پہاڑ کو سرکانے کا نہیں اسے ریزہ ریزہ کر دینے والا ہے۔'' میری بات سن کر وہ ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا پھر وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

''تم ابھی تک ان بے وقوفانہ باتوں کو سینے سے لگائے بیٹھے ہو...... بکواس کرتا تھا میں...... نا سمجھ تھا...... اتنا ہی شوق ہے ایمانداری کا تو جاؤ پہلے اپنے گھر کی خبر تو لو۔ جاؤ جا کر اپنے باپ کے کالے دھندوں کو دیکھو پھر کرو انہیں اسکینڈلائز...... میں بھی دیکھتا ہوں تمہارا حوصلہ باپ سے کتنا طاقتور ہے۔'' اس نے فون بند کر دیا لیکن میں سن ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میرا باپ چودھری حشمت علی کیسے کیسے دھندوں میں ملوث تھا۔

☆☆☆

میں میز پر بکھری روشنی کی ننھی مگر تیز کرنوں کو دیکھے جا رہا تھا۔ وہ ہیرے تھے جو اس ہیئر کلپ میں سے نکلے تھے۔ تقریباً دو درجن تعداد تھی جن کی قیمت کروڑوں میں تو

ہوگی۔ کئی گھنٹے میں گم صم سا نہیں گھورتا ہوا سوچتا رہا پھر میں نے اپنا موبائل اٹھا کر لاہور میں اپنے دوست فیصل بٹ کو کال کی۔

''اوئے کدھر غائب ہوگیا ہے تُو...... بالکل گدھے کے سینگوں کی طرح......'' میری آواز پہچانتے ہی وہ شروع ہوگیا۔

''میں تمہیں جو کہنے والا ہوں اسے غور سے سن...... مجھے کچھ چیزیں چاہئیں، کل شام سے پہلے پہلے...... ڈاک سے بھیج، کوریئر سے بھیج یا کسی کے ہاتھ بھیج...... کل شام سے پہلے پہلے مجھے یہ چیزیں چاہئیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''او ٹھنڈ رکھ میرے شیر...... گل ای کوئی نہیں...... فوراً بتا کہ کیا چاہیے؟'' وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔ میں نے جواباً اسے جو کہا تو اس نے بلا حجت جواب دیا۔

''ٹھیک ہے کل دوپہر تک تجھے یہ سامان مل جائے گا۔''

میں نے کال کاٹ دی اور ایک بار پھر آشتی اور ان ہیروں کی سوچ میں غرق ہوگیا۔ اتنا تو میں جانتا تھا کہ اس سارے علاقے میں چودھری حشمت علی کے علاوہ کوئی اور مائی کا لعل غیر قانونی کام نہیں کرسکتا تھا...... تو پھر یہ آشتی کون تھی؟ اور کس کے لیے کام کررہی تھی؟ کیونکہ ماکھا اینڈ کمپنی کا اس کے تعاقب میں ہونا ثابت کرتا تھا کہ چودھری حشمت علی بھی اسی سوال میں سرگرداں ہیں۔ یونہی سوچتے سوچتے جانے کب میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

اگلے دن دوپہر تک میرا سامان ایک پیکٹ کی صورت میں مجھ تک پہنچ گیا تھا اور شام کو میں حسب وعدہ رہٹ کے پاس آشتی کا انتظار کرتا رہا لیکن یہ انتظار، انتظار ہی ثابت ہوا۔ جب سورج ڈھلنے کے بعد بھی وہ نہیں آئی تو میں لوٹ آیا۔ سارا دن بوریت میں گزرا۔ اگلی شام میں پھر اس کا انتظار کرنے پرانے رہٹ پر پہنچا لیکن وہ پھر نہیں آئی۔

''کیا اس کے لیے ان بیش قیمت ہیروں سے زیادہ اہم بھی کوئی اور کام ہوگا؟'' میں اسی سوچ میں غرق حویلی پہنچا۔

نازو مجھے چائے دینے آئی تو میں نے پوچھا۔ ''چودھری صاحب کہاں ہیں؟''

''پتا نہیں...... کل سے کہیں گئے ہوئے ہیں...... اور ان کے ساتھ ساتھ جواد بھائی بھی غائب ہیں۔ شاید بہاولپور گئے ہوں گے۔'' اس کے جواب میں میں خاموشی سے چائے پینے لگا وہ بھی کچھ دیر خاموش کھڑی رہی پھر کہنے لگی۔ ''تم نے اچھا نہیں کیا...... وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔'' میں سمجھ گیا اس کا اشارہ کس کی طرف ہے۔

''میں اس باب کو بند کرچکا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ بند ہی رہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''تم مرد کبھی بھی کسی لڑکی کے احساسات کو نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ بھنا کر بولی۔ ''تمہارے نزدیک جذبات کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔''

''تم جانتی ہو میں ایسا نہیں ہوں۔'' میں نے نرمی سے کہا۔

''جو میں جانتی ہوں وہ تم مانو گے نہیں...... کیا یہ غلط ہے کہ تم نے ماہی کو اپنانے سے صرف اس لیے انکار کیا ہے کیونکہ اس کا حکم ابا جی نے دیا تھا؟''

''یہ سچ نہیں ہے۔'' مجھے غصہ آگیا۔ جواباً وہ بھی غصیلے لہجے میں بولی۔

''تو پھر یہ بھی جھوٹ ہوگا کہ آج تک تم نے ابا جی کی ہر ہاں کو...... نہ میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ تم صرف اس لیے انکار کررہے ہو کیونکہ یہاں بھی ابا جی کی ہاں نے تمہارا راستہ روک رکھا ہے۔ تم اپنے بچپن کی محرومی کا بدلہ اس لڑکی سے لے رہے ہو جس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیا مرد کے لیے اس کی انا کسی کی محبت سے زیادہ اہم ہوتی ہے؟''

''نازو...... نازو...... پلیز...... مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ وہ کوئی اور بات کہے بغیر واپس چلی گئی۔

میرا ذہن جو پہلے ہی سوچوں کے بھنور میں گھوم رہا تھا، اب یک لخت کسی گرداب میں آ الجھا تھا۔ ماہی کا مسئلہ، پراسرار آشتی اور ہیرے، چودھری حشمت علی کے غیر قانونی دھندے...... ہر سوچ آپس میں گڈمڈ ہوتی جارہی تھی۔ کافی دیر میں سوچوں کے اس بھنور میں چکر کھاتا رہا پھر ایک خیال بجلی کی طرح چونکا گیا۔ ابا جی اور جواد گاؤں میں نہیں ہیں۔ بھائی شفیق اور عمران تو پہلے ہی شہر میں تھے...... یہ وقت سوچ میں ضائع کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا مخصوص سامان اٹھایا اور باہر نکل آیا۔

کچھ دیر بعد میں ایک بیچارو پر مراد آباد کے جنگل کی طرف جارہا تھا۔ بظاہر یہ بے حد گھنا جنگل دراصل اندر سے تیزی سے ختم ہورہا تھا کیونکہ یہاں سے قیمتی لکڑی ٹرک بھر بھر کر نکالی جاتی تھی اور بدلے میں نئے درختوں کو اگانے کا سلسلہ مفقود تھا۔ میں جنگل کے آخری کونے میں واقع ریسٹ ہاؤس کی اس عمارت تک پہنچنا چاہتا تھا جہاں وہ خفیہ راستہ موجود تھا جس کے ذریعے سرحد پر اسمگلنگ ہوتی تھی۔

عیدالفطر کے حسین رنگوں سے سجا جولائی 2017ء کا خوشیاں بکھیرتا



ماہنامہ پاکیزہ کراچی

رفعت سراج و شیریں حیدر کے دلکش ناول، نت نئے روپ لیے......

سحر ساجد کے خوب صورت اندازِ بیان کا مرقع **من جان بازم**

سیما رضا ردا کا منی ناول، تیزی سے اگلی منزل کی جانب گامزن

اختر شجاعت، اخلاص کے موثر بیان کے ساتھ

عید کے رنگ **عقیلہ حق، رضوانہ پرنس، منشا محسن علی، غزالہ عزیز** کے ساتھ ساتھ دیگر مایہ ناز رائٹرز کی تحریروں کے سنگ۔

پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی و معروف قلم کار **فریدہ اشفاق** نے بڑھائی ہماری بزم کی رونق

شائستہ زریں کے دلچسپ و خصوصی عید **سروے** میں شرکاء کے خوب صورت جوابات

اس کے علاوہ

نادیہ احمد، فریدہ سیفی، فوزیہ احسان رانا، فصیحہ آصف خان، فریدہ لاکھانی، فوزیہ اشرف و ریما نور رضوان کے پُرمسرت افسانے

عید کی مناسبت سے دل خوش کُن سلسلے مزیدار پکوان مہندی کے حسین ڈیزائن اور سجنے سنورنے کے انداز صرف آپ کی خوش ذوقی کی خاطر

یہیں پر قیمتی نوادرات لائے جاتے تھے اور پھر ان کی پیکنگ وغیرہ ہوتی تھی۔ میری گاڑی جنگل میں موجود ایک پکی سڑک پر دوڑ رہی تھی جو سیدھی ریسٹ ہاؤس تک جاتی تھی لیکن میں نے آدھا راستہ طے کرنے کے بعد گاڑی سڑک سے اتار کر درختوں کے بیچ روک دی۔ اب آگے گھنے درختوں کی وجہ سے صرف پیدل چلنا ہی ممکن تھا۔ گھپ اندھیرے میں یہاں حشرات الارض کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ نباتات کی وہی مخصوص مہک تھی جو ایسے جنگلوں میں مہکتی ہے۔ میرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ روشنی کا چھوٹا سا دائرہ بنا رہی تھی جس کی مدد سے میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے راستوں کا بخوبی علم تھا۔ تقریباً پانچ منٹ تک پیدل چلنے کے بعد میں نے ٹارچ بند کر دی۔ کیکر کی جھاڑیوں کے پیچھے مجھے ہلکی روشنی میں نہائی وہ کھنڈر جیسی عمارت نظر آ رہی تھی۔

یہ عمارت دراصل انگریزوں کے زمانے کا ڈاک بنگلا تھا...... لیکن پھر جنگل کے کنارے ایک نیا ریسٹ ہاؤس بننے کی وجہ سے یہ خالی رہ گیا اور اب یہ اس غیر قانونی کام میں ملوث تھا جس کے لیے میں یہاں آیا تھا۔

باہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے شک تھا کہ کہیں ماکھا اور اس کے ساتھی یہاں موجود نہ ہوں مگر یہ سوچ بھی مجھے روکنے والی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر جائزہ لینے کے بعد اس کی چار دیواری تک پہنچ گیا۔ بلند و بالا چار دیواری کے اوپر خاردار باڑ بھی نصب تھی۔ یہ یہاں کے بندروں اور دوسرے جانوروں سے بچاؤ کا کام کرتی تھی لیکن بندر اتنے ہوشیار ہوتے ہیں کہ وہ رکاوٹوں کا حل نکال لیتے ہیں میں تو پھر بھی انسان تھا۔ میں دیوار کے بالکل قریب لگے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ کافی اوپر جا کر میں ایک سیدھی ڈال پر چلتا ہوا دیوار کی طرف بڑھا...... یہاں سے مجھے اس درخت پر چھلانگ لگانا تھی جو دیوار کے دوسری طرف تھا۔ یہاں درمیانی فاصلہ تقریباً آٹھ فٹ تھا اور نیچے خاردار باڑ تھی جہاں میں گر سکتا تھا۔ مجھے خود پر یقین تھا لہٰذا ایک گہری سانس لے کر میں نے جمپ لگائی اور سیدھا سامنے کے درخت پر جا کودا۔ کودتے ہی میرے پیروں تلے تو کوئی ڈال نہیں آئی لیکن ہاتھ میں ضرور ایک مضبوط مگر لچکیلی شاخ آ گئی۔ میں ٹہنیوں کو توڑتا ہوا اس شاخ کے سہارے زمین کی طرف آن گرا۔ شاخ کی وجہ سے میں بڑے آرام سے زمین پر اترتا چلا گیا...... جیسے ہی پاؤں نے زمین کو چھوا میں نے شاخ کو چھوڑا اور خود کو درخت کی اوٹ میں لے گیا۔ ٹہنیوں کا شور سن کر کوئی دور سے چلایا۔

’’کون ہے ادھر......؟‘‘

دوسری آواز ذرا دور سے آئی۔ ’’بندر ہوں گے تو اپنا کام کر......! چل اب حقہ لے بھی آ یہاں...... کتنی دیر ہو گئی تھی ’’چلم‘‘ بناتے ہوئے۔‘‘

’’لاتا ہوں لاتا ہوں...... کس بات کی کال (جلدی) ہے تجھے۔ سارا دن تو سوتا رہا ہے۔ ماکھا نہیں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہڈحرامی شروع کر دے۔‘‘

قریبی آواز گونجی۔ ’’تجھے کتنی دفعہ کہا ہے کر یے میرے منہ مت لگا کر......‘‘

کریما پھر کوئی جواب دینے لگا۔ مجھے دو باتوں کا اندازہ ہوا۔ ایک تو یہ کہ دونوں فرد ایک دوسرے سے کافی دور تھے اور دوسرے یہ کہ ماکھا یہاں نہیں تھا۔ میں نے مزید دیر کرنے کے بجائے حرکت میں آنے کا فیصلہ کر لیا۔

گھاس پر رینگتا ہوا میں پہلے والے آدمی کی طرف بڑھا جو میرے زیادہ نزدیک تھا۔ یہ میری طرف پشت کیے پاؤں کے بل بیٹھا ایک انگیٹھی میں کوئلے دہکا رہا تھا۔ میں بے آواز اس کے پیچھے پہنچا اور کنپٹی پر زوردار ضرب لگائی، وہ کراہ کر نیچے گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ میں اسی طرح رینگتا ہوا دوسری آواز کی طرف بڑھا۔ مین گیٹ کے پاس دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن میں سے ایک پر ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔ کچھ دیر میں وہ بھی انٹا غفیل ہو گیا۔

برآمدے کے پار ایک ہی دروازہ تھا جس پر لگا تالا اس چابی سے کھل گیا جسے میں نے اس کی جیب سے حاصل کیا تھا جو گیٹ کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔ اندرونی کمرے بالکل خالی تھے۔ مطلب فرنیچر وغیرہ تو آراستہ تھا لیکن کوئی انسان موجود نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کی کوشش کے بعد میں تہ خانوں کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے اپنی جیب میں لگا پین ویڈیو کیمرا آن کر دیا۔ جب میں نیچے اترا تو یہ تہ خانہ میری سوچ سے زیادہ بڑا تھا۔ یہ اتنا طویل ہال تھا جیسے پوری عمارت کے نیچے ہی بنا دیا گیا ہو۔ تہ خانے میں کباڑ جیسا بہت سا سامان تھا۔ ایک کونے میں گتے کے بڑے بڑے کارٹن تھے جو پیک کیے گئے تھے۔ میں نے ایک کارٹن کو احتیاط سے کھولا۔ اندر پرالی بھری ہوئی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے پرالی کی پہلی تہ باہر نکالی۔ نیچے اخبار میں لپٹی ایک ٹھوس شے موجود تھی۔ میں نے اسے کھولا تو میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ یہ آرٹ کا ایک نادر نمونہ تھا۔ چونے سے بنی ایک چھوٹی سی بگھی...... معمولی سی ٹوٹ پھوٹ کے علاوہ

بالکل مکمل تھی ۔ یہ ہمارے ملک کا ورثہ تھا جسے دونوں ہاتھوں سے چند کاغذی نوٹوں کے عوض گنوایا جا رہا تھا ۔ اس ایک کارٹن میں چھ پیس چھپائے گئے تھے اور یہاں کل بیس کارٹن تھے ۔

میں نے دوسرے ڈبے بھی کھول کر دیکھے ۔ ان میں پرانے وقتوں کے برتن، سکے، ہتھیار اور شوپیس وغیرہ تھے ۔ یہ سب سامان یقینی طور پر ہڑپہ کے کھنڈرات سے برآمد ہو کر یہاں تک پہنچا تھا ۔ اس ہال نما تہ خانے کے پختہ فرش پر فولاد کی دو مساوی پٹڑیاں تھیں جیسے ریل گاڑی کے لیے ہوتی ہیں..... مگر مجھے علم تھا کہ یہاں ریل گاڑی نہیں بلکہ پہیہ لگے لوہے کے کھلے منہ والے چند ڈبوں کو آپس میں منسلک کر کے ایک موٹر انجن کے ساتھ ریل گاڑی کی طرح استعمال کیا جاتا ہے ۔ یہ بالکل ایسی ہی گاڑی تھی جیسی کہ کان (مائن) میں سے معدنیات نکالنے کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ اس وقت یہ ریل نما ڈبے نظر نہیں آرہے تھے تو اس کا مطلب تھا کہ وہ کھیپ لے کر خفیہ راستے کے دوسرے سرے پر پہنچے ہوئے ہوں گے ۔ میں اس پٹڑی کے ساتھ چلتا ہوا کمرے کی آخری دیوار تک جا پہنچا ۔ اس دیوار پر بینک لاکر جیسا ایک آہنی دروازہ لگا ہوا تھا جو کہ یقیناً بند تھا ۔ پٹڑی اس دروازے کی نچلی درز سے اندر جا رہی تھی اس دروازے کے پار وہ خفیہ راستہ تھا جس کا دوسرا سرا پڑوسی ملک میں چھوٹی حویلی کے تہ خانوں میں پہنچا ہوا تھا ۔

کتنی سنسنی خیز بات تھی کہ اس خفیہ راستے سے بڑے ہی آرام سے سرحد پار کی جا سکتی تھی لیکن اس کے باوجود یہاں اس کی حفاظت پر کوئی مامور نہیں تھا ۔ میں سوچ رہا تھا کہ عسکری لحاظ سے یہ جگہ کتنی اہمیت کی حامل تھی ۔ اس خفیہ راستے کا راز رکھنے کے لیے پتا نہیں کس کس کا منہ بند کیا گیا ہوگا ۔ میری جیب میں موجود پین کی شکل میں اسپائی ویڈیو کیمرا سب کچھ ریکارڈ کر رہا تھا ۔ مجھے یہاں ایک گھنٹا ہو چکا تھا ۔ باہر موجود بے ہوش افراد اب کسی بھی لمحے اٹھ سکتے تھے ۔ اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے مجھے اس بات کا یقین بھی تھا کہ وہ دونوں کسی کو نہیں بتائیں گے کہ یہاں کوئی آیا تھا جو ان کو بے ہوش کر کے کسی شے کو چھیڑے بغیر چلا گیا ہے کیونکہ اس طرح خود ان کی شامت آجاتی ۔

☆☆☆

بڑے عرصے بعد میں فارم ہاؤس آیا تھا ۔ کئی ایکڑ پر پھیلا یہ فارم ہاؤس بڑی زبردست جگہ تھی ۔ یہاں نہایت اعلیٰ اور قیمتی گھوڑے رکھے گئے تھے ۔ میں نے بھی ایک گھوڑے پر بیٹھ کر ریس ٹریک پر گھڑسواری کی اور جب تھک گیا تو اتر آیا اور گھوڑا اصطبل کے رکھوالے نورا کے سپرد کر دیا ۔

میں اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا جب ملگجی سی روشنی میں، میں نے برآمدے میں کھلی چھت والی سرخ جیپ دیکھی ۔

''تو نے مجھے بتایا نہیں کہ ماکھا بھی ادھر آیا ہے ۔''

میں نے نورے سے کہا تو اس کا رنگ بدل گیا ۔ اس نے میری نظروں کا تعاقب کر کے برآمدے میں کھڑی سرخ جیپ کو دیکھ لیا جو ماکھے کے پاس ہی ہوتی تھی ۔

''ماکھا تو جی پرسوں سے ادھر ہی ہے ۔''

''اکیلا ہے یا اور بھی کوئی ہے اس کے ساتھ؟ اور یہ ہے کہاں......؟''

''اکیلا نہیں ہے جی...... کن ٹٹے کی پوری فوج ساتھ ہی ہے...... اور ہونا کہاں ہے جی، وڈے چودھری جی تو ہیں نہیں...... اس لیے پورا ماحول تیار کیا ہے...... کرم آباد سے ''ناچنے والیاں'' اور سیال پور سے ''دیسی'' کا وڈا ڈرم آیا ہے جی ۔'' وہ آہستہ سے بولا ۔ تو میں اس طرف بڑھ گیا جدھر تہ خانوں کا راستہ تھا ۔ مجھے اچھی طرح پتا تھا کہ یہاں تہ خانے ہیں ۔ یہ تہ خانے اسٹور اور گودام کا کام کرنے کے لیے بنائے گئے تھے لیکن درحقیقت یہاں زیر زمین قید خانے بنائے گئے تھے ۔ میں سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچا تو لوہے کا دیو ہیکل دروازہ بند تھا ۔ اندر سے دھمک کی مدھم آوازیں آرہی تھیں ۔ میں واپس اوپر آیا، اب کی بار میرا رخ اس طرف تھا جدھر ان تہ خانوں کا حبس نکالنے کے لیے بڑے بڑے ایگزاسٹ فین لگائے گئے تھے ۔ ان کے ساتھ جالی دار کھڑکیاں بھی تھیں جن سے اندر کا منظر صاف نظر آتا تھا ۔ نیچے تیز روشنی میں ویسا ہی منظر تھا جس کا مجھے اندازہ تھا ۔ فل والیوم کے ساتھ ایک پنجابی گانا چل رہا تھا ۔ بڑے کمرے کے عین وسط میں چار لڑکیاں ڈانس میں مشغول تھیں ۔ نورے کے کہنے کے مطابق یہ کرم آباد کی ''ناچنے والیاں'' تھیں ۔ ان چاروں کے گرد تقریباً دس افراد تھے جن میں سے کن ٹٹا ماکھا...... مجھے صاف نظر آرہا تھا وہ سب نشے میں دکھائی دے رہے تھے ۔

پھر میں چونکا جب میں نے ماکھے کو اٹھتے ہوئے دیکھا وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف جا رہا تھا لیکن یہ دروازہ تہ خانے کا بیرونی دروازہ نہیں تھا بلکہ کمرے کے ایک کونے میں بنا ہوا تھا ۔ میں جانتا تھا کہ اس دروازے کے پار جیلوں

جیسی بیرکیں بنی ہوئی ہیں جہاں چودھری حشمت علی اپنے مجرموں کو قید رکھتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گیا اور چند لمحوں بعد کسی کو گھسیٹتا ہوا باہر کھینچ لایا اور اسے کمرے کے وسط میں پٹخ دیا۔ وہ ایک لڑکی تھی۔ ناچنے والیاں ایک طرف ہٹ گئیں۔ ماکھے نے ایک گلاس اٹھا کر گندا محلول اندر انڈیلا اور نیچے گری ہوئی لڑکی کے بال جکڑ کر کچھ کہنے لگا...... لیکن بے ہنگم موسیقی کے شور میں مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اس بدنصیب کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا لباس پھٹ چکا تھا...... قمیص کی داہنی آستین کندھے کے جوڑ سے غائب تھی۔ بازو پر کہنی سے اوپر تک ایک پٹی بندھی تھی جو خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ ننگے پاؤں اور ننگے سر اس کا حلیہ قابلِ رحم تھا پھر مجھے ماکھے کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''مار مجھے...... اوئے اب مار بھی......'' لیکن جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو اس نے ایک زوردار ٹھوکر اس لڑکی کے سر پر دے ماری۔ وہ گیند کی طرح اچھل کر گری اور تبھی میں نے اس کے چہرے کی پہلی جھلک دیکھی۔ وہ آشتی تھی۔ میرے جسم کا سارا خون میرے چہرے پر جیسے سمٹ آیا ہو۔ کنپٹیوں پر دھمک سی محسوس ہونے لگی۔ میں بت بنا کھڑا رہا...... حتیٰ کہ ماکھے نے اس کے زخمی بازو پر دوسری ٹھوکر لگائی تو اس کی چیخ نے مجھے زندہ کر دیا۔ میں آندھی کی طرح بھاگتا ہوا تہ خانے کی سیڑھیوں سے اترا اور زوردار لات اس دیوہیکل دروازے پر دے ماری جس سے وہ ہلا تک نہیں لیکن اس ٹھوکر کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ اندر سن لی گئی تھی۔ اس کے بعد میں پوری قوت سے دروازے کو پیٹنے لگا۔ دروازہ کچھ دیر بعد کھلا۔ اندر داخل ہوتے ہی میں نے دروازہ کھولنے والے کے منہ پر گھونسا مارا، وہ وہیں پر گھٹنوں کے بل گرتا چلا گیا۔ میوزک بند ہو چکا تھا اور آشتی بھی غائب تھی۔ یقیناً اسے واپس اسی کونے والے کمرے میں ڈال دیا گیا ہوگا۔ میں غصے سے اس دروازے کی طرف بڑھا لیکن ماکھا یک لخت میرے سامنے آ گیا۔

''چھوٹے چودھری جی...... کدھر جا رہے ہیں آپ......؟'' اس کے منہ سے بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔

''سوال کرنے سے پہلے سوچ لے کہ تیرے جسم کے اتنے ٹوٹے کروں گا کہ روح کو حیرانی ہوگی کہ وہ نکلے تو کہاں سے نکلے۔'' میں نے سرد آواز میں کہا۔

''اس جسم کی اک اک بوٹی آپ کی ہی وفادار ہے جناب...... جیسے مرضی ورتیں (استعمال کریں)......'' وہ نشے کے باوجود اپنے قابو میں تھا۔

''ایسا ہی ہوگا...... لیکن ابھی مجھے آشتی کو دیکھنے دو۔'' میں نے آگے بڑھنا چاہا لیکن اس نے پھر راستہ روک لیا۔

''کون آشتی...... ادھر کوئی نہیں ہے جدھر آپ جا رہے ہیں۔''

''چند ساہ (سانس) اور جی لے ماکھے...... مجھے ادھر جانے دے۔'' میں پھنکارا۔

''اللہ کی قسم مار کر دفن کر دیں...... پر ادھر نہیں جانے دوں گا۔ وڈے چودھری کے آنے تک اس بوہے (دروازے) کو کوئی نہیں کھول سکتا۔'' اس کے انداز میں اتنا اطمینان تھا کہ میں جھلا کر رہ گیا۔ میرا پہلا تھپڑ جو اس کے منہ پر پڑا اس کی آواز کسی دھماکے سے کم نہ تھی لیکن وہ کسی چٹان کی طرح اپسے جا مد رہا کہ ذرا سا بھی ہلا نہیں۔ میں نے تابڑ توڑ کئی گھونسے اور تھپڑ اس کے جڑ دیے۔ اس نے ہر وار مسکراتے ہوئے جھیلا۔ ایک بار جو میری لات کھا کر وہ گرا تو میں اس کے جسم کو پھلانگ کر دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس نے لپک کر میرے دونوں پاؤں جکڑ لیے۔

''نہیں چودھری جی...... ادھر نہیں......'' میں اسے وحشیانہ انداز میں ٹھوکریں مارتا رہا۔ نہ میرا غصہ کم ہوا نہ اس کا عزم...... جانے کس مٹی کا بنا تھا وہ کم بخت...... پھر یک لخت اس کے باقی ساتھیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

''چھوڑ دو مجھے حرام زادو!'' میں انہیں گالیاں دینے لگا۔ ماکھا اٹھا...... اپنے لہولہان چہرے کے ساتھ وہ اور بھی بدصورت نظر آ رہا تھا۔

''آپ چلے جائیں چودھری جی...... خدا کا واسطہ یہاں سے چلے جائیں۔ یہ جگہ آپ کے قابل نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا، انہوں نے مجھے جکڑ لیا اور تہ خانے سے باہر سیڑھیوں پر چھوڑ کر دیوہیکل دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ دروازہ نہیں کھلے گا۔ کچھ دیر میں وہیں کھڑا ہانپتا رہا اور پھر بھناتا ہوا واپس حویلی میں آ گیا۔ میں نے فون پر اباجی کا نمبر ملایا۔ وہ آؤٹ آف رینج تھا۔ جواد کا نمبر بھی یہی بتا رہا تھا۔ میرا غصہ بڑھتا جا رہا تھا پھر عمران بھائی کا نمبر ملایا تو انہوں نے ریسیو کر لیا۔

''اباجی کدھر ہیں؟'' میں نے ان کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔

''وہ تو ڈیرہ (چولستان) گئے ہوئے ہیں...... تم ان کے موبائل پر کال کرو۔''

''وہاں شاید سگنل نہیں ہیں ...... ایک بندہ بھیجیں ان تک ...... ڈھونڈیں جہاں بھی ہیں وہ اور میرا پیغام پہنچائیں ان تک۔'' میں پھر چلایا۔

''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ یہ کس لہجے میں بات کر رہے ہو۔'' وہ حیران ہوئے۔

''بھاڑ میں جائے لہجہ ...... ان تک میرا پیغام پہنچائیں کہ اگر آشتی کے ساتھ کچھ بھی برا ہوا تو میں ان کی جاگیر کو آگ لگا دوں گا۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے شاید ......'' وہ بھی جواباً غصے میں بولے اور فون بند کر دیا۔ میں سر پکڑ کر بیڈ پر گر گیا۔

تھوڑی دیر بعد کوئی آہستہ سے میرے قریب آیا اور بیٹھ گیا پھر کسی ہاتھ نے میرے بالوں کو چھوا۔

''میں صدقے میرا لعل ......'' میں نے ناراضی کے سے انداز میں وڈی بھرجائی کا ہاتھ بھی جھٹک دیا۔

''بہت غصہ ہے بھئی ...... آخر کو چودھری حشمت علی کا ہی پتر ہے نا۔ لے نکال اپنا غصہ ...... ساری اگ (آگ) مجھ پر نکال دے۔'' انہوں نے پھر سے میرے بالوں میں ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔ میں بے اختیار ان کی گود میں سر رکھتا چلا گیا۔

''مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے بھرجائی ......'' میں نے بھیگے سے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

دو ملاقاتیں ...... دونوں ہی اتفاقیہ اور قطعی غیر سنجیدہ ...... ان دو ملاقاتوں میں ایسا کیا تھا جو میں اسے اس طرح چاہنے لگا تھا۔ کوئی ایک بات، کوئی ایک تاثر، کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا جس پر اس طرح کا گمان بھی کیا جا سکتا ہو۔ کیا تھا اس لڑکی میں جو مردوں کی طرح لڑتی تھی۔ غنڈوں کو پیٹتی تھی۔ ہر وقت غصے میں رہتی تھی۔ پراسرار طور پر چہرے بدلتی رہتی تھی۔ وہ لمحہ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا جس لمحے میں، میں نے اسے اپنے دل کے قریب محسوس کیا ہو۔ شاید وہ لمحہ ان دو ملاقاتوں میں کہیں نہیں تھا پھر کیا وہ اس تیسری ملاقات میں تھا جو کل رات انجانے میں ہوئی تھی؟ میں نے اسے جس حالت میں دیکھا تھا اس کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا ...... اس کی حالت سے دو چیزیں بڑی واضح تھیں ...... ایک تو اسے خواب آور ادویات دی گئی تھیں، دوسرے اس پر تشدد کیا گیا تھا۔ وہ اپنی بے حسی کے اس مقام پر تھی جہاں میری سوچ کا دائرہ ختم ہو گیا تھا۔ ہاں البتہ وہ وقت یہ انکشاف ضرور کر گیا کہ میں اسے چاہنے لگا ہوں۔ میری آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلیں اور میں فوراً ہی بستر سے اتر گیا۔

''چودھری صاحب آ گئے؟'' باہر نکلتے ہی میں نے نازو سے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''چائے لاؤں!'' اس نے پکارا لیکن میں باہر نکل چکا تھا۔ جس وقت میں گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا، میں نے منشی کرم دین کو دیکھا۔

''تم تو چودھری صاحب کے ساتھ تھے ......؟''

''جی چھوٹے چودھری جی ...... ہم آج سویرے ہی لوٹے ہیں۔''

''اور اب وہ کدھر ہیں ......؟'' میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے پوچھا۔

''وہ حویلی نہیں آئے ...... بلکہ فارم ہاؤس کی طرف چلے گئے تھے۔''

میں گاڑی دوڑاتا ہوا فارم ہاؤس تک پہنچا تو میری توقع کے عین مطابق ...... وہاں سوائے نورے کے اور کوئی نہیں تھا۔

''سویرے چار بجے کے قریب چودھری صاحب آئے تھے جی ...... ماکھے نے ان سے ملاقات کی اور پھر سبھی گاڑیوں میں سوار ہو کر جانے کدھر چلے گئے۔'' نورے نے میرے پوچھنے پر یہ جواب دیا۔ میں کتنی ہی دیر وہاں کھڑا سوچتا رہا لیکن جب سوچ کے گھوڑے دوڑ دوڑ کر تھک گئے تو میں واپس حویلی میں آ گیا۔ اب کی بار میرا رخ جواد کے پورشن کی طرف تھا۔ میں جواد کے کمرے میں آ گیا۔ وہ واش روم میں تھا ...... باہر نکلتے ہی وہ چونک گیا۔

''یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ لگتا ہے ساری رات سوئے نہیں ...... آنکھیں کتنی سرخ ہو رہی ہیں۔''

''یار! ایک مسئلہ ہے لیکن تو زیادہ سوال نہیں کرے گا۔ جتنا پوچھوں صرف اتنا ہی بتائے گا۔'' میں نے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تم جانتے ہو ماکھا اینڈ کمپنی آج کل کسی مشن پر ہے ...... صرف ہاں یا نہ ......'' میں نے آخر میں اس کے سوال پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''میں جانتا ہوں کہ وہ ایک پراسرار لڑکی کے پیچھے ہیں ...... بلکہ تھے کیونکہ اب تک تو انہوں نے اسے پکڑ بھی لیا ہو گا، ہے نا؟''

''لیکن ......'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

''سوال نہیں جواد مجھے صرف یہ جاننا ہے کہ وہ لڑکی

اس وقت کہاں ہے اور کس کی تحویل میں ہے؟''
''میں نہیں جانتا۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کل رات ہمیں یہ اطلاع ملی تھی کہ ماکھے نے اس لڑکی کو پکڑ لیا ہے۔ وہ لڑکی ماما جی کے لیے اتنی اہم تھی کہ انہوں نے اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ شکار کا پروگرام ختم کیا اور واپس آ گئے۔ مجھے انہوں نے وہیں رکنے کا کہا تب مجھے اندازہ بھی نہیں تھا کہ اصل بات کیا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے پہنچا ہوں یہاں...... لیکن تم اس میں اتنی دلچسپی کیوں لینے لگے ہو؟'' وہ سوال کرنے سے باز نہ آ سکا۔
''وہ لڑکی کل تک فارم ہاؤس میں قید تھی...... اور چودھری صاحب حویلی جانے کے بجائے سیدھے فارم ہاؤس ہی گئے تھے...... اور جاتے ہی انہوں نے اس لڑکی کو کہیں اور منتقل کر دیا کیونکہ...... کیونکہ میں اس لڑکی کو بچانا چاہتا تھا۔'' جواد چونک گیا۔ میں نے اسے کل رات کی تفصیل بتا دی۔
''اوہ...... لیکن تم نے ایسا کیوں کیا؟ تم اسے کیوں بچانا چاہتے تھے؟'' وہ بے چینی سے بولا۔
''پتا نہیں کیوں......؟ میں اس سے صرف دو بار اتفاقیہ طور پر ملا تھا...... ایک بار ٹرین میں اور ایک بار شاہ مراد کے دربار پر...... پتا نہیں کیوں میرا دل اس کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔'' میں نے ہیئر کلپ کے مسئلے کو بیچ میں سے حذف کرتے ہوئے اسے بتایا۔
''یہ کیا کہہ رہے ہو تم......؟ تم نہیں جانتے وہ کون ہے؛ وہ مجرمہ ہے مجرمہ......'' وہ بے چینی سے ٹہلتے ہوئے مجھے سمجھا رہا تھا۔
''کوئی انسان ماں کے پیٹ سے مجرم پیدا نہیں ہوتا جودی...... وہ جو بھی ہے، میں اس کے کام سے نفرت کر سکتا ہوں مگر...... اس سے نہیں۔'' میں نے کہا۔
''تم...... تم کیا کر سکتے ہو میں جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں کس مشن پر ہو۔ تم چودھری حشمت علی کے غیر قانونی دھندوں پر سے پردہ اٹھانے آئے ہو۔ میں جانتا ہوں تم نے شہر میں کیا کیا گل کھلائے تھے۔ وہ چیمبر آف کامرس، مشہور سیاستدان اور وہ تمہارا دوست ایس پی...... اور تم کہتے ہو کہ تم وہی لکھو گے جو سچ ہے۔ تو کیا کل کو تم اپنی محبوبہ کے کارنامے بھی افشا کرو گے؟ کیا اس کے بعد وہ تم سے محبت کرنے کے قابل رہے گی؟ ایک صحافی اور مجرم کے بیچ میں یا تو مفاہمت ہوتی ہے یا پھر دشمنی...... محبت کہیں نہیں ہوتی...... بھول جاؤ اسے کامی۔'' وہ تلخی سے بولے جا رہا تھا۔
''تمہیں کیا لگتا ہے میں اپنے باپ سے کوئی انتقام لے رہا ہوں...... کیا میں نے انہیں کبھی سمجھایا یا نہیں؟ تمہاری سوچ سے زیادہ جودی...... تمہاری سوچ سے کہیں زیادہ میں نے انہیں سمجھایا ہے لیکن وہ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے واپسی نہیں ہو سکتی۔'' میں نے بھی تلخی سے کہا۔ ''لہٰذا اب میں مجبور ہوں لیکن میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا تھا۔ میں تو اس لیے آیا تھا کہ تم چودھری صاحب کے بہت قریب ہو اس لیے تمہیں اس لڑکی کے بارے میں پتا ہوگا...... لیکن لگتا ہے یہ معاملہ تم سے بھی چھپا لیا گیا ہے۔ ٹھیک ہے...... اب مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اس بار اس نے بھی مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ جب میں اپنے پورشن کی طرف آیا تو مجھے پتا چلا کہ چودھری صاحب بڑے کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ میں سیدھا ان کی طرف آ گیا۔ وہ اپنے مخصوص تخت پر نیم دراز حقہ گڑگڑا رہے تھے۔
''مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔''
''تو نے جو کچھ نواب اور مہتاب آراء کے ساتھ کیا، اس کے بعد تو مجھ سے بات کرنے کا حق کھو چکا ہے۔'' ان کی گمبھیر آواز گونجی۔
''میں اس بارے میں بات کرنے نہیں آیا۔'' ایک توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''میں آشتی کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں۔''
وہ خاموش رہے۔ ''آشتی وہی لڑکی ہے جو اس وقت ماکھے کی تحویل میں ہے۔'' میں نے مزید کہا۔
''تو نے ماکھے پر ہاتھ اٹھا کر اچھا نہیں کیا۔'' انہوں نے صرف اتنا ہی کہا۔
''مجھے افسوس ہے کہ میں اسے جان سے نہیں مار سکا۔''
''اور مجھے افسوس ہے کہ تو میرا پتر ہے...... چودھری حشمت علی کا پتر۔'' وہ بھڑک کر بولے۔
''مجھے اس بحث میں نہیں پڑنا ابا جی۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کو چھوڑ دیا جائے۔''
''تجھے اس سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ تو نہیں جانتا وہ کون ہے اور ہم نے اسے کیوں پکڑ رکھا ہے۔''
''مجھے کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ اس لڑکی کو چھوڑ دیا جائے۔ آپ کو اس سے جو چیز چاہیے وہ اس کے پاس نہیں ہے، وہ میرے

پاس ہے۔''

وہ چونک گئے۔''تیرے پاس......؟ کیا ہے تیرے پاس؟ کیا تو جانتا ہے کہ وہ کس کے لیے کام کرتی ہے؟''

میں نے فوراً اندازہ لگایا کہ اباجی کو ہیروں کے بارے میں علم نہیں......وہ صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آشتی کس کے لیے کام کرتی ہے لہٰذا میں نے فوراً ہیروں کی بات چھپالی۔

''نہیں، میں نہیں جانتا......لیکن اگر آپ مجھے اس سے ملنے دیں تو میں اس سے وہ ساری معلومات حاصل کرسکتا ہوں جو آپ کے بندے اس پر تشدد سے بھی حاصل نہیں کرسکے۔''

''نہ تو تیری بات ہمیں سمجھ آتی ہے اور نہ تجھے ہماری بات سمجھ آتی ہے۔ ہمیں جو چاہیے ہم وہ خود ہی حاصل کرلیں گے۔ تو چھٹی پہ آیا ہے......مزے کر اور چلا جا واپس شہر۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے ہونے دے۔ تیری ضرورت نہ کبھی پہلے تھی اور نہ اب ہے......اور جو تھوڑی بہت بات چیت کا رشتہ ہمارے بیچ تھا تو اسے ختم کرچکا ہے۔ تو نے نواب سے نہیں ہمارے ساتھ بھی تعلق توڑ لیا ہے۔''

''آپ کے لیے بیٹے سے زیادہ اہم نواب صاحب ہیں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''کاش تو نے کبھی پتر ہونے کا حق ادا کیا ہوتا۔''

میں جھنجلاتے ہوئے وہاں سے نکل کر اپنے کمرے میں آگیا۔ کچھ دیر ہی گزری تھی جب میرے موبائل پر جواد کی کال آئی۔

''میں جانتا ہوں وہ لڑکی کہاں اور کس کی قید میں ہے......لیکن میں تمہیں اس کا پتا بتانے کے علاوہ اور کوئی مدد نہیں کرسکتا۔'' اس کے بعد اس نے مجھے اس جگہ کا پتا بتادیا۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر شروع ہوچکا تھا......پہلی تاریخ کے چاند کی وجہ سے زیادہ روشنی نہیں تھی۔ میں پچھلے ایک گھنٹے سے درختوں کے اس جھنڈ میں بیٹھا تھا۔ مجھ سے کچھ دور وہ چار دیواری تھی جو نواب صاحب کا ڈیرہ کہلاتی تھی۔ جواد کے مطابق آشتی اسی چار دیواری کے اندر تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی لیکن اندر کتنے لوگ تھے یہ میں نہیں جانتا تھا۔ میں ڈیرے کی طرف بڑھا اور چند لمحوں میں ہی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر ایک درخت کی اوٹ میں بیٹھا نظر دوڑاتا رہا۔ فی الحال تو کوئی بندہ بشر نظر نہیں آیا۔ سامنے برآمدہ تھا اور اندر بنے دو دروازے بند تھے۔ میں برآمدے کے ساتھ گھومتا ہوا عمارت کے عقبی طرف

آگیا۔ یہاں ایک پرچھتی سی بنی تھی۔ اندر چارا کاٹنے والی بجلی کی مشین لگی تھی اور ایک طرف کپاس کی خشک ٹہنیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ فوری طور پر ایک خیال ذہن میں آیا اور میں نے جیب سے لائٹر نکال کر ان خشک ٹہنیوں کو آگ لگادی۔

اس کے بعد میں واپس اسی جگہ آیا جہاں سے کودا تھا اور درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی شعلے بھڑک اٹھے اور دھڑا دھڑ آگ جلنے لگی۔ اس آگ میں سرکنڈوں اور پھونس سے بنی چھت بھی شامل ہونے لگی تھی۔ اس کے بعد اندر سے کچھ آوازیں آئیں اور پھر برآمدے کا ایک دروازہ دھڑ سے کھلا۔ اندر سے چار پانچ افراد بھاگتے ہوئے نکلے اور آگ کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ میں نے ایک لمحہ توقف کیا کہ کہیں اور کوئی بھی باہر نہ آجائے لیکن جب کوئی اور نہیں آیا تو میں بھاگتا ہوا برآمدے میں آیا اور کھلے دروازے کے اندر گھس گیا۔ باہر سے اب چیخنے کے ساتھ ساتھ گالیوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ میں اندر داخل ہوا تو خود کو ایک کمرے میں پایا۔ یہاں میرے دائیں بائیں تین چار بند دروازے اور بھی تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک دروازہ کھلا اور کوئی بھاگتا ہوا باہر نکلا۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی وہ رکتے رکتے بھی میری پہنچ میں آچکا تھا۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی گن کو پکڑا اور دائیں ہاتھ سے اس کا گلا پکڑ کر اسے دیوار کے ساتھ لگادیا۔ میرا انگوٹھا اس کی شہ رگ پر تھا میں نے اسے دباتے ہوئے پوچھا۔''وہ لڑکی کہاں ہے، جسے چودھری حشمت علی کے بندے یہاں لائے تھے......؟'' اس کے منہ سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ سوال پوچھنے کے بعد میں نے دباؤ کم کردیا۔

''مم میں نہیں جانتا وہ......'' میں نے دباؤ بڑھا دیا اور اس وقت کم کیا جب اس کا پورا جسم کانپنے لگا۔

''وہ...... وہ اس طرف...... تہ...... تہ خانے میں ہے۔'' اس نے اٹک اٹک کر کہا۔ میں نے گردن سے ہاتھ ہٹا کر کنپٹی پر مکا مارا تو وہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کی گن اٹھا کر میں اس دروازے کی طرف آگیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ دروازے پر بڑا سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے گن کے بھاری دستے کی پہلی ضرب سے ہی اسے توڑ دیا اور اندر داخل ہوگیا۔

کمرے کے اندر تمباکو کی بوریوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس کی بو دماغ کو چڑھ رہی تھی۔ لمبائی کے رخ پر بنے اس کمرے کے آخری کونے میں تہ خانے کا تختہ فرش پر نصب نظر آرہا تھا۔ اس تختے کے باہر بھی کنڈی لگا کر تالا لگایا

گیا تھا۔ میں نے دو تین بار گن کے بٹ مارے لیکن اسے کچھ بھی نہ ہوا۔ تب میں دو قدم پیچھے ہٹا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ گن کاک کر کے میں نے برسٹ مارا۔ تڑتڑاہٹ کی آواز دھماکوں سے کم نہیں تھی۔ تختے کی کنڈی تالے سمیت اڑ چکی تھی۔ میں نیم اندھیرے میں ڈوبی سیڑھیاں اترا۔ یہاں نیچے بھی تمباکو کی ہی بوریاں تھیں لیکن میری نظریں اس کونے پر جمی تھیں جہاں زمین پر پیال بچھائی گئی تھی...... اور اس پیال پر جو وجود ٹیڑھا میڑھا پڑا تھا وہ یقیناً آشتی کا ہی تھا۔ وہ نیم بے ہوش تھی۔ میں نے اسے اٹھایا اور سیڑھیوں کے ذریعے باہر نکل آیا۔ جس وقت میں کمرے کے دروازے کی جانب بڑھا تب مجھے بند دروازے کی نچلی درز سے کچھ سایوں کی حرکت محسوس ہونے لگی۔ میں نے فوراً آشتی کو زمین پر لٹایا اور گن کا رخ نیچے کر کے دو برسٹ مارے۔ دروازے کا نچلا تختہ ہی اڑ گیا۔ میں باہر نکلا تو یہاں دو بندے تھے جو فائرنگ کی .... زد سے بچ کر کمرے سے باہر بھاگ گئے تھے۔

اسی لمحے ہال کمرے میں شدید فائرنگ ہونے لگی۔ آگ بجھانے والے یقیناً گولیوں کی آوازوں پر واپس آ گئے تھے......اور اب برآمدے سے اندر فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کی گولیاں کھلے دروازے اور کھڑکیوں کے راستے اندر فرش اور دیواروں پر اندھا دھند برس رہی تھیں۔ میں نے چند جوابی فائر کیے اور یہ خیال رکھا کہ ان گولیوں سے کوئی شدید زخمی نہ ہو اور واپس تہ خانے والے کمرے کی طرف آ گیا۔ آشتی یہیں زمین پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس طویل کمرے میں کوئی اور دروازہ یا کھڑکی نہیں تھی...... صرف بلندی پر روشن دان تھے جن پر جالی لگی ہوئی تھی لیکن کوشش کی جا سکتی تھی۔ میں نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اس کے آگے تمباکو کی بوریوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔ اس کے بعد روشن دان کی طرف متوجہ ہوا۔ بوریوں کی ایک قطار سیدھی اس تک جا رہی تھی۔ میں نے تمباکو کی بوریوں کو ایک خاص انداز میں اٹھا اٹھا کر اس کے نیچے رکھنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد میں ہانپ ضرور رہا تھا لیکن کامیاب ہو چکا تھا۔ اب روشن دان تک بوریوں کی ایک سیڑھی سی بن گئی تھی۔ پہلے میں اکیلے اوپر گیا اور روشن دان پر لگی جالی کو گن کے بٹ مار مار کر توڑ دیا۔ اسی دوران کمرے کے دروازے پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں تیزی سے نیچے آیا اور آشتی کو اٹھا کر روشن دان کی طرف آ گیا۔ یہ روشن دان دراصل وہ بڑے بڑے سوراخ تھے جہاں اس

گودام نما کمرے کا حبس نکالنے کے لیے بڑے بڑے ایگزاسٹ فین لگانے تھے مگر ابھی تک یہ فین نہیں لگے تھے۔ بہر حال، ہم ان سوراخوں میں سے گزر سکتے تھے۔ میں نے آشتی کو اس سوراخ سے باہر نکال کر لٹکایا اور اسے بازوؤں سے پکڑ کر نیچے اتارتا گیا۔ وہ بدستور بے ہوش تھی۔ اب اس کے ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہ گئے تھے۔ میں نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے۔ وہ دھم کی آواز کے ساتھ نیچے جا گری۔ اس وقت طویل کمرے کا دروازہ ٹوٹ گیا اور اس کے سامنے رکھی بوریوں کا ڈھیر بھی ڈھیر ہو گیا۔ عین اس وقت جب وہ اندر داخل ہوئے میں باہر نکل چکا تھا۔

آشتی پھولوں کی ایک کیاری میں گری تھی جہاں زمین نرم تھی۔ میں نے اسے وہیں پودوں میں چھپایا اور خود تیزی سے برآمدے کی طرف بڑھ گیا۔ میرا نہیں خیال تھا کہ اب اس عمارت میں کوئی اور بندہ اپنے ہوش و حواس میں موجود ہو۔ لہٰذا میں واپس آیا، آشتی کو اٹھایا اور گیٹ کی طرف بھاگا۔

جب میں باہر نکل رہا تھا تب میں نے ہوا کی لہروں پر شور کی آوازیں سنیں۔ دور سے کچھ ٹمٹماتی روشنیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ یہ رینجرز نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ بارڈر ایریا یہاں سے دور تھا اور نہ ہی پولیس ہو سکتی تھی کیونکہ اس علاقے میں کچھ ہی دور پولیس چوکی بنی ضرور تھی لیکن وہ اتنی زیادہ فائرنگ سننے کے باوجود ادھر آنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے۔

دو اندازے تھے ...... یا تو یہ ڈیرے والوں کے ہی بندے تھے یا پھر گاؤں کے وہ مسلح لوگ تھے جو عموماً رات کو فائرنگ کی آوازیں سن کر ڈاکوؤں کی سرکوبی کے لیے باہر نکل آتے تھے۔ میں ان کے مخالف رخ پر بھاگنے لگا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ دور تک پھیلے کھیتوں میں ایک انسانی وجود کا وزن اٹھائے میں کتنا بھاگ سکتا تھا مگر جیسے ہی میں کچھ دور ایک کچے راستے پر پہنچا، ایک سایہ تیزی سے میری طرف آیا۔ میں نے گن سیدھی کی۔

''چھوٹے چودھری جی ...... مجھے جواد صاحب نے بھیجا ہے...... اس طرف آ جائیں۔'' اس نے سرگوشی کی۔ جواد کا نام سن کر میں مطمئن ہو گیا۔ اس بات کی مجھے پہلے سے ہی امید تھی کہ جواد کہیں نہ کہیں میری مدد ضرور کرے گا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت تلے ٹریکٹر کھڑا تھا۔ کچھ دیر بعد میں آشتی کے ساتھ اس پر سوار ایک انجانی منزل کی طرف رواں تھا۔

☆☆☆

مٹی کی کچی دیواروں سے بنے اس گھر میں صرف تین کمرے ہی تھے۔ میں آخری کمرے میں تھا۔ یہاں لالٹین کی زردسی ہلکی روشنی اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ چارپائی پر آشتی لیٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔ پہلی بار میں اس کے اتنے نزدیک تھا۔ اس کی گہری سانسوں کا زیروبم دریا کی بہتی لہروں جیسا تھا۔ مسلے ہوئے کپڑوں اور مخدوش حالت کے باوجود وہ کسی مقدس صحیفے کی طرح میرے سامنے تھی، یوں جیسے اسے مجھ پر ہی نازل کیا گیا ہو۔ اس کے بالوں کی ایک لٹ پیشانی کے زخم سے چپکی ہوئی تھی۔ میں نے ڈیٹول ملے نیم گرم پانی میں بھگوئی روئی کے ساتھ اس زخم کو صاف کیا۔ چند لحوں بعد یہ بال آزاد ہو گئے جنہیں میں نے ہٹا کر زخم کو اور اچھی طرح صاف کیا۔ یہ پیشانی کا وہ زخم تھا جو میری نظروں کے سامنے ماکھے نے اسے ٹھوکر لگا کر دیا تھا۔ میں نے اس پر پٹی باندھ دی۔ گردن پر ہلکی خراشیں تھیں ان پر صرف ڈیٹول ہی استعمال کیا پھر میری نظر اس کے بازو کی طرف گئی۔ بائیں بازو کی کہنی سے اوپر ایک خون آلود بوسیدہ پٹی تھی۔ میں نے اسے اتارا تو پریشان ہو گیا۔ یہ گولی کا زخم تھا اور کچھ دن پرانا تھا۔ مجھے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ گولی اندر نہیں ہے لیکن زخم میں پیپ پڑنے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ میں نے فی الوقت اسے بھی صاف کر کے نئی پٹی باندھ دی۔ اس کے جسم کے باقی زخم لباس کے اندر چھپے تھے اور وہ میری دسترس سے باہر تھے۔ میں نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا، اس کا جسم بری طرح تپ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔

اس سخت جان لڑکی کو تو اپنی جان کی پرواہ ہی نہیں تھی مگر تشدد کرنے والوں نے اس پر ایسا تشدد کیا تھا کہ وہ اس وقت اپنی زندگی کے لاچار ترین لمحات میں تھی۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھا تو میں اس کی تپتی پیشانی پر ہولے ہولے پھونکیں مارنے لگا۔

میری نظریں اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ لالٹین کی زرد اور مدھم روشنی میں اس کے چہرے کی رنگت کچھ زیادہ ہی زرد نظر آ رہی تھی۔ سوئی سوئی کیفیت میں بھی کرب کے آثار بڑے واضح تھے۔ اسی لمحے ایک کھٹکا سا ہوا' میں نے پھرتی سے وہی گن اٹھالی جو ڈیرے سے ہی میرے ساتھ یہاں تک آئی تھی۔ دروازے سے میرا محسن اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک دیہاتی لڑکی بڑی سی چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

''چھوٹے چودھری جی...... میں اپنی زنانی صغراں کو لے آیا ہوں۔'' وہ بولا تو میں نے بے تابی سے کہا۔

''دیکھو صغراں! ادھر آؤ...... تم نے اس لڑکی کا لباس بدلنا ہے اور دیکھنا جسم پر جہاں جہاں چوٹ کے نشان ہوں انہیں صاف کر کے دوا لگانی ہے...... اور اگر چوٹ گہری ہو تو پٹی بھی کر دینا۔'' میں نے اسے سمجھایا۔ ''کر لوگی نا ایسا......؟''

''ہاں جی...... میں نے باجی کلثوم کے ساتھ کام بھی کیا ہے جی...... وہ ''ہیلتھ ورکر'' تھیں جی......''

''ٹھیک ہے اور اپنا کوئی جوڑا بھی لائی ہونا؟'' میں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں مطمئن ہو کر اس کے آدمی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ مٹی سے پوتے صحن میں دیسی کیکر کا گھنا درخت تھا۔ میں اس کے نیچے بچھی چار پائی پر آ بیٹھا۔ اندھیرے میں ہم دونوں سایوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔

''اب بتاؤ کون ہو تم...... اور جواد نے تمہیں کیا کہا تھا؟'' میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اپنے محسن سے سوال کیا۔ وہ عام مزارعوں کی طرح زمین پر ہی بیٹھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں جتنا بھی اصرار کروں، یہ میرے برابر نہیں بیٹھے گا۔

''میرا نام شوکا ہے جی۔ میں مراد آباد میں آپ کے منشی بابا رحمے کے ساتھ ہوتا ہوں۔ گودام میں بوریوں کو نکلوا کے ٹرکوں پر لوڈ کروانے کا کام میرے ذمے ہے جی۔ باؤ جواد بہت اچھے بندے ہیں جی۔ وہ ہم جیسے غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مہینے بعد کنک یا چول (گندم یا چاول) بھی دلا دیتے ہیں...... اور کبھی کبھار پگار (تنخواہ) کے علاوہ بھی پیسے دے دیتے ہیں۔ کل انہوں نے مجھے علیحدہ بلوایا اور کہا کہ ایک ضروری کام کرنا ہے لیکن کسی کو خبر نہ ہو۔ میں نے کہا حکم دیں سرکار، ایسا کم کریں گے کہ مونڈھے پر کھڑے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو گی۔ بولے بالکل ایسا ہی کام کرنا پھر کہنے لگے آدھی رات کے بعد نواب صاحب کے ڈیرے کے آس پاس ٹریکٹر لے کر جانا ہے۔ چھوٹے چودھری اکیلے یا کسی کے ساتھ نظر آئیں تو انہیں اس مکان میں لے جانا ہے۔ تو سرکار میں نے چاچے فضلو سے بہانہ کر کے ٹریکٹر لیا اور ڈیرے کے پاس پہنچ گیا۔ آپ کو لے کر یہاں آیا اور ٹریکٹر گھر کھڑا کر کے آپ کے کہنے پر اپنی زنانی کو بھی لے آیا ہوں۔''

اس نے تفصیل بتائی۔ اس سے پہلے میں اس گھر کا جائزہ لے چکا تھا۔ یہاں کے ایک کمرے میں ٹی وی اور کرسیاں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے کمرے میں کچن بنا تھا جہاں چولہا، گیس کا سلنڈر اور کھانے پینے کی اشیا سے بھرا ریفریجریٹر بھی موجود تھا۔ تیسرے کمرے میں چار پائیاں اور کرسیاں پڑی تھیں۔ میں نے آشتی کو یہیں لٹا دیا تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی لیکن وہ ہوش میں نہیں تھی۔ پوشیدہ زخموں کی بینڈیج اور لباس تبدیل کروانے کے لیے میں نے ہی شوکے کو کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی یا بہن کو لے آئے۔ یہاں مجھے ایک اچھا خاصا فرسٹ ایڈ بکس بھی مل گیا تھا جس سے میں نے طاقت کے انجکشن اور بینڈیج کا سامان نکال کر استعمال کیا تھا۔ جواد نے بڑے موقع پر میری مدد کی تھی ورنہ آشتی کو اس حالت میں لے کر میں کہاں جاتا۔

''چھوٹے چودھری جی...... میں نے بی بی کا لباس بدل دیا ہے۔'' شوکے کی بیوی باہر نکل کر کہنے لگی۔

''اور چوٹیں وغیرہ......؟'' میں نے پوچھا۔

''چوٹ تو نہیں جی بس نیل پڑے ہوئے تھے۔ میں نے دوا لگا دی ہے۔ پر جی بی بی کو بڑا ای تیز تاپ (بخار) چڑھا ہے آپ کہیں تو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کر دوں؟''

''ہاں...... تم ایک برتن میں برف اور پانی لے آؤ۔ میں پٹیاں کرتا ہوں جب تک تم چائے بنا دینا۔ میرا بھی سر درد کر رہا ہے۔'' میں اسے ہدایات دیتے ہوئے کمرے میں آ گیا۔ ایک جانب کھڑا پیڈسٹل فین پوری رفتار سے چل تو رہا تھا لیکن گرمیوں کا حبس کمرے میں موجود تھا میں نے لالٹین کی لو مزید دھیمی کرتے ہوئے کمرے کی کھڑکیاں بھی کھول دیں تاکہ تازہ ہوا اندر آ سکے۔

☆☆☆

میری آنکھیں کسی کھٹکے سے ہی کھلی تھیں۔ کمرے کی کھلی کھڑکی سے دھوپ کی کرنیں براہ راست آشتی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ جاگ رہی تھی۔ میں نے پہلے تو کھڑکی بند کی پھر کمرے سے باہر نکل کر پورے گھر کا راؤنڈ لگایا۔ شوکا اور اس کی بیوی فجر کے وقت ہی چلے گئے تھے۔ میں کافی دیر تک آشتی کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں کرتا رہا تھا جس سے کافی افاقہ ہوا تھا اور پھر یونہی کرسی پر بیٹھا بیٹھا جانے کب سو گیا تھا۔ اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔ میں نے اپنے موبائل سے جواد کو کال کی۔ بیل بجتی رہی لیکن اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ باورچی خانے میں میں نے دودھ گرم کر کے پیالے میں ڈالا اور اس میں ڈبل روٹی کے دو پیس ڈال کر واپس کمرے میں آ گیا۔ آشتی ویسے ہی لیٹی ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظریں مجھ پر پڑیں وہ بری طرح چونک گئی۔

(جاری ہے)



ذہانت

سلیم انور

سراغ رسانی بھی ایک ایسا دلچسپ ہنر ہے جس میں اگر مہارت مل جائے تو اس فن کو استعمال کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ اس نے بھی ایک معمولی سی بات سے غیر معمولی معمّا حل کرلیا جس کے بارے میں شاید اس کے افسران کا گمان تک نہ گیا تھا... گویا ذہانت کسی اعلیٰ یا ادنیٰ کی میراث نہیں ہوتی۔

مغرب سے درآمد شدہ انتہائی دلچسپ کیس کی روداد

سیاہ رنگ کی کیڈی لاک کار شہر کی مصروف شاہراہ کے کارنر پر زناٹے سے گھومی اور کورٹ ہاؤس کی سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اس کی رفتار میں قدرے کمی آگئی۔ کار کی پسنجر سائڈ کی کھڑکی کا ہلکے رنگ کا شیشہ نیچے کھسکا اور ایک سیمی آٹومیٹک ہینڈ گن کی نال باہر جھانکنے لگی۔

مجرموں کے گروہ کا مخبر اور مرکزی حکومت کا وعدہ معاف گواہ پال گلیپسی چلتے چلتے سہم کر ٹھٹک گیا۔ وہ جہاں تھا، اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اسے جس بات کا ہمیشہ ڈر

رہتا تھا، اب اس کا امکان یقینی دکھائی دے رہا تھا۔

پال گلیسپی کی حفاظت پر مامور ایف بی آئی کے باڈی گارڈز نے فوراً خود کو ڈھال بناتے ہوئے پال گلیسپی کو نیچے گرا دیا۔ انہوں نے بھی خطرہ محسوس کرلیا تھا لیکن ان کی بروقت حفاظتی تدبیر اور چوکسی کے باوجود سیاہ کیڈی لاک کار سے چلائی گئی گولیوں میں سے ایک پال گلیسپی کے شانے کے پار ہو چکی تھی۔

سڑک پر کیڈی لاک کار کے پہیوں کی چرچراہٹ گونجی اور کیڈی لاک رواں ٹریفک کے درمیان سے فراٹے بھرتی ہوئی آگے نکل گئی لیکن کار کے ڈرائیور سے ایک غلطی ہوگئی۔ اس نے مرکزی شاہراہ کی طرف مڑنے...... کے بجائے کیڈی لاک بائیں جانب کی ایک بغلی گلی میں موڑ دی اور آگے جاکر اسے رکنا پڑا کیونکہ وہاں ایک ڈلیوری وین ڈبل پارکنگ کیے ہوئے تھی اور آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کیڈی لاک کے دونوں سوار عجلت میں کار سے اتر کر پیدل ہی آگے کی جانب دوڑ پڑے۔

انہوں نے خود کو چار پولیس افسران کے نرغے میں پایا جو اپنی ڈیوٹی ختم کرکے واپس جا رہے تھے۔ فائرنگ اور پھر پولیس سائرن کی آواز سن کر وہ پولیس افسر چوکنا ہو گئے تھے۔ انہوں نے جب دو آدمیوں کو تیزی سے بھاگتے ہوئے پایا تو ان پر جھپٹ پڑے اور انہیں دبوچ لیا۔

اتنے میں ایف بی آئی کے لوگ بھی وہاں پہنچ گئے اور پولیس افسروں نے دونوں مجرموں کو ان کے حوالے کر دیا۔

اسپیشل ایجنٹ براؤن اس یونٹ میں نیا آیا تھا اور اسے ہمیشہ غیر اہم اور بور کر دینے والے کام دیے جاتے تھے۔

اس کیس میں ایجنٹ براؤن سے کہا گیا کہ وہ کیڈی لاک کار کو گلی سے نکال کر باہر لے آئے تاکہ ٹریفک کی روانی نارمل ہو جائے۔

کار میں سوار ہونے اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کے بعد ایجنٹ براؤن نے کار کے عقبی آئینے کی پوزیشن درست کی، کار کو ریورس کر کے پیچھے لے گیا اور پھر اسے گھما کر وہاں لے آیا جہاں اس کے ساتھی دونوں ملزموں کو ان کے شہری حقوق پڑھ کر سنا رہے تھے۔

ایجنٹ براؤن کیڈی لاک سے نیچے اتر کر کھڑا ہو گیا اور اپنے ساتھیوں کی کارروائی دیکھنے لگا۔

ہتھکڑی پہنے ہوئے ایک ملزم کا قد لانبا، جسم اکہرا تھا اور چہرے پر اداسی طاری تھی۔ ہتھکڑی والا دوسرا ملزم قامت میں اپنے ساتھی سے پانچ انچ چھوٹا تھا۔ اس کا قد ایجنٹ براؤن جتنا تھا البتہ اس کا جسم اپنے ساتھی کے مقابلے میں بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ لہراتے ہوئے جوش وخروش سے باتیں کر رہا تھا۔

ایف بی آئی کے اس اسپیشل یونٹ کا ڈائریکٹر ایجنٹ فورڈن سخت برہم ہو رہا تھا۔ ''انہوں نے اپنی گن گلی کے ایک نالے میں پھینک دی ہے۔'' فورڈن نے غراتے ہوئے کہا۔ ''انہوں نے اپنے دستانے بھی وہاں نالے میں چھپا دیے ہیں۔ آل رائٹ، بوائز۔ میں ایک بار پھر تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم میں سے فائر کس نے کیے تھے؟''

''میں نے نہیں کیے تھے۔'' تومند پستہ قد ملزم نے کہا۔

''میں نے بھی نہیں کیے تھے۔'' دبلے پتلے اداس چہرے والے نے کہا۔

ان دونوں کا جواب سن کر ایجنٹ براؤن مسکرانے لگا۔ اسے اپنے باس کو متاثر کرنے کا ایک عمدہ موقع مل رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں کہ فائرنگ ان دونوں میں سے کس نے کی تھی۔'' ایجنٹ براؤن نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس کا باس ایجنٹ فورڈن یہ سن کر چونک پڑا۔ ''ان میں سے فائرنگ کرنے والا کون ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یہ!'' ایجنٹ براؤن نے پستہ قد ملزم کی جانب اشارہ کیا۔

''کیا تم یہ وثوق سے کہہ رہے ہو؟''

''ہاں۔ اس لیے کہ جب آپ نے مجھے ان کی کیڈی لاک گلی سے ریورس کر کے ہٹانے اور ٹریفک کے لیے راستہ صاف کرنے کا حکم دیا تھا تو کیڈی لاک میں سوار ہوتے ہی مجھے سب سے پہلے عقبی آئینہ ایڈجسٹ کرنا پڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ پچھلا ڈرائیور قامت کے لحاظ سے خاصا مختلف تھا چونکہ اس تومند پستہ قد ملزم کا قد میرے برابر ہے لہٰذا لمبے قد والا ہی کیڈی لاک چلا رہا تھا اور فائرنگ کرنے والا ملزم یہ پستہ قد اور تومند شخص ہے۔''

اس کا باس ایجنٹ براؤن کی ذہانت پر اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

زندان

زویا اعجاز

اگرچہ سب جانتے ہیں کہ قیدوبند کی صعوبتیں آسان نہیں مگر کچھ لوگ اس مصیبت میں از خود گرفتار ہوکر فخر محسوس کرتے ہیں یہ اور بات کہ یہ زندان لوہے کی سلاخوں کا ہے یا رواجوں کا... وہ لوگ بھی باپ داداؤں کے رواجوں کے قیدی تھے اور جب کسی نے اس قید سے رہائی چاہی تو اس کے پر کاٹ دیے گئے... کہ یہ پرواز اس کے مقدر کا حصہ ہو ہی نہیں سکتی... ان کی آنکھوں نے بھی کچھ خواب دیکھ لیے تھے ایسی آزاد فضا میں سانس لینے کے جوان کی تقدیر میں تھی ہی نہیں۔

خون کی ہولی کھیلنے والے خون کے رشتوں کا دلخراش فسانہ



چودھری اشفاق پرویز کے گھر میں آج شادی تھی۔ شادی خوشیوں، مسرتوں اور چاہتوں کا استعارہ ہوتی ہے لیکن اشفاق کے گھر کی یہ دوسری شادی ایسی کسی بھی کسوٹی پر پوری نہیں اتر رہی تھی۔ رسول نگر کے باسیوں کو لگ بھگ ایک سال قبل اشفاق پرویز کے پہلوٹھی کے بیٹے ندیم کے نکاح کی تقریب اب تک نہیں بھولی تھی۔ کشادہ گلی میں ٹینٹ لگا کر مردوں کے لیے خصوصی محفل کا اہتمام تھا۔ قریبی شہر کے مشہور ترین خواجہ سراؤں کے گروہ نے رات بھر پنجابی

گانوں پر دھما چوکڑی مچائے رکھی تھی۔ عیش و طرب کی یہ محفل اس وقت ختم ہوئی جب موذن نے نمازِ فجر کے لیے غافل دلوں کے قفل ہٹانے کے لیے صدائیں دیں۔

آج اشفاق پرویز کی اکلوتی بیٹی کی شادی تھی۔ ایک خاموش اور یاسیت نے حویلی نما اس گھر کے در و دیوار کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ خواجہ سراؤں کی جگہ اداسی بال کھولے رقصاں تھی۔ گھر کے مکین سادہ سے کپڑوں میں ملبوس کسی روبوٹ کے مانند ضروری کام نمٹا رہے تھے۔ ہونٹ سختی سے بھینچے، آنکھوں میں سرد مہری کے تاثرات لیے وہ ماحول کی وحشت اور بوجھل کیفیت میں مزید اضافہ کر رہے تھے۔

زنانہ و مردانہ حصے میں رسمِ طعام مکمل ہوئی تو دلہن کو اس کے کمرے سے باہر لایا گیا۔ اس کے سادہ و سوگوار حسن پر نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ اپنی نئی زندگی سے متعلق خواب اور شریکِ حیات کے تصور سے ہی اس کے وجود میں ایک میٹھی سی لہر ابھرتی اور ایک سرشاری سی اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی۔

مجازی خدا سے وابستہ جذبات، احساسِ ملکیت کا تفاخر، بوجھل آنکھوں میں خمار بن کر چھلک رہے تھے لیکن اس خمار میں کہیں نہ کہیں ایک اضطراب بھی کروٹ لے رہا تھا۔ والدین کے آنگن اور جان چھڑکنے والے بھائیوں سے دوری کا تصور بار بار پلکیں نم کر دیتا تو وہ بوجھل سانس لیے پہلو بدل کر رہ جاتی۔ اسے اپنے آس پاس اداسی اور وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

چند لمحے یونہی خاموشی سے سرک گئے پھر اس کی سماعت میں ایک مانوس آواز آئی۔ ''دلہن کو رخصت کرنے کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ الجھ گئی۔ ''ابھی کیسے بھلا؟ ابھی تو ایجاب و قبول کے مراحل باقی ہیں۔ ابھی تو یوسف کو اپنا شرعی ساتھی تسلیم کرنا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

'یوسف' کا نام ذہن میں آتے ہی اس کی ذہنی رو ایک بار پھر منقطع ہو گئی اور وہ نہایت انہماک سے اس کے تصور میں گم ہو کر گرد و پیش سے بیگانہ ہو گئی۔

☆☆☆

رسول نگر ایک بے مثال قصبہ تھا۔ یہاں کی مٹی میں محبت اور روایت پسندی رچی بسی تھی۔ قصبے کے باسی بہت تفاخر سے اپنی مخصوص طرزِ فکر سے چمٹے ہوئے تھے۔ گناہ و ثواب کے نظریات بھی منفرد تھے۔ ہر وہ کام جو پرکھوں کی روایات سے متصادم ہوتا، گناہ کے زمرے میں شمار ہوتا۔ اپنے آباء کے قائم کردہ رواجوں کا فروغ ہی ان کی اولین ترجیح تھا۔

وہ اپنے رواجوں کے قیدی تھے اور انہیں یہ اسیری راس آ چکی تھی۔ اشفاق پرویز بھی انہی روایات کا پابند تھا۔ زندگی کے ہر معاملے میں اس کے معیار دُہرے تھے اور ان معیار کا براہِ راست تعلق 'اصناف' سے تھا۔ اسے بچپن میں مولانا صاحب کا پڑھایا ہوا ایک سبق کبھی فراموش نہ ہو سکا تھا۔ وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ ''مرد کا درجہ عورت سے بلند ہے۔''

لیکن یہ اتفاق تھا یا قدرت، وہ دوسرا سبق یاد نہ رکھ سکا۔ مولانا صاحب نے یہ بھی تو بتایا تھا کہ مرد ایک حاکم ہے تو اہلِ خانہ اس کی رعیت اور ہر حاکم اپنی رعیت سے حسنِ سلوک، عدل اور برتاؤ کے لیے جوابدہ ہوگا۔

اشفاق پرویز کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ ان کی پرورش بھی خاندانی و علاقائی روایات کے عین مطابق ہوئی۔ بڑے بیٹے ندیم کو بچپن ہی سے قائم مقام جانشین کا رتبہ حاصل تھا۔ اس نے صرف اتنی ہی تعلیم حاصل کی جتنی اپنی جاگیر کا حساب کتاب دیکھنے کے لیے ضروری تھی۔ دوسرا بیٹا فرحان البتہ پڑھائی میں کافی ہوشیار تھا اور رسول نگر کے اکلوتے ہائی اسکول میں خوب نام روشن کر رہا تھا۔

اس کی تیسری اور آخری اولاد ثنا تھی جس کے لیے اشفاق کے دل میں پدرانہ جذبات بیٹوں سے کم نہیں تو زیادہ بھی بہر حال نہ تھے۔ رسول نگر میں لڑکیوں کی تعلیم کا تا حال کوئی رواج نہیں تھا۔ انہیں محض قرآن ناظرہ کی تعلیم ہی دلوائی جاتی۔ مولانا صاحب اور ان کے اہلِ خانہ کا بے حد احترام کیا جاتا اور اپنی خاندانی حشمت پر مان کے باوجود بچوں اور بچیوں کو مسجد میں درس لینے کے لیے بھیجا جاتا تھا۔

لڑکیوں کو مولانا صاحب کی بیوی پڑھایا کرتیں۔ وہ روشن دماغ اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ ان کے شوق اور ذوق کے پیشِ نظر مختلف کتابیں اور اخبارات بھی آیا کرتے۔ ان اخباری تراشوں پر بنی تصاویر دیکھ کر ثنا بہت خوش ہوتی تھی۔ ایک روز اس نے کسی اخبار پر لکھے چند حروف اٹکتے ہوئے پڑھے تو مریم بے حد حیران ہوئیں۔

''تم نے کیسے پہچانا کہ اس لفظ کا تلفظ کیا ہے؟'' انہوں نے دریافت کیا۔

''سیپارہ پڑھاتے ہوئے بتایا تھا نا آپ نے۔ بس وہیں سے اندازہ لگایا۔'' وہ شرما گئی۔

''بہت خوب! تم تو بہت ذہین بچی ہو...... واقعی عربی اور اردو کا رسم الخط ایک سا ہے۔'' مریم نے اس کے گال تھپتھپائے۔

مریم نے اسی رات شوہر سے اس بات کا ذکر کیا اور ثنا کو اردو انگریزی پڑھانے کی خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔

''آپ کی خواہش شرعی اور جائز ہے لیکن اس علاقے میں تعلیم نسواں کا کوئی رواج نہیں۔''

''آپ کی بات بجا...... لیکن ہو سکتا ہے یہ کوشش بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہو جائے۔ میں مقامی خواتین کی منفی سوچ' تنگ نظری اور اولاد کے معاملات میں بے احتیاط رویوں سے بہت عاجز ہوں...... میرے پاس سیپارہ پڑھنے والی بچیاں اکثر ایسی باتیں کرتی ہیں کہ میں دنگ رہ جاتی ہوں...... اتنی سی عمر میں ایسا علم ذہنی بربادی اور بے راہ روی کا سبب ہے۔''

مولانا عبدالوہاب نے کچھ دن سوچ بچار کے بعد اشفاق سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا مدعا سن کر وہ پل بھر کے لیے خاموش ہوا اور پھر گلا کھنکھارتے ہوئے کہنے لگا۔

''آپ کی خواہش سر آنکھوں پر مولوی جی! لیکن معذرت قبول کیجیے، ہماری برادری میں لڑکیوں کو پڑھایا نہیں جاتا۔''

''معاف کیجیے گا لیکن جب آپ اپنے گھر میں ٹیلی ویژن، غیر ملکی چینلز کی اجازت دے سکتے ہیں تو پھر پڑھنے لکھنے میں کیا قباحت ہے؟''

''آپ سمجھ کیوں نہیں رہے مولوی صاحب؟ ہمارے رواج اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔ میں اپنے پرکھوں کے خلاف کیسے جا سکتا ہوں؟'' وہ جھنجلایا۔

''تعلیم ایک جبلی تقاضا ہے اشفاق صاحب! اور جبلت پر پہرا لگایا جائے تو بربادی کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ باقی رہی بات آپ کے رسم و رواج کی...... تو میں ان کی بہت قدر کرتا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو ہم بچی کو کسی کے بھی علم میں لائے بغیر لکھنا پڑھنا سکھا دیں گے۔ ہمارا مقصد نمود و نمائش ہرگز نہیں ہے بلکہ اچھا شعور دینا ہے۔'' انہوں نے نرمی سے کہا۔

''بچیوں نے پڑھ لکھ کر کرنا ہی کیا ہے قبلہ! انہیں سسرال میں گھر داری اور بچے ہی تو سنبھالنے ہوتے ہیں لیکن اگر آپ اتنا اصرار کر رہے ہیں تو میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔'' اشفاق جز بز ہوا کیونکہ وہ ٹی وی اور کیبل کی موجودگی کی کوئی دلیل نہیں دے پایا تھا اور اس روز کے بعد ثنا کی نئی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

رسول نگر کے ان رواج پرست باسیوں میں سے ایک اور خاندان اپنے مستقبل سے بے خبر اپنی ذات کے دائرے میں سرشار و مگن زندگی کی راہیں متعین کر رہا تھا۔ یہ خاندان اشفاق پرویز کا دیرینہ ہمسایہ تھا۔ ذات پات کے فرق کی بنا پر ان دونوں میں کبھی مثالی تعلقات تو قائم نہ ہو سکے تھے تاہم خوشی غمی کے مواقع پر اچھی یاد اللہ رہتی تھی۔ اس گھرانے کا سربراہ سلیم اختر تھا۔ اس کے آبا و اجداد جوتیاں گانٹھنے کا کام کرتے تھے جسے بعد میں سلیم نے ایک درمیانے درجے کے کارخانے میں تبدیل کر دیا لیکن اپنی لاکھ کوششوں کے باوجود وہ رسول نگر کے رہائشیوں کے دل و دماغ سے اپنے ماضی کی شناخت مٹا نہ پایا تھا۔ اہلِ علاقہ اس سے بہت تپاک سے ملتے' خلوص و عزت کا مظاہرہ بھی کرتے مگر پیٹھ پیچھے اس کی ہرزہ سرائی بھی خوب کرتے تھے۔

یوسف، سلیم اختر کا اکلوتا بیٹا تھا۔ معاشی خوشحالی کے باوجود ان کی سوچ بھی اسی دائرے میں مقید تھی۔ زندگی کی چار دہائیاں مڈل کلاس طبقے میں بسر کرنے کے بعد سلیم اور اس کی بیوی تا حال یہ چولا اتار نہ پائے تھے۔ رسول نگر میں ان کے اکلوتے بیٹے یوسف کی سادگی اور شرمیلی طبیعت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ وہ مسجد اور اسکول میں بہترین طالبعلم تھا اور اس کی یہی ذہانت' نرم مزاجی اور سادگی ثنا کو کم عمری میں ہی بہت بھانے لگی تھی۔ مریم اکثر اس سے سودا سلف منگوالیا کرتی تھیں۔ اس لین دین میں اس کا سامنا ثنا سے بھی ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی متانت ثنا کے لیے بہت متاثر کن تھی۔ وہ بے اختیار اس کی طرف مائل ہونے لگی۔ اسی آنکھ مچولی میں بچپن کا جنکشن چھوٹ گیا اور وہ دونوں جوانی کی سرحد پر آن کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

''سلیمہ کی بہو زچگی سے فارغ ہو گئی کیا؟'' نسرین نے اپنے ساتھ بیٹھی کوثر سے دریافت کیا۔

''نہیں آپا! تین ہفتے ابھی باقی ہیں۔'' کوثر نے دھیرے سے بتایا لیکن یہ سرگوشی اگلی رو میں بیٹھی لڑکیوں کی سماعت میں پہنچ گئی تھی۔

''ان تین ہفتوں کے بعد وہ پھر سے ایک نئے بچے کی تیاری میں جت جائے گی۔ اتنی جلدی تو ہمارے گھروں میں کیلنڈر بھی نہیں بدلتے جتنی جلد سلیمہ کے گھر نیا مہمان آجاتا ہے۔'' نسرین نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس روز برادری میں ہونے والی شادی کی ایک تقریب میں تقریباً سارا خاندان جمع تھا۔ ثنا بھی اپنی والدہ کوثر کے ساتھ وہیں موجود تھی۔ اسے شادی بیاہ کی ان تقریبات میں شرکت بہت بھاتی تھی۔ یہ شادیاں درحقیقت اس سمیت کئی لڑکیوں کے لیے تفریح کا ذریعہ تھیں۔ گھرداری کے مدار سے وقتی فرار پانے والی خواتین اپنی چٹ پٹی گفتگو، غیبتوں اور خاندانی امور پر بحث کرتی اپنے اردگرد بیٹھی ان کم عمر لڑکیوں کی موجودگی اکثر فراموش کر دیا کرتی تھیں۔

شادی بیاہ کی رسموں کے دوران یہ عورتیں دُلہا دُلہن کو ذومعنی جملے کستیں۔ واضح ترین الفاظ میں کیے جانے والے غیر مہذب مذاق بھی ان تقاریب کا لازمی جزو ہوتے تھے۔ یہ خواتین جب بھی محفل جما کر بیٹھتیں، اپنے ازدواجی تعلقات سے لے کر بچوں کی پیدائش اور دورانِ حمل تک کے تجربات بہ بانگِ دہل ایک دوسرے کے گوش گزار کرتیں اور وہ یہ حقیقت فراموش کر دیتیں کہ یہ کم عمر لڑکیاں 'سماعت' سے ہرگز محروم نہیں ہیں۔ یہ بے احتیاطی انہیں وقت سے پہلے ہی باخبر کر دیتی ہے اور پھر وہ اس علم کے اطلاق کے لیے مچلنے لگتیں۔

اس وقت بھی نسرین اور کوثر کی اگلی رو میں بیٹھی لڑکیاں دھیمی سرگوشیوں میں باتوں میں مگن تھیں۔ نسرین کی چودہ سالہ بیٹی اپنا آنچل انگلی پر مروڑتے شرم سے بل کھا رہی تھی۔

''ارے اب خاموش ہی رہو گی یا منہ سے کچھ پھوٹو گی بھی؟'' فاخرہ نے بے چینی سے ٹہوکا دیا۔

''مم...... میں کیا بولوں؟ مجھے شاہد نے منع کیا ہے کہ ہماری بات چیت کسی سے نہیں کرنی ...... نظر بد بھی لگ سکتی ہے۔'' ثمرین نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا۔

فاخرہ اور ثنا نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی۔

''میں سب جانتی ہوں کہ کیوں منع کر رہا ہے وہ تمہیں؟'' فاخرہ نے آنکھیں مٹکائیں۔

''میرے پیچھے کیوں پڑی ہو؟ اس ثنا سے بھی تو پوچھو۔ اس نے تو آج تک منہ سے بھاپ بھی نہیں نکالی۔'' ثمرین نے توپوں کا رخ تبدیل کیا۔

فاخرہ اس کی طرف متوجہ ہوئی ہی تھی کہ کھانا لگنے کی صدا نے وہاں ایک ہڑبونگ مچا دی اور بات آئی گئی ہو گئی۔ ثنا کے لیے ایسے کسی بھی موقع پر اپنی ہم عمر لڑکیوں کے تند و تیز سوالات کا جواب دینا بہت مشکل ہو جاتا تھا۔

یہ بات حقیقت تھی کہ اس کی زندگی میں ان لڑکیوں کی طرح کسی بھی مرد کی باقاعدہ آمد نہ ہوئی تھی لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ جذبات و احساسات کے بارے میں کوری تھی۔ بچپن میں مریم سے اردو، انگریزی لکھنے پڑھنے کے سوا اس کی زندگی میں مزید کسی قسم کا کوئی تغیر نہیں آیا تھا مگر وہ رسول نگر کی پچانوے فیصد لڑکیوں کی طرح کچھ خفیہ معاملات سے قبل از وقت ہی 'باخبر' ہو چکی تھی تاہم اس علم کو تجربات کی بھٹی میں استعمال کرنے کا کوئی وسیلہ تا حال میسر نہیں آیا تھا۔ قدرتی امر کے تحت کوئی بھی بیل اپنی افزائش کے لیے نزدیک ترین سہارے سے لپٹ جایا کرتی ہے۔ ثنا بھی اپنے جذبات سے مغلوب یوسف کے لیے بہت زیادہ بے اختیار ہو چکی تھی۔

گزرتے وقت میں یوسف کی فطرت میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا حلقۂ احباب انتہائی محدود تھا۔ اسکول میں اس کی دوستی ثنا کے بھائی فرحان سے تھی اس لیے کبھی کبھار وہ ان کے گھر بھی آ جایا کرتا اور اس وقت اپنے ماحول اور عمر کے تقاضوں سے بے حال اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے لاکھ جتن کرتی لیکن نتیجہ ندارد۔

''میں ایسا کیا کروں یوسف کہ تمہاری نظروں میں آ جاؤں؟ کیا میں اتنی بے مول ہوں کہ کوئی مجھے اس طرح نظر انداز کرتا رہے؟'' اس رات وہ بہت بے چینی میں مبتلا تھی۔

وہ کسی بھی شادی سے لوٹنے کے بعد یونہی بے چینی اور اضطراب کا شکار رہتی تھی۔ عام لڑکیوں کی طرح اسے بھی شادی کا بہت شوق تھا۔ ثنا اپنی عمر کے سولہ پڑاؤ مکمل کرنے کے باوجود اس امرت سے تا حال محروم تھی اور اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ اشفاق پرویز اپنی جائداد کے بٹوارے میں کسی غیر فرد کو شامل نہیں کرنا چاہتا تھا۔ برادری میں ایک دو رشتوں کی موجودگی کے باوجود وہ اکلوتی بیٹی کے لیے پرکھوں کی ایک اور روایت پر عمل کرنے کا تہیہ کیے بیٹھا تھا۔

لیکن تقدیر ان تدابیر پر خندہ زن اپنے ترکش کے تیر آزمانے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

نوعمر لڑکوں کا ایک گروپ کالج کے گراؤنڈ میں گھاس پر بے فکری سے براجمان تھا۔

یہ سبھی لڑکے سال اول کے طالب علم تھے اور اپنے فری پیریڈ میں وقت گزاری کے لیے یہاں چلے آیا کرتے تھے۔ کالج بیگ ایک جانب رکھے وہ اپنے موبائل فون پر نظریں جمائے بے حد مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے انداز و اطوار، لباس، رنگ ڈھنگ میں جدت کی چھاپ تھی

تاہم وہاں ایک لڑکا ایسا بھی موجود تھا جو یونیفارم کی مماثلت کے علاوہ ان سے بالکل مختلف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے چہرے مہرے اور اطوار میں گریز، جھجک اور سادگی نمایاں تھی۔ باقی لڑکوں کے برعکس وہ ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ وہ یوسف سلیم تھا جو کچھ ماہ قبل ہی شہر کے اس معروف ترین کالج میں انٹر سائنس کی پڑھائی کے لیے آیا تھا۔

اس کے ہم جماعت لڑکے بہت شوخ، تیز طرار طبیعت کے مالک تھے جن کی زندگی میں پڑھائی اور نصابی کتابوں کا شمار سب سے آخر میں ہوتا تھا۔ فراغت میں وقت گزاری کے لیے ان کے پاس دو ہی راستے تھے...... موبائل فون اور لڑکیوں سے بات چیت......

بدقسمتی سے یوسف ان دونوں ہی معاملات میں انتہائی کورا تھا۔ رسول نگر کا یہ شریف النفس لڑکا سماجی رابطوں میں بھی بہت محدود رہتا۔ آبائی علاقے میں اس کا قریبی دوست صرف فرحان تھا جو چند نمبرز کے فرق سے انٹر سائنس میں داخلہ لینے میں ناکام رہا اور اب اسی شہر کے ایک اور معروف کالج میں زیر تعلیم تھا۔

یوسف کی خاموشی اور سادگی اکثر ہم جماعت لڑکوں میں باعثِ تمسخر بنی رہتی۔ اس وقت بھی جماعت کا ''سی، آر'' اچانک وہاں آن پہنچا اور اس کے ہاتھ سے کتاب کھینچ کر ایک جانب اچھال دی۔

''افلاطون اور سقراط کی اولاد! کبھی ان کتابوں کی دنیا سے باہر بھی جھانک لیا کرو۔'' وہ تمسخر سے بولا۔

''یہ کیا حرکت ہے بلال؟ کتاب کو یوں زمین پر نہیں پھینکتے۔ بے حرمتی ہوتی ہے۔'' یوسف تڑپ گیا۔

اس کی توجیہہ پر وہ فلک شگاف قہقہے لگانے لگے۔

''تمہارے اندر کس صدی کی روح موجود ہے؟ کتاب کی حرمت کیا شے ہوتی ہے بھلا؟'' بلال نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں بھئی! ہم نے تو آج تک صرف عورت کی حرمت کے بارے میں سنا ہے جسے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ہزار ہا جتن کرتی رہتی ہے۔'' عمر نامی لڑکے نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''بالکل! اسی لیے تو شاعر نے بھی کہا تھا کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔'' بلال نے لہک کر کہا۔

''شاعر نے اس ضمن میں یہ بات ہرگز نہیں کی تھی۔'' یوسف نے قطع کلامی کی۔ ''میرے نزدیک عورت کا صرف ایک ہی روپ اور حق ہے...... عزت و احترام۔''

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

رونق: مسکراہٹ درد کی شکست اور چہرے کی رونق ہے۔

رونا: کبھی کبھی آپ کے پاس رونے کے لیے کندھا نہیں ہوتا مگر سجدے میں رونے کے لیے زمین ضرور ہوتی ہے۔

انسان: ہزاروں فرشتے اس انسان کے ہاتھوں کو چومنے آتے ہیں جو کسی دوسرے انسان کی مشکل میں مدد کرتا ہے۔

عاجزی: جو لوگ تکبر کو دور پھینک دیتے ہیں اور عاجزی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رحمت ان پر سایہ فگن ہو جاتی ہے۔

مشکل: غلطی ماننے اور گناہ چھوڑنے میں کبھی دیر مت کرو کیونکہ سفر جتنا طویل ہوگا، واپسی اتنی ہی مشکل ہوگی۔

ساتھ: وقت اور بخت کبھی ساتھ نہیں چلتے۔ کبھی وقت ہاتھ چھڑا لیتا ہے تو کبھی بخت...... اگر کبھی اتفاقاً مل جائیں تو پھر یہ تقدیر بدل دیتے ہیں۔

تلاش: جس دل میں ثواب کا شوق اور عذاب کا خوف پیدا ہو جائے تو جنت اس کی تلاش میں لگ جاتی ہے۔

معراج: آنسو اور مسکراہٹ دو انمول خزانے ہیں۔ آنسو صرف اپنے رب کے حضور بہاؤ اور مسکراہٹ اللہ کی مخلوق میں بانٹ دو کہ یہی زندگی کا تقاضا اور انسانیت کی معراج ہے۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

انمول موتی

انسان پوری زندگی میں تین چیزوں کے لیے محنت کرتا ہے۔ میرا نام اونچا ہو، میرا لباس اچھا ہو، میرا مکان خوبصورت ہو...... لیکن موت آتے ہی اللہ پاک سب سے پہلے اس کی تینوں چیزوں کو بدل دیتا ہے۔

نام: مرحوم
لباس: کفن
مکان: قبر

اے انسان! پھر تو کس چیز پر غرور کرتا ہے؟

(مرسلہ: راحیلہ شفیق۔ سندھی ہوٹل، نیو کراچی)

''انگور کھٹے ہیں یوسف صاحب!'' عمر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''افسوس ہوتا ہے تم لوگوں کی سوچ پر۔'' اس نے تاسف سے کہا۔

''میں تو ابھی تک وہ دن نہیں بھولا جب اس کی وجہ سے ماریہ مجھ سے بریک اپ کرنے کے لیے تل گئی تھی...... اس احمق نے ماریہ کی دوست کی بہت انسلٹ کی تھی۔'' بلال نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب...... میں اس کے غلط مطالبات نہیں مان سکتا تھا۔'' وہ ہکلا گیا۔

''مجھے تو کبھی کبھی تم پر شک ہونے لگتا ہے...... کہیں اس گریز کے پیچھے کوئی طبی مسئلہ تو نہیں؟'' عمر نے سنجیدگی سے کہا۔

''میرے منہ کی بات چھین لی تم نے...... مجھے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔'' زید نے اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

''تم لوگوں کے دماغ چل گئے ہیں...... اور کوئی بات نہیں۔'' وہ اپنی کتابیں سمیٹتا ہوا ایک جھٹکے سے اٹھا اور ان کی معنی خیز ہنسی نظرانداز کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس رات ہاسٹل کے کمرے میں لیٹا وہ بے چینی سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ دوستوں کی باتیں، تمسخر اور تشکیک آمیز ذلت اس کی روح پر کچوکے لگانے لگی۔ اس رات عمر کی جانب سے اپنے وقار اور عزت پر شکوک نے اس کی سوچ کا زاویہ بدل دیا.... اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے کسی لڑکی سے باضابطہ بات چیت اور تعلقات اب بے حد ضروری ہو چکے تھے تاہم ایک بات تو طے تھی کہ وہ کسی بھی شہری لڑکی سے ایسا رشتہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔

پھر اس کے تصور میں ایک ہیولا لہرایا۔ عورت کی چھٹی حس اگر مرد کی بدلتی نظریں اور تیور بھانپ لیتی ہے تو مرد بھی اس کے ناز و انداز، بلاوجہ ٹکراؤ، شرم و حیا کے بے وقت مظاہروں سے اس کی کشش اور ارادے فوری طور پر سمجھ جاتا ہے۔ یوسف کے دماغ نے بھی اپنی اس مشکل کا حل تلاش کر لیا تھا۔ ثنا کا خیال آتے ہی اس کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

☆☆☆

ثنا اور یوسف کی قسمت عروج پر تھی۔

موسم سرما کی تعطیلات ہوئیں تو یوسف چند روز کے لیے رسول نگر روانہ ہو گیا۔ انہی دنوں اشفاق پرویز کے بڑے بیٹے کی شادی بھی طے پا گئی۔ فرحان نے بچپن کی دوستی کے ناتے یوسف کو بھی تقریبات میں مدعو کیا۔

مہندی کی تقریب میں خواجہ سراؤں کی آمد نے محفل گرما دی تھی۔ شرکاء کا ذہنی ارتکاز مکمل طور پر ان کے رقص کی طرف مائل تھا۔ برادری کے رسم و رواج کے باعث خواتین کو اس محفل میں پھٹکنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ اس لیے انہوں نے متبادل راہ کے طور پر چھتوں کی منڈیریں سنبھال لیں۔ اپنے وجود اور چہرے چادر سے ڈھانپے وہ رقص و سرود کی اس محفل سے مکمل طور پر محظوظ ہو رہی تھیں۔

ماحول پر ایک سحر سا طاری تھا مگر دو نفوس ایسے بھی تھے جو ایک دوسرے کی موجودگی کے باعث اضطراب کا شکار تھے۔ یوسف یہ سنہری موقع ہرگز گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بے نیازی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ فرحان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اس نے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی کھڑی کر کے مخصوص اشارہ کیا اور اندرونی جانب بڑھ گیا جہاں ایک قطار میں چند بیت الخلا موجود تھے۔

خواجہ سراؤں کے ٹولے نے اب فرحان اور اس کے چند دوستوں کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔ دیگر شرکاء کے فلک شگاف مخصوص نعروں اور سیٹیوں نے ماحول مزید گرما دیا۔ یوسف اندرونی جانب اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی کھیلنے کے لیے تیار تھا۔ اس کی توقع کے عین مطابق ثنا اس کی آمد سے بے خبر نہیں تھی۔ اگلے پانچ منٹ میں وہ بھی وہیں آن کھڑی ہوئی۔ وہ بظاہر اسے نظرانداز کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔

یوسف خاموشی اور شدید بے چینی میں وہیں ساکت کھڑا اس سے مخاطب ہونے کا عذر تلاش کرتا رہا لیکن ثنا نے اس کی یہ مشکل بھی آسان کر دی۔

''آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ کسی کی تلاش ہے کیا آپ کو؟'' اس نے دھیمے لہجے میں استفسار کیا۔

''جی! بس طبیعت میں کچھ گرانی محسوس ہو رہی تھی اس لیے باہر جانے کا دل نہیں چاہ رہا۔'' وہ اعتماد سے بولا۔

''ذرا چہل قدمی کر لیجیے...... طبیعت میں بہتری پیدا ہو جائے گی۔'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ ہاں، وہ بات الگ تھی کہ اس کے جسم کا ہر عضو ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ یوسف کسی بھی طرح اسے روک لے۔

''میری طبیعت میں بہتری ایسے پیدا نہیں ہو سکتی ثنا!'' اس کا لہجہ گمبھیر تھا۔ کالج اور ہاسٹل میں اپنے دوستوں کو فون پر بات چیت کرتے دیکھ کر وہ لاشعوری طور پر انہی کے اطوار کی نقالی کر رہا تھا۔

''تو پھر کیسے ممکن ہے؟'' ثنا نے اپنے جوش پر قابو

پاتے ہوئے کہا۔ یوسف کے بدلے ہوئے انداز اور تیور اسے اپنی دعاؤں کی قبولیت کا یقین دلا رہے تھے۔

وہ اس کا ہاتھ تھامے صحن کے کونے میں موجود درخت تلے لے آیا۔ ثنا نے بالکل بھی مزاحمت نہ کی۔

''میں یہاں صرف تمہارے لیے آیا تھا۔ تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ عجلت میں تھا۔ اگر چھت یا بیرونی سمت سے کوئی بھی یہاں آ نکلتا تو انہیں اپنی موجودگی کی وضاحت دینا ناممکن ہو جاتا۔

''کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟'' ثنا کی آواز جوشِ مسرت سے لڑکھڑانے لگی۔

''میں...... وہ...... تم سے......'' یوسف کے لیے مدعا بیان کرنا دشوار ہو رہا تھا۔

''شادی کرنا چاہتے ہیں مجھ سے؟'' وہ تیز لہجے میں اعتماد و تیقن سے بولی۔

یوسف حیرانی اور بے یقینی سے اس کے معصوم چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اس سے محض دوستی کرنے کا خواہاں تھا اور وہ پل بھر میں ہی شادی جیسے انتہائی فیصلے پر بھی پہنچ گئی تھی۔

''آپ ابھی یہاں سے جائیں...... میں دو روز بعد آپ سے پیر سائیں کے مزار کی عقبی جانب ملوں گی۔ باقی معاملات وہیں طے کرلیں گے۔'' وہ سیڑھیوں پر ہلکی سی آہٹ محسوس کر کے گھبرا کر کہنے لگی۔

''ٹھیک ہے! میں منتظر رہوں گا۔'' یوسف نے اس کا ہاتھ زور سے دباتے ہوئے چھوڑ دیا۔

رسول نگر کے اس رواج پرست گھرانے میں بغاوت کی ایک نئی داستان رقم ہونے کے لیے تیار تھی۔

☆☆☆

پیر سائیں کا مزار قصبے کی اختتامی حدود میں واقع تھا اور یہ واحد جگہ تھی جہاں والدین کچے اعتقاد کی بدولت اپنی بچیوں کی آمد و رفت پر رتی بھر بھی معترض نہ ہوتے۔

عشق و محبت کی ناؤ کبھی بھی کسی کی شراکت و تعاون کے بغیر ساحل پر لنگر انداز نہیں ہوسکتی۔ ثنا نے بھی احتیاطی تدابیر کے تحت فاخرہ کو شریکِ راز بنالیا۔ ماضیِ قریب میں وہ بھی فاخرہ کی ایسی ان گنت ملاقاتوں پر پہرے دار کے فرائض سرانجام دیتی رہی تھی اور آج اس قرض کی وصولی کا وقت آن پہنچا تھا۔

اس روز ان دونوں میں نصف گھنٹا بات چیت ہوتی رہی۔ یوسف اپنے وقار اور بھرم کی تکمیل کے لیے ہر ممکن حد تک جانے کے لیے تیار تھا تو دوسری جانب ثنا اپنے ماحول اور ذہنی کجی کی بدولت اپنے وجود میں پنپنے والی خواہشات کی تسکین کا سامان چاہتی تھی۔

یوسف نے طے شدہ منصوبے کے تحت اپنا چھوٹا سا موبائل فون اسے تھما دیا۔ یہ فون اور سم کافی عرصے سے اس کے استعمال میں تھی اور اب ہنگامی حالات میں اس نے اسے استعمال کرنے کے لیے دے دیا تھا۔

''یہ کس لیے ہے؟'' وہ حیرانی سے ننھا سا سیٹ الٹتے پلٹتے ہوئے بولی۔

''یہ بہت قیمتی شے ہے ثنا! اسے حفاظت سے اور کسی محفوظ مقام پر رکھنا۔'' وہ اسے سمجھانے لگا۔

''ہاں! وہ تو میں جانتی ہوں...... ندیم بھائی اور فرحان کے پاس بھی ایسے بڑے فون موجود ہیں۔''

''میں نے اس میں اپنا نمبر محفوظ کر دیا ہے...... ہم روزانہ رات کو بات کیا کریں گے......'' وہ اسے کال کرنے، مسڈ کال چیک کرنے اور میسج کرنے کا طریقہ سمجھانے لگا۔

''لیکن یوسف! ہماری شادی......''

''میرے امتحان ہوتے ہی ہم شادی کے معاملات میں پیش قدمی کرلیں گے...... اس وقت تک اس فون کو بہت حفاظت سے رکھنا...... اور اس کے متعلق کسی کو بھنک بھی نہیں لگنی چاہیے...... سمجھ گئیں......؟'' وہ اسے چارجر تھماتے ہوئے بولا۔

''بالکل سمجھ گئی...... تم فکر نہ کرو......'' اس نے بے تکلفی سے کہا اور اپنا رخ موڑ کر موبائل چادر تلے اپنے گریبان میں چھپا لیا۔

نصف گھنٹے بعد جب وہ وہاں سے رخصت ہوئی تو خوشی و سرشاری سے اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ یوسف کی قربت کا خمار اسے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے کر اولین چاہت کا نشہ دو آتشہ کرنے لگا۔

وہ دونوں ایک پُر خطر راہ پر قدم رکھ چکے تھے اور مسافت کی چاشنی و لذت نے انہیں سفر کے آغاز ہی میں ہر خطرے سے بے نیاز کر دیا تھا۔

☆☆☆

تعطیلات ختم ہوتے ہی وہ ہاسٹل واپس لوٹ آیا۔

بلال، عمر اور زید کی باتیں اس کے دل میں نیزے کی انی کے مانند گڑی تھیں۔ وہ انہیں اپنی اہلیت اور ذہانت بہر صورت ثابت کرنا چاہتا تھا۔ بلال اور عمر اسی شہر کے رہائشی تھے البتہ زید اسی کی طرح ایک نواحی قصبے میں رہتا تھا۔

ہاسٹل واپسی کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق رات دس بجے کے بعد وہ موبائل کمپنی کے نائٹ پیکیج سے استفادہ کرتے ہوئے ثنا کو روزانہ فون کرتا۔ عورت کا بے پروا اور حدود و قیود سے آزاد عشق مرد کو بھی عقل و شعور سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ ثنا نے اسے عشق و طلب کی ان راہوں پر سرپٹ بھاگنے کا ہنر سکھانے کا آغاز کر دیا تھا۔

دھیمی سرگوشیوں اور چمکتی آنکھوں سے کی جانے والی یہ فون کالز زید سے پوشیدہ نہ رہ سکیں۔ وہ تیسرے ہی روز کالج میں بلال اور عمر کو اس تبدیلی کے متعلق آگاہ کرنے کے بعد اس کے سر ہو گیا۔

''کیا ماجرا ہے یوسف صاحب یہ؟ جب سے لوٹے ہو بدلے بدلے سے سرکار نظر آتے ہیں۔'' زید نے فری پیریڈ میں اسے جالیا۔

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' یوسف طرح دینے لگا۔

''تو پھر رات گئے فون پر باتیں' یہ بدلے ہوئے تیور اور خوشی کس وجہ سے ہے؟'' بلال نے اسے گھورا۔

''کچھ خاص نہیں...... بس اس روز شادی پر ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی تھی۔''

''لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں، تمہارے علاقے میں تو لڑکیاں بالکل بھی پڑھی لکھی نہیں ہیں...... تو پھر یہ موبائل فون کا استعمال اور میسیجز...... یہ قصہ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' عمر نے حالات کا بالکل درست تجزیہ کیا تھا۔

''میں نے کب کہا کہ وہ میرے علاقے سے ہے...... شادی پر کسی دوسرے قصبے سے آئی تھی...... بس اتفاقاً ہماری بات چیت ہو گئی۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ عمر اور زید اسی کے توسط سے فرحان سے بھی واقف تھے۔ وہ اکثر اس سے ملنے کالج یا ہاسٹل میں بھی آجایا کرتا تھا، اس لیے ان کے سامنے رسول نگر کی کسی فرضی لڑکی کا نام لینے کا مطلب بھی ثنا ہی کی نامزدگی تھا۔

''مجھے تو دال میں کچھ کالا لگتا ہے...... کہیں یہ اپنا ہی کوئی غیر استعمال شدہ نمبر ملا کر ہمیں بے وقوف تو نہیں بنا رہا۔'' بلال نے ہنسی اڑائی۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا...... میں تمہیں ثبوت دینے کے لیے تیار ہوں۔'' یوسف بھڑک اٹھا۔

''ٹھیک ہے...... ہم آج رات نو بجے وارڈن سے سیٹنگ کر کے ہاسٹل آئیں گے۔'' عمر نے کہا۔

''شیور...... وائے ناٹ؟'' وہ اطمینان سے بولا اور موبائل نکال کر ثنا کو نو بجے فون سننے کا پیغام بھیج دیا۔

اس رات زید اور یوسف کے مشترکہ کمرے میں وارڈن کی مٹھی گرم کرنے کے بعد وہ دونوں بھی موجود تھے۔ نو بجتے ہی یوسف نے اسے فون ملایا لیکن کئی بار کوششوں کے باوجود ثنا نے کال اٹینڈ نہ کی۔ متوقع ذلت اور ہرزہ سرائی کے تصور سے اس کی پیشانی سرد موسم میں بھی عرق آلود ہو گئی۔

ساتھیوں کی تمسخر اڑاتی ذومعنی ہنسی نظرانداز کر کے وہ کچھ دیر بعد ایک بار پھر اپنی سابقہ کوشش میں مصروف ہو گیا۔ ثنا کے فون اٹھاتے ہی اس نے اسپیکر آن کیا اور تلخی سے مخاطب ہوا۔

''حد ہوتی ہے غیر ذمے داری اور بے پروائی کی بھی...... میں نے دوپہر میں میسج کیا تھا کہ نو بجے فون کروں گا......''

''سوری یوسف! مجھے واقعی کچھ مصروفیت نے گھیر لیا تھا...... ورنہ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کیا۔'' وہ اس کے لہجے میں درشتی محسوس کرتے ہی گھبرا گئی تھی۔

''تو کیا میں یہاں فارغ ہوتا ہوں...... مجھے بھی پڑھائی کی بہت سی مصروفیات ہوتی ہیں...... لیکن اگر تم اتنی ہی مصروف ہو تو بات چیت کا یہ سلسلہ یہیں روک دیتے ہیں......'' وہ اپنے دوستوں کی موجودگی میں دانستہ اس قدر رکھائی اختیار کیے ہوئے تھا۔

''نہیں...... ایسا نہیں کرنا...... ایسا ہرگز نہیں کرنا...... میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معذرت کرتی ہوں...... آئندہ میں ایسی غلطی بالکل بھی نہیں ہونے دوں گی۔'' وہ رونے لگی تھی۔

''میرا موڈ اس وقت سخت آف کر دیا ہے تم نے...... میں بعد میں بات کروں گا۔'' اس نے نخوت سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا اور فاتحانہ نظروں سے ان تینوں کی جانب دیکھنے لگا جو اس وقت انتہائی بے یقینی اور حیرت میں مبتلا تھے۔

''امیزنگ...... تم تو واقعی چھپے رستم نکلے......'' بلال نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے ہمیں تم سے ٹریننگ لینی چاہیے...... اس انداز میں اگر میں اپنی کسی گرل فرینڈ سے بات کروں تو وہ کبھی مجھ سے دوبارہ رابطہ ہی نہ کرے...... اور یہ لڑکی محض چند منٹ تاخیر کی وجہ سے تم سے معافیاں طلب کر رہی تھی۔''

''بہت خوش قسمت ہو بھئی تم تو!'' عمر بھی اسی کیفیت میں مبتلا تھا۔

یوسف نے مسکراتے ہوئے بے نیازی سے اپنے

کندھے اچکا دیے۔ اس کے پاس ان کی بے یقینی وحیرانی کا بے حد مدلل جواب موجود تھا۔ وہ جن لڑکیوں سے روابط قائم رکھے ہوئے تھے' ان کے پاس متبادل راہوں کی موجودگی نے نخوت اور ناز وادا میں تحکمانہ انداز پیدا کررکھا تھا لیکن ثنا کی زندگی میں یوسف کے سوا اور کوئی روزن موجود نہیں تھا۔ اس لیے وہ ذہنی طور پر اسی کے تابع تھی۔

اس سمجھداری اور ذہانت پر خوش ہوتا وہ اپنی انا اور مردانہ وقار پر لگے کاری زخموں کی تسکین میں اپنے ہی اصول وضوابط اور آدرش فراموش کر چکا تھا۔ ضرورت و طلب کے اس کھیل میں اب اسے بھی لذت وفرحت محسوس ہونے لگی تھی۔

☆☆☆

محبت کا میدان سجے چھ ماہ سے زائد عرصہ بیت چکا تھا۔

اس میدان میں دونوں ہی کھلاڑی اپنی فطری وجبلی صلاحیتوں کے تحت ایک بھرپور اننگز کھیل رہے تھے۔ عورت عمر کے خواہ کسی بھی حصے میں محبت کرے' وہ اس مرد سے شادی' گھر اور بچوں کے تصورات بھی خود ہی بھرپور طریقے سے تخلیق کرلیا کرتی ہے۔

ثنا نے بھی ایسے جانے کتنے ہی خوابوں کی تزئین و آرائش کررکھی تھی۔ عورت کے اس خواب نگر میں امید' آس اور یقین کے رنگ بھرنے کی ذمے داری ہمیشہ مرد ہی نبھاتا آیا ہے اور یوسف بھی یہ کارِ خیر بہت احسن طریقے سے نبھا رہا تھا۔ سابقہ لڑکیوں کے مطالبات کے برعکس وہ ثنا سے بات چیت میں بہت پُرسکون اور آرام دہ رہتا تھا۔ اسی دوران وہ چند دن رسول نگر رہنے کے لیے گیا تو اس سے ایک مختصر ملاقات بھی کرآیا۔ ثنا کی وارفتگی' خودسپردگی اور جذبات کا برملا اظہار یوسف کی کمزوری بننے لگا اور اس نے بالآخر وقت گزاری کا خیال ترک کرکے شادی کا فیصلہ کرلیا۔

اس فیصلے کے بعد ثنا کے لیے اس کا احساسِ ملکیت مزید سوا ہوگیا۔ گفتگو میں بے تکلفی پیدا ہوئی اور احساسات کے اظہار میں تہذیب کا دامن خاکستر ہونے لگا۔ وہ رات رات بھر فون پر اپنی ناآسودہ خواہشات کی تسکین کا سامان کرتے رہتے لیکن اگلے روز یہ خواہشات پہلے سے کہیں زیادہ تشنگی کا احساس دلانے لگتیں۔

روئے ارض میں نامحرم رشتوں سے جذباتی وابستگی اور آسودگی وتسکین سے حاصل شدہ خمار کو پوشیدہ رکھنا ابن آدم اور بنت حوا کے لیے کبھی آسان نہیں رہا۔ اس اندھادھند سفر میں احتیاط ختم ہوجاتی ہے اور مخمور آنکھیں' بہکی چال' کھویا کھویا انداز قرب وجوار میں بسے لوگوں کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں۔

ثنا کے گھر میں موجود دونوں خواتین بھی اب ٹھٹکنے لگی تھیں۔

وہ ناسمجھ تو خیر بالکل بھی نہ تھیں اس لیے بخوبی سمجھ چکی تھیں کہ مرد کی قربت کے سوا عورت پر ایسی کیفیت کبھی طاری نہیں ہوسکتی لیکن الجھن تو یہ تھی کہ ثنا کی زندگی میں آنے والا وہ شخص آخر تھا کون؟ اور اسے نقب لگانے کا موقع کیسے مل گیا؟

ان دونوں خواتین کا مخمصہ یکساں سہی لیکن تحفظات میں فرق بہرحال موجود تھا۔ ماں اس صورت حال پر پریشان تھی تو ندیم کی بیوی بے حد خوش۔ ماں یہ معاملہ

بالکل خاموشی سے سلجھانا چاہتی تھی لیکن سدرہ اسے مزید ہوا دینے کی خواہشمند تھی۔ اس کے ذہن وسوچ میں بھی ایک کجی بہرحال موجود تھی۔ گھر کی اس بیٹی کے عیب عیاں کرنے کے بعد وہ سسرالی رشتوں کو اپنے دباؤ میں رکھنا چاہتی تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنے دیور فرحان کو مہرہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''کل رات بہت دیر تک جاگتے رہے تم؟ طبیعت تو ٹھیک تھی نا؟'' اس نے بڑی شفقت سے دریافت کیا۔

''میں تو سفر کی تھکان سے بہت جلد سو گیا تھا بھابی۔'' فرحان نے ہنس کر کہا۔

''اچھا...... پھر مجھے ہی غلط فہمی ہوئی ہوگی......'' اس نے الجھ کر کہا۔

''غلط فہمی کی کوئی وجہ بھی تو ہوتی ہے آخر؟''

''کل رات ثنا کے کمرے سے باتوں اور ہنسی کی آواز سنی تھی...... اس لیے مجھے لگا شاید اپنے کالج کے قصے اسے سناتے رہے ہو۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''چلو مجھے ہی مغالطہ ہوا ہوگا پھر۔''

فرحان کی پیشانی پر بل گہرے ہو گئے۔ ایسی ہی ہلکی پھلکی آوازیں اس نے بھی پچھلی بار سنی تھیں لیکن دھیان نہ دیا تھا۔ اب سدرہ کی بات سن کر اسے کسی انہونی کا احساس ہونے لگا۔ اس نے فوری ردِعمل کے بجائے خاموشی سے معاملے کی تہ تک پہنچنے کا ارادہ کر لیا۔

☆☆☆

محبت و چاہت کی راہ گزر پر چلنے والے اکثر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے زعم میں مبتلا ہو کر اپنی ہلاکت و بربادی کے اسباب خود ہی پیدا کر لیتے ہیں۔

ثنا کی بے احتیاطی اور احمقانہ دلیری بھی بہت بڑھ چکی تھی۔ وہ رات گئے کم از کم دو گھنٹے یوسف سے بلاناغہ بات کرتی۔ موبائل فون اپنے ہی کمرے میں چارج کرنے میں بھی اسے کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ اپنی تقدیر کی گھات سے بے خبر وہ اس رات بھی نہایت اطمینان سے اپنے اسی کام میں مگن تھی جب اس کے سر پر فرحان کی آمد کی صورت میں پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

سنسنی خیز اور رومانوی گفتگو کے بعد وہ فون اپنے گریبان میں چھپانے ہی والی تھی کہ دروازے کا قفل کھلنے کی آواز نے اسے حواس باختہ کر دیا۔ اشفاق کے پاس ہر کمرے کی اضافی چابیاں موجود تھیں جو آج فرحان کے بروقت کام آئیں۔

اس حادثاتی صورتِ حال نے اسے موبائل چھپانے کا موقع ہی نہ دیا اور اگلے ہی لمحے وہ فرحان کے گھونسوں اور تھپڑوں کی زد میں تھی۔ اسی شور وغل میں اشفاق اور ندیم بھی وہیں چلے آئے اور حقیقت سے آگاہی کے بعد وہ بھی اس پر پل پڑے۔

اس چار چوٹ نے ثنا کے دل و دماغ میں مزید بغاوت کی آبیاری کر دی۔ وہ اپنے نفع و نقصان سے بے پروا ہو کر ان کے دوبدو کھڑی ہو گئی۔

''مجھے اس طرح زدوکوب کر کے اپنے مسائل خود بڑھا رہے ہیں آپ لوگ...... میری گمشدگی یا ذات کو پہنچنے والا کوئی بھی نقصان آپ سب کو قانونی شکنجے میں بھی جکڑ سکتا ہے۔'' وہ حلق کے بل چلائی۔

یوسف کی زبانی اور ٹی وی پر وقتاً فوقتاً دیکھنے اور سننے والے کئی مناظر اسے مزید شیر کر رہے تھے۔

''نمٹ لوں گا میں تجھ سے بھی...... تیرے قانون سے بھی...... اور تجھے اس قانون کا سبق پڑھانے والے سے بھی۔'' فرحان نے لہورنگ آنکھوں سے اسے زوردار تھپڑ رسید کرتے ہوئے کہا۔

موبائل فون اور چارجر ہاتھ میں تھامے وہ تن فن کرتا اپنے کمرے میں پہنچا اور اپنا ذہن پُرسکون کرنے کے لیے ٹھنڈا پانی پی کر صوفے کی پشت پر سر رکھے نیم دراز ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے گہرے سانس لیتے ہوئے اعصاب پر قابو پایا اور اسی موبائل سے اپنا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اپنے فون کی اسکرین پر 'یوسف کالنگ' کے الفاظ دیکھ کر اس کے حواس پر گویا بجلی گری اور ذہن ایک بار پھر بھک سے اڑ گیا۔ اس نے طیش کے عالم میں ثنا سے برآمد شدہ فون آف کر دیا۔

مجرم کا نام سامنے آتے ہی اس کی رگوں میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

☆☆☆

ثنا کی حالت بے حد خراب تھی۔

اس بے موقع آفت اور فون سے محرومی نے اسے بہت پریشان کر دیا تھا لیکن وہ گھر کے کسی بھی فرد پر اپنی کمزوری ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ماں کی لعنت ملامت اور سدرہ کے لعن طعن اس کے باغیانہ خیالات کو مزید ہوا دے رہے تھے۔

گھر میں چھائی خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ چند روز بعد اشفاق نے اپنے کمرے میں دونوں بیٹوں کو طلب کر لیا۔ وہ اس قضیے کو مکمل طور پر ختم کرنا چاہتا تھا۔ ثنا

بھی اپنے مضروب وجود کو گھسیٹتی ہوئی وہاں جا پہنچی۔

''کیا لینے آئی ہو یہاں؟'' ندیم نے دہاڑ کر کہا۔

''میں اپنا حق لینے آئی ہوں۔'' وہ بے خوفی سے بولی۔

''حقوق و فرائض کے بہت اچھے سبق پڑھائے ہیں یوسف نے تمہیں۔'' فرحان نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

وہ اس کی زبان سے یوسف کا نام سن کر پل بھر کے لیے پریشان ہوئی لیکن پھر اپنے وجود میں مچلتے آتش فشاں کے سامنے مغلوب ہوگئی۔

''ہم ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

''اگر تم یہ سوچے بیٹھی ہو کہ میں تمہاری شادی ایسے شخص کے بیٹے سے کردوں گا جس کے پرکھوں کی روزی ہمارے جوتے بنانے سے وابستہ تھی...... تو ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔'' اشفاق غرایا۔

''آپ یوسف کے خاندانی پس منظر کا بہانہ بنا رہے ہیں...... ورنہ میں جانتی ہوں کہ آپ میری شادی کہیں بھی کرنا ہی نہیں چاہتے...... آپ کو اپنی جائداد زیادہ عزیز ہے۔'' وہ بے قابو ہوگئی۔

''نہیں...... ایسا کچھ بھی نہیں ہے...... ہم تمہاری شادی ضرور کریں گے...... اور یوسف ہی سے کریں گے...... وہ میرا بچپن کا دوست ہے...... اس کی زندگی آئینے کی طرح میرے سامنے واضح ہے...... اس سے بہتر ساتھی تمہارے لیے اور کوئی بھی نہیں ہوسکتا...... اس لیے بے فکر ہو جاؤ...... تمہاری شادی ضرور ہوگی۔'' فرحان کے معتدل اور ٹھنڈے لہجے نے پل بھر میں اس کی ساری اذیت فراموش کردی۔

وہ ندیم اور اشفاق کے سپاٹ چہروں کو نظر انداز کرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب چل دی۔

اس کی آنکھوں میں بہت سے خواب پھر لوٹ آئے تھے۔

☆☆☆

''دلہن کو رخصت کرنے کا وقت ہوگیا ہے۔''

ثنا کی سماعت میں ایک بار پھر اس فقرے نے ہلچل مچا دی۔ وہ یک دم ماضی کے گرداب سے نکل کر حال میں پہنچ گئی۔ یوسف کو حاصل کر لینے کا خیال اسے ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔ اس لمحے وہ خود کو روسول نگر کی خوش قسمت ترین لڑکی تصور کر رہی تھی جس نے رسم و رواج کے ان کڑے پہروں کے باوجود اپنی منزل پالی تھی۔

اسی پل اس کی نظر ایک کونے میں کھڑی کوثر پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں وحشت و ویرانی کے ڈیرے تھے۔ بیٹی سے نظر ملتے ہی وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی اور بلکتی ہوئی اس کے گلے لگ گئی۔

''اپنی مجبور اور بے بس ماں کو معاف کر دینا میری بچی!'' وہ دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔

''آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں امی؟ یوسف مجھ سے واقعی بہت محبت کرتا ہے اور وہ مجھے بہت خوش رکھے گا۔'' ثنا سرشاری سے بولی۔

کوثر کے آنسوؤں میں مزید تیزی پیدا ہوگئی۔

سدرہ اور چند قریبی رشتے دار عورتیں اسے اپنے نرغے میں لیے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئیں۔ خوشی و سرشاری کے باوجود اس کے قدم بے حد بھاری ہو رہے تھے۔ اس کے دل میں ایک الجھن تھی جسے وہ الفاظ کا روپ دینے سے قاصر تھی۔ ذہن کے نہاں خانوں میں کوئی خلش و چبھن سی موجود تھی جو اس کے وجود کو بے چینی میں مبتلا کر رہی تھی۔

وہ اپنی محبت کی تکمیل پر خوش ہونا چاہتی تھی لیکن ایک جامد کیفیت اور سناٹا جانے کیوں اس کے تصور پر حاوی ہو کر اسے افسردہ کر رہا تھا۔

''اس خوشی کے موقع پر میں کیوں اتنی اداس ہوں...... اس دن کی آمد کے جانے کتنے خواب دیکھے تھے میں نے؟'' وہ اپنے ذہن پر زور دیتی بار بار خود کلامی کرتی رہی۔

اپنی رشتے دار خواتین کے ساتھ ایک سحر کے عالم میں چلتی وہ ایک کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔

''یوسف کے والدین میری رخصتی میں کیوں شامل نہیں ہوئے بھلا؟'' اس نے خود کلامی کی۔ ''ناراض ہوں گے ہم سے...... کوئی بات نہیں...... میں اپنی محبت، خدمت اور اطاعت سے انہیں بھی راضی کرلوں گی۔''

اسے کمرے کی دہلیز سے اندر بھیج کر سبھی خواتین پلٹ گئیں۔ وہ اس سادہ کا بک نما کمرے کے کونے میں موجود ایک بستر اور لکڑی کی خستہ حال میز دیکھ کر ایک بار پھر الجھ گئی تھی۔ ٹرانس کی کیفیت میں بستر کی داہنی جانب تپائی پر موجود سرخ رنگ کی ایک شے دیکھ کر اس کے لاشعور میں بنی خلش اور چبھن یک دم بھیانک روپ دھارے اس کے روبرو کھڑی ہوگئی۔ ثنا نے خوفزدہ ہو کر اپنی آنکھیں زور سے میچ لیں اور یوسف کا نام پکارتے ہوئے بے ساختہ چیخنے لگی۔

اسے اپنی سبھی الجھنوں کے جواب پل بھر میں ہی مل گئے تھے۔

☆☆☆

یوسف، ثنا کے اچانک غیاب اور فون بند رہنے پر بہت پریشان تھا۔

وہ مسلسل اس کا نمبر ملاتا لیکن مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہ ہونے کی سپاٹ مشینی آواز اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیتی۔ جلد ہی یہ جھنجلاہٹ کوفت اور پھر گہرے تفکر میں ڈھل گئی۔

وہ اس کے وجود، گفتگو اور اظہار محبت کا عادی تو تھا ہی مگر اب یہ عادت ایک نشے کے مانند اس کی لت بن چکی تھی۔

پہلے پہل تو وہ اس غیاب کو ثنا کے سابقہ فرمائشی پروگرام ہی کی کڑی سمجھتا رہا۔ گزشتہ چند روز سے وہ اسے رسول نگر آمد اور ملاقات کے لیے بہت مجبور کررہی تھی۔ دو روز بعد اسے تشویش لاحق ہونے لگی۔ ثنا کی احتیاط پسندی، حاضر دماغی اور بیدار مغزی کے باعث اسے یقین تھا کہ وہ کسی بھی احمقانہ صورتِ حال کا شکار نہیں ہوسکتی لیکن اب قرائن بتاتے تھے کہ اس کے ساتھ کوئی انہونی پیش آچکی ہے۔

اگلے دو روز مزید انتظار کے بعد اس نے اندیشوں سے لبریز دل پر قابو پاتے اپنے گھر فون کیا۔ سلیم، بیٹے کی آواز سن کر کھل اٹھا۔

''میں آج صبح ہی سے تجھے بہت یاد کررہا تھا میرے لعل! اتنے روز ہوگئے تجھ سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

''میرے پرچے ہورہے ہیں ابا جی! ان سے فرصت ملتے ہی میں چکر لگاؤں گا۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''جیوندا رہ میرا پتر! تیری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''بالکل فرسٹ کلاس...... گھر میں سب ٹھیک ہے نا...؟ اور وہ چاچا اشفاق کے گھر میں سب کیسے ہیں؟ فرحان کئی روز سے وہاں گیا ہوا ہے، فون بھی نہیں اٹھاتا۔'' اس نے پیشانی مسلتے ہوئے ایک اور عذر تراشا۔

''سب ٹھیک ہے یہاں...... فرحان بھی ٹھیک ہے...... ابھی مجھے کل شام ہی ملا تھا لیکن شاید جلد بازی میں دیکھ نہیں پایا اور اپنی موٹر سائیکل دوڑا لے گیا۔''

یوسف نے ادھر اُدھر کی چند باتیں کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ اس کا اضطراب کسی صورت بھی کم نہیں ہورہا تھا۔ ایک بے عنوان وحشت، بے کلی اور گھبراہٹ نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔

اگلے روز شام سے کچھ ہی دیر قبل اسے فرحان اور اپنے ایک مشترکہ دوست کا فون موصول ہوا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اس نے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے اپنا حلق تھوک سے تر کیا اور فون آن کرلیا۔

''کدھر غائب ہو یوسف تم؟ آج صبح سے تمہارے فون پر اتنے میسج بھی کیے میں نے۔'' عدیل نے عجلت میں پوچھا۔

''میں کتابوں میں ہی مگن تھا...... فون سائلنٹ پر تھا اس لیے علم نہ ہوسکا۔'' اس نے ایک آفاقی جواز بیان کیا۔

''اچھا یار! میں آج ضروری کام کے لیے اپنے گاؤں جارہا ہوں۔ رستے میں یاد آیا کہ تمہارے کیمسٹری کے نوٹس واپس ہی نہیں کیے۔ میں بس اسٹینڈ تک پہنچ چکا ہوں۔ اب اگر واپس آؤں گا تو بہت دیر ہوجائے گی۔ تم کسی طرح خود آکے لے لو نوٹس۔'' وہ تیزی سے کہتا چلا گیا۔

''میں کیسے آؤں عدیل؟ تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا۔'' یوسف بیزاری سے بولا۔

''میں نے حسن کو فون کردیا ہے۔ وہ تمہیں اپنی بائیک پر لے آئے گا۔ بس جلدی نکلو۔'' اس نے فون بند کردیا۔

یوسف ذہنی طور پر پہلے ہی بہت الجھا ہوا تھا۔ اس صورتِ حال پر مزید کوفت میں مبتلا ہوگیا۔ اگلے پانچ منٹ میں حسن اسے لینے آگیا۔ مخدوش ذہنی کیفیت کے تحت وہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ حسن کے پاس جب اپنی بائیک موجود ہے تو عدیل براہِ راست اسی کے توسط سے نوٹس بھجوا سکتا تھا۔ وہ یوسف کی آمد کے لیے کیوں اتنا مصر تھا؟

پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد وہ دونوں ایک اجاڑ اور سنسان عوامی پارک میں موجود تھے۔ یوسف اب بھی غائب دماغی میں مبتلا تھا۔ اس کا ذہنی ارتکاز اور لاشعور تا حال ثنا کی جانب متوجہ تھے۔ حسن اس کا ہاتھ تھامے پارک کی عقبی سمت درختوں کے جھنڈ میں بڑھنے لگا۔

''یہ کیا مذاق ہے حسن...... عدیل کہاں ہے؟'' وہ جھنجلا گیا۔

''یہیں موجود ہے عدیل بھی...... پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' اس نے بے پروائی سے کہا۔

تھوڑی دور جانے کے بعد عدیل بھی نظر آگیا لیکن اس کے پاس کسی قسم کا کوئی سامان نہیں تھا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے عدیل؟ تم لوگ کیا گیم کررہے ہو میرے ساتھ؟'' وہ بھڑک اٹھا۔

''گیم تو تم کرتے آئے ہو ہمارے ساتھ میرے بھولے بادشاہ! اور اب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا ہے تو ہمت ہارنے لگے ہو۔'' اپنے عقب سے ایک سرد آواز نے اسے پل بھر کے لیے ساکت کردیا۔

اس کے بدترین خدشات حقیقت کا روپ دھارتے نظر آنے لگے۔ فرحان لہو رنگ آنکھوں اور چہرے پر نفرت

سجائے اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ نہیں آرہی...... یہ انتہائی گھٹیا مذاق ہے......" اس کا وجود لرزنے لگا۔

فرحان نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر ایک زوردار گھونسا رسید کیا اور غراتے ہوئے بولا۔

"چند ماہ قبل جب زید اور بلال نے تمہاری اس نئی تبدیلی کی بابت بتایا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تم میرے ہی گھر میں نقب لگا رہے ہو۔ تمہاری شہ کی وجہ سے وہ بالشت بھر کی چھوکری ہمارے منہ کو آنے لگی ہے...... ہمیں میڈیا اور قانون کی دھمکیاں دیتی ہے...... اور کل تو میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ اس کی شادی تم ہی سے کرواؤں گا...... اس شادی کو یادگار بنانے کے لیے ہی تو تمہیں یہاں بلوایا ہے میں نے۔"

فرحان کے سفاک لہجے نے یوسف کے وجود میں سنسناہٹ پیدا کر دی۔ اس نے بے اختیار وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن حسن اور عدیل نے اسے سختی سے دبوچ لیا۔ ان دونوں کی سیاسی تنظیموں سے وابستگی اور بدمعاش فطرت لوگوں سے میل جول کے باعث ہی فرحان نے انہیں اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔

وہ دونوں اس کے بازو تھامے درختوں کے جھنڈ میں لے گئے۔ شام کے سائے دھیرے دھیرے گہرے ہونے لگے تھے۔ آسمان پر پرندوں کے شور کے باوجود وہ اپنی جانب بڑھتی موت کی صدا بخوبی سن رہا تھا۔

درختوں کی آڑ میں لے جاتے ہی فرحان نے اپنی پشت پر موجود بیگ کھولا اور ایک بڑا سا چاقو اور قدرے چھوٹی کلہاڑی برآمد کی۔ اس کے بعد اس نے ان دونوں کو اشارے سے اسے زمین پر لٹانے کے لیے کہا اور پتلون کی جیب میں موجود فون نکال کر ایک نمبر ملایا۔

"ندیم بھائی! شکار قابو میں آچکا ہے...... فون ثنا کو دیجیے۔"

دوسری جانب سے فوری طور پر فون اس کے حوالے کر دیا گیا۔ فرحان گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا اور بھرپور طاقت سے چاقو اس کے سینے میں گھونپ دیا۔ یوسف کے حلق سے بے ساختہ چیخ برآمد ہوئی۔ فرحان نے اپنے فون کا اسپیکر آن کر دیا۔ ثنا کی ہذیانی آواز اس کی سماعت میں پڑنے لگی۔

اس نے ایک بار پھر چاقو اس کے بازو میں گھونپا۔ گوشت اور ریشوں کے کٹنے کی آواز ثنا کو سنانے کے لیے اس نے ایسے ان گنت وار کیے اور ہر وار سے قبل فون بالکل اسی جگہ کے پاس رکھ دیتا۔ ثنا کی چیخ و پکار اور منت سماجت بڑھتی چلی جا رہی تھی لیکن اس پر تو کوئی جنون سوار ہو چکا تھا۔ خرخراہٹ کی آواز سنتے ہی ثنا کی صدائیں یک دم تھم گئیں۔ وہ اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھی۔ اپنے وقار و بھرم کے لیے محبت کی مسافت اختیار کرتا یوسف سلیم خوابوں کا تاوان ادا کرتے، خاک اوڑھے بے نام و نشان قبر میں سو گیا۔

☆☆☆

کمرے میں پنکھے کی مدھم گھوں گھوں کی آواز میں ثنا کو یوسف کی کراہیں، کربناک چیخیں اور اذیت گونجتی سنائی دے رہی تھی۔

فرحان کی یقین دہانی کے بعد اس کی مسرتوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا لیکن اگلے روز ندیم نے اس کا بازو دبوچتے ہوئے اپنا موبائل فون اس کے کان سے لگایا تو وہ اس کا مطلع نظر سمجھ ہی نہ پائی۔ اسی پل یوسف کی وحشت ناک چیخوں نے اسے ہذیان میں مبتلا کر دیا۔ وہ متواتر ان کی منت سماجت کرتی رہی لیکن وحشت و جنون کا یہ رقص تھم نہ پایا۔ یوسف کی خرخراتی آواز تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

اگلے کئی روز وہ یونہی اپنی سدھ بدھ گنوائے خالی الذہنی کی کیفیت میں مبتلا رہی۔ اذیت و کرب نے اس کا ذہن مکمل طور پر مفلوج کر دیا تھا۔ شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت وہ یوسف پر گزری قیامت یکسر بھول گئی۔ اس کی ذہنی رو منقطع ہو جاتی اور وہ ایک بار پھر ماضی کو ہی اپنا حال سمجھنے لگتی۔ اس کا ذہنی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا تھا۔

یوسف کے غیاب پر سلیم اختر کی کالج آمد و رفت، رسول نگر میں تشویش کی لہر اور اسے تلاشنے کی ناکام کوششوں کا احوال اس تک کبھی پہنچنے ہی نہ دیا گیا اور پھر ایک روز خاندانی روایات کے مطابق اس کی شادی طے کر دی گئی۔

ثنا کی خوشی سنبھالے نہ سنبھل رہی تھی۔ وہ اب بھی اسی گمان میں جی رہی تھی کہ فرحان کے ایما پر ندیم اور اشفاق اس کی شادی یوسف سے طے کرنے کے لیے راضی ہو گئے ہیں لیکن یہ بھرم اور ٹرانس اس سادہ دڑبے نما کمرے میں تپائی پر موجود ایک سرخ رنگ کی شے دیکھ کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس سرخی میں اسے یوسف کی آخری صدائیں، خرخراہٹ اور لہولہو وجود پوری شدت سے یاد آگیا تھا۔

وہ اپنا بوجھل وجود گھسیٹتے ہوئے تپائی کے پاس پہنچی۔ سرخ غلاف میں موجود قرآنِ پاک نکالا اور اسے عقیدت و احترام سے چوم کر کھولتے ہوئے یوسف کے روحانی سکون کے لیے بہ آوازِ بلند تلاوت شروع کر دی۔

طاقتور

ملک صفدر حیات

لالچ اور طمع کسی بھی نوعیت کا ہو انسان کی عقل پر پردے ڈال دیتا ہے... کوئی عشق میں اندھا اور کوئی دولت کے لیے پاگل... انسان مفاد میں کبھی عزت سے کھیلتا ہے اور کبھی زندگی سے... وہ دونوں بھی جب والدین کی عزت کو خاک میں ملا کر نکلے تو خود بھی خاک میں مل گئے اور طاقت کے گھمنڈ میں کوئی تیسرا شخص اس خونی واردات میں بازی لے گیا مگر... لاکھ تدبیروں کے باوجود ناحق بہنے والا خون خود ہی قاتل کا پتا دے جاتا ہے بشرطیکہ منصف کے ہاتھ میں ترازو اپنا توازن قائم رکھے اور... ملک صفدر جیسے اصول پسند لوگ اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے کوئی بھی انتہائی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ لہٰذا انصاف تو ہونا ہی تھا مگر کچھ معاملات میں انصاف ملنے کے بعد بھی انسان خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔

عزت کا جنازہ نکالنے والے عاقبت نااندیشوں کے جنازوں کا عبرت اثر واقعہ

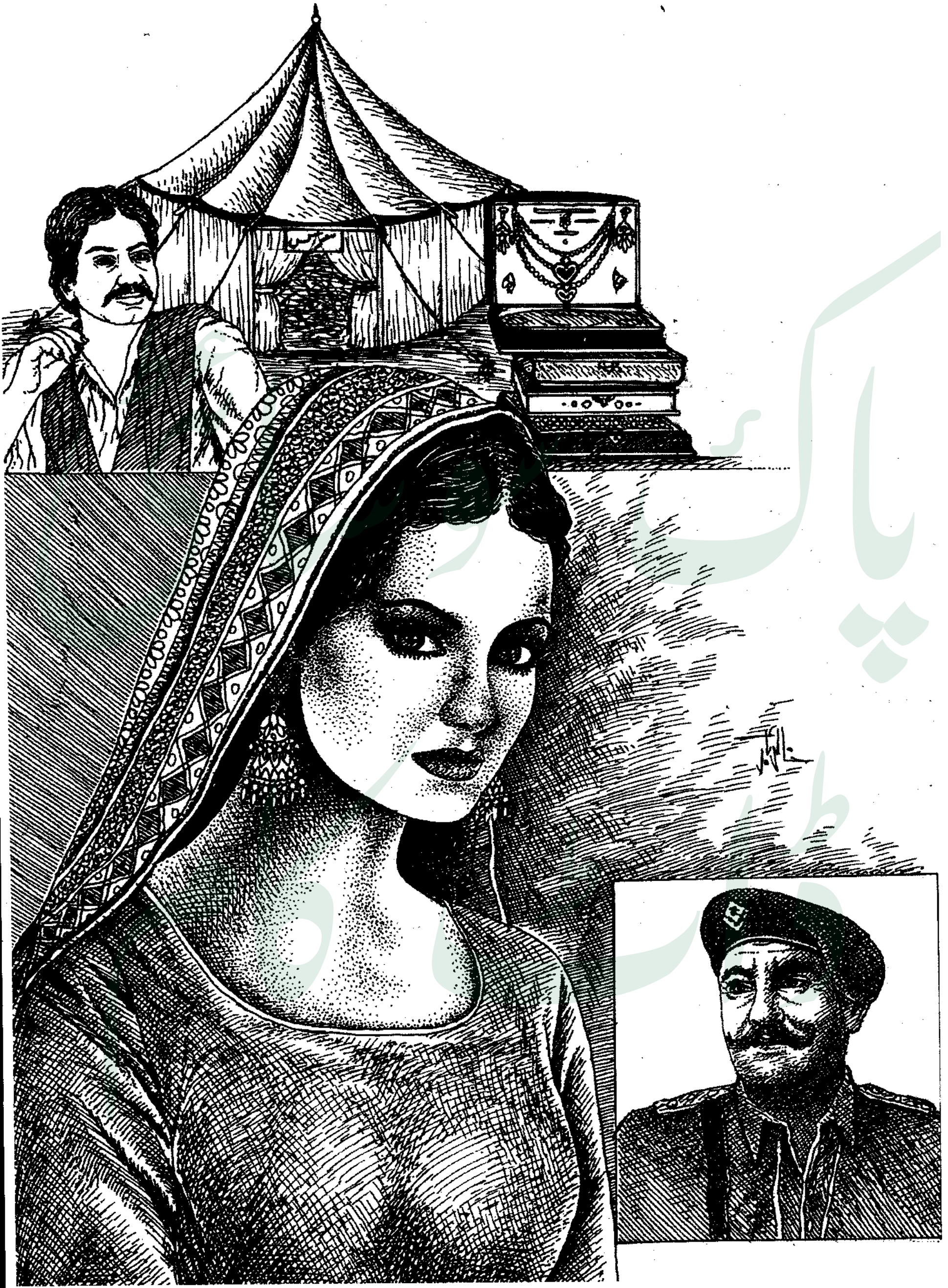
اکلوتی اولاد کے والدین بہت جذباتی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر اگر یہ اولاد بیٹی ہو اور وہ بھی بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی ہو تو پھر والدین کی حساسیت اور جذباتیت میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے اور اسی جذباتی وابستگی کے سبب وہ بیٹی کی شادی کے سلسلے میں دانستہ تاخیری حربے اختیار کرنے لگتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں، اگر بیٹی بیاہ کر دوسرے گھر چلی گئی تو وہ تنہا رہ جائیں گے۔ تنہائی کے اسی احساس سے ڈر جانے والے والدین بعض اوقات بڑی سیاست سے کام لیتے ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھانڈ کر کوئی ایسا لڑکا تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہوتا کہ اسے بہ آسانی گھر داماد بنایا جا سکے۔ اس طرح ان کے جگر کا ٹکڑا یعنی ان کی بیٹی ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسا سوچنا یا ایسا کرنا غلط ہے یا درست، میرے خیال میں اگر باہمی رضامندی سے کسی والدین کو اپنی بیٹی کے لیے ایسا کوئی گھر داماد لڑکا مل جاتا ہے تو اس میں کوئی برائی بھی نہیں۔

ان کو بھی اپنی بیٹی کے لیے ایک ایسا ہی شوہر چاہیے تھا جو گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہو۔ وہ کافی عرصے سے کسی ایسے ہی شخص کی تلاش میں تھے۔ قبل اس کے کہ ان کی محنت رنگ لاتی، ان کی اکلوتی اولاد گھر سے غائب ہو گئی تھی۔

وہ گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔ ایک روز حسب معمول میں تیار ہو کر تھانے پہنچا تو لڑکی کی گمشدگی کا ایک کیس میرا منتظر تھا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے میرے پاس پہنچ کر بتایا۔

''ملک صاحب! یہ لوگ کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

کانسٹیبل کے ''یہ لوگ'' کا مطلب میں بڑی وضاحت سے سمجھ گیا تھا۔ اس کا اشارہ ان دو افراد کی طرف



تھا جو باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک مرد اور دوسری عورت تھی۔ جب میں اپنے کمرے کی طرف آرہا تھا تو ان پر میری نگاہ پڑی تھی۔

میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''معاملہ کیا ہے؟''

''ان کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہوگئی ہے۔'' مذکورہ کانسٹیبل نے بتایا۔ ''وہ اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم انہیں اندر بھیج دو۔'' میں نے کہا۔ ''اور میرے لیے ٹھنڈا پانی بھی۔''

وہ بڑے ادب سے گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح فریج کا رواج عام نہیں ہوا تھا۔ لفظ ''رواج'' کو اگر ''ضرورت'' سے بدل دیا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ آج کل جہاں تک بجلی کی رسائی ہے وہاں ضروریات زندگی کی تقریباً تمام اشیا پہنچی ہوئی ہیں جیسے ٹی وی، فریج، کیبل لیکن جس زمانے کا یہ قصہ ہے، اس وقت گاؤں دیہات میں فریج کا کوئی تصور نہیں ہوتا تھا۔ موسم گرما میں ٹھنڈے پانی کے حصول کے لیے مٹی کے گھڑے اور مٹکے وغیرہ استعمال کیے جاتے تھے۔ ہمارے تھانے میں بھی ٹھنڈے پانی کی فراہمی کا یہ بندوبست موجود تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں ٹھنڈے پانی کا گلاس اور فریادی جوڑا میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں نے اپنی میز کے سامنے بچھی کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔

''بیٹھ جاؤ......!''

لحاتی تذبذب کے بعد وہ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ان کے انداز سے پریشانی مترشح تھی۔ کانسٹیبل کی زبانی مجھے اتنا تو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کے سلسلے میں تھانے آئے ہیں۔ بیٹھنے کے بعد وہ اضطراری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ میں نے ان کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''جی بتائیں......آپ لوگوں کا کیا مسئلہ ہے؟''

سوالیہ انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کردیا۔ مرد نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام غلام سرور ہے اور یہ میری بیوی آسیہ ہے۔'' اس نے اپنی ساتھی عورت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''ایک پریشانی ہمیں کھینچ کر آپ کے پاس لے آئی ہے۔''

''تمہاری جوان بیٹی گھر سے غائب ہوگئی ہے...... ہیں نا؟'' میں نے باری باری ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''گھر سے نہیں تھانے دار صاحب۔'' آسیہ بی بی روہانسی ہوگئی۔ ''وہ تو گھر پہنچی ہی نہیں...... ہم اس کا انتظار کرتے رہ گئے۔ ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی اور اب ہم...... آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔''

یہ بات مجھے کانسٹیبل نے بتائی تھی کہ ان کی جوان بیٹی گھر سے غائب ہوگئی تھی۔ بہرحال، گھر سے یا کہیں باہر سے...... ان کی بیٹی گم ہو چکی تھی۔ غلام سرور نے امداد طلب نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔

''تھانے دار صاحب! ہم زیبو کی وجہ سے سخت پریشان ہیں۔ آپ کسی بھی طرح ہماری بیٹی کو ڈھونڈ نکالیں ورنہ اس کی ماں رو رو کر اپنی آنکھیں اندھی کر بیٹھے گی۔''

''پریشانی تو تم دونوں کے چہروں سے جھلک رہی ہے۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ تمہاری بیٹی کب اور کہاں سے غائب ہوئی ہے۔ جب تک پوری بات مجھے پتا نہیں چلے گی، میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔''

وہ دونوں گھبرا کر سراسیمہ نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ غلام سرور لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! آپ ایسا تو نہ کہیں۔ ہم بہت آس امید لے کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ زیبو کل رات سے غائب ہے...... اوپر خدا اور نیچے آپ ہی ہیں جو زیبو کو ڈھونڈ سکتے ہیں۔''

''میں تمہاری آس اور امید کو توڑ نہیں رہا......'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں تھانے میں آلو پیاز کی آڑھت کرنے نہیں بیٹھا ہوں۔ میرے محکمے نے آپ لوگوں کی دادرسی کے لیے ہی مجھے یہاں تعینات کیا ہے۔ میرے تھانے کی حدود میں جو بھی واقعہ رونما ہوگا اسے میں نے ہی دیکھنا ہے لیکن جب تک مجھے کسی معاملے کے پس منظر کا علم نہیں ہوگا، میں صحیح خطوط پر کوئی کوشش نہیں کرسکوں گا۔ آپ لوگ میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

''جی......جی......'' غلام سرور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جلدی سے بولا۔ ''میں سمجھ گیا جناب۔ میں آپ کو

بتاتا ہوں۔‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔

’’زبیدہ عرف زیبو گزشتہ روز اپنی سہیلیوں کے ہمراہ میلے کی رونق دیکھنے گئی تھی۔ شام تک اس کی سہیلیاں تو واپس اپنے گھروں کو پہنچ گئیں لیکن زیبو ابھی تک غائب ہے۔ ہمارے اختیار میں جو تھا وہ ہم نے کیا لیکن زیبو کی تلاش میں ہمیں کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پچھلی رات ہم نے بڑی اذیت میں گزاری ہے۔ صبح کسی سیانے نے مشورہ دیا کہ ہمیں تھانے جا کر اپنی بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانا چاہیے۔ اس بندے کا مشورہ ہماری سمجھ میں آ گیا اور ہم آپ کے پاس چلے آئے ہیں......‘‘

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ غلام سرور کی بیان کردہ کہانی ہر لحاظ سے نامکمل تھی۔ زبیدہ عرف زیبو کی تلاش کے لیے یہ معلومات کافی نہیں تھیں۔ وہ دونوں اس قدر پریشان تھے کہ کام کی باتیں اگلوانے کے لیے ان کا ایک بھرپور انٹرویو ضروری تھا لہٰذا میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے غلام سرور کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

’’آپ لوگوں نے زیبو کی ان سہیلیوں سے پوچھ تاچھ کی جن کے ہمراہ وہ میلے کی رونق دیکھنے گئی تھی؟‘‘

غلام سرور کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا جبکہ اس کے مقابلے میں آسیہ بی بی کو ہیوی ڈیوٹی کہا جا سکتا تھا۔ آسیہ بی بی ایک موٹی تازی اور خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پینتالیس کے اریب قریب لگایا۔ بعدازاں میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ وہ چھیالیس سال کی تھی۔ ان کی گمشدہ بیٹی زیبو کی عمر چوبیس سال تھی۔

’’ہم نے باری باری سب لڑکیوں سے زیبو کے بارے میں پوچھ لیا ہے۔‘‘ غلام سرور نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ’’لیکن زیبو کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ اس کی دونوں سہیلیاں اپنے اپنے گھروں کو پہنچ گئی ہیں اور ہم ابھی تک زیبو کی راہ تک رہے ہیں۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’زیبو کی ان دو سہیلیوں کے نام کیا ہیں؟‘‘

اس بار آسیہ بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ’’ایک کا نام رفعت ہے اور دوسری کا نام فریدہ ہے۔‘‘

’’فریدہ اور رفعت نے زیبو کی گمشدگی پر کیا کہا ہے؟‘‘

میں نے براہِ راست آسیہ بی بی سے پوچھا۔ ’’میرا مطلب ہے، ان کے خیال میں زیبو کہاں جا سکتی ہے؟‘‘

’’ان کا کہنا ہے کہ واپسی پر زیبو اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔‘‘ آسیہ بی بی نے جواب دیا۔ ’’اس کے بعد وہ دونوں اپنے اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔ انہیں بھی اس بات پر شدید حیرت ہے کہ زیبو جب اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی تو پھر گھر کیوں نہیں پہنچی۔ وہ دونوں زیبو کے لیے بہت پریشان ہیں۔‘‘

’’آسیہ بی بی! تمہاری باتوں سے میں یہ سمجھ پایا ہوں کہ رفعت اور فریدہ تمہاری گلی میں نہیں رہتیں۔‘‘ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ’’اسی لیے وہ میلے سے واپسی پر زیبو کو اس کی گلی میں داخل کر کے آگے بڑھ گئی تھیں؟‘‘

’’جی...... جی ہاں!‘‘ وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ’’وہ دونوں منڈھورا کلاں ہی میں رہتی ہیں لیکن ان کے گھر دوسری گلیوں میں ہیں۔‘‘ لمحاتی توقف کر کے اس نے سانس کو ہموار کیا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

’’فریدہ کا گھر ہماری عقبی گلی میں ہے۔ یوں سمجھیں کہ ہمارا گھر فریدہ کے گھر کے ساتھ پچھواڑے سے ملا ہوا ہے۔ دونوں گھروں کی چھتیں آپس میں ملے ہونے کی وجہ سے بہ ذریعہ چھت دونوں سہیلیاں بہ آسانی ایک دوسرے کے گھر میں آتی جاتی رہتی ہیں جبکہ رفعت کا گھر دو گلیاں چھوڑ کر ہے۔‘‘

پھر غلام سرور نے مجھے بتایا کہ رفعت کی تین سال پہلے شادی ہو گئی تھی۔ اس کا دو سال کا ایک بیٹا ہے۔ یہ بچہ دو سال پہلے عید کے دن پیدا ہوا تھا لہٰذا اس کا نام عید محمد رکھ دیا گیا جو بگڑ کر عیدو ہو گیا۔ رفعت کے شوہر کا نام مشتاق محمد تھا۔ وہ کوٹ کشال نامی گاؤں میں رہتا تھا۔ آج کل رفعت اپنے میکے منڈھورا کلاں آئی ہوئی تھی۔ کوٹ کشال میں مشتاق کریانے کی دکان چلاتا تھا۔

میں نے غلام سرور سے پوچھا۔ ’’کیا زیبو کی شادی ہو چکی ہے؟‘‘

یہ سوال میں نے ایک خاص مقصد سے پوچھا تھا ورنہ اب تک جو حالات میرے علم میں آ چکے تھے ان کی روشنی میں بڑے واضح انداز میں دیکھا جا سکتا تھا کہ گمشدہ زیبو غیر شادی شدہ تھی۔

غلام سرور نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ ’’نہیں جناب۔‘‘

’’کیا وہ منگنی شدہ ہے؟‘‘ میں نے سوال کیا۔

اس نے ایک بار پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ’’اس کی کہیں بات وغیرہ چل رہی تھی؟‘‘

’’ابھی تک اس قسم کا کوئی باقاعدہ سلسلہ شروع نہیں

ہوا تھا۔'' اس نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''سلسلہ تو شروع ہوہی جاتا لیکن زیبو کے باپ کی وجہ سے معاملہ کھٹائی میں پڑ جاتا ہے۔'' آسیہ بی بی نے شکایتی نظر سے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''غلام سرور کی وجہ سے کیوں؟'' میں نے خاصے تیز لہجے میں سوال کیا۔

آسیہ بی بی کی بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر غلام سرور کی جانب دیکھا اور میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''پچھلے چار سال میں پانچ چھ گھروں سے زیبو کے رشتے آئے ہیں مگر غلام سرور نے صاف انکار کر دیا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میں نے الجھن زدہ نظر سے باری باری ان دونوں کی جانب دیکھا۔ ''لوگ تو اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں جو کسی اچھی جگہ سے بیٹی کا رشتہ آجائے؟''

''غلام سرور کہتا ہے، زیبو تو ابھی بچی ہے۔ اس کی شادی کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' آسیہ بی بی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ہاں...... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔'' غلام سرور ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میری نظر میں زیبو ابھی کم سن ہے......'' بولتے بولتے اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ اس نے ایک افسردہ سانس خارج کی پھر اپنی نم آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

''آہ...... میری زیبو کہاں چلی گئی...... میں اسے کدھر تلاش کروں......!''

زیبو، غلام سرور کی اکلوتی اولاد تھی اور اکلوتی اولاد کے حوالے سے میں نے اس کہانی کے ابتدائیہ میں اپنے خیالات کا کھل کر اظہار کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب غلام سرور کی حالت قدرے سنبھل گئی تو میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''غلام سرور! اچھی طرح سوچ کر بتاؤ، کیا اس سے پہلے بھی کبھی زیبو گھر سے غائب ہوئی ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں جواب دیا۔ ''ایسا واقعہ پہلے کبھی پیش نہیں آیا۔''

''تم لوگوں کی کسی سے کوئی خار بازی تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہرگز نہیں جناب۔'' اس نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔ ''ہماری کسی سے کوئی دشمنی نہیں جو زیبو کی گمشدگی کو اس تناظر میں دیکھا جائے۔''

''تمہارے دوسرے رشتے دار کہاں رہتے ہیں؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، منڈھورا کلاں کے علاوہ......؟''

اس نے آلے دوالے کے تین چار گاؤں کے نام گنوا دیے اور کہا۔ ''ہمارے تمام رشتے دار انہی گاؤں میں آباد ہیں۔''

''کیا زیبو انہی میں سے کسی رشتے دار کے گھر تو نہیں چلی گئی؟'' میں نے ایک امکانی بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ''وہ ہمیں بتائے بغیر یوں خاموشی سے اکیلی نہیں جاسکتی اور وہ بھی شام کے وقت...... ناممکن۔ ویسے بھی یہ سارے پنڈ منڈھورا کلاں سے کافی فاصلے پر ہیں۔''

''یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ مجھے اپنے پاس آنے والے مصیبت زدہ افراد سے ہر نوعیت کے سوالات پوچھنا پڑتے ہیں لہٰذا میری کسی بات کا بُرا منانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے باری باری دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لینے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر غلام سرور کی بیوی کی جانب دیکھتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

''آسیہ بی بی! میں تم سے ایک انتہائی نازک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے، تم سچا اور کھرا جواب دو گی......!''

وہ الجھن زدہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ پوچھیں تھانے دار صاحب۔ میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی۔''

''کیا زیبو کسی لڑکے کو پسند کرتی تھی؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

وہ دونوں ہراساں نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ میں نے ان کے اطمینان کی خاطر کہا۔ میرے سوال نے انہیں مضطرب کر دیا تھا۔

''میں یہ سوال کرنے کے لیے مجبور ہوں لیکن آپ لوگوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت ہمارے بیچ میں جو بھی گفتگو ہو رہی ہے، اس کا تذکرہ کسی چوتھے تک نہیں پہنچے گا۔''

''تھانے دار صاحب! میں بڑی سے بڑی قسم کھا کر یہ کہنے کو تیار ہوں کہ زیبو کے ساتھ ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی لڑکے کو نہیں چاہتی تھی۔''

میں نے کرید کا عمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا

گاؤں کا کوئی لڑکا زیبو کو پسند کرتا تھا؟''

''تھانے دار صاحب!'' غلام سرور نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔''ہماری زیبو کے ساتھ ایسا کچھ بھی نہیں تھا کہ وہ کسی سے یا کوئی اس سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہو۔ ہاں، جیسا کہ آسیہ نے آپ کو بتایا ہے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''زیبو کے باقاعدہ کئی گھروں سے رشتے آتے رہے ہیں لیکن ان میں سے کوئی میرے معیار پر پورا نہیں اترا اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔''کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم نے ہونے والے داماد کے لیے اپنے ذہن میں کیا معیار قائم کر رکھا ہے؟''

''بس جی، وہ محنتی ہو، میری زیبو کو کما کر کھلا سکے۔ اس کا خیال رکھ سکے۔'' اس نے جواب دیا۔''اور......!''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے کہا۔''کیا اب تک زیبو کے جتنے بھی رشتے آئے ہیں وہ تمام لڑکے نکھٹو اور ہڈحرام تھے جو تم نے انہیں اپنی فرزندی میں لینے سے انکار کر دیا؟''

''ایسی بات نہیں ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں دریافت کیا۔''تھوڑی دیر پہلے''اور'' پر پہنچ کر تمہارے ریکارڈ کی سوئی پھنس کیوں گئی تھی۔ تم مجھے کیا بتانا چاہ رہے تھے جو اچانک رک گئے......!''

''وہ جناب...... میں یہ کہہ رہا تھا کہ......'' وہ ندامت آمیز انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔''میں ایسے داماد کی تلاش میں ہوں جس کے آگے پیچھے کوئی نہ ہو یا پھر وہ انتہائی مختصر خاندان رکھتا ہو۔ دراصل، میں زیبو کو اپنی نگاہ سے دور نہیں کرنا چاہتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ بیاہ کر مجھ سے دور ہو گئی تو میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ پاؤں گا۔''

اپنی بات کے اختتام پر وہ بے حد جذباتی ہو گیا تھا۔ اس کے مسئلے کو سمجھنے میں مجھے کسی قسم کی کوئی دقت یا دشواری محسوس نہ ہوئی۔ اس کی خواہش کی تہ میں اترنے کے بعد میں نے کہا۔

''تو سیدھی طرح یہ کہو نا کہ تمہیں ایک ایسے لڑکے کی تلاش ہے جو گھر داماد بن کر رہنے کے لیے تیار ہو......؟''

''جی...... جی......'' وہ بڑی سرعت سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔''آپ بالکل ٹھیک سمجھے ہیں۔''

غلام سرور کی خواہش کسی بھی زاویے سے غیر اخلاقی یا غیر قانونی نہیں تھی، لہٰذا میں نے اس کی منصوبہ بندی پر کوئی تبصرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے میں نے ممکنہ سوالات ان میاں بیوی سے پوچھ لیے تھے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک اس کیس کا کوئی سرا میرے ہاتھ نہیں لگا تھا جسے تھام کر میں دوسرے سرے تک پہنچنے کی کوشش کرتا جہاں زیبو سے میری ملاقات ہو جاتی۔

''آپ لوگ قطعی پریشان نہ ہوں۔'' میں نے باری باری ان دونوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔''میں آپ کی بیٹی کو بازیاب کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ...... زیبو بہت جلد آپ تک پہنچ جائے گی لیکن اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے آپ کو مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہوگا۔''

''ہم ہر تعاون کے لیے تیار ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ بہ یک زبان ہو کر فدویانہ انداز میں بولے۔''آپ حکم کریں، ہمیں کیا کرنا ہے......؟''

''اول...... آپ اپنے ان تمام رشتے داروں سے رابطہ کر کے زیبو کے بارے میں معلومات حاصل کریں جن کے پاس اس کے جانے کے امکانات ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے انہیں ہدایت کی۔''دوم...... زیبو اپنی جن دو سہیلیوں کے ساتھ میلا دیکھنے گئی تھی، آپ کو ان دونوں کے بیانات کا بندوبست کرنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں رفعت یا فریدہ کی زبان سے کوئی ایسی بات اگلوانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا جو زیبو کی تلاش کے سلسلے میں مددگار ثابت ہوگی۔ تم ان دونوں خواتین کو تھانے تک لانے کا انتظام کر لو گے؟''

میں نے یہ سوال براہِ راست غلام سرور سے کیا تھا۔ لہٰذا جواب بھی اسی نے دیا۔''جی سرکار! میں یہ کام کر لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔ سمجھ لیں کہ یہ میری ذمے داری ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں دیکھتا ہوں تم اس ذمے داری کو کس طرح نبھاتے ہو......'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا پھر پوچھا......''غلام سرور! تم کرتے کیا ہو؟''

''میرا ذاتی کام ہے جی۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس ذاتی کام کی نوعیت کیا ہے؟''

''میں بوتلوں کا کام کرتا ہوں تھانے دار صاحب۔''

پھر میرے استفسار پر غلام سرور نے مجھے ''بوتلوں والے کام'' کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے اپنے گھر میں دیسی کولڈ ڈرنکس بھرنے کی مشین لگا رکھی تھی۔ دیسی کولڈ ڈرنکس سے مراد وہ بوتلیں ہیں جو کسی نہ کسی برانڈ کے ذائقے کی نقل ہوتی ہیں اور اصل بوتل سے یہ آدھی قیمت پر مل جاتی ہیں۔ غلام سرور اپنے گھریلو پلانٹ پر جو بوتلیں بھرتا تھا ان کے نام کچھ اس طرح تھے...... لیمن، روز اپ، وِمٹو وغیرہ۔ غلام سرور اپنے گھر میں یہ بوتلیں بھرتا تھا پھر بوتلوں والے ڈالے (کریٹ) سائیکل پر لاد کر مختلف دکانوں پر سپلائی کرتا تھا۔

میں نے غلام سرور اور اس کی بیوی آسیہ کو تسلی دی کہ میں بہت جلد ان کی بیٹی زیبو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ دونوں میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں زیبو کی گمشدگی کے بارے میں غور کرنے لگا۔ ان دونوں میاں بیوی سے مجھے جس قدر معلومات حاصل ہوئی تھیں ان سے میری تشفی نہیں ہو سکی تھی۔ ان معلومات کی روشنی میں زیبو تک رسائی حاصل کرنا ممکن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں بیچ میں سے غائب تھیں۔

غلام سرور نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ زیبو کی دونوں سہیلیوں رفعت اور فریدہ کو میرے پاس لے کر آئے گا۔ مجھے امید تھی کہ یہ دونوں خواتین زیبو کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ایسا ضرور جانتی ہوں گی جو اس کی تلاش میں میری مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

راحت کی عمر کم اور تکلیف کا دورانیہ ہمیشہ طویل ہوتا ہے۔ یہی فارمولا موسموں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ پاکستان میں پائے جانے والے موسموں میں موسم گرما کے دن طویل اور موسم سرما کے دن خاصے مختصر ہوتے ہیں۔ موسم سرما میں دن کا آغاز ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد پتا چلتا ہے کہ رات کی آمد آمد ہے جبکہ موسم گرما کے دن کو گزارنا، پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہے۔

سہ پہر کے بعد میرے جی میں آئی کہ منڈھورا کلاں جا کر وہاں کے حالات کا جائزہ لوں۔ غلام سرور اور آسیہ بی بی کی فراہم کردہ معلومات اس معاملے کو آگے بڑھانے کے لیے کافی نہیں تھیں۔ تھانے میں فوری نوعیت کی کوئی مصروفیت نہیں تھی لہٰذا میں نے ایک تانگا منگوایا اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے کر موضع منڈھورا کلاں روانہ ہو گیا۔

ان دنوں میری تعیناتی رسول پور تارڑ کے تھانے میں تھی۔ رسول پور تارڑ نامی یہ قصبہ حافظ آباد اور پنڈی بھٹیاں کے درمیان واقع ہے۔ منڈھورا کلاں، کولھوال، کوٹ کشال، سلطان پورہ، شمس آباد اور چک جنجوعہ میرے تھانے کی حدود میں آتے تھے۔ ہم ایک نہر کے کنارے سفر کرتے ہوئے منڈھورا کلاں پہنچ گئے۔

غلام سرور کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے میں نے اس میلے کا ایک طائرانہ نظارہ بھی کر لیا جس کا ذکر غلام سرور نے کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق، یہ میلا ہر سال مئی کے مہینے میں گاؤں سے باہر ایک کھلے میدان میں لگا کرتا تھا جو کئی دن تک جاری رہتا تھا۔ عام دنوں میں یہ وسیع و عریض میدان بچوں کے کھیل کود کے لیے استعمال ہوتا تھا جس میں فٹ بال، والی بال، پتنگ بازی اور دیگر معروف دیہاتی کھیل کھیلے جاتے تھے۔

غلام سرور کا گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے گھر کے پچھلے حصے میں پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان کے آگے ایک طویل برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد ایک کشادہ صحن تھا جس میں آم اور امرود کے درخت استادہ تھے۔ صحن کے ایک کونے میں برآمدے سے ملحقہ ایک ''اوپن کچن'' بنا ہوا تھا۔ اوپن کچن کے الفاظ سے آپ کہیں اسے امریکن کچن نہ سمجھ لیجیے گا۔ اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ ایک بے در و دیوار چھت والا قدرتی ایئرکنڈیشنڈ باورچی خانہ تھا۔ صحن کے مختلف حصوں میں پانی والے ٹب اور بوتلوں والے خالی اور بھرے ہوئے دونوں قسم کے ڈالے بھی رکھے نظر آ رہے تھے۔ اس گھر کا تیسرا کمرا مکان کے سامنے والے حصے میں، داخلی دروازے کے ساتھ بنا ہوا تھا اور اس کمرے میں غلام سرور نے بوتلیں بھرنے والی پریشر مشین لگا رکھی تھی۔ گویا یہ اس کی کولڈ ڈرنک فیکٹری تھی!

غلام سرور نے ہمیں اپنے گھر کے صحن میں بٹھایا۔ اگرچہ موسم کافی گرم تھا لیکن سائے دار درختوں کے نیچے... چارپائی پر بیٹھنا خاصا خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ غلام سرور اور اس کی بیوی آسیہ ہمارے سامنے دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے تو میں نے کہا:

''غلام سرور! مجھے تمہارے کہے ہوئے الفاظ پر تو کسی قسم کا کوئی شبہ نہیں لیکن میں نے سوچا کہ خود ہی تمہارے گاؤں کا ایک چکر لگا لیتا ہوں۔ اس طرح رفعت اور فریدہ سے بھی ملاقات ہو جائے گی اور میں جائے وقوعہ کا جائزہ بھی

لے لوں گا۔ ہوسکتا ہے، کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے جس کی مدد سے میں زیبو کا سراغ لگانے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا جو آگئے۔" آسیہ بی بی سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "ورنہ ہم نے تو پروگرام بنایا تھا کہ صبح ہی صبح آپ کے پاس جائیں گے۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہوگئی تھی کہ آپ لوگوں کو میرے پاس آنے کا پروگرام بنانا پڑا؟"

"بات دراصل یہ ہے تھانے دار صاحب......" غلام سرور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ "میں نے کچھ رقم آسیہ کے پاس رکھوائی تھی۔ وہ پیسے گھر سے غائب ہیں۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ غلام سرور نے بڑی اہم بات کی تھی۔ آسیہ بی بی نے کہا۔

"ہم اسی وجہ سے آپ کے پاس آنا چاہتے تھے۔"

"کتنی رقم غائب ہوئی ہے؟" میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

"دو ہزار روپے۔" اس نے جواب دیا۔

"دو ہزار......" میں نے حیرت بھرے انداز میں دہرایا۔

میری حیرت کا سبب یوں تھا کہ جس زمانے کا واقعہ میں آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں تب دو ہزار روپے کوئی معمولی رقم شمار نہیں ہوتی تھی۔ وہ بہت ہی بھلا اور سستا زمانہ تھا۔ ایک عام آدمی کی تنخواہ تیس سے چالیس روپے ہوا کرتی تھی یا زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ روپے۔ سونا ستر، اسی روپے تولہ مل جاتا تھا۔ ایک درمیانے سائز کے گھرانے کا مہینے بھر کا راشن دس روپے میں آجاتا تھا۔ اب آپ خود ہی حساب لگالیں کہ اس دور کے دو ہزار روپے آج کل کتنی مالیت کے حامل تھے!

آسیہ بی بی نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ "جی تھانے دار صاحب۔"

غلام سرور نے مجھے بتایا۔ "میں نے یہ رقم ایک خاص مقصد کے لیے آسیہ کے پاس رکھوائی ہوئی تھی۔ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا رہتا ہوں۔ یہ میری برسوں کی بچت ہے...... بلکہ بچت تھی۔ اب تو وہ گھر سے غائب ہوچکی ہے...... آہ!" اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر افسردہ انداز میں بتانے لگا۔

"میں بڑی دھوم دھام سے زیبو کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے سامنے والا مکان خرید کر زیبو کو

دینا چاہتا تھا تا کہ شادی کے بعد وہ ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہے۔ میری کوشش تو یہی تھی کہ مجھے کوئی نیک اور صالح گھر داماد مل جائے۔ یہ مکان خرید کر زیبو کو دینے والا منصوبہ اس صورت کے لیے تھا کہ اگر زیبو کا شوہر ہمارے ساتھ رہنے کے لیے راضی نہ ہوا تو میں ان لوگوں کو سامنے والے گھر میں بسا دوں گا مگر...... سب ختم ہو گیا...... زیبو بھی گئی اور...... دو ہزار کی رقم بھی غائب ہے۔''

میں ایک دکھی باپ کے جذبات کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ غلام سرور کے تمام منصوبوں کا ستیاناس ہو گیا تھا۔ میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچ رہا تھا۔ زبیدہ عرف زیبو کی گمشدگی کے ساتھ ہی گھر سے دو ہزار بھی غائب ہوئے تھے لہٰذا ایسا سوچنے میں کوئی قباحت نہیں تھی کہ زیبو وہ رقم اپنی مرضی سے ساتھ لے گئی ہوگی۔ اسی پوائنٹ کو نظر میں رکھتے ہوئے میں نے آسیہ بی بی سے پوچھا۔

''تم نے دو ہزار کی یہ رقم کہاں رکھی تھی؟''

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اپنے شوہر کی طرف دیکھا پھر جھلّائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''سرور! تھانے دار صاحب کافی دیر سے بیٹھے ہیں۔ تم ان کے لیے کوئی ٹھنڈی بوتل تو لے کر آؤ۔ دیکھو تو کتنی گرمی ہو رہی ہے۔''

اس نکتے پر میں آسیہ بی بی سے متفق تھا کہ موسم بہت گرم ہو رہا تھا لہٰذا میں نے غلام سرور کو کولڈ ڈرنک لانے سے منع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت میں واقعتاً شدید پیاس محسوس کر رہا تھا اور یقیناً میرے ساتھ آنے والے کانسٹیبل کا بھی یہی حال تھا۔

غلام سرور اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''میں ان لوگوں کے لیے دودھ سوڈا بنا کر لاتا ہوں۔''

''دودھ سوڈا'' اس زمانے کا ایک معروف اور ہر دل عزیز مشروب تھا جسے گرمی کا توڑ سمجھا جاتا تھا۔ پکے ہوئے دودھ کے اندر سوڈے کی کوئی بھی بوتل ملا کر دودھ سوڈا تیار کر لیا جاتا تھا اور حسبِ ضرورت اس میں چینی اور برف بھی شامل کر لی جاتی تھی۔ اس مقصد کے لیے عموماً روز اَپ کی بوتل استعمال کی جاتی تھی جس کے اندر موجود سوڈا واٹر کا رنگ سرخ ہوتا تھا۔ دودھ میں شامل ہونے کے بعد اس ٹھنڈے میٹھے مشروب یعنی دودھ سوڈا کا رنگ گلابی ہو جاتا تھا جو گرمی کو منہ توڑ جواب دیتا تھا۔

غلام سرور کے جانے کے بعد میں نے آسیہ بی بی کے سامنے اپنا سوال دہرایا۔ ''تم نے دو ہزار کی یہ رقم کہاں رکھی تھی؟''

''کپڑوں والے ٹرنک میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمام کپڑوں کے بالکل نیچے۔''

''اور یہ ٹرنک (بڑا صندوق) کہاں رکھا تھا؟'' میں نے استفسارات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میرے کمرے میں۔'' اس نے گھر کے عقبی حصے میں بنے دو کمروں میں سے ایک کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں اور سرور (غلام سرور) اسی کمرے میں رہتے ہیں۔''

''کیا زیبو تم لوگوں کے ساتھ اس کمرے میں نہیں رہتی تھی؟''

''نہیں جی...... وہ دوسرے کمرے میں رہتی تھی۔'' بات کے اختتام پر اس نے مذکورہ کمرے کی طرف اشارہ بھی کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''گھر میں تمہارے علاوہ یہ بات اور کس کو معلوم تھی کہ دو ہزار روپے کپڑوں والے ٹرنک کی تہ میں رکھے ہوئے ہیں؟''

''یہ بات میرے علاوہ سرور اور زیبو کو بھی پتا تھی۔''

''کیا اس ٹرنک میں تم کوئی تالا وغیرہ بھی ڈال کر رکھتی تھیں؟''

''نہیں جی......'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بتایا۔ ''تالا لگانے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ ہم تینوں کے سوا اس گھر میں کوئی آتا جاتا نہیں ہے اور اگر کوئی آتا بھی ہے تو اسے کیا پتا کہ میں نے ٹرنک کے اندر کپڑوں کے نیچے دو ہزار روپے چھپا رکھے ہیں......!''

''گویا یہ رقم تم تینوں میں سے کسی نے غائب کی ہے!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے تیکھے انداز میں سوال کیا۔

''میں کیوں غائب کروں گی جی......'' وہ یک لخت پریشان ہو گئی۔ ''اور سرور بھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔ وہ اکثر میرے پاس رقم رکھواتا رہتا ہے اور جب اسے ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ ہی سے مانگتا ہے۔''

''اور زیبو کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے......؟'' اس کے چہرے پر نگاہ جما کر میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ میرے سوال کو اچھی طرح سمجھ گئی اور بولی۔ ''میں زیبو کو بھی چور نہیں سمجھتی تھانے دار صاحب۔''

''تم یہ تو تسلیم کرتی ہو نا کہ گھر سے دو ہزار روپے غائب ہوئے ہیں؟''

''جی......اس میں تو کوئی شک ہی نہیں۔''

''اور زیبو بھی کل شام سے غائب ہے؟''

''جی۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''کیا اس سے پہلے بھی کبھی گھر میں سے کوئی رقم غائب ہوئی ہے؟''

''نہیں جی...... کبھی نہیں۔'' وہ سر کو انکاری جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''یہ پہلا واقعہ ہے۔''

''اور تم لوگوں نے تھانے میں مجھے بتایا تھا کہ زیبو کی گمشدگی کا بھی یہ پہلا واقعہ ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس سے پہلے وہ کبھی گھر سے غائب نہیں ہوئی تھی؟''

''جی......جی...... حقیقت یہی ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''تم مجھے کیا سمجھتی ہو آسیہ بی بی؟''

میرے اس سوال نے اسے الجھن میں ڈال دیا۔ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

''آپ تو تھانے دار ہیں جی۔''

''اور تھانے دار کا کام ہے، تھانے داری کرنا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تو تم مانتی ہونا......؟''

''جی بالکل مانتی ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولی۔

''میرا پیشہ یعنی یہ ''تھانے داری'' مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ میں حالات و واقعات کو مدنظر رکھتے ہوئے منطقی انداز میں سوچوں۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''اور میں منطقی طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ رقم کے غیاب کا زیبو کی گمشدگی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ سادہ الفاظ میں تم یہ سمجھ لو کہ جہاں زیبو گئی، رقم بھی وہیں گئی ہے۔''

''میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا تھانے دار صاحب۔'' وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھامتے ہوئے بولی۔

''تم پریشان نہیں ہو آسیہ بی بی۔'' میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ''تمہیں آزردہ دیکھ کر غلام سرور بھی ہمت ہارنے لگتا ہے۔ تم لوگوں کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ کیس میرے ہاتھ میں ہے اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ بہت جلد میں زیبو کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور پھر رقم کو بازیاب کرنے میں بھی دیر نہیں لگے گی۔''

وہ تشکرانہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے روہانسے انداز میں بولی۔ ''رقم گئی چولھے میں۔ بس زیبو خیریت سے صحیح سلامت واپس آ جائے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے......''

بات کے اختتام پر اس کی آنکھیں چھلک گئیں۔ وہ اپنے دوپٹے کے پلو سے آنکھوں میں اترنے والے آنسوؤں کے نمکین سیلِ آب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کرنے لگی۔

آسیہ بی بی ایک ماں تھی۔ میں اس کے محسوسات کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان لمحات میں بیٹی کی گمشدگی کے حوالے سے بہت زیادہ جذباتی ہو رہی تھی اور...... اسے مغموم ہونا بھی چاہیے تھا۔ جس کا کلیجا جل رہا ہو وہی اس کی تپش کو محسوس کر سکتا ہے۔ دور سے دیکھنے والے تماشائی کہلاتے ہیں......!

ہمارے بیچ سوال و جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ غلام سرور دودھ سوڈے کے ساتھ واپس آ گیا۔ وہ اللہ کا بندہ جگ بھر کر دودھ سوڈا بنا لایا تھا، برف کی آمیزش نے جسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا تھا۔ میں نے اور کانسٹیبل نے دو دو کنگ سائز گلاس دودھ سوڈا اپنے معدوں میں اتارا تو گرمی ہم سے کوسوں دور جا کھڑی ہوئی۔ اس ''کام'' سے فارغ ہونے کے بعد میں نے غلام سرور سے کہا۔

''میں تمہارے دونوں کمروں کو اندر سے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''جی......ضرور دیکھیں۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے کانسٹیبل کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور غلام سرور کی معیت میں عقبی کمروں کی سمت بڑھ گیا۔ میرے وہاں سے ہٹتے ہی کانسٹیبل دوبارہ دودھ سوڈے والے جگ کے ساتھ ''مصروف'' ہو گیا تھا۔

درحقیقت میں غلام سرور کے گھر کا تفصیلی معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ گھر ایک لحاظ سے ''جائے وقوعہ'' کی حیثیت کا حامل تھا۔ زیبو نے اپنی زندگی کے چوبیس سال اس گھر میں گزارے تھے۔ اس امر کا اغلب امکان تھا کہ اس گھر کے اندر سے مجھے کوئی ایسا سراغ مل جاتا جو زیبو کی بازیافت میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ زیبو کی تلاش کے سلسلے میں مجھے ہر محاذ پر کام کرنا تھا اور اس مشن میں، میں معمولی سے معمولی اشارے کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا تھا۔

غلام سرور کی راہ نمائی میں پہلے میں نے اس کمرے کا معائنہ کیا جو ان میاں بیوی کے استعمال میں تھا۔ اس کمرے میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی۔ وہاں سے مجھے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی جو کسی بھی حوالے سے زیبو کی تلاش میں مددگار ثابت ہو سکتی تھا۔ میں مذکورہ کمرے سے نکل کر زیبو والے کمرے میں آ گیا۔

غلام سرور سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا جبکہ آسیہ بی بی باہر ہی رہ گئی تھی۔ میں نے زیبو والے کمرے کا

تفصیلی جائزہ لیا تو اس تلاش کے سلسلے میں مجھے پہلی کامیابی حاصل ہوگئی۔ زیبو کے کپڑے والے اٹیچی کیس میں سے مجھے ایک تہ شدہ پرچہ ملا۔ یہ پرچہ کسی لائن دار کاپی میں سے پھاڑ کر الگ کیا گیا تھا۔ میں نے تہ شدہ اس پرچے کو کھول کر دیکھا تو میرے پورے وجود میں سنسنی سی پھیل گئی۔ مذکورہ پرچے پر رقم وہ مختصر سی تحریر مجھے چونکا دینے کے لیے کافی تھی۔ وہاں لکھا تھا۔

''آج شام چھ بجے میلے میں، سرکس کے قریب...... کھارا۔''

اس یک سطری تحریر سے ظاہر ہوتا تھا کہ کھارا نامی کسی شخص نے شام چھ بجے کسی شخص سے میلے میں سرکس کے قریب ملاقات کی بات کی تھی۔ یہ پرچہ چونکہ زیبو کے اٹیچی کیس میں سے برآمد ہوا تھا لہٰذا ذہن یہی کہتا تھا کہ کھارا نے زیبو سے شام چھ بجے سرکس کے نزدیک میلے میں ملنے کا اشارہ دیا تھا۔ زیبو گزشتہ روز اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ہمراہ میلا دیکھنے گئی تھی۔ حالات و واقعات کی روشنی میں یہ پتا چلتا تھا کہ یہ رقعہ گزشتہ روز صبح یا دوپہر میں کھارا کی جانب سے زیبو تک پہنچا تھا اور پھر زیبو، کھارا سے ملاقات کرنے میلے کی طرف گئی تھی۔

ان لمحات میں میرا ذہن برق رفتاری سے کام کر رہا تھا۔ میں نے مذکورہ رقعہ غلام سرور کی جانب بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''جی......'' وہ میرے اس اچانک سوال پر بوکھلا گیا اور اضطراری لہجے میں بولا۔ ''یہ ایک کاغذ ہے جی......''

''تم نے دیکھا، یہ کاغذ مجھے کہاں سے ملا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جی تھانے دار صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے اسے زیبو کے اٹیچی کیس میں سے نکالا ہے۔''

میں نے مختصر تحریر والا وہ رقعہ اسے تھماتے ہوئے پوچھا۔ ''دیکھو...... اس میں کیا لکھا ہے؟''

اس نے میرے ہاتھ سے وہ پرچہ لے لیا پھر بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں چٹا ان پڑھ ہوں جناب۔ میں نہیں جانتا، اس کاغذ پر کیا لکھا ہے۔ آپ پڑھ کر سنائیں۔''

مجھے اس کی مجبوری کا احساس ہوگیا۔ میں نے فوراً اس کی فرمائش پوری کردی۔

مذکورہ رقعے کی تحریر سے آشنائی کے بعد غلام سرور کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ ندامت آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے لرزیدہ لہجے میں بولا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھانے دار صاحب...... یہ سب کیا ہے جناب......؟''

''یہ سب زیبو کی گمشدگی کا خلاصہ ہے غلام سرور۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''کسی کھارا نے گزشتہ روز شام چھ بجے تمہاری بیٹی زیبو کو میلے میں سرکس کے نزدیک ملنے کے لیے بلایا تھا۔ مجھے بتاؤ، یہ کھارا کون ہے؟''

''کھارا کا اصل نام افتخار ہے جناب۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''یہ نذیر عرف جیرا تیلی کا بیٹا ہے۔ جیرا تیلی اور کھارا ادھر منڈھورا کلاں ہی میں رہتے ہیں لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ کھارا کا میری زیبو سے کیا تعلق......!''

''تعلق تو بہت گہرا ہے غلام سرور۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر واقعی تمہاری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تو میں سمجھاتا ہوں......''

میں سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا، غلام سرور وحشت زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جارہی تھیں۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ ان پڑھ شخص معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا تاہم اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ زیبو کا کھارا سے کوئی تعلق واسطہ بھی ہوسکتا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے تجزیے سے آگاہ کردیا۔

''لیکن ...... یہ کیسے ...... ہوسکتا ہے تھانے دار صاحب ......'' وہ نحیف آواز میں بولا۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آرہا......''

''غلام سرور! تمہارے یقین کرنے یا یقین نہ کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی۔'' میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا...... اب یہ سوچو کہ زیبو کو واپس کیسے لانا ہے؟''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ یکا یک زمین پر بیٹھا پھر میرے پاؤں کو تھام کر منت آمیز لہجے میں بولا۔

''تھانے دار صاحب! میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے......''

مجھے ایک باپ کی بے بسی، بے چارگی اور لجاجت پر بہت ترس آیا۔ والدین بعض حالات میں کس قدر نادم اور مجبور ہوجاتے ہیں۔ غلام سرور کی ذہنی اور قلبی کسمپرسی پر میرا

دل کٹ کر رہ گیا۔ ان لمحات میں میرے دل و دماغ میں صرف ایک ہی آرزو تھی کہ...... کاش! اولاد کے اندر اپنے والدین کی عزت کا احساس جاگ اٹھے......!

میں نے جھک کر غلام سرور کو شانوں سے تھام لیا پھر بہ زورِ بازو اسے کھڑا کرتے ہوئے حوصلہ بخش لہجے میں کہا۔ ''غلام سرور! زیبو میری بیٹی کی طرح ہے۔ بچوں سے غلطی ہوجاتی ہے۔ وہ نادانی میں غلط قدم اٹھالیتے ہیں۔ یہ ان کا جذباتی فیصلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر انہیں مطلق احساس نہیں ہوتا کہ وہ اپنے والدین کے چہروں پر کالک مل کر تاریک راہوں کی مسافرت اختیار کررہے ہیں۔ انہیں بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کا یہ اقدام انہیں تباہی و بربادی کے عمیق گڑھے میں جا پھینکے گا۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر اپنی بدبختی پر مہر تصدیق ثبت کردیتے ہیں لیکن ......'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے نہایت ہی سنجیدگی سے کہا۔

''......لیکن بڑوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ چھوٹوں کی کوتاہیوں کو ٹھیک کریں۔ ہم بڑے ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی اصلاح کرنا ہے۔ تم فکر نہ کرو غلام سرور۔ میں بہت جلد زیبو کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ اس کی تلاش کے سلسلے میں ''کھارا'' کی شکل میں ایک سرا میرے ہاتھ لگ گیا ہے۔ میں اس ڈور کو تھام کر زیبو اور کھارا تک پہنچ جاؤں گا...... ان شاء اللہ!''

فرطِ ندامت سے اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ وہ ممنونیت سے لبریز آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! اگر آپ میری بیٹی کو عزت و آبرو کے ساتھ ڈھونڈ کر صحیح سلامت واپس لے آئیں تو میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''مجھے انسانوں کی عزت و آبرو کی حفاظت کرنا آتا ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''تم مطمئن ہوجاؤ۔ تمہاری عزت میری عزت ہے۔''

''آپ بہت عظیم ہیں تھانے دار صاحب......!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اللہ میری باقی عمر بھی آپ کو دے دے۔''

''غلام سرور......!'' میں نے اس کے منوں بوجھ تلے دبے ضعف زدہ کندھے کو تشفی بھرے انداز میں تھپتھپاتے ہوئے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''عظیم صرف اللہ کی ذات پاک ہے اور ساری تعریفیں اسی پر جچتی ہیں۔ عزت اور ذلت دینے کا اختیار اسی خالق و مالک کے پاس ہے۔ میں تو اس کا ایک ادنیٰ سا بندہ ہوں اور اپنی بساط بھر کوشش میں لگا رہتا ہوں اور ...... کامیابی یا ناکامی اسی پر چھوڑ دیتا ہوں۔ اگر میرے مالک کو منظور ہوا تو زیبو بہت جلد صحیح سلامت تمہارے سامنے ہوگی۔''

''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے تھانے دار صاحب۔'' وہ اپنی بھیگی آنکھوں کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

اس وقت ہم دونوں کے سوا اس کمرے میں اور کوئی بندہ بشر موجود نہیں تھا اور یہ اچھا ہی تھا ورنہ میں نے اس کیس کو حل کرنے کے لیے زیبو کے اٹیچی کیس سے جو اہم سراغ ڈھونڈ نکالا تھا، وہ کسی تفتیش اور تحقیق کے مرحلے سے گزرے بغیر ہی کسی سنسنی خیز انکشاف کے مانند جنگل کی آگ کی طرح منڈھورا کلاں کے قرب و جوار میں پھیل جاتا جس کے نتیجے میں مجھے کارِ سرکار کے حوالے سے مختلف نوع کی دقت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ اسی خدشے کے پیشِ نظر میں نے کہا۔

''غلام سرور! یہ راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہنا چاہیے کہ کھارا اور زیبو کے حوالے سے مجھے کوئی رقعہ ملا ہے۔ جب تک میں تم سے نہ کہوں، تم مختصر تحریر والے اس پرچے کا ذکر کسی سے نہیں کروگے۔ میری بات سمجھ رہے ہونا......؟''

''اچھی طرح سمجھ گیا سرکار۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں، میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔ آپ مجھ پر بھروسا کرسکتے ہیں۔''

میں نے اس رقعے کو تہ کرکے اپنی جیب میں رکھا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''غلام سرور! میں نے تمہارے ذمے ایک کام لگایا تھا۔ اس سلسلے میں تم نے کچھ کیا؟''

''کون سا کام تھانے دار صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''وہ جو میں نے تم سے کہا تھا کہ میں رفعت اور فریدہ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے یاد دلایا۔ ''کیا تم نے اس کا کوئی بندوبست کیا ہے؟''

''جی۔ میں نے ان دونوں کے گھر والوں سے بات کی ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لیکن ایک مسئلہ ہے......''

وہ متذبذب انداز میں رکا تو میں نے پوچھا۔ ''کون سا مسئلہ؟''

''میں نے رفعت کے باپ وزیر علی اور فریدہ کے باپ حکیم بسم اللہ کو آپ کے بارے میں بتایا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں حکیم بسم اللہ نے ایک درخواست کی ہے۔''

''کیسی درخواست؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''حکیم بسم اللہ کا کہنا یہ ہے کہ لڑکیوں کو تھانے بلا کر تفتیش کرنا مناسب نہیں۔'' غلام سرور نے منت ریز لہجے میں بتایا۔ ''یہ عزت دار لوگ ہیں۔ جو بھی سنے گا کہ ان کی بیٹیوں کو تھانے میں بلایا گیا ہے، وہ اپنے ذہن کے مطابق سو باتیں بنائے گا۔ تھانے دار صاحب سمجھ دار آدمی ہیں۔ اگر وہ والدین کی مجبوریوں کا احساس کریں تو پوچھ پرتیت کا یہ سلسلہ حکیم بسم اللہ کے گھر پر رکھا جا سکتا ہے۔''

غلام سرور کی بات میں وزن تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ تجویز حکیم صاحب نے دی ہے؟''

''جی سرکار!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا رفعت کا باپ وزیر علی اس تجویز سے متفق ہے؟''

''سولہ آنے متفق ہے جناب۔'' اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ''اور رفعت کا شوہر مشتاق محمد بھی اس تجویز سے پوری طرح مطمئن ہے۔''

پھر غلام سرور نے مجھے بتایا کہ کوٹ کشال سے مشتاق آیا ہوا ہے اور ایک آدھ روز میں وہ رفعت اور دو سالہ بیٹے کو اپنے ساتھ کوٹ کشال لے جائے گا۔ ان کی شادی کو تین سال ہوئے تھے۔ عیدوان کا اکلوتا بیٹا تھا۔

گمشدہ زبیدہ عرف زیبو آخری مرتبہ گزشتہ شام رفعت اور فریدہ کے ساتھ اپنی گلی کے کونے تک آئی تھی لہٰذا یہ دونوں اس کی تلاش کے سلسلے میں میری خاصی مدد کر سکتی تھیں اسی لیے میں نے پوچھ گچھ کی غرض سے انہیں تھانے بلانے کی بات کی تھی لیکن حکیم بسم اللہ نے جو تجویز پیش کی تھی وہ ہر لحاظ سے جائز اور معقول نظر آتی تھی چنانچہ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''غلام سرور! مجھے حکیم بسم اللہ کی یہ تجویز نما فرمائش منظور ہے۔ تم رفعت کو حکیم صاحب کے گھر میں بلا لو۔ جب تک میں تمہارے گھر کی چھت کی سیر کر لیتا ہوں۔''

''بہت بہتر سرکار......'' وہ جلدی سے بولا۔

بات کے اختتام پر وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے فوراً محسوس کر لیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن کسی خاص وجہ سے رک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ہچکچاہٹ کو میں بڑے واضح انداز میں دیکھ سکتا تھا۔

''کیا بات ہے غلام سرور۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کوئی مسئلہ ہے کیا؟''

''وہ سرکار......'' وہ لجاجت بھرے انداز میں بولا۔ ''میں کھاراوالے معاملے کی وجہ سے ڈر رہا ہوں......''

''کیسا ڈر؟'' میں نے دریافت کیا۔

''آپ انہیں تفتیش کے لیے تھانے بلائیں گے یا ادھر گاؤں ہی میں پوچھ تاچھ کریں گے؟'' جواب دینے کے بجائے اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

میں اس کے خوف کی تہ میں اتر گیا پھر تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس حوالے سے ڈرنے یا فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا، بہت طریقے سلیقے سے کروں گا۔ میرے کسی عمل سے تمہاری عزت پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔''

''آپ کا بہت بہت شکریہ سرکار۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں آپ کے ایک ایک احسان کو زندگی بھر بھلا نہیں سکوں گا۔''

''میرے احسانات کی گنتی میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کرو غلام سرور۔'' میں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے خلوص بھرے انداز میں کہا۔ ''اگر انسان ہمت کا دامن تھام کر رکھے تو زندگی کے مسائل اس کے سامنے قدم جما کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ مشکل وقت کو جرأت مندی ہی سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اگر انسان ہمت ہار کر بیٹھ جائے تو پھر مشکل وقت اس کی پشت پر سوار ہو جاتا ہے اور...... اسے قبر میں اتار کر ہی دم لیتا ہے۔''

میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھ گئی۔ وہ بڑی سرعت سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''جی سر...... میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔''

میں نے غلام سرور کو روانہ کیا اور کانسٹیبل کو اپنے پاس بلا لیا اور کہا۔ ''معشوق علی! کیا تم اس سے پہلے بھی منڈھورا کلاں آئے ہو؟''

مذکورہ کانسٹیبل کا نام معشوق علی اور اس کے بھائی کا نام عاشق علی تھا۔ اکثر لوگ ان دونوں بھائیوں کے ناموں پر حیرت کا اظہار کرتے تھے اور بعض اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق، اظہار رائے بھی کرتے تھے۔ معشوق پستہ قامت اور عاشق دراز قد تھا۔

''جی ملک صاحب!'' معشوق علی نے جواب دیا۔ ''میں کئی بار یہاں آ چکا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"میں تھوڑی دیر کے لیے حکیم صاحب کے گھر میں مصروف رہوں گا۔ اس دوران میں تم نے ایک اہم کام کرنا ہے۔"

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔ "حکم کریں ملک صاحب۔"

میں نے اسے جیرا تیلی اور اس کے بیٹے افتخار عرف کھارا کے بارے میں خصوصی ہدایات دیں اور غلام سرور کی چھت کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

حکیم کا اصل نام احمد شجاع تھا لیکن وہ "حکیم بسم اللہ" کے نام سے منڈھورا کلاں اور گردونواح کے تمام گاؤں میں مشہور تھا اور اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ وہ بات بات پر "بسم اللہ" کے الفاظ دہراتا رہتا تھا لہٰذا لوگ اسے حکیم احمد شجاع کے بجائے حکیم بسم اللہ کے نام سے جانتے تھے۔

یہ میری حکیم بسم اللہ سے پہلی ملاقات تھی۔ اس کی عمر ستر سے متجاوز تھی۔ وہ ایک پستہ قامت اور مائل بہ فربہی بدن کا مالک شخص تھا۔ اس کے بال سلامت تھے مگر ان میں مکمل سفیدی جھلکتی تھی۔ یہی حال اس کی ڈاڑھی کا بھی تھا۔ اس نے سر پر ٹوپی بھی سفید ہی لگا رکھی تھی۔ حکیم احمد شجاع نے "بسم اللہ" کی تکرار سے میرا استقبال کیا پھر بڑی نرمی سے بولا۔

"ملک صاحب! میں آپ کا شکر گزار ہوں جو آپ نے میری تجویز مان لی۔"

اس وقت میں حکیم بسم اللہ کی بیٹھک میں بیٹھا تھا اور وہاں ہم دونوں کے علاوہ غلام سرور بھی موجود تھا۔ میں نے حکیم صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جناب! آپ کی تجویز جائز اور معقول تھی لہٰذا اسے رد کرنے کے لیے میرے پاس کوئی جواز نہیں تھا۔ عزت دار لوگ دوسروں کی عزت کا بھی پاس کرتے ہیں۔"

"بسم اللہ...... اللہ بھلا کرے آپ کا۔" وہ پُرسوچ انداز میں سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "انسان کسی دوسرے انسان کو وہی کچھ دے سکتا ہے جو اس کے پاس ہوتا ہے۔ عزت والا دوسروں کی بھی عزت کرتا ہے۔"

چند لمحات تک ہمارے درمیان زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے بات ہوتی رہی۔ حکیم بسم اللہ بھی زیبو کے غیاب پر بہت دکھی تھا۔ زیبو اس کی بیٹی فریدہ کی گہری سہیلی تھی۔ فریدہ، حکیم بسم اللہ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔ فریدہ کے دونوں بھائی اس سے بڑے تھے جن کی عمریں علی الترتیب پچیس اور تیس سال تھیں۔ فریدہ کم وبیش اٹھارہ سال کی تھی۔

میں نے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا تم نے رفعت کو بلالیا ہے؟"

"رفعت اپنے خاوند کے ساتھ گھر کے اندرونی حصے میں موجود ہے ملک صاحب۔" غلام سرور کے بجائے حکیم بسم اللہ نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے، پہلے آپ ان لوگوں کو فارغ کردیں۔ فریدہ تو اپنے گھر کی بچی ہے۔ اس سے... آپ بعد میں پوچھ تاچھ کر لیجیے گا۔"

میں نے حکیم بسم اللہ کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ پہلی پارٹی کو میرے پاس بھیج دیں۔"

حکیم بسم اللہ اٹھ کر کھڑا ہوا تو غلام سرور نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی نگاہ کا مطلب سمجھ گیا اور کہا۔

"غلام سرور! میں تنہائی میں دونوں خواتین سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں لہٰذا تمہیں بھی جانا ہوگا۔"

وہ منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر بیٹھک سے باہر نکل گیا۔ اگلے ہی لمحے رفعت اور مشتاق محمد میرے سامنے موجود تھے۔ رفعت دلکش سراپا کی مالک ایک خوبصورت عورت تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے پچیس کے آس پاس لگایا۔ بھرے بھرے بدن نے اس کے حسن کی زرخیزی میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ اس کی بہ نسبت مشتاق محمد "بس ایویں" سا ہی تھا۔ "پہلوئے حور میں لنگور، خدا کی قدرت" والا محاورہ شاید ایسے ہی جوڑوں کے لیے بنایا گیا ہے۔ مشتاق محمد، رفعت کے ساتھ اس طرح چپکا ہوا تھا جیسے اسے ڈر ہو کہ اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس کی نگاہ چوکی تو کوئی اس کی منکوحہ کو چرالے جائے گا......!

حسین ودل نشیں بیویوں کے واجبی شکل وصورت کے مالک شوہروں کو اکثر وبیشتر بڑے کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے کیسز میں شوہر نہ چاہتے ہوئے بھی بہت زیادہ شکی مزاج ہوجاتا ہے۔ اگر بیوی مسکرا کر کسی مرد سے بات کرلے تو اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔

میں نے بہ غور اس بے میل جوڑے کا جائزہ لیا پھر مشتاق محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "ادھر کوٹ کشال میں تمہاری کریانے کی دکان کیسی چل رہی ہے؟"

"جی ...... اللہ پاک کا شکر ہے؟" اس نے کھرے لہجے میں جواب دیا۔

"میں نے پوچھا۔ "چھوٹے عیدو کا کیا حال ہے؟"

"وہ بھی ٹھیک ہے جی۔"

"اسے ساتھ لائے ہو یا وہ نانی کے گھر میں ہے؟"

"ساتھ لائے ہیں جی۔" اس نے بتایا۔ "وہ اندر

حکیم صاحب کے گھر میں ہے۔''
''میں تمہیں ایک زحمت دینا چاہتا ہوں مشتاق محمد......!''
اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں تھانے دار صاحب!''
''تم تھوڑی دیر کے لیے عیدو کے پاس چلے جاؤ۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم بچے کا خیال رکھو جب تک میں تمہاری بیوی سے سوال جواب کر لیتا ہوں۔''
''وہ جی ...... بچہ اندر خیر خیریت ...... سے ہے......''
اس نے رفعت کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''میں ادھر ہی بیٹھنا چاہتا......ہوں جناب......''
میں مشتاق محمد کے تحفظات یعنی اس کی نفسیاتی مجبوری کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا لیکن اس وقت میں بھی اپنے فرض کے تقاضوں کے سامنے مجبور تھا۔ اگر مشتاق محمد میرے سر پر سوار رہتا تو رفعت آزادانہ طور پر میرے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی تھی لہٰذا اس شکی اور متذبذب شخص کو بیٹھک سے باہر نکالنا ضروری تھا۔
''مشتاق محمد!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''تھانے دار تم ہو یا میں؟''
وہ میری بات کی تہ تک نہ پہنچ سکا، پلکیں جھپک کر الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''جناب، ظاہر ہے...... تھانے دار تو آپ ہی ہیں۔ میں تو کریانے کی دکان چلاتا ہوں۔''
''اگر تم تھانے دار نہیں ہو تو پھر مجھے تھانے داری کرنے دو۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے۔ ''تم جا کر باہر بیٹھو۔ میں چند منٹ تمہاری بیوی سے تنہائی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''
اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں بیٹھی یا نہیں۔ بہرحال، اس نے کوئی ضد بحث نہیں کی اور چپ چاپ بیٹھک سے باہر چلا گیا۔ میں رفعت کی جانب متوجہ ہو گیا۔
''رفعت!'' میں نے براہِ راست اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''شادی سے پہلے تم ادھر منڈھورا کلاں ہی میں رہتی تھیں اور شادی کے بعد بھی تم گاہے بگاہے یہاں کا چکر لگاتی رہتی ہو اس لیے مجھے امید ہے کہ تم منڈھورا کلاں کے معاملات کو اچھی طرح سمجھتی ہو گی؟''
''جی......'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ ''اگرچہ اس گاؤں کے تمام لوگوں سے میرا میل جول نہیں لیکن اکثر کو میں جانتی ہوں۔''
''میں دیگر لوگوں کی بات نہیں کر رہا رفعت۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا اشارہ زبیدہ عرف زیبو کی طرف ہے!''
''زیبو کو تو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔
''اگر تم زیبو کو اچھی طرح جانتی ہو تو پھر یقیناً تمہیں اس بات کا بھی علم ہو گا کہ آج کل اس کا گاؤں کے کس لڑکے کے ساتھ چکر چل رہا تھا؟'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''
''یہ بات تمہارے علم میں نہیں یا تم کسی مصلحت کے پیش نظر مجھے بتانا نہیں چاہ رہی ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''ہوسکتا ہے، زیبو نے تمہیں اس راز کو فاش کرنے سے منع کر رکھا ہو......!''
''میں قسم کھا کر کہتی ہوں جی......'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''میں زیبو کے ایسے کسی معاملے سے واقف نہیں ہوں۔''
''تم کہاں تک پڑھی ہوئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔
اس نے بتایا۔ ''میں نے تو اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی۔''
''مطلب یہ کہ......تم اردو کا ایک لفظ نہیں پڑھ سکتی ہو؟''
''بالکل نہیں جی۔'' وہ گردن کو نفی میں جھٹکتے ہوئے بولی۔
پہلے میرے جی میں یہ آئی تھی کہ میں رفعت کو وہ معنی خیز رقعہ دکھاؤں جو مجھے زیبو کے اٹیچی کیس میں سے ملا تھا اور پھر اس سے پوچھوں کہ زیبو اور کھارا کے بیچ کون سی کھچڑی پک رہی تھی۔ اسی غرض سے میں نے اس کی تعلیم کے بارے میں سوال کیا تھا لیکن پھر ایک فوری خیال کے تحت میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور پوچھا۔
''زیبو کے باپ غلام سرور نے مجھے بتایا ہے کہ کل تم اور فریدہ زیبو کے ہمراہ میلا دیکھنے گئی تھیں اور واپسی پر تم لوگوں نے زیبو کو اس کی گلی کے کونے تک چھوڑا تھا بلکہ وہ تم دونوں کے سامنے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تھی......؟''
''سرور چاچا نے آپ کو بالکل ٹھیک بتایا ہے۔'' رفعت نے جواب دیا۔
''کیا اس کے بعد پھر زیبو سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی؟''
''نہیں جی......''
''مطلب، تمہیں بالکل اندازہ نہیں کہ زیبو کہاں گم

ہو گئی ہے؟"

"اگر اس بارے میں مجھے کچھ پتا ہوتا تو میں آپ کو ضرور بتاتی۔" وہ بے چارگی سے بولی۔ "میں زیبو کی گمشدگی کے لیے خود بہت پریشان ہوں اور میری آرزو ہے کہ وہ جلد از جلد مل جائے۔"

اس کے الفاظ سے سچائی کی بو آتی تھی۔ میں اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی روشنی میں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ میرے سوالات کے جواب میں وہ کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہی تھی۔ میں مزید دس منٹ تک گھما پھرا کر اس سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن اس انٹرویو کے نتیجے میں کوئی ایسی بات سامنے نہ آسکی جس کی مدد سے میں زیبو تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کوئی عملی قدم اٹھاتا۔

میں نے رفعت کو جانے کی اجازت دے کر فریدہ کو اپنے پاس بلالیا۔

فریدہ سترہ اٹھارہ سال کی ایک تیز طرار لڑکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے شرارت آمیز ذہانت ٹپکتی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی کھوجی ایسی جھلک تھی۔ فریدہ کا شمار ان لڑکیوں میں ہوتا تھا جن کے اندر تفتیش، تشکیک، تحقیق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں ذرا سی بھی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ اس سانولی سلونی لڑکی کے بدن میں ایک بے چین اور مضطرب روح قید تھی۔

"فریدہ! تم نے کتنی تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟" میں نے سوالات کا آغاز کرتے ہوئے نرم لہجے میں استفسار کیا۔

"میں پرائمری پاس ہوں تھانے دار صاحب۔" اس نے بڑے فخر سے بتایا۔

فریدہ کا فخر بے جا نہیں تھا۔ اس زمانے میں میٹرک پاس شخص بابو کہلاتا تھا۔ اس تناظر میں کسی لڑکی کا پرائمری پاس ہونا آج کل کا گریجویشن سمجھ لیں۔ فریدہ کے حوالے سے میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی تھی اور وہ یہ کہ ...... فریدہ ایک نڈر اور بے باک لڑکی تھی۔ اسے اپنی بات کہنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔

"ویری گڈ!" میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا پھر اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کہا۔ "یہ تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ انسان کو کم از کم اتنا تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے کہ لکھنے پڑھنے کے میدان میں اسے کسی کی محتاجی نہ ہو......" لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ تم زیبو کی سب سے گہری سہیلی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ اپنے دل کی ہر بات تم سے کہتی ہوگی۔ اس کا کوئی بھی معاملہ تم سے پوشیدہ نہیں ہوگا......؟"

"گہری سہیلی والی بات تو ٹھیک ہے جی لیکن میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرسکتی کہ وہ اپنے دل کی ہر بات مجھے بتاتی ہو......"

"یہ تو تم بڑی عجیب بات کر رہی ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "جب وہ تمہاری سب سے گہری سہیلی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنی خاص باتیں تم سے چھپاتی ہو......!"

میری بات کے جواب میں فریدہ نے کچھ نہیں کہا۔

میں نے دوسرے زاویے سے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ "تم نے پرائمری تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کیا زیبو بھی لکھنا پڑھنا جانتی تھی؟"

"وہ باقاعدہ اسکول تو نہیں گئی لیکن میں نے کوشش کر کے اسے گزارے لائق لکھنا پڑھنا سکھا دیا تھا۔" فریدہ نے بتایا۔

"مطلب یہ کہ وہ اردو کی تحریر پڑھ اور سمجھ لیتی تھی؟"

"جی!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی پھر چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں تھانے دار صاحب؟"

میں نے سر دست اس کے سوال کا جواب نہیں دیا اور پوچھا۔ "کیا زیبو نے کبھی تم سے کسی کے نام کوئی خط لکھوایا تھا؟"

"کبھی نہیں!" وہ پوری قطعیت سے بولی۔

"یا کسی کا بھیجا ہوا کوئی رقعہ تم سے پڑھوایا ہو؟" میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"بالکل بھی نہیں......" وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھ رہی ہوں، آپ مجھ سے کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں...... کوئی ایسی بات جس کا تعلق زیبو کی گمشدگی سے ہے۔"

فریدہ متجسس فطرت کی مالک ایک ذہین لڑکی تھی۔ میری معنی خیز کرید سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں نے زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے کسی خاص راز کو پالیا ہے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ زیبو کے اٹیچی کیس سے ملنے والے رقعے کے بارے میں فریدہ کو بتا دوں۔ وہ یقیناً اس بارے

میں کچھ نہ کچھ جانتی ہوگی۔ میں نے کہا۔
"تم بالکل ٹھیک سمجھ رہی ہو فریدہ!"
"پھر بتائیں نا، آپ مجھ سے کون سی اہم بات چھپا رہے ہیں؟" وہ پُراشتیاق انداز میں مستفسر ہوئی۔
"بتاؤں گا لیکن پہلے تم مجھ سے وعدہ کرو کہ کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گی۔" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ "جب تک میں زیبو کو تلاش نہیں کر لیتا، تم اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھو گی۔"
"جی۔ میں پکا وعدہ کرتی ہوں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "آپ مجھ پر بھروسا کر سکتے ہیں۔"
"تم پر بھروسا ہے جبھی تو میں نے یہ ذکر چھیڑا ہے۔" میں نے اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "تم بہت دانش منداور تعلیم یافتہ لڑکی ہو۔"
اپنی تعریف ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ میرے توصیفی کلمات سے وہ خوش ہوگئی۔ میں نے اپنی جیب سے وہ تہ شدہ کاغذ نکال کر فریدہ کی جانب بڑھا دیا جو مجھے گمشدہ زیبو کے اٹیچی کیس میں سے ملا تھا۔
اس نے مذکورہ کاغذ کو کھول کر پڑھا۔ اس دوران میں، میں اس کے چہرے اور آنکھوں میں ابھرنے والے تاثرات کا بہ غور جائزہ لے رہا تھا۔ اس مختصر سی تحریر نے فریدہ کو چونکا دیا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھرنے والی بے یقینی اور حیرت آمیز الجھن نے مجھے بتا دیا کہ وہ زیبو اور کھارا کے بیچ پائے جانے والے کسی معمولی یا غیر معمولی تعلق سے واقف نہیں تھی۔ اس نے دو، تین مرتبہ اس یک سطری تحریر کو پڑھا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے سرسراتی ہوئی آواز میں بولی۔
"یہ کیا ہے تھانے دار صاحب......؟"
"یہ ایک رقعہ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "جو کھارا نے زیبو کو لکھا تھا اور اسے بتایا تھا کہ گزشتہ شام زیبو میلے میں سرکس کے قریب اس سے ملاقات کرے۔"
"یہ تو میں بھی سمجھ رہی ہوں۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی پھر پوچھا۔ "یہ خط آپ کو کہاں سے ملا ہے؟"
"زیبو کے کپڑوں والے اٹیچی کیس کے اندر سے۔"
"اوہ......!" وہ ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گئی۔
"تم زیبو کی ایک رازدار سہیلی ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اور کھارا بھی منڈھورا کلاں ہی کا وسنیک ہے۔ مجھے بتاؤ، میں اس بات پر کیسے یقین کر لوں کہ زیبو اور کھارا کے "عشق پیچے" سے تم واقف نہیں ہو......؟"
"مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ کھارا کے گھر سے زیبو کا رشتہ آیا تھا۔" وہ پُرسوچ انداز میں بولی۔ "اور سرور چاچا نے اس رشتے سے انکار کر دیا تھا۔ باقی آپ نے جس "عشق پیچا" کا ذکر کیا ہے، ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔"
"قسم کھانے کی ضرورت نہیں بیٹی۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "مجھے تمہاری بات کا بھروسا ہے مگر تم خود بتاؤ، اس خط کی مختصر سی تحریر کیا پیغام دے رہی ہے......؟"
"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں تھانے دار صاحب۔" وہ گمبھیر انداز میں بولی۔ "لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں زیبو کے کسی ایسے چکر کی خبر نہیں رکھتی۔ زیبو نے اس حوالے سے کبھی میرے سامنے کھارا کا ذکر نہیں کیا۔"
"تم نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا تھا کہ غلام سرور نے زیبو کے لیے آئے ہوئے کھارا کے رشتے سے انکار کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "اس انکار کا کوئی خاص سبب تھا؟ کیا کھارا میں کوئی خامی تھی؟"
"کھارا میں ایسی کوئی خامی نہیں کہ جس کی مذمت کی جا سکے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "میں سمجھتی ہوں کہ اس انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ چاچا سرور جیرا تیلی اور اس کے بیٹے کھارا کو کم ذات سمجھتا ہے۔"
"کوئی بھی انسان اپنی ذات کی بنا پر کم تر یا برتر نہیں ہوتا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کا عمل اور کردار اس کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا تعین کرتا ہے۔ ایک نیچ ذات کا شخص بھی اپنے فعل اور اخلاق کی بدولت عظمت کی بلندیوں کو چھو سکتا ہے۔"
"آپ کہتے تو ٹھیک ہی ہیں تھانے دار صاحب۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "پر چاچا سرور کو کون سمجھائے......!"
"اس لم ڈھینگ کو میں چنگی طراں سمجھاؤں گا۔" میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ "لیکن پہلے میں زیبو کو بازیاب کر لوں......" پھر میں نے اچانک سوال کیا۔ "میلا دیکھنے جانے والا آئیڈیا زیبو کا تھا نا؟"
"جی۔ یہ پروگرام اسی نے بنایا تھا۔" وہ جلدی سے بولی۔

''ہوں......'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ زیبو نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تم دونوں کو اپنے ساتھ کرلیا تھا اور واپسی پر بھی وہ تم دونوں کی نظروں کے سامنے ہی اپنی گلی میں داخل ہوئی تھی تاکہ... بہ وقتِ ضرورت تم لوگ گواہی دے سکو کہ وہ میلے سے تم دونوں کے ساتھ واپس آئی تھی اور تم لوگوں نے اپنی آنکھوں سے اسے گلی میں داخل ہوتے دیکھا تھا......!''

''آپ کی باتوں سے تو ایسا ہی لگتا ہے جی۔'' وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''زیبو بہت ہی گھنی لڑکی ہے تھانے دار صاحب۔ اس نے نہ تو کسی کو کھارا والے معاملے کی ہوا لگنے دی اور نہ ہی ہمیں یہ محسوس ہونے دیا کہ وہ کسی خاص مقصد کے لیے میلا دیکھنے کی ضد کررہی تھی۔ اب میری سمجھ میں آرہا ہے کہ اس نے میلے میں......''

اس نے بولتے بولتے اچانک خاموشی اختیار کی تو میں چونک اٹھا۔ میں نے اضطراری انداز میں سوال کیا۔

''اب تمہاری سمجھ میں کیا آرہا ہے؟''

''زیبو نے میلے میں ایک عجیب حرکت کی تھی......!''

''کیسی حرکت؟'' میں نے زور دے کر پوچھا۔

''ہوا کچھ یوں تھانے دار صاحب......'' وہ... پُرخیال انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''میلے میں مختلف اشیائے خورونوش کے علاوہ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کے اسٹال بھی لگے ہوئے تھے۔ ہم ان اسٹالز پر فروخت ہونے والی مختلف اشیا کا جائزہ لے رہے تھے کہ چوڑیوں والے ایک اسٹال پر ہمیں محسوس ہوا کہ زیبو ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم نے یعنی میں نے اور رفعت نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ زیبو کہاں غائب ہوگئی؟ ہم دونوں کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ ہم اس کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں دوڑا ہی رہے تھے کہ وہ ہمیں سرکس والے تنبو کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ قریب پہنچنے پر ہم... نے جب اس سے پوچھا کہ وہ کہاں مرگئی تھی تو الٹا اس نے ہم پر چڑھائی کردی۔ اس کا اصرار اس بات پر تھا کہ ہم اسے اکیلا چھوڑ کر آگے بڑھ گئے تھے۔ ہم اس وقت چوڑیوں والے جس اسٹال پر کھڑے تھے، سرکس والے تنبو اس کے عقب میں تھے یعنی ہم لوگ سرکس کو پیچھے چھوڑ کر یہاں پہنچے تھے۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا اور سرزنش بھرے انداز میں کہا۔

''ہم نے تمہیں نہیں چھوڑا بلکہ تم خود ہی ہوشیاری سے پیچھے رہ گئی تھیں۔''

رفعت نے بھی اسے لتاڑا۔ ''تم تو ''الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے'' والی بات کررہی ہو......!''

ہمارے انداز سے زیبو گھبرا گئی اور لکنت زدہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہ نا...... مجھے ایک اسٹال پر...... ململ کے دوپٹے نظر آئے تو میں انہیں...... دیکھنے کے لیے رک گئی تھی۔ جب میں نے نگاہ اٹھائی تو تم دونوں مجھے دکھائی نہیں دیں...... میں نے بڑی مشکل سے تمہیں ڈھونڈا ہے۔ دیکھ رہی ہو نا، میلے میں کتنا رش ہے۔''

فریدہ نے مجھے بتایا۔ ''زیبو کی وضاحت میں اگرچہ کوئی دم نہیں تھا لیکن اس وقت چونکہ میرے ذہن میں اس کے حوالے سے شک والی کوئی بات موجود نہیں تھی لہٰذا میں اس کی بات پر اعتبار کرکے مطمئن ہوگئی تھی مگر......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اب یہی لگ رہا ہے کہ زیبو نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یقیناً کھارا سے ملنے گئی تھی اور انہوں نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ زیبو ہمارے ساتھ میلے سے واپس جائے گی اور جب ہم اسے اس کی گلی میں داخل کرکے آگے بڑھ جائیں گے تو وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق دوبارہ کھارا کے پاس پہنچ جائے گی۔ تھانے دار صاحب......'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''آپ کا شک بالکل درست ہے۔ مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ زیبو اپنی مرضی سے کھارا کے ساتھ کہیں گئی ہے۔''

''فریدہ! تم ایک ذہین اور عقل مند لڑکی ہو۔'' میں نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''بڑی ہوکر تم کیا بنوگی؟''

''کیا میں آپ کو بڑی نہیں لگتی؟'' فریدہ کے استفسار سے معصومیت جھلکتی تھی۔

''بڑی تو میں تمہیں اس وقت مانوں گا جب تم ان تمام باتوں کو راز رکھوگی جس کی میں نے تمہیں تاکید کی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ویسے میرے پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ آگے تمہارا کیا ارادہ ہے۔ تم نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''ابا جی تو مجھے حکیمنی بنانا چاہتے ہیں۔'' وہ میری بات کو سمجھتے ہوئے بولی۔ ''جبکہ ریاض اور فیاض میرے دونوں بڑے بھائیوں کی یہ خواہش ہے، جلد از جلد میری شادی

کر دی جائے۔''

''تمہارے ابا جی حکیم بسم اللہ کا ارادہ نیک ہے اور تمہارے دونوں بھائیوں کی سوچ بھی خاصی معقول ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اس حوالے سے تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا جی ......'' وہ سادگی سے بولی۔

''تمہاری سمجھ میں کچھ اس لیے نہیں آتا کہ تم اچھی خاصی سمجھ دار ہو۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جو لوگ عقل سے پیدل ہوتے ہیں وہی سب سمجھنے کے دعوے کرتے ہیں۔ ویسے تمہارے لیے میرا ایک مشورہ ہے......''

وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ''کون سا مشورہ جی؟''

''اگر تمہارے ابا جی اجازت دیں تو تم پولیس ڈیپارٹ منٹ میں ملازمت اختیار کر لو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے اندر پولیس والوں کی طرح تجزیہ کرنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔ تم اس شعبے میں بہت کامیابی حاصل کر سکتی ہو۔''

''آپ مذاق تو نہیں کر رہے......؟'' وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اللہ...... آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔'' وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے تھانے دارنی بننے کا بہت شوق ہے مگر ابا جی مجھے حکیمنی بنانا چاہتے ہیں......'' پھر وہ خاصی مچل کر بولی۔ ''آپ ابا جی سے میرے بارے میں بات کریں نا!''

''میں تمہارے سلسلے میں حکیم بسم اللہ سے بات کروں گا مگر زیبو کی گمشدگی والے اس کیس کو حل کرنے کے بعد۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اور جب تک میں زیبو کا سراغ نہیں لگا لیتا تم نے کسی کو نہیں بتانا کہ ہمارے بیچ کیا اہم باتیں ہوئی ہیں۔ تم سمجھ رہی ہو نا، میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''بڑی چنگی طراں سمجھ رہی ہوں جی۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ بولی۔ ''تھانے دار صاحب! آپ جلد از جلد زیبو کو ڈھونڈ نکالیں۔''

''ان شاء اللہ! میں زیبو کی بازیابی کے لیے پوری کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔

ایک دو مزید سوالات کے بعد ضروری ہدایات دے کر میں نے فریدہ کو فارغ کر دیا۔ میں حکیم بسم اللہ کے گھر سے نکلا تو غلام سرور میرے ہمراہ تھا۔ اس نے فکرمند لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''تھانے دار صاحب! میری بیٹی کا کچھ پتا چلا آپ کو؟''

''ہاں۔ ایک سراغ تو ملا ہے......'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''کچھ مجھے بھی تو بتائیں سرکار۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا لہٰذا حتی الامکان نرم لہجے میں، میں نے کہا۔ ''اب تک جو حالات وواقعات سامنے آئے ہیں ان کی روشنی میں تو یہی نظر آ رہا ہے کہ زیبو اپنی مرضی سے کھارا کے ساتھ نہیں گئی ہے لیکن اس امر کا حتمی فیصلہ کل شام تک ہوگا۔ اس دوران میں دو اہم کام کرنا ہیں...... ایک تم نے اور ایک میں نے۔''

وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''میں اپنے انداز میں کھارا کے بارے میں تفتیش کروں گا اور تم نے اپنے ان تمام عزیزوں اور رشتے داروں سے رابطہ کر کے یا ان کے پاس جا کر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا ہے کہ زیبو کہیں ان میں سے کسی کے گھر تو نہیں پہنچ گئی......!''

''جی ٹھیک ہے۔ میں کل صبح ہی اس مہم پر روانہ ہو جاؤں گا۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔ ''لیکن......''

وہ بولتے بولتے رکا تو میں نے سوال کیا۔ ''لیکن کیا غلام سرور؟''

''آپ جو کھارا کے بارے میں منڈھورا کلاں میں پچھ پرتیت کریں گے اس سے میری عزت کا جنازہ نکل جائے گا تھانے دار صاحب......'' وہ نم ناک آواز میں بولا۔

''میری بات غور سے سنو غلام سرور......'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ زیبو تمہاری عزت کو خاک میں ملا کر جا چکی ہے۔ اب اس عزت کا جنازہ اٹھے یا تدفین ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں کہ پورے

منڈھورا کلاں میں زیبو اور کھارا کے تعلقات کا ڈھونڈورا پیٹتا پھروں گا۔ تیسری بات یہ کہ مجھے بھی تمہاری عزت کا بہت خیال ہے۔ میں نے کہا نا کہ میں اپنے انداز میں طریقے سلیقے سے کھارا کے بارے میں تفتیش کروں گا۔ منڈھورا کلاں میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی کہ میں کیا کرتا پھر رہا ہوں......"

"آپ کا بہت بہت شکریہ تھانے دار صاحب!" وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی ممنونیت بھرے لہجے میں بولا۔

"اور آخری بات......" میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر تاکیدی لہجے میں کہا۔ "تم بھی ان معاملات میں اپنی زبان کو بند ہی رکھنا۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی، میں سمجھ گیا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے زیبو کے لیے آنے والے جن پانچ چھ رشتوں کی بات کی تھی، کیا ان میں افتخار عرف کھارا تیلی کا رشتہ بھی شامل تھا؟"

"جی۔" اس نے مختصر جواب دیا۔

"کیا کھارا اوباش، آوارہ، نکھٹو اور نکما لڑکا ہے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"نہیں جی۔" وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"پھر اس کے رشتے سے انکار کی وجہ؟"

"وہ جی...... ایک تو وہ ذات کا تیلی ہے۔" وہ اپنی سوچ کے مطابق وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "دوسرے اس کا خاندان بہت بڑا ہے۔ کھارا کے چھ بھائی اور پانچ بہنیں ہیں۔ وہ میرے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔"

میرا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ذات پات کے معاشرتی نظام کے حوالے سے اسے کھری کھری سناؤں لیکن وہ اس وقت جس جذباتی صدمے سے دوچار تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ فی الحال میں کوئی ایسی سخت بات نہ کروں جس سے اس کی ذہنی اور قلبی اذیت میں اضافہ ہو لہٰذا میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"غلام سرور! تم جس بندے کو گھٹیا ذات اور کم نسل سمجھتے تھے، تمہاری بیٹی نے اسی شخص کا انتخاب کر کے تمہاری آنکھیں کھولنے کا سامان کر دیا ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ اپنی ذاتی انا کی تسکین کے لیے تم آنکھیں بند کیے خوابِ خرگوش کے مزے لیتے رہو......"

وہ ہکا بکا مجھے تکتا چلا گیا۔ باتیں کرتے ہوئے ہم تانگے کے قریب پہنچ گئے تھے۔ غلام سرور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میری لتاڑ کے جواب میں کیا کہے اور میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ وہ لازمی کوئی جواب دے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے حوصلہ بڑھانے والے انداز میں کہا۔

"غلام سرور! آرام سے گھر جاؤ اور میں نے تمہیں جو ہدایات دی ہیں، صبح اٹھ کر اس مشن کا آغاز کر دو۔ اللہ خیر کرے گا۔"

"میری زیبو تو مل جائے گی نا......؟" وہ دکھی لہجے میں مستفسر ہوا۔

"ان شاء اللہ!" میں نے تہِ دل سے کہا۔ "اللہ کی رحمت اور میری کوشش پر یقین رکھو۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

غلام سرور کو تسلی تشفی دینے کے بعد میں تانگے میں بیٹھ گیا۔ کانسٹیبل معشوق علی نے بھی میری تقلید کی پھر میرے اشارے پر کوچوان نے تانگے کو منڈھورا کلاں سے رسول پور تارڑ کی سمت بڑھا دیا۔ جب ہم منڈھورا کلاں کی حدود سے نکلے تو مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح میں نے کانسٹیبل معشوق علی کو موضع کولھووال روانہ کر دیا۔ گزشتہ شام جب میں حکیم بسم اللہ کی بیٹھک میں رفعت اور فریدہ کا انٹرویو کر رہا تھا تو اس وقت مذکورہ کانسٹیبل منڈھورا کلاں میں گھوم پھر کر میرے حکم کی تعمیل میں مصروف تھا۔ میں نے کھارا کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کا کام معشوق علی کے سپرد کیا تھا اور اس اللہ کے بندے نے بڑے تسلی بھرے انداز میں یہ کام سرانجام دے ڈالا تھا۔

معشوق علی کی تحقیق کے مطابق، زیبو کی گمشدگی سے ایک روز قبل افتخار عرف کھارا موضع کولھووال چلا گیا تھا۔ اس واقعے کو چونکہ ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے اس لیے مجھے بالکل درست تاریخیں تو یاد نہیں ہیں۔ ہم واقعات کو آسانی سے سمجھنے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ زیبو بائیس مئی کی شام سے لاپتا تھی اور اس کی گمشدگی کی رپورٹ تئیس مئی کی صبح میرے تھانے میں درج کرائی گئی تھی اور آج چوبیس مئی کی صبح تھی۔ اس حساب سے کھارا اکیس مئی کی صبح منڈھورا کلاں سے کولھووال روانہ ہوا تھا۔ ان تاریخوں کو حتمی نہ سمجھا جائے۔ بس، یہ بات ذہن میں رہے کہ وہ مئی کا مہینا

اور گندم کی کٹائی کا موسم تھا۔

کولھو وال نامی گاؤں، منڈھورا کلاں سے لگ بھگ چار میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا دیہات تھا جہاں کھارا کی خالہ رہتی تھی۔ کھارا اپنی خالہ بلقیس فاطمہ سے ملنے کولھو وال گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ معشوق علی کی فراہم کردہ ان معلومات میں کس حد تک صداقت تھی۔ آیا کھارا اکیلا کولھو وال پہنچا تھا یا زیبو بھی اس کے ساتھ تھی؟ یا وہ لوگ کولھو وال کی طرف گئے ہی نہیں تھے؟ ان تمام سوالات کے جواب اسی وقت مل سکتے تھے جب معشوق علی کولھو وال سے واپسی پر اپنی رپورٹ پیش کرتا۔

معشوق علی کی واپسی کا انتظار کرنا میری مجبوری تھی مگر میری سوچ کی راہ میں کوئی رکاوٹ، وقت یا دشواری حائل نہیں تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا مسلسل زیبو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

میری اب تک کی محنت سے جو نتیجہ برآمد ہوا تھا اس کے مطابق تو یہ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ زیبو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت، اپنی رضامندی سے کھارا کے ساتھ گئی تھی۔ کہاں؟...... اس بات کا فیصلہ ہونا باقی تھا۔ اغلب امکان یہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ لوگ کولھو وال کی طرف گئے ہوں گے۔ میں نے امکان کی بات کی ہے۔ حتمی نتائج تو معشوق علی کی واپسی پر ہی سامنے آنا تھے۔ عین ممکن تھا کہ میں جیسا سوچ رہا ہوں، سب کچھ اس کے برعکس نکل آئے!

ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن سردست یہ ہوا کہ سہ پہر کے وقت غلام سرور میرے پاس تھانے پہنچ گیا۔ گرمی نے اس کی مت مار رکھی تھی۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔ میں نے اسے ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پلائے تو اس کے ہوش ٹھکانے آئے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے تو اس نے بتایا کہ آج صبح سے وہ اپنی سائیکل پر گاؤں گاؤں گھومتا ہوا یہاں پہنچا ہے۔

''میں سمجھ سکتا ہوں کہ تم نے چلچلاتی دھوپ میں کس قدر تکلیف اٹھائی ہوگی۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''کیا اس دوڑ دھوپ کا کوئی مثبت نتیجہ بھی سامنے آیا؟''

اس کے چہرے پر اذیت کے آثار نمودار ہوئے اور وہ بڑی غمگین نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ اس کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ زیبو کی تلاش کے مشن میں ناکام لوٹا تھا۔ نامرادی اس کے چہرے پر رقم تھی اور ناامیدی بڑے خوفناک انداز میں اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔

''کیا ہوا غلام سرور؟'' میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا، گلوگیر آواز میں بولا۔ ''تھانے دار صاحب! زیبو کہیں بھی نہیں ملی......''

میں نے تسلی دلاسا دے کر اسے قدرے نارمل کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بس تو پھر اس کا ایک ہی مطلب ہے......''

''کیا مطلب ہے سرکار؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''مطلب یہ کہ وہ کھارا کے ساتھ ہی گئی ہے۔'' میں نے رسان سے جواب دیا۔

''مگر وہ گئی کہاں ہے......؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''پہلا امکان موضع کولھو وال کا ہے۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔

''کولھو وال......؟'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''کولھو وال میں کھارا کی خالہ رہتی ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''کھارا کے بارے میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ وقوعہ سے ایک روز پہلے اپنی خالہ سے ملنے کولھو وال گیا ہے لہٰذا اس بارے میں سوچا جا سکتا ہے کہ کھارا، زیبو کو اپنے ساتھ کولھو وال لے گیا ہو۔''

غلام سرور میرے اس مشن سے آگاہ نہیں تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے اس بارے میں بتایا۔ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''ہاں۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ کولھو وال میں جیرا تیلی کی سالی بلقیس رہتی ہے لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ کھارا، زیبو کی گمشدگی سے ایک دن پہلے کولھو وال......'' وہ بولتے بولتے رک گیا پھر الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''جب کھارا اس واقعے سے ایک دن پہلے ہی کولھو وال چلا گیا تھا تو پھر وہ زیبو کو کہیں کیسے لے کر جا سکتا ہے تھانے دار صاحب؟''

''یہی معلوم کرنے کے لیے میں نے اپنے ایک کانسٹیبل کو آج صبح ہی کولھو وال روانہ کر دیا ہے۔'' میں

نے معتدل انداز میں کہا۔ ”شام تک یہ عقدہ بھی کھل ہی جائے گا۔“

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کانسٹیبل معشوق علی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر تھکن کے آثار تھے اور آنکھوں سے ناکامی جھلکتی تھی۔ وہ مضمحل انداز میں میرے سامنے اور غلام سرور کے پہلو میں ایک کرسی پر بیٹھ چکا تو میں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی معشوق علی! اس عاشق جوڑے کا کچھ پتا چلا؟“

”بڑی گڑبڑ ہے ملک صاحب۔“ وہ مایوسی سے بولا۔

”کیسی گڑبڑ؟“ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”کھارا کی خالہ بلقیس فاطمہ نے بتایا ہے کہ کھارا اکیس مئی کی دوپہر میں اس کے گھر آیا تھا۔“ کانسٹیبل اپنی کارروائی کی روداد بیان کرتے ہوئے بولا۔ ”اور پھر اگلی صبح یعنی بائیس مئی کو وہ واپس منڈھورا کلاں چلا گیا تھا۔ اس کے بعد ان لوگوں کو کھارا کی کوئی خیر خبر نہیں۔“

زیبو بائیس مئی کی شام میلے سے واپسی پر غائب ہوئی تھی اور زیبو کے اٹیچی کیس سے ملنے والا رقعہ بتاتا تھا کہ اسی تاریخ کو وہ پرچہ زیبو تک پہنچا تھا ورنہ اس پر ”آج شام“ کے الفاظ درج نہ ہوتے۔ اگر کھارا بائیس مئی کی صبح کو لھووال سے منڈھورا کلاں کے لیے روانہ ہوا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ اس نے یہ پیغامی رقعہ وقوعہ کے روز دوپہر میں زیبو تک پہنچایا تھا۔

”کھارا تو خاصا چالباز قسم کا بندہ معلوم ہوتا ہے۔“ میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”منڈھورا کلاں میں اس نے یہ تاثر دیا کہ وہ وقوعہ سے ایک روز پہلے ہی کو لھووال چلا گیا تھا تاکہ زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے کسی کا اس کی طرف دھیان نہ جائے۔ اس کے بعد وہ نہایت ہی خاموشی سے منڈھورا کلاں آیا اور زیبو کو میلے میں سرکس کے قریب شام چھ بجے پہنچنے کی ہدایت کی۔ زیبو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور میلے سے واپسی پر وہ غائب ہوگئی یعنی اپنے عاشق کے ساتھ کسی نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئی۔ منڈھورا کلاں والوں کے ریکارڈ میں کھارا اپنی خالہ کے گھر لھووال گیا ہوا ہے۔ بلقیس فاطمہ کے ریکارڈ کے مطابق، اس کا بھانجا کھارا ایک دن اس کے پاس گزار کر واپس منڈھورا کلاں چلا گیا ہے اور ہم یہاں بیٹھے اپنے ریکارڈ کو درست کرتے ہوئے یہ سوچ رہے ہیں کہ زیبو اور کھارا سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہوچکے ہیں۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ان دونوں کا منصوبہ خاصا جان دار ہے لیکن میں اتنی آسانی سے ان کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ وہ اگر پاتال میں بھی چھپے بیٹھے ہوں گے تو میں انہیں گردن سے پکڑ کر باہر کھینچ لاؤں گا۔“

”تھانے دار صاحب! مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ زیبو اتنا بڑا قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔“ غلام سرور نے رنجیدہ لہجے میں کہا۔

”تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”زیبو منظر سے غائب ہے۔ حالات و واقعات یہ بتاتے ہیں کہ وہ اپنی رضا سے کھارا کے ساتھ کہیں گئی ہے۔ اس حقیقت کو بدلا نہیں جاسکتا۔“

”ملک صاحب! میرا خیال ہے کہ کھارا کے گھر والوں کو بھی شاملِ تفتیش کرنا چاہیے۔“ معشوق علی نے صلاح دینے والے انداز میں کہا۔ ”ہوسکتا ہے، ہم کسی اہم سراغ تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔“

”تم زیادہ تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟“ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔

”آپ حکم کریں ملک صاحب!“ وہ کراری آواز میں بولا۔ ”اگر میں تھکا ہوا بھی ہوں تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“

”میں تمہاری تجویز سے عملی اتفاق کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“ میں نے پُرمعنی انداز میں کہا۔ ”اور اس کے لیے تمہارا چاق و چوبند ہونا ضروری ہے۔“

”میں ایک دم فٹ ہوں جناب۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔

”تم ابھی اور اسی وقت غلام سرور کے ساتھ منڈھورا کلاں روانہ ہوجاؤ۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں کھارا کے باپ جیرا تیلی یا اس کے کسی بھائی کو تھانے میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”ملک صاحب!“ وہ یک لخت اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بڑے اعتماد سے بولا۔ ”آپ کے حکم کی تعمیل کے لیے میں بالکل تیار ہوں۔“

میں نے غلام سرور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی معشوق علی کے ساتھ جاؤ اور اپنے گھر میں آرام سے بیٹھو۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ زیبو کو تلاش کرنا میری ذمے داری ہے۔ میں نے تمہاری خواہش پر

زیبو کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر رکھی ہے۔ اب میں کھارا کے خلاف اغوا کا مقدمہ درج کرنے والا ہوں۔ تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ زیبو کو بازیاب کرنا میرے فرائض کا حصہ ہے۔''

وہ مطمئن ہو کر معشوق علی کے ساتھ رخصت ہو گیا۔

میں نے اے ایس آئی نیک محمد کو اپنے پاس بلالیا۔ نیک محمد زیبو کی گمشدگی کی تفصیلات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا صبح پانچ چھ اہلکار میسر ہو سکتے ہیں؟''

''جی ملک صاحب۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور پوچھا۔''آپ کے ذہن میں کیا پلان ہے؟''

''میں دو دو پولیس اہلکاروں پر مشتمل تین چھاپا مار ٹیمیں تشکیل دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے اے ایس آئی کو اپنے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا۔''یہ ٹیمیں علی الصباح تھانے سے روانہ ہو جائیں گی اور اریب قریب کے تمام گاؤں دیہات میں زیبو اور کھارا کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں ملک صاحب۔'' وہ توانا لہجے میں بولا۔''میں خود اپنی نگرانی میں آج رات ہی تین ٹیمیں تیار کر کے انہیں سب سمجھا دوں گا۔ بلکہ ایک ٹیم میں، میں خود بھی شامل ہوں گا۔ ہم سب سادہ لباس میں کل تڑکے تڑکے تھانے سے روانہ ہو جائیں گے۔''

''شاباش!'' میں نے اس کے منصوبے کو سراہتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا۔''امید ہے، کل شام سے پہلے تم مجھے کوئی خوش خبری سناؤ گے!''

''ان شاء اللہ!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔''میرا ارادہ تو یہی ہے۔ میں آپ کی امیدوں پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔''

تھوڑی دیر تک ہم زیبو کی گمشدگی کے حوالے سے باہمی اظہار کرتے رہے پھر اے ایس آئی کسی کام سے اٹھ گیا۔ میں عموماً اس وقت تک اپنے کوارٹر میں چلا جاتا تھا لیکن آج میں جم کر تھانے میں بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کانسٹیبل معشوق علی کی واپسی کا انتظار تھا۔ ویسے بھی میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا۔

لگ بھگ ساڑھے نو بجے معشوق علی منڈھورا کلاں سے واپس آ گیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ نذیر عرف جیرا تیلی بھی اس کے ساتھ تھا۔ جیرا خاصا برہم نظر آتا تھا۔ جب وہ میرے سامنے حاضر ہوا تو اکھڑے ہوئے لہجے میں مجھ سے مستفسر ہوا۔

''تھانے دار صاحب! آپ نے کس قانون کے تحت اس وقت مجھے تھانے بلایا ہے؟''

''تھانے بلانے کے لیے کسی ٹائم ٹیبل پر مبنی کوئی قانون ابھی تک بنایا نہیں گیا۔'' میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔''میں کسی بھی شخص کو کسی بھی وقت تھانے بلانے کا مجاز ہوں۔''

''پر میرا قصور کیا ہے جناب؟'' میرے جارحانہ تیور دیکھ کر وہ فوراً نرم پڑ گیا۔''ہم پہلے ہی پریشان بیٹھے تھے، اوپر سے آپ کا سپاہی مجھے پکڑ کر تھانے لے آیا ہے۔ یہ کوئی انصاف تو نہ ہوا نا......!''

''انصاف ہمیشہ کسی معاملے کے آخری مرحلے پر کیا جاتا ہے جیرا۔ ابھی تو شروعات ہے۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔''تمہارے قصور پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اپنے گھر میں کیوں پریشان بیٹھے تھے اور...... اس بات کی تسلی رکھو میں انصاف کے تقاضے پورے کرنے میں ذرا سی بھی کوتاہی نہیں کروں گا۔''

''وہ جی...... ہمارے گھر میں...... چوری ہو گئی ہے......'' اس نے بتایا۔

''اوہ......!'' میں نے افسوس بھرے انداز میں ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔''یہ کب کا واقعہ ہے؟''

''صحیح وقت کا تو پتا نہیں جناب۔ ہمیں آج صبح ہی پتا چلا ہے۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔''کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ کس قسم کا چور تھا جس نے......''

وہ بولتے بولتے اچانک رکا تو میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔''جس نے کیا......؟''

''جس نے صرف طلائی زیور چرایا ہے۔'' وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔''باقی گھر کی ہر شے جوں کی توں اپنی جگہ پر رکھی ہوئی ہے، صرف زیورات غائب ہوئے ہیں۔''

میرا ذہن تیز رفتاری سے ایک خاص انداز میں سوچنے لگا۔ میں نے جیرا تیلی سے سوال کیا۔''چوری ہونے والے زیورات کی مالیت کتنی ہو گی؟''

جیرا کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جناب! ان زیورات کا وزن پندرہ تولے سے زیادہ ہی تھا۔ میرے خیال میں لگ بھگ ڈیڑھ ہزار روپے

کے تو ہوں گے ہی۔ ان میں کچھ زیور تو میری گھر والی کا تھا، باقی میں نے بیٹی کی شادی کے لیے تیار کروایا تھا۔ سب کا سب چلا گیا تھانے دار صاحب......!'' بات کے اختتام پر وہ افسوسناک انداز میں سر کو جھٹکنے لگا۔

''جیرا! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لو کہ میں نے تمہارے گھر سے زیورات چرانے والے چور کو پکڑ لیا ہے۔''

''جی......!'' اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، چاروں جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے اس نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''چور کہاں ہے جی؟''

''وہ تھوڑی سیر و تفریح کے لیے نکلا ہوا ہے۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم فکر نہیں کرو۔ کل کا سورج غروب ہونے سے پہلے وہ چور میرے تھانے کی حوالات میں بند ہوگا مع مالِ مسروقہ و مغوی زیبو......!''

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں تھانے دار صاحب......؟''

''جیرا......!'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب کوئی چور باہر سے گھر کے اندر داخل ہو کر چوری کرتا ہے تو وہ نقدی، زیورات اور گھر میں موجود ہر قیمتی چیز کو اٹھا لے جاتا ہے لیکن......''

میں نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحاتی توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن جب گھر کے اندر بسنے والے کسی شخص کو چوری کا خیال آتا ہے تو وہ صرف اپنی ضرورت کی شے ہی چرا کر لے جاتا ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں...... گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے!''

''آپ بڑی الجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ پریشان کن انداز میں بولا۔ ''کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ ہمارے گھر کے ہی کسی فرد نے زیورات چرائے ہیں؟''

''تم بالکل ٹھیک سمجھے ہو جیرا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے بیٹے کھارا کا کارنامہ ہے۔ وہ گھر سے زیورات اور گاؤں سے غلام سرور کی بیٹی زیبو کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ میں نے اسی سلسلے میں تمہیں تھانے بلایا ہے۔''

''لیکن جناب! زیبو تو بعد میں گم ہوئی ہے۔'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔ ''کھارا تو ایک دن پہلے اپنی خالہ سے ملنے کولھووال چلا گیا تھا......''

''کیا کھارا کولھووال سے واپس آ گیا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے انداز میں دریافت کیا۔

''نہیں جی، وہ ابھی تک ادھر ہی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم اگر ایسا سوچ رہے ہو تو احمقوں کی جنت میں رہتے ہو۔'' میں نے جیرا تیلی کے دماغ کے کیڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''کھارا اکیس مئی کی صبح منڈھورا کلاں سے نکلا اور اسی روز دوپہر سے پہلے وہ بلقیس فاطمہ یعنی تمہاری سالی کے گھر کولھووال پہنچ گیا۔ اگلی صبح یعنی بائیس مئی کو وہ بلقیس کے گھر سے یہ کہہ کر نکلا کہ واپس منڈھورا کلاں جا رہا ہے۔ وہ منڈھورا کلاں آیا ضرور مگر کسی سے ملا نہیں۔ اس نے زیبو کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ میلے میں آ کر سرکس کے قریب اس سے ملاقات کرے۔ زیبو نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ساتھ میلے میں پہنچ گئی۔ اس طرح کھارا کا کام آسان ہو گیا اور وہ زیبو کو لے اڑا۔ میں نے کھارا کے خلاف زیبو کے اغوا کی رپورٹ درج کر لی ہے اور پورے علاقے میں تمہارے ہونہار بیٹے کی تلاش جاری ہے۔ کھارا بہت جلد آہنی سلاخوں کے پیچھے ہوگا۔''

وہ دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے رو دینے والے انداز میں بولا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ کھارا نے ایسا کیا ہوگا۔''

''میں یہ تمام باتیں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں جیرا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے پاس ایک ایک چیز کا ثبوت موجود ہے۔ میں نے جس کانسٹیبل کو بھیج کر ابھی تمہیں تھانے بلایا ہے نا یہ صبح کولھووال کا دورہ کر کے آیا ہے اور اس نے تمہاری سالی بلقیس فاطمہ سے ملاقات بھی کی تھی۔ یہ ساری معلومات وہیں سے حاصل ہوئی ہیں اور یہ دیکھو......'' میں نے اپنی میز کی دراز کھول کر وہ تہ شدہ پرچہ نکال لیا جو مجھے زیبو کے اٹیچی کیس سے ملا تھا۔ میں نے مذکورہ رقعہ جیرا تیلی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ تحریری ثبوت بھی دیکھ لو اپنے سپوت کے کرتوت کا......!''

وہ لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ رقعے کی مختصر سی یک سطری تحریر نے اس کے چودہ طبق گل کر دیے۔ وہ بڑی بے بسی

سے بولا۔ ''او کھارا...... یہ تو نے کیا کر دیا......!''

''کھارا نے تو جو کیا، سو کیا۔ اب میں اس کے ساتھ جو کروں گا اس سے کھارا کی آنے والی سات نسلیں بھی سبق حاصل کریں گی۔''

''سرکار! معاف کر دیں۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگا۔ ''کھارا نادان ہے۔ اس سے کوتاہی ہو گئی۔ آپ میرے بچے کو بچا لیں۔''

''تمہارا بچہ کوئی سولی نہیں چڑھا ہوا جو میں اسے بچا لوں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسی نادانیوں اور کوتاہیوں کے لیے قانون کی کتابوں میں مختلف تعزیریں درج ہیں۔ تمہارے اس ننھے منے معصوم بالک کو بھی تمام مراحل سے گزرنا ہوگا۔ قانون امیر غریب، شاہ و گدا سب کے لیے یکساں ہے۔ کوئی اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتا۔''

وہ کرسی سے اٹھا اور میز کے نیچے گھس کر میرے قدموں سے لپٹ گیا پھر رو رو کر اپنے بیٹے کے لیے رحم کی اپیلیں کرنے لگا۔

میں نے بہ مشکل اس سے اپنے پاؤں چھڑائے اور معشوق علی کو حکم دیا۔ ''اس پاگل کے بچے کو باہر نکالو......''

معشوق علی نے کوشش کر کے جیرا تیلی کو کھینچ تان کر میری میز کے نیچے سے نکالا اور دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کے دونوں ہاتھ ابھی تک معافی کے انداز میں جڑے ہوئے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''جیرا! تم نے کولھو تو لگا رکھا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سرکار۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''تیلی، تیل نہیں نکالے گا تو کھائے گا کہاں سے......!''

''تمہارے کولھو کے بیل جب مستی کرتے ہیں تو پھر تم کیا کرتے ہو؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''میں نے کولھو پر ایک لمبی سے ڈانگ (لاٹھی) رکھی ہوئی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''خرمستی کرنے والے بیلوں کی ٹانگوں پر جب دو چار ڈانگیں پڑتی ہیں تو وہ الف کی طرح سیدھے ہو جاتے ہیں۔''

''ڈانگ'' دراصل نہ تو لاٹھی ہوتی ہے اور نہ ہی چھڑی۔ آپ ڈانگ کو ان دونوں کے اریب قریب کی کوئی چیز سمجھ لیں۔ میں نے جیرا تیلی کی بات کے جواب میں کہا۔

''قانون بھی ایک کولھو ہی کی طرح ہوتا ہے۔ یہ مستی کرنے والے انسان نما بیلوں پر دفعات کی ڈانگیں برساتا ہے۔ پھر جیل کی بلند و بالا سنگلاخ دیواروں کے پیچھے پہنچ کر یہ بیل جیسے اڑیل اور منہ زور انسان الف کی طرح سیدھے ہو جاتے ہیں۔''

اس نے اچانک ایک عجیب حرکت کی۔ اس کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے حرکت میں آئے پھر اس نے اپنی پگڑی اتار کر میرے بوٹوں پر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

''رحم سرکار...... میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔''

لعنت ہے ایسی اولاد پر اور غرق ہوں ان کی جوانیاں جن کے کالے کرتوتوں کی وجہ سے ان کے والدین کی عزت خاک میں مل جائے اور انہیں ایسی نامعقول اولاد کے لیے در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں۔ ہر کس و ناکس کے قدموں پر سر رکھ کر ان کے لیے رحم کی بھیک مانگنا پڑے......!

میں نے معشوق علی کی معاونت سے بہ مشکل جیرا تیلی کو نارمل کیا۔ جب وہ اپنے حواسوں میں آ گیا تو میں نے اس سے پوچھا۔

''اب دس سے زیادہ کا وقت ہو گیا ہے۔ تم واپس منڈھورا کلاں جاؤ گے یا ادھر تھانے ہی میں تمہارے لیے منجی بسترے کا بندوبست کرا دوں؟''

''تھانے میں......؟'' اس نے سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ڈرو نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ''میں تمہیں حوالات میں بند نہیں کر رہا۔ ادھر تھانے کے صحن میں تمہارے سونے کا انتظام کرا دوں گا۔''

''نہیں سرکار۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ادھر رسول پور تارڑ میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ میں اس کے گھر میں رات گزار کر صبح آپ کے پاس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

جیرا تیلی کے جانے کے بعد میں بھی اپنے کوارٹر میں آ گیا۔

اگلے روز یعنی پچیس مئی کی صبح تین چھاپا مار ٹیمیں تھانے سے روانہ ہو گئیں۔ ان میں ایک ٹیم میں اے ایس آئی نیک محمد بھی شامل تھا۔ یہ تمام پولیس اہلکار سادہ لباس میں تھے اور انہوں نے گرد و نواح کے تمام گاؤں دیہات کی خاک چھان کر کھارا اور زیبو کو تلاش کرنا تھا۔ نیک محمد نے مجھے بتایا تھا کہ وہ موضع کولھو وال کی طرف جا رہا ہے۔ نیک محمد بہت ہی ہوشیار اور زیرک پولیس اہلکار تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر کے ساتھ لوٹے گا۔

دس بجے کے قریب جیرا تیلی بھی تھانے پہنچ گیا۔ اس

کی ذہنی حالت کافی حد تک سنبھل چکی تھی تاہم وہ ابھی تک سہا ہوا اور پریشان سا تھا۔ سہ پہر کے وقت اے ایس آئی نیک محمد واپس آ گیا۔ وہ میری توقع کے عین مطابق، خاصی مفید معلومات کے ساتھ لوٹا تھا۔ نیک محمد کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے۔ ان میں سے ایک شخص کو دیکھتے ہی جیرا تیلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ مذکورہ بندہ جیرا کا کوئی شناسا تھا۔

نیک محمد نے مجھ سے کہا ”ملک صاحب! یہ جیرا کا ساڑھو یعنی بلقیس فاطمہ کا خاوند شوکت علی ہے۔“ اس کا اشارہ اس بندے کی طرف تھا جس کو دیکھ کر جیرا کی آنکھوں میں شناسائی کے تاثرات ابھرے تھے۔ ”کھارا اپنے اسی خالو کے گھر ایک دن گزار کر بائیس مئی کی صبح کو لھووال سے واپس منڈھورا کلاں چلا گیا تھا۔“

”اس میں تو کوئی خاص بات نہیں نیک محمد۔“ میں نے سرتاپا شوکت علی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ معلومات تو مجھے پہلے سے حاصل ہیں۔“

”خاص بات اس بندے میں ہے ملک صاحب؟“ نیک محمد نے اپنے ساتھ آئے ہوئے دوسرے شخص کی جانب انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”شوکت علی کو تو میں محض اس لیے اپنے ساتھ لے آیا ہوں کہ یہ اپنے ساڑھو جیرا کو بتا سکے کہ اس کا سپوت بائیس مئی کی صبح اپنی خالہ کو ”اللہ حافظ“ کہہ کر ان کے گھر سے نکل گیا تھا۔“

”اور اس بندے کی کیا خاصیت ہے؟“ میں نے دوسرے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے اے ایس آئی نیک محمد سے سوال کیا۔

”اس کا نام انور زرگر ہے۔“ نیک محمد نے جواب دیا۔ ”انور کا تعلق موضع کولھووال سے ہے۔ وہاں اس کی صرافے کی دکان ہے۔ انور زرگر کو اپنے ساتھ لانے کا مقصد یہ ہے کہ اکیس مئی کی سہ پہر کھارا اس کے پاس گیا تھا......“

”پندرہ تولے سونے کے زیورات بیچنے۔“ میں نیک محمد کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ”نیک محمد! تم یہی بتانا چاہ رہے ہو نا......؟“

جیرا تیلی کی زبانی مجھے پتا چل چکا تھا کہ ان کے گھر سے کم و بیش پندرہ تولے وزن کے طلائی زیورات چوری ہو گئے تھے اور میں نے شک نہیں بلکہ یقین ظاہر کیا تھا کہ یہ اوچھی حرکت کھارا کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس تناظر میں جب نیک محمد نے انور زرگر کا تعارف کرایا اور یہ بتایا کہ کھارا اس سے جا کر ملا تھا تو بے ساختہ پندرہ تولے سونے کی فروخت والا سوال میرے منہ سے نکل گیا تھا۔

نیک محمد نے معنی خیز انداز میں زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے ملک صاحب۔“

پھر جب میں نے انور سنار سے سوال و جواب کیے تو میرے دوسرے کئی اندازے بھی درستی کی منازل طے کرتے دکھائی دیے۔ انور زرگر نے بتایا کہ اکیس مئی کی سہ پہر کھارا چند طلائی زیورات فروخت کرنے اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے مذکورہ زیورات کی اچھی طرح جانچ کرنے کے بعد ان کا وزن کیا تو وہ کم و بیش ساڑھے پندرہ تولے نکلا۔ انور نے وہ زیورات اپنے پاس رکھ لیے اور اگلی صبح ادائیگی کا وعدہ کیا۔ ان کے بیچ ایک ہزار روپے کے عوض یہ سودا طے پا گیا تھا۔ آئندہ صبح یعنی بائیس مئی کو کھارا اپنی خالہ اور خالو کے گھر سے رخصت ہو کر سیدھا انور زرگر کے پاس پہنچا۔ انور نے وعدے کے مطابق، گن کر ایک ہزار روپے کی رقم کھارا کے حوالے کر دی۔ اس کے بعد کھارا کہاں گیا، انور کو کوئی خبر نہیں تھی۔

مگر مجھے یہ خبر تھی کہ کھارا ایک ہزار روپے کی تگڑی رقم کے ساتھ سیدھا منڈھورا کلاں پہنچا تھا۔ اس نے بائیس مئی کی شام چھ بجے زیبو کو میلے میں سرکس کے قریب آنے کو کہا۔ زیبو اپنے گھر سے دو ہزار روپے چرا لائی تھی۔ ان دونوں چوروں نے اپنے اپنے گھر والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور ایک نئی زندگی کی شروعات کرنے نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو گئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کے پاس تین ہزار روپے موجود تھے۔ اگر جیرا کوئی کام دھندا نہیں بھی کرتا تو اس رقم کے سہارے وہ دو تین سال تک بہ آسانی گزارہ کر سکتے تھے۔

کھارا اور زیبو اپنے اپنے گھر والوں اور منڈھورا کلاں کے باسیوں کی آنکھوں میں یقیناً دھول جھونک کر منظر سے غائب ہو گئے تھے لیکن قانون کی آنکھیں ابھی محفوظ تھیں اور یہ آنکھیں آسمان کے اس پار اور پاتال کی تہ کے نیچے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ مجھ پر ایک ضد سی سوار ہو گئی کہ آئندہ چوبیس گھنٹے کے اندر میں ہر قیمت پر زیبو اور کھارا کو بازیاب کر کے رہوں گا۔

میں نے شام سے پہلے جیرا تیلی، اس کے ساڑھو شوکت علی اور انور زرگر کو رخصت کر دیا اور آئندہ کے لائحہ عمل کو ترتیب دینے لگا۔

مجھ پر جو ضد سوار ہوئی تھی وہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اگر کوئی بات معمولی ہو تو پھر وہ بھلا ضد کیسے ہوسکتی ہے......! ضد تو نام ہی غیر معمولی تمنا، انتہا پسند سوچ اور ناممکن عمل کا ہے۔

☆☆☆

چھبیس مئی کی صبح بڑی سنسنی خیز اور ہنگامہ پرور تھی!

رات سونے سے پہلے میں نے زیبو اور کھارا کی بازیابی کے لیے ایک جامع منصوبہ ترتیب دے لیا تھا۔ بس، اس پر عملدرآمد کی ضرورت باقی تھی لیکن اگلی صبح ''نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے'' کے مصداق مجھے اپنے اس منصوبے پر پیش قدمی کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور جن دو ''لوبرڈز'' کی مجھے تلاش تھی ان کے حوالے سے ایک حتمی اطلاع تھانے پہنچ گئی۔ اپنی ضد پر عمل کرنے سے پہلے ہی اللہ نے میری عزت رکھ لی تھی۔

وہ اطلاع انتہائی افسوسناک اور صدمے سے بھرپور تھی۔ میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو وہاں میری آمد سے پہلے ہی غلام سرور، جیرا تیلی اور منڈھورا کلاں کے چند وسنیک موجود تھے۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی غلام سرور کے ہاتھوں سے ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔

''تھانے دار صاحب!'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''آپ نے تو مجھے تسلی دی تھی کہ میری بیٹی صحیح سلامت واپس آجائے گی۔ میں دعا کروں۔ میں نے بہت دعائیں مانگیں لیکن دیکھ لیں، موت دعا سے بھی زیادہ طاقتور نکلی......''

''آپ چاہے میرے بیٹے کو کڑی سے کڑی سزا دیں لیکن اسے زندہ کردیں سرکار۔'' جیرا تیلی دونوں ہاتھ جوڑ کر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بولا۔ ''آپ کھارا کو زندگی بھر کے لیے جیل میں ڈال دیں، میں اف تک نہیں کروں گا......''

چشم زدن میں یہ بات میری سمجھ میں آگئی کہ زیبو اور کھارا اب زندہ انسانوں کی دنیا میں باقی نہیں تھے۔ دونوں بدنصیب باپوں کی جذباتی کیفیت کو میں بہ خوبی محسوس کرسکتا تھا لہٰذا میں نے کسی بحث و تکرار کی ضرورت محسوس نہ کی اور تسلی تشفی دے کر ان سے حقیقتِ حال جاننے کی کوشش میں لگ گیا۔ جیرا تیلی، غلام سرور اور ان کے ساتھ آنے والے افراد نے جو تفصیلات مجھے بتائیں، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جیسا کہ یہ بات آپ کے ذہن میں ہے کہ ان دنوں گندم کی کٹائی چل رہی تھی۔ ارشاد اور طفیل نامی دو افراد حسب معمول اپنی درانتیوں کے ساتھ آج صبح فصل کی کٹائی کے لیے کھیتوں میں پہنچے۔ یہ کھیت نہر کے کنارے کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ارشاد اور طفیل نے اپنے کام کا آغاز اسی جگہ سے کیا جہاں پچھلے روز انہوں نے چھوڑا تھا۔ وہ گندم کو اپنی درانتیوں سے کاٹتے ہوئے مخصوص رفتار سے کھیت کے اندر ہی اندر آگے بڑھ رہے تھے کہ کھڑی فصل کے اندر بے سدھ پڑے دو انسانوں کو دیکھ کر وہ چونک اٹھے۔ انہیں فوراً اندازہ ہوگیا، وہ دونوں زندگی کی نعمت سے محروم ہوچکے ہیں۔ ارشاد اور طفیل نے فوراً سے پیشتر کھارا اور زیبو کو پہچان لیا۔ انہوں نے کھیت سے باہر نکل کر شور مچایا تو کھیتوں میں کام کرنے والے افراد وہاں جمع ہوگئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے زیبو اور کھارا کی موت کی خبر، جنگل کی آگ کی طرح پورے منڈھورا کلاں میں پھیل گئی اور ...... اب وہ لوگ میرے سامنے تھے!

میں نے ایک تانگے کا بندوبست کرایا اور فوراً منڈھورا کلاں کی جانب روانہ ہوگیا۔ اب کی بار اے ایس آئی نیک محمد بھی میرے ساتھ تھا۔ وہ لوگ بھی ایک تانگے ہی میں تھانے پہنچے تھے۔ ان کا تانگا ہمارے تانگے کے پیچھے منڈھورا کلاں کی سمت رواں دواں تھا۔

بدن کے آر پار ہونے والی چلچلاتی دھوپ میں، میں نے جائے وقوعہ کا جائزہ لیا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا جس کھیت سے زیبو اور کھارا کی لاشیں ملی تھیں وہ کھیت نہر کے کنارے کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ کھیت اور نہر کے درمیان ایک کچا راستہ تھا جس پر عموماً تانگوں، ریڑھوں، بیل گاڑیوں، سائیکل سواروں اور مال مویشی کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ ہم بھی اسی راستے پر سفر کرتے ہوئے منڈھورا کلاں پہنچے تھے۔

میں نے دونوں لاشوں کا معائنہ کیا تو مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ زیبو اور کھارا کو گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ لاشوں کی حالت بتاتی تھی کہ ان دونوں کو تین چار روز پہلے قتل کر کے کھڑی فصل کے اندر پھینک دیا گیا تھا۔ قاتل جو کوئی بھی تھا وہ مضبوط ہاتھ پاؤں کا مالک ایک طاقت ور شخص تھا ورنہ اتنی آسانی سے دو انسانوں کی جان لینا کسی عام آدمی کے بس کی بات نہیں تھی جبکہ ان دو افراد میں ایک نوجوان مرد بھی ہو......!

میں موقع واردات کی کارروائی مکمل کرچکا تو نیک محمد تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے نزدیک آگیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش جھلک رہا تھا۔ اس نے ایک چیز

میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ دیکھیں ملک صاحب......!''

میں نے دیکھا۔ وہ چاندی کا ایک لاکٹ تھا جس کی زنجیر ٹوٹ کر لٹک رہی تھی۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ تمہیں کہاں سے ملا؟''

میری حیرت اور استعجاب کا سبب یہ تھا کہ وہ ایک غیر معمولی سائز کا لاکٹ تھا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق کم وبیش پچاس قیراط کا ایک یمنی عقیق اس لاکٹ میں جڑا ہوا تھا۔ یہ عقیق مستطیل شکل کا تھا۔ لاکٹ اور اس کی زنجیر خالص چاندی سے بنے ہوئے تھے اور...... وہ زنجیر ایک جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی!

''یہ مجھے ادھر سے ملا ہے۔'' نیک محمد جائے واردات کے نزدیک ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے لگتا ہے اس لاکٹ کا قاتل کے ساتھ کوئی کنکشن ضرور ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے نیک محمد!'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس لاکٹ پر بھی ریسرچ کرتے ہیں، پہلے ان لاشوں کو سرکاری اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرنا ہوگا۔ اب تو ان سے بدبو بھی اٹھنے لگی ہے۔''

وہ لاشیں تین چار روز سے اس کھیت کے اندر پڑی تھیں، اوپر سے گرمی کا موسم۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہاں کیا عالم ہوگا۔ تیار کھڑی پکی ہوئی فصل چاہے گندم کی ہو یا چاول کی، اناج کی ایک مخصوص بو کھیتوں کے بیچوں بیچ سرسراتی رہتی ہے۔ اس بو کو فضا میں بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ گرم موسم اس کی شدت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ یہی سبب تھا کہ لاشوں کی بدبو بہت دور تک نہیں پھیل سکی تھی۔ یہ بدبو فصل کی مخصوص بو میں سرایت کر کے اپنی مخصوص ناگوار شناخت کھو بیٹھی تھی۔

میں نے دونوں لاشوں کو ایک تانگے پر لدوایا اور پوسٹ مارٹم کے لیے نیک محمد کی نگرانی میں ضلعی اسپتال روانہ کر دیا۔ اس کے بعد میں موقع پر موجود افراد کی جانب متوجہ ہوگیا۔ جیرا تیلی، غلام سرور، طفیل اور ارشاد بھی ان افراد میں شامل تھے۔ میں نے ٹوٹی ہوئی زنجیر والا وہ لاکٹ ان سب کو دکھانے کے بعد پوچھا۔

''تم میں سے کوئی اس لاکٹ کو پہچانتا ہے؟''

''یہ تو میں نے سینڈو کے گلے میں دیکھا تھا۔'' ایک شخص نے انکشاف انگیز انداز میں بتایا۔

''کون سینڈو......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وہ جی...... ادھر سرکس میں کام کرتا ہے۔'' ایک دوسرے شخص نے جواب دیا۔ ''وہ سرکس میں مختلف کرتب دکھاتا ہے۔ اس کا بدن گینڈے کی طرح مضبوط اور ربر کے مانند لچکیلا ہے جناب۔ وہ اپنے جسم کو بہت چھوٹے سے آہنی کڑے میں سے نکال کر خوب داد وصول کرتا ہے۔''

''سینڈو'' کا کردار ہر سرکس کا لازمی حصہ ہے۔ سینڈو کے نام سے جانا جانے والا یہ قوی الجثہ شخص سرکس میں مختلف کھیل تماشے دکھاتا ہے جن میں سے ایک خاص آئٹم چھوٹے سے آہنی کڑے میں سے اپنے جسم کو نکالنا بھی ہے۔ سینڈو کا نام سامنے آنے سے بہت سی ڈھکی چھپی باتیں بھی واضح ہوگئی تھیں۔ زیبو اور کھارا کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتارنے والا قاتل سینڈو جیسا تندرست اور توانا ہی ہوسکتا تھا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ لاکٹ تم نے سرکس میں کام کرنے والے سینڈو کے گلے میں دیکھا تھا؟'' میں نے اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا جس نے لاکٹ کو شناخت کیا تھا۔

''جی، مجھے پکا یقین ہے۔'' وہ ٹوٹی ہوئی زنجیر والے لاکٹ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میری آنکھیں دھوکا نہیں کھاسکتیں تھانے دار صاحب۔ یہ وہی لاکٹ ہے جو ہر وقت سینڈو کے گلے میں جھولتا رہتا تھا لیکن......!''

وہ اچانک بولتے بولتے رک گیا تو میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ کہ......'' وہ بتانے لگا۔ ''سینڈو کئی دن سے سرکس میں نظر نہیں آرہا۔ پتا نہیں، وہ کہاں چلا گیا ہے......!''

اس انکشاف نے میرے وجود میں سنسنی سے دوڑا دی۔ سینڈو کے غائب ہونے کا ایک ہی مطلب تھا کہ وہ دو افراد کے قتل میں ملوث تھا۔ لوبرڈز کے قاتل کی نشاندہی ہوگئی تھی۔

''تم نے کب سے سینڈو کو سرکس میں نہیں دیکھا؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''یہی کوئی...... تین چار دن سے جناب۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

میرے لیے کھیتوں میں کھڑے رہنا اب کسی بھی طور ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے پہلی فرصت میں میلے کا رخ کیا اور مذکورہ سرکس پہنچ گیا۔ سرکس کے مالک کا نام سلطان تھا۔ سرکس کے کھیل تماشے شام میں شروع ہوتے تھے اس لیے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



اس وقت سلطان فری تھا اور اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا۔

میں نے سلطان کو مختصر الفاظ میں حقیقتِ حال سے آگاہ کیا اور پوچھا۔

”سینڈو کہاں ہے؟“

”چار دن پہلے وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔“ سلطان نے جواب دیا۔ ”لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ سینڈو نے دو انسانوں کی جان لی ہے......!“ اس کی آنکھوں میں الجھن بھری حیرت جھلک رہی تھی۔

”تمہارے یقین نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا سلطان۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم مجھے بتاؤ کہ ایسی کون سی آفت آگئی تھی جو وہ چلتے ہوئے سرکس کو چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا ہے؟“

”وہ کافی دنوں سے گھر جانے کے لیے مجھ سے چھٹی مانگ رہا تھا۔“ سلطان نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ”اور میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ ابھی اسے چھٹی نہیں مل سکتی۔ جب ہم منڈھورا اکلاں سے سرکس سمیٹیں گے تو پھر وہ جی بھر کے چھٹی کرلے۔ پتا نہیں، میری بات اس کی سمجھ میں آئی کہ نہیں۔ وہ ایک رات چپ چاپ سرکس سے غائب ہوگیا۔ میں یہی سمجھا کہ وہ اپنے گھر چلا گیا ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ ”مطلب یہ کہ وہ جاتے ہوئے تم سے مل کر بھی نہیں گیا؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”سینڈو کون سی تاریخ کو غائب ہوا تھا؟“

”بائیس مئی کی شام کو۔“ اس نے جواب دیا۔

یہ وہی تاریخ تھی جب زیبو شام میں اپنی دو سہیلیوں رفعت اور فریدہ کے ہمراہ میلا دیکھنے گئی تھی اور سرکس کے قریب اس نے کھارا سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد زیبو کا شمار گمشدہ افراد میں ہونے لگا تھا۔ اس سے یہی بات سمجھ میں آرہی تھی کہ زیبو اور کھارا کی جانوں کا ہتھیارا صرف اور صرف سینڈو ہی ہوسکتا تھا۔

”یعنی تم پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ سینڈو اپنے گھر ہی گیا ہوگا؟“ میں نے سرکس کے مالک سلطان سے پوچھا۔

”یہ بات میں نے حالات و واقعات کی روشنی میں کہی ہے تھانے دار صاحب۔ وہ مجھ سے گھر جانے کی چھٹی مانگ رہا تھا اس لیے میں نے یہ سمجھ لیا، وہ اپنے گھر چلا گیا ہوگا۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”حقیقت کیا ہے، یہ تو

لطائف

لڑکی۔ ”تم مجھ سے کتنا پیار کرتے ہو؟“

لڑکا۔ ”میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔“

لڑکی۔ ”پھر بھی کتنا؟“

لڑکا۔ ”یوں سمجھو کہ میں موبائل فون اور تم میری ”سم“ ہو۔ پھر لڑکے نے مزید کہا۔

”تمہارے بغیر میں بیکار ہوں۔“

لڑکی۔ ”اوہاؤ سویٹ...... آئی لو یو سو مچ!“

لڑکا دل میں بولا۔ ”پاگل کہیں کی! اسے کیا پتا چائنا موبائل میں چار سمیں چلتی ہیں۔“

☆☆☆

ڈاکٹر: آپ کے شوہر کو مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ یہ نیند کی گولیاں ہیں۔

بیوی: یہ میں انہیں کس وقت دوں؟

ڈاکٹر: یہ آپ نے کھانی ہیں!

☆☆☆

اردو کا ٹیچر: بتاؤ یہ کون سا زمانہ ہے؟ میں ناچ رہا ہوں، تم ناچ رہے ہو، سب ناچ رہے ہیں۔

شاگرد: سر! خالص بے غیرتی کا زمانہ ہے!

☆☆☆

مریض: ڈاکٹر صاحب دو سال پہلے مجھے بخار ہوا تھا۔

ڈاکٹر: تو اب کیا ہوا؟

مریض: تب آپ نے نہانے سے منع کیا تھا۔ پوچھنا ہے کہ اب نہالوں یا......؟

(مرسلہ: بسنعیہ منظور، یوحنا آباد، لاہور)

☆☆☆

ایک گاؤں میں کسی بزرگ کا انتقال ہوا تو اس کی وجہ سے اسکول میں بچوں کی چھٹی ہوگئی۔

دوسرے دن بچوں نے دو بزرگوں کو دیکھا تو ایک بچہ بولا۔

”دیکھو دو اور چھٹیاں گھوم رہی ہیں۔“

(مرسلہ: محمد شہباز ناز، ضلع سرگودھا)

صرف خدا ہی جانتا ہے۔''

- سلطان کی بات میں وزن تھا۔ میں نے کہا۔

''حقیقت سے پردہ میں خود اٹھالوں گا۔تم مجھے سینڈو کے گھر کا پتا بتاؤ......؟''

''سینڈو پنڈی بھٹیاں کا رہنے والا ہے۔'' سلطان نے بتایا۔

''پنڈی بھٹیاں خاصا وسیع علاقہ ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''میں پنڈی بھٹیاں کے ایک ایک گھر میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ سینڈو وہاں رہتا ہے یا نہیں۔ مجھے اس کے گھر کی ٹھیک ٹھیک لوکیشن بتاؤ۔''

سلطان نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

☆☆☆

ستائیس مئی کی صبح بڑی خوشگوار اور پُرسکون تھی۔ میں مطمئن ذہن کے ساتھ تیار ہو کر تھانے پہنچا تو خادم حسین نے سینڈو کو میرے سامنے پیش کر دیا۔ گزشتہ روز، رات گئے میں نے پنڈی بھٹیاں سے سینڈو کو گرفتار کر لیا تھا اور تھانے پہنچا کر اسے حوالدار خادم حسین کی تحویل میں ان احکامات کے ساتھ دے دیا تھا۔

''خادم حسین! رات کا جتنا وقت باقی ہے، یہ تمہاری حوالداری کی آزمائش کے لیے کافی ہوگا۔ صبح یہ بندہ مجھے ٹیپ کی طرح فرفر بولتا ہوا ملنا چاہیے۔''

''ملک صاحب! ٹیپ ریکارڈ حاضر ہے۔'' خادم حسین نے سینڈو کو میرے سامنے پیش کرتے ہوئے بڑے فخر سے بتایا۔''آپ پلے کا بٹن دبائیں۔ یہ فرفر بولنے لگے گا۔''

''کیا اس نے دہرے قتل کا اقبال کر لیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ملک صاحب۔'' حوالدار سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔''آپ کو پتا ہے، میری حوالداری تو پتھروں کو بولنے پر مجبور کر دیتی ہے، یہ تو گوشت کا پہاڑ ایک انسان ہے۔ بس، اس نے میری فرمائش پوری نہیں کی......''

حوالدار نے معنی خیز انداز میں اپنی بات پوری کی تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔''تم نے سینڈو سے ایسی کون سی فرمائش کر دی تھی؟''

وہ اپنی جیب میں سے چوڑی کے سائز کا ایک آہنی کڑا برآمد کرتے ہوئے بولا۔''یہ بڑا سینڈو بنا پھرتا ہے نا۔ میں نے اس سے کہا، تم سرکس میں لوہے کے کڑے میں سے اپنے بدن کو گزارتے ہو۔ تمہاری کاریگری کو میں تو اس وقت مانوں گا جب تم سرکس کے باہر یعنی حوالات میں میری نگاہ کے سامنے خود کو اس کڑے کے اندر سے گزار کر دکھاؤ گے۔'' بات کے اختتام پر خادم حسین نے چوڑی کی گولائی والے آہنی رنگ کو فضا میں لہراتے ہوئے اضافہ کیا۔''اس کڑے میں سے ملک صاحب......''

حوالدار کی بات سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''تو اس نے تمہاری فرمائش پوری نہیں کی......؟''

''نہیں جناب۔'' خادم حسین نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''حالانکہ آپ دیکھ لیں، میں نے اس کے بدن پر کتنا تیل مل رکھا ہے تاکہ میرے فراہم کردہ کڑے میں سے خود کو گزارتے ہوئے اسے کسی دقت کا سامنا نہ ہو......''

خادم حسین بالکل درست کہہ رہا تھا۔ سینڈو کے جسم پر اس وقت لباس کے نام پر صرف ایک جانگیا تھا اور واقعتاً اس کا پورا بدن تیل سے چمک رہا تھا۔ اس چمک میں پسینے کی فراوانی بھی شامل تھی۔ میں نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ایک غیر سنجیدہ استفسار کیا۔

''اوئے نامعلوم سینڈو کی نالائق اولاد! ادھر سرکس میں تو تم بڑے کمالات دکھاتے ہو۔ میرے حوالدار کی ایک چھوٹی سی فرمائش تم سے پوری نہ ہو سکی؟''

''تھانے دار صاحب! آپ خود سوچیں......'' سینڈو عاجزانہ انداز میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔''میں اپنے بدن کو اس چوڑی میں سے کیسے گزار سکتا ہوں؟''

''جب تم دو جیتے جاگتے انسانوں کو زندگی سے گزار سکتے ہو تو پھر اپنے ناپاک بدن کو چوڑی میں سے کیوں نہیں گزار سکتے۔'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''یہ تسلیم کرتے ہو نا کہ تم ہی نے زیبو اور کھارا کو موت کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''جج...... جی......!'' اس نے ندامت بھرے انداز میں سر کو اثباتی جنبش دی۔

''کیوں......!'' میں نے کڑک لہجے میں استفسار کیا۔''تمہاری ان دونوں سے کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی نہیں جی......'' وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

''میں تو انہیں جانتا تک نہیں تھا۔ میں منڈھورا کلاں میں اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔''

''پھر تم نے ان بدنصیبوں کے خون میں ہاتھ کیوں رنگے؟'' میں نے پھنکار سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

''وہ...... جی ...... میں لالچ میں آ گیا تھا......'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''دولت کا لالچ نا......؟''

''بس جی ...... تین ہزار روپے کا ذکر سن کر میرے دل میں لالچ پیدا ہو گیا تھا۔'' وہ اقبالِ جرم پر اپنے بیان کی تصدیقی مہر ثبت کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اس شام سرکس کے تنبو کے نزدیک ان دونوں کو باتیں کرتے سن لیا تھا۔ اس وقت میں تنبو کے اندر اپنے آئٹم کی تیاری کر رہا تھا اور ان کی آواز بڑے واضح طور پر مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ ان کی باتوں سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئی کہ وہ فرار کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ میں نے ان کی ساری پلاننگ سن لی۔ لڑکی نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ واپس گھر کی طرف جانا تھا لیکن گھر میں داخل ہونے کے بجائے واپس میلے میں آ جانا تھا۔ جس میدان میں یہ میلا لگا ہوا ہے، اس کے آخری کنارے پر نہر کی پلیا ہے۔ لڑکے نے وہاں بیٹھ کر لڑکی کا انتظار کرنا تھا۔ لڑکی کو میلے کے اندر سے گزرتے ہوئے اس پلیا تک پہنچنا تھا۔ پھر اندھیرا پھیلتے ہی وہ دونوں ایک نئی زندگی کی تلاش میں کسی نامعلوم منزل کی جانب روانہ ہو جاتے۔ مجھے ان کی منزل کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا اور لڑکے نے ایسا کوئی ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ ان کی ساری گفتگو میں میری توجہ صرف ایک ہی نکتے پر لگی ہوئی تھی......''

''کون سا نکتہ؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''ان دونوں کے پاس تین ہزار روپے کی ایک تگڑی رقم موجود تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''دو ہزار روپے لڑکی اپنے گھر سے چرا کر لائی تھی اور ایک ہزار روپے لڑکے نے کہیں سے مارے تھے۔ بس جناب ...... اس رقم کے حصول کے لیے میں لالچ میں آ گیا تھا۔ میں نے سرکس کو خیرباد کہا اور ان سے پہلے ہی نہر والی پلیا کے نزدیک کھڑی فصل میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ پھر جب وہ دونوں یکے بعد دیگرے اس پلیا پر پہنچے تو میں نے اپنے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے ان دونوں کو قتل کر دیا اور ان کی لاشوں کو کھیتوں میں چھپا کر میں رفو چکر ہو گیا۔''

''تم اس رقم کو ہتھیانے کے لیے لالچ میں آ گئے تھے اور قانون تمہیں قرار واقعی سزا دینے کے لیے حرکت میں آ چکا ہے۔'' میں نے تند لہجے میں کہا۔ ''اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں پھانسی لگنے سے نہیں بچا سکتی...... کیا سمجھے؟''

''جناب! میں لوٹی ہوئی رقم میں سے دو ہزار روپے واپس کرنے کو تیار ہوں۔'' وہ ہوشیاری سے بولا۔ ''آپ کوئی ہلکی دفعہ لگا کر مجھے پھانسی سے بچا لیں۔ میں جیل جانے کے لیے تیار ہوں۔''

وہ مجھے ہلکی دفعہ لگانے کے لیے دو ہزار روپے رشوت کی پیشکش کر رہا تھا۔ اسے قطعاً علم نہیں تھا کہ ملک صفدر حیات دو ہزار کیا، دو لاکھ یا کروڑ میں بھی بکنے والا نہیں تھا۔ میں نے اس کا ذہن پڑھنے کے لیے گھسائی کا عمل جاری رکھا۔

''دو ہزار روپے کیوں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تم نے تو ان مقتولین سے پورے تین ہزار روپے لوٹے تھے......!''

''وہ جی ...... ایک ہزار روپے میں نے خرچ کر دیے ہیں۔''

''تم نے چار دن میں ایک ہزار روپے خرچ کر ڈالے۔'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایسا کیا خرید لیا تم نے؟''

''خریدا تو کچھ نہیں تھانے دار صاحب......!''

''پھر ایک ہزار روپے کہاں چلے گئے؟''

''میں پنڈی بھٹیاں میں تین چار لوگوں کا مقروض تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جیسے ہی پیسے میرے ہاتھ میں آئے، میں نے سب سے پہلے قرض ادا کیا۔ اب باقی دو ہزار روپے بچے ہیں۔ اگر آپ مجھے پھانسی سے بچا لیں تو یہ دو ہزار روپے میں آپ کو دینے کے لیے تیار ہوں۔''

''یہ دو ہزار روپے تو میں تم سے ضرور وصول کروں گا لیکن اپنے لیے نہیں۔'' میں نے اس کی خوش فہمی کا جنازہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ رقم جائے گی اس کے اصل حق داروں کے پاس البتہ تمہارے لیے میرے پاس ایک تحفہ ہے......''

''تحفہ......!'' وہ حیرت بھری نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''کیسا تحفہ؟''

''تم نے دو انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سنگین جرم کیا ہے سینڈو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس جرم کی پاداش میں تمہیں پھانسی پر تو لٹکنا ہی پڑے گا۔ میں تمہیں اس عظیم کارنامے پر موت کا تحفہ پیش کرتا ہوں۔''

وہ رونے گڑگڑانے لگا، اپنی جان بخشی کے لیے میری منت سماجت کرنے لگا لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی

اور حوالدار خادم حسین سے کہہ کر اسے حوالات میں بند کروا دیا۔ اسی روز میں نے اس کی نشان دہی پر دو ہزار روپے بھی برآمد کرا لیے۔

اگلی صبح میں نے بڑے مضبوط چالان کے ساتھ اسے عدالت میں پیش کر دیا۔ سینڈو میری تحویل میں اپنے جرائم کا اقبال کر چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اس سے وصول ہونے والی رقم اس درخواست کے ساتھ عدالت میں چالان کے ہمراہ جمع کرا دی۔

''میری معزز عدالت سے استدعا ہے کہ وہ اس رقم کو جلد از جلد ریلیز کر دے تاکہ مقتولین کے ورثا کی حتی المقدور اشک شوئی کی جا سکے۔''

پہلی ہی باقاعدہ پیشی پر عدالت نے مذکورہ رقم میرے حوالے کر دی تاکہ میں اسے حق داروں تک پہنچا سکوں۔ اگلے روز میں نے غلام سرور اور جیرا تیلی کو تھانے بلا لیا۔ اس دوران میں زیبو اور کھارا کو منڈھورا کلاں کے قبرستان میں منوں مٹی کے نیچے دبایا جا چکا تھا۔

ان دونوں کی حالت قابلِ افسوس ہو رہی تھی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیا اور معذرت آمیز ہمدردی سے کہا۔

''مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ میں زیبو اور کھارا کو زندہ سلامت تم تک نہیں پہنچا سکا لیکن اس امر پر میرا ذہن مطمئن ہے کہ میں نے ان دونوں کے قاتل سینڈو کو ایک مضبوط کیس کے ساتھ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا ہے۔ ایک آدھ پیشی میں اس کے لیے پھانسی کے احکامات صادر ہو جائیں گے لیکن میں نے تم دونوں کو اس وقت ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے۔''

ان دونوں نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے اپنی میز کی دراز میں سے دو بھورے رنگ کے لفافے برآمد کرتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کی ایک ایک امانت میرے پاس رکھی ہے۔ یہ میں تمہارے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ دونوں بہ دستور الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکے جا رہے تھے۔ میں نے ایک ایک بھورا لفافہ ان کی طرف بڑھا دیا۔

غلام سرور والے لفافے میں ایک ہزار تین سو چونتیس روپے اور جیرا تیلی والے لفافے میں چھ سو چھیاسٹھ روپے موجود تھے۔ سینڈو نے لوٹی ہوئی رقم میں سے ایک ہزار ٹھکانے لگا دیے تھے، باقی جو دو ہزار روپے بچے تھے، اس رقم میں ان دونوں کا حسابی نسبت تناسب کے اصول کے مطابق یہی حصہ بنتا تھا جو میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔

ان دونوں نے اپنا اپنا لفافہ کھول کر رقم گنی پھر غلام سرور نے تیکھے لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کیا یہ پیسے میری زیبو کی زندگی کا نعم البدل ہو سکتے ہیں؟''

''میں کاغذ کے ان ٹکڑوں کا کیا کروں گا؟'' جیرا تیلی دکھی لہجے میں بولا۔ ''میرا جوان جہان بیٹا چلا گیا۔ یہ پیسے میرے درد کا مداوا نہیں بن سکتے۔''

''میں تم دونوں کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اور مانتا ہوں کہ یہ رقم زیبو اور کھارا کو زندگی کی طرف واپس نہیں لا سکتی لیکن ایسے ہی مواقع پر انسان کی بے بسی اور لاچاری بتاتی ہے کہ سب کچھ اس کے بس میں نہیں ہے۔ بہت سارے دیگر معاملات کی طرح زندگی اور موت کا معاملہ بھی قدرت نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس کی مرضی کے بغیر نہ تو کوئی زندگی اس دنیا میں آنکھ کھول سکتی ہے اور نہ ہی موت کسی انسان کی زندگی کو چاٹ سکتی ہے۔ اس کی مشیت کے سامنے سب مجبور ہیں۔''

میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ میرا بیان کردہ آفاقی فلسفہ جیرا تیلی اور غلام سرور کی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں...... بہرحال ان دونوں نے مجھ سے کوئی جرح بحث نہیں کی اور بوجھل سینوں کے ساتھ واپس چلے گئے۔

میرا فلسفہ مبنی بر حقیقت تھا۔ انسان چاہے کتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو، اس کے اختیار کی ایک حد ہوتی ہے سینڈو کے پاس جسمانی طاقت کی کمی نہیں تھی۔ وہ چھوٹے سے آہنی رنگ میں سے اپنے گینڈا وجود کو گزار کر دکھاتا تھا، پھر بھی وہ موت کے شکنجے میں پھنسنے سے خود کو نہ بچا سکا۔ میرے پاس قانون کی لامحدود طاقت موجود تھی مگر میں اس اختیار کو استعمال کر کے زیبو اور کھارا کو زندگی ایسی نعمت سے سرفراز نہیں کر سکتا تھا۔ ہم میں سے ہر کوئی اپنی اپنی حیثیت میں اس ''طاقت ور'' کی قدرت کے سامنے مجبور تھا۔ اگر وہ مالک و خالق و رازق ایسا ہی طاقتور اور قادرِ مطلق نہ ہوتا تو انسان اسے کبھی خدا تسلیم نہ کرتا!

میری توقع کے عین مطابق، آئندہ پیشی پر سینڈو کو پھانسی کی سزا سنا دی گئی۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ ''مرحوم لوبرڈز'' نے کس سمت پرواز کی ٹھانی تھی......!

(تحریر: حُسام بٹ)

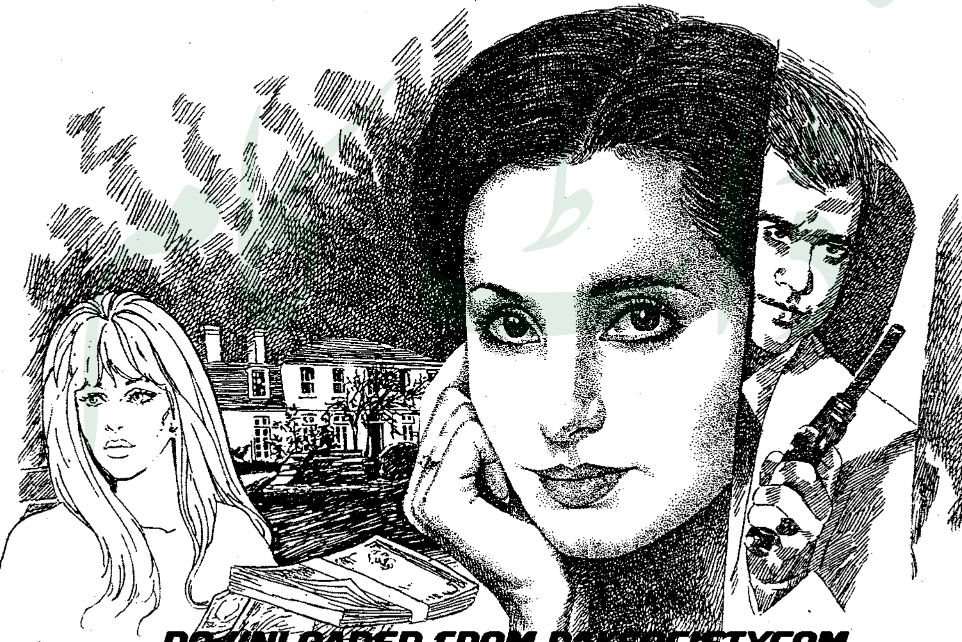
میں نے ایسے کئی قصے سن رکھے ہیں جن میں تجہیز و تکفین کے موقع پر گولیاں چلنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایسا ہی ایک واقعہ اسکوٹلر ہولو میں پیش آیا جہاں ایک ہی خاندان کے دو گروپوں کے درمیان میت کی تدفین کے موقع پر گولیاں چلیں لیکن میرے علم میں یہ پہلا واقعہ تھا جس میں متاثرہ شخص پہلے ہی مر چکا تھا بلکہ اس کی میت انتہائی نفیس تابوت میں رکھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں تابوت کو پہنچنے والے نقصان کا جائزہ لیتا، اسے زمین پر رکھا جاچکا

دہری خوشی

ثمر عباس

بعض اوقات قانون کے رکھوالوں کو بھی ایک جرم کو ختم کرنے کے لیے دوسرا جرم کرنا پڑتا ہے مگر... اسے جرم کوئی مانتا نہیں ہے۔ یہی حال اس کا بھی تھا جس نے بلندی کی جانب قدم تو بڑھائے تھے لیکن اس کے لیے کسی کو پستی کی جانب دھکیلنا ضروری تھا۔ لہذا اس نے بھی اسی فارمولے پر عمل کیا اور اپنے حصے کی ساری خوشیاں سمیٹ لیں۔

مغربی معاشرے کے انتہائی کمزور اور
غلیظ پہلو کو اجاگر کرتی تحریر



تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ گولی پیتل سے بنے ہوئے نقش و نگار اور لوہے کے صندوق کا کچھ بگاڑ سکی ہوگی۔

مرنے والا جیمس گارلینڈ ہوم مختلف اوقات میں پوسٹ ماسٹر، میئر اور ریاستی مجلس قانون ساز کا رکن رہ چکا تھا۔ کئی سالوں سے وہ ہر روز صبح قصبے میں شیو بنوانے اور اٹلانٹا جرنل کی کاپی خریدنے آیا کرتا تھا۔ لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے اور مختلف معاملات میں اس کی رائے جاننا چاہتے۔ لیکن گرتی ہوئی صحت کے پیش نظر وہ چند ماہ سے اپنے گھر کے پورچ تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کا پورچ بہت سے گھروں سے بھی بڑا ہے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی اور کاروباری معاملات میں صاف شفاف اور فیاض سمجھا جاتا تھا۔ وہ راستہ چلتے ہوئے ہر بچے کو ٹافی اور بادام دیا کرتا۔ ان میں سیاہ فام اور سفید فام بھی بچے شامل تھے۔

اسے دوسرے لوگوں کو بھی فیاضی پر آمادہ کرنے کا گر آتا تھا۔ میں خود بھی اس سے مستفید ہو چکا تھا، جب میں نے ایک ڈوبتے ہوئے لڑکے کو ندی سے نکالا تھا۔ اس کا باپ ایک ممتاز بینکر تھا۔ اس نے مجھے انعام دینا چاہا لیکن میں نے انکار کر دیا تب ہوم نے مداخلت کی اور مجھے سمجھایا کہ مجھ جیسے ابھرتے ہوئے ڈپٹی شیرف کے لیے یہ ٹرک کتنا کارآمد ہوگا اور اس سے پوری کاؤنٹی فائدہ اٹھائے گی۔ شیرف کڈ کو جب معلوم ہوا تو وہ مجھ سے حسد کرنے لگا اور اس نے شوشا چھوڑا کہ یہ ٹرک کاؤنٹی کی ملکیت ہونا چاہیے لیکن ہوم نے اس کی بات کو اہمیت نہیں دی۔ دوسرے لوگوں کی طرح شیرف بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ جیمس گارلینڈ ہوم سے مخالفت مول لینے کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا۔

مجھے دوسری بار اس سے ملنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب اس نے نشے میں مدہوش ایک شخص سے نمٹنے کے لیے مجھے بیسلے ہوٹل بلایا۔ وہ شخص اپنی بیوی کو بری طرح زدوکوب کر رہا تھا۔ ہوم اتنا برہم تھا کہ اس نے مجھے اس شخص کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے کا حکم دیا لیکن فوراً ہی قانون ہاتھ میں لینے کی تجویز پر معذرت کر لی۔

اب بیسلے ہوٹل بھی ہوم خاندان کی ملکیت ہے۔ جیمس گارلینڈ ہوم نے یہ ہوٹل خاص طور پر اپنی بہن کے لیے خریدا تھا جس کا شوہر جوئے میں ہار گیا تھا۔ مسز بیسلے وہ ہوٹل فروخت کرنا چاہ رہی تھی اور ہوم نے ایک معقول قیمت دے کر اسے خرید لیا تھا۔ اس طرح ہوم کی بہن کو رہائش اور خوراک کے ساتھ ایک مفید کام بھی ہاتھ آ گیا۔ اس نے اپنے شوہر کے نقصان کو ذہن میں رکھتے ہوئے حساب کتاب پر زیادہ توجہ دی کیونکہ تمام تجارتی گماشتے اور ریلوے کے افسران اس قصبے سے گزرتے تھے، اس لیے مجھے امید تھی کہ اس کا ہوٹل ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

جیمز گارلینڈ ہوم کی عمر نوّے برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس لیے اس کی موت کو دردناک نہیں کہا جا سکتا، تاہم اس کے جنازے میں سوگواروں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ غمزدہ سیاہ فام لوگوں کے ساتھ چند سفید فام بھی کنٹری روڈ پر صف بستہ کھڑے تابوت کا انتظار کر رہے تھے تاکہ مرنے والے کو آخری بار خراج عقیدت پیش کر سکیں۔ اس روز موسم بھی خوشگوار تھا۔ ہلکی بارش ہونے سے گرد بیٹھ چکی تھی۔ میری ڈیوٹی چرچ گراؤنڈ اور قبرستان کو جانے والی سڑک پر تھی تاکہ وہاں آنے والی گاڑیوں .... کے لیے راستہ بنا سکوں۔ مجھے منہ زور گھوڑوں اور کار سے باہر نکلتی خواتین کی جھالروں کے کسی بھی خطرناک ملاپ کو روکنا تھا۔

میں کاؤنٹی کا واحد ڈپٹی تھا جس کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ حالانکہ شیرف کو بھی اس موقع پر موجود ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے بدن پر پھوڑے پھنسیاں نکلی ہوئی تھیں اور دانت میں بھی تکلیف تھی۔ میں ایک چھوٹی نوٹ بک میں اس کی غیر حاضریوں کا ریکارڈ محفوظ کر رہا تھا۔ وہ اگلے سال ہونے والے انتخابات میں بھی گزشتہ بیس برسوں کی طرح بلامقابلہ منتخب ہونے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ میرے ذہن میں دوسرے خیالات تھے۔ قانون نافذ کرنے والے افسر کی حیثیت سے یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ نکمے پن کی بنیاد پر اس کے خلاف کوئی مہم چلا سکتا کیونکہ وہ ہر ایک کی جڑوں میں بیٹھا ہوا تھا اور جانتا تھا کہ لوگ اپنے گندے کپڑے کہاں ٹھکانے لگاتے ہیں۔ میرا منصوبہ یہ تھا کہ اس کی خراب صحت کو بنیاد بنا کر اس کے خلاف مہم چلائی جائے۔

میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی جیمز گارلینڈ ہوم کے جنازے پر بھی گولی چلا سکتا ہے۔ دھماکے کی آواز اتنی شدید تھی کہ کھودی گئی قبر کے پاس کھڑے ہوئے لوگ اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ جنگل کی سمت سے آنے والی گولی تابوت کو ٹکرانے سے پہلے ایک جنازہ بردار کے ہیٹ پر لگی۔ خوش قسمتی سے اس وقت جنازہ ایک ٹرالی پر رکھا ہوا تھا اور اسے زمین پر اتارنے کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ سب لوگ چند قدم پیچھے ہٹ چکے تھے اور پادری کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ کب جنازہ برداروں کو تابوت اتارنے کے لیے کہتا ہے۔

میرا پہلا خیال تھا کہ کسی بے وقوف شکاری یا نوجوان

طالب علم نے حادثاتی طور پر گولی چلادی ہو گی لیکن پھر خیال آیا کہ یہ آواز کسی رائفل یا شاٹ گن کی نہیں بلکہ ریوالور کی تھی پھر میرا دھیان اس سمت کی جانب ہو گیا جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ میں نے گردن نیچی کر کے گھٹنوں کے بل اس جانب بڑھنا شروع کر دیا اور زور سے چلایا۔ ”میں ڈپٹی شیرف اسٹو کی بول رہا ہوں۔ اپنے ہتھیار نیچے رکھو۔“

میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی جب میں نے ایک اور گولی چلنے کی آواز سنی۔ یہ آواز بھی اسی سمت سے آئی تھی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا رخ کس جانب تھا۔ میں صرف دھوئیں کی لکیر کو جھاڑیوں میں جاتے ہوئے دیکھ سکتا تھا۔ مجھے پوری امید تھی کہ گولی چلانے والا اس وقت تک فرار ہو چکا ہو گا لیکن وہ کہیں نہیں گیا بلکہ اس نے خود ہی اپنے دل میں گولی ماری اور پیچھے کو گر پڑا۔ اس کے پاس ہی ایک پرانا اعشاریہ تین صفر کا ریوالور سوکھے پتوں پر پڑا ہوا تھا۔ اس آدمی اور ریوالور کے درمیان سستی شراب کی ایک خالی بوتل بھی نظر آئی۔ جنازے میں شرکت کے لیے آنے والے چند لوگ میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے اور ان میں سے ایک بولا۔ ”یہ کون ہے؟“

لیکن کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ میں نے خود بھی پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے پھر میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی لیکن کچھ نہیں ملا۔ اس موسم میں بھی اس نے کافی بھاری کوٹ پہن رکھا تھا۔ قریب ہی اس کا ہیٹ پڑا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی۔

”تم میں سے کوئی چرچ کے کچن سے آئل کلاتھ لا سکتا ہے تاکہ ہم اسے لاش پر ڈال سکیں۔“ میں نے کہا۔ ”خواتین کو بتانے کی ضرورت نہیں۔“

اس کے بعد مجھے اس وقت تک وہاں رکنا تھا جب تک جیمز گارلینڈ ہوم کا تابوت زمین پر نہ رکھ دیا جاتا پھر میں لاش کو اپنے ٹرک تک لے جانے کے لیے ٹرالی مستعار لے سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اسے بوڑھے ڈاکٹر میکونی کے پاس لے جاؤں گا۔ وہ جنگ کے دوران آرمی سرجن رہ چکا تھا اور اب بھی ریلوے میں ڈاکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کے پاس زیادہ تر ریلوے کے ملازمین یا ایسے مسافر علاج کے لیے آتے ہیں جو ریل پر چڑھتے اترتے کے دوران زخمی ہو گئے ہوں۔ وہ قصبے میں رہنے والوں کی معمولی بیماری کا بھی علاج کرتا ہے البتہ سنگین نوعیت کی بیماری کے لیے کاؤنٹی کے اسپتال جانا پڑتا تھا۔

لیکن ڈاکٹر نے لاش کا سرسری معائنہ کرنے کے بعد مجھے جھنڈی دکھادی اور کہا کہ اس کا تجہیز و تکفین میں شریک ہونا ضروری ہے اور مجھے چاہیے کہ لاش کو براہِ راست تجہیز و تکفین کا انتظام کرنے والے جان ملٹن پینروز کے پاس لے جاؤں۔ مجھے جان لینا چاہیے تھا کہ وہ بھی میکونی کی طرح یہاں موجود ہو گا لیکن میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی یہ لوگ ایسے مواقع پر اپنے آپ کو نمایاں نہیں کرتے چنانچہ ایک گھنٹے بعد میں لاش سمیت اس کے دفتر پہنچ گیا جہاں عقبی دروازے پر لٹکا ہوا ”بند ہے“ کا بورڈ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے پریشانی کے عالم میں اپنا ہیٹ اتارا اور سر کھجانے لگا۔ اچانک میری نظر مس ہیزلین پوک پر گئی جو سائیکل پر سوار اپنے سفید بل ڈاگ گمبو کے ساتھ آرہی تھی۔ وہ کاؤنٹی نرس تھی اور میں گزشتہ ایک برس سے اس پر فریفتہ تھا۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھی مجھ پر کچھ کچھ مہربان ہے۔ وہ زیادہ تر زچہ اور ضعیف لوگوں کو دیکھتی تھی لیکن اس نے ایک سے زائد مرتبہ سنگین نوعیت کے کیسوں میں بھی مدد کی تھی۔

مس پوک نے دستانے والا ہاتھ ہلایا اور قریب آکر مجھے ہیلو کہا۔ اس نے سائیکل روکی اور اس کی نظریں میرے ٹرک کے پچھلے حصے پر جا کر ٹھہر گئیں جہاں مکھیاں جمع ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ اس نے سائیکل پر بیٹھے بیٹھے وہاں نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”یہ پیچھے کیا رکھا ہوا ہے؟“

میرا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر اس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ میں چلتا ہوا اس کے پاس گیا اور آہستہ سے بولا۔ ”مجھے اس کا روشنی میں معائنہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے کہ میں اسے رات بھر کے لیے سرد خانے میں رکھوا دوں۔ پینروز ابھی تک ہوم کے جنازے میں ہی ہے۔“

اس نے ”بند ہے“ کے بورڈ پر نگاہ ڈالی۔ اپنی سائیکل پورچ کی ریلنگ کے ساتھ لگائی پھر اس نے اپنے ہیٹ میں سے ایک پن نکالی اور اسے دروازے میں لگی لالٹین کے پیندے میں ڈالا تو ایک چابی باہر آگئی۔

”مسٹر پینروز نے مجھے جلد خراب ہونے والی دوائیں اپنے ریفریجریٹر میں رکھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔“

اس نے دروازہ کھول کر مجھے اشارہ کیا تو میں نے کہا۔ ”کسی کو مت آنے دینا جب تک میں اندر ہوں۔ بات پھیلتے دیر نہیں لگتی لیکن میں کسی سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا جب تک کہ مجھے خود معلوم نہ ہو جائے کہ معاملے کی نوعیت کیا ہے۔“

میں تیزی سے وہ لاش اٹھا کر اندر لے گیا اور اسے ایک میز پر لٹا دیا۔ لاش اکڑنا شروع ہوگئی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے آئل کلاتھ ہٹایا۔ مس پوک میرے پیچھے کھڑی ہوئی تھی گو کہ وہ مداخلت کرنا نہیں چاہ رہی تھی لیکن میں جانتا تھا کہ وہ سب کچھ غور سے دیکھ رہی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ جنازے کے موقع پر کیا واقعہ پیش آیا اور یہ کہ وہاں موجود کوئی بھی شخص اسے نہیں پہچانتا۔

''مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا لیکن کیا تم اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنا چاہو گی۔ ممکن ہے کہ تم نے اسے کہیں دیکھا ہو۔ ممکن ہے کہ یہ کبھی تمہارے پاس علاج کی غرض سے آیا ہو یا سینی ٹوریم کا کوئی مریض ہو۔''

اس نے لاش کو ہر زاویے سے دیکھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

میں نے اس سے کہا کہ وہ دوسرے کمرے میں چلی جائے کیونکہ میں لاش کے کپڑے اتار کر اس کے زخم کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔

''تم میرے اور اس کے درمیان میں ایک پردہ ڈال دو۔ اس طرح میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھ پاؤں گی جو میری بے ہوشی کی وجہ بن سکے۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''تم پردے کے دوسری جانب سے مجھے اپنے مشاہدات بتا سکتے ہو۔ تم جو کچھ کہو گے، وہ میں لکھتی جاؤں گی۔ ممکن ہے کہ یہ بعد میں تمہارے کام آئے۔''

اس نے اپنے بیگ سے نوٹ بک اور پنسل نکالی اور میں نے پردہ برابر کر دیا پھر میں نے اس کے لباس کے بارے میں تفصیل سے بیان کرنا شروع کیا۔ اس کے سفید سوٹ پر سامنے کی جانب ایک خون کا دھبا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی نشان نظر نہیں آیا لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم کے نچلے حصے پر کوئی نشان یا زخم ہوگا جس سے اس کی شناخت میں مدد مل سکے۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ ایک براؤن رنگ کا پیدائشی نشان اس کی بغل اور کمر کے درمیان تھا جو سیدھا اس کی ناف تک چلا گیا تھا۔ میں نے اس کی پتلون ڈھیلی کر کے تھوڑی سی نیچے کھسکائی تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے کہ میری زبان سے ایک ایسا لفظ نکل گیا جو میں نے زندگی میں کبھی کسی عورت کے سامنے ادا نہیں کیا تھا۔

'' معافی چاہتا ہوں مس پوک۔ میں ...... میں ...... بھول گیا تھا۔''

''اوہ میرے خدا! یہ کیا ہے؟'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔ میں نے اس کے قدموں کی آواز اپنی جانب آتے سنی تو آئل کلاتھ سے لاش کا وہ حصہ ڈھک دیا۔

''کیا یہ مخنث ہے؟'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''اس کے ساتھ اس سے بھی برا ہوا ہے۔ یہ پیدائشی ایسا نہیں تھا۔ اسے دانستہ طور پر نامرد بنایا گیا ہے۔''

اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پاگل خانے سے آیا ہوں پھر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ بولی۔

''مجھے دیکھنے دو۔''

اس نے اپنے دستانے اتار کر کہنیوں تک لمبے ربر کے دستانے چڑھا لیے جو پینیر وز کسی لاش کو حنوط کرتے وقت پہنا کرتا تھا پھر وہ میرے پاس سے گزرتی ہوئی لاش تک گئی اور اس پر پڑا ہوا آئل کلاتھ ہٹانے لگی۔ میں پردے کے دوسری جانب چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر آ گئی اور اس نے اپنی نظریں دیوار پر جما دیں۔

''کیا تم مجھے بتانا پسند کرو گی کہ کیا سوچ رہی ہو؟''

''یہ ٹھیک ہے کہ زخم کافی پرانے ہیں اور ایک ہی وقت میں لگے ہیں لیکن یہ عمل دو مرحلوں میں ہوا ہے۔'' میں نے اس سے وضاحت کرنے کے لیے کہا تو وہ بولی۔ ''نامرد بنانے کا کام کسی معمولی مہارت رکھنے والے نے انجام دیا تھا جس کے پاس صرف جانوروں کو خصی کرنے کا تجربہ تھا۔''

''مس پوک! یہ کام تو یہاں کے تقریباً سبھی کسان کر لیتے ہیں۔''

''یہ سچ ہے لیکن یہ کام کسی حملہ آور نے کیا ہے جو اسی مقصد سے آیا تھا اور اسے کچھ جدوجہد بھی کرنا پڑی جس کی وجہ سے صحیح کام نہیں ہو سکا۔ چند گھنٹوں بعد ہی زخم بگڑنا شروع ہو گیا جس کا علاج ایک تربیت یافتہ ڈاکٹر نے کیا۔ میں نہیں سمجھتی کہ یہ کسی کی مدد کے بغیر خود ڈاکٹر کے پاس گیا ہوگا۔''

''کیا تم نے اس کے سر کی ایک جانب لگنے والے زخم پر غور کیا؟ اس ضرب سے اس کی کھوپڑی میں فریکچر تو نہیں ہوا لیکن اس سے یقیناً وہ حواس باختہ ہو گیا ہوگا۔''

''ممکن ہے کہ حملہ آور نے اس پر قابو پانے کے لیے ایسا کیا ہو۔'' وہ گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''اس نے خودکشی کر کے وقت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال اسے ایک سال کے اندر مر جانا تھا۔ کیا تم نے اس کے سوجے ہوئے پیٹ پر ابھری ہوئی رگیں دیکھیں؟ اس کا جگر خراب ہو چکا ہے۔''

میں اتنی دیر لاش کے پاس ہی رکا رہا جب تک وہ ایڈگر فولٹن کو لے کر نہیں آ گئی۔ اس فوٹوگرافر کا اسٹوڈیو زیادہ

دور نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی پینرز کے بلانے پر کئی مُردہ لوگوں کی تصویریں کھینچ چکا تھا۔ یہاں تک کے غمزدہ خاندانوں نے بھی مرنے والے کے ساتھ یادگار کے طور پر تصویریں بنوائیں۔ اس کے آنے سے پہلے پیرز بھی پہنچ گیا اور اس نے مرے ہوئے شخص کو مناسب شکل دینے میں میری مدد کی۔ اس نے جسم اور چہرے کی صفائی کرنے کے ساتھ ساتھ اس مُردہ شخص کے بالوں میں کنگھی کی اور اس کی گردن میں ایک کاغذ کا ٹکڑا لگا دیا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی تصویر اخبارات میں دینے کے ساتھ ساتھ پوسٹر بھی شائع کیے جائیں اور انہیں ریاست میں واقع تمام شیرف کے دفاتر اور ڈاک خانوں کو بھیجا جائے۔ فولٹن نے تجویز پیش کی کہ اس کی آنکھوں پر بھی ہلکی سی ٹچنگ کر دی جائے تا کہ وہ کھلی ہوئی نظر آئیں۔

ان پوسٹرز کی اشاعت کے کافی دنوں بعد بھی کوئی جواب نہ آیا تو میں مایوس ہو گیا۔ اس مرنے والے کی لاش کاؤنٹی قبرستان کے اس گوشے میں رکھ دی گئی جو لاوارثوں کے لیے مخصوص تھا۔ اس روز میں بکس ڈولی کے اسٹور کے قریب سے تجاوزات ہٹوا رہا تھا کہ میں نے ایک ویگن کے رکنے کی آواز سنی جس میں ایک مضبوط ڈیل ڈول والا مرد، سنہرے بالوں والی عورت اور بہت سے بچے سوار تھے۔ مرد نے ایک راہ گیر سے پوچھا تو اس نے میری جانب اشارہ کر دیا۔ وہ مجھ سے تقریباً دس فٹ کے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ اس مرد نے ہیٹ اتار کر میری طرف دیکھا اور عورت کو گاڑی سے اترنے میں مدد دی۔ وہ عورت سڑک پار کر کے میرے پاس آئی اور بولی۔ ''یہاں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہم اکیلے میں بات کر سکیں۔'' وہ مضبوط جسامت والی خوب صورت عورت تھی۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ ہو گی اور اس کے ہاتھ میں اس پوسٹر کی ایک کاپی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہ شخص میرا باپ ہے۔ گو کہ میں نے اسے بیس سال سے نہیں دیکھا لیکن یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ وہی ہے۔''

میں اسے بازار کے عقب میں ایک کمرے میں لے گیا جسے میں اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔

''میں نے یہ پوسٹر کوساویل کے پوسٹ آفس میں دیکھا تھا۔ اب میرا نام جینیٹ ٹیٹر ہے لیکن پہلے میں فورسائٹ ہوتی تھی۔ میرے باپ کا نام ولیم فوسٹر تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اسے شراب نوشی کی عادت تھی اور میں ہمیشہ ڈرتی تھی کہ اس کی موت شاید کسی شرمناک طریقے سے ہو گی۔''

اس وقت لاش کاؤنٹی اسپتال کے مُردہ خانے میں تھی جو وہاں سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ اس لیے فوری طور پر اس کی شناخت نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا میں نے تصدیق کے لیے اس سے کچھ باتیں پوچھنا ضروری سمجھا۔

''کیا اس کے جسم پر کوئی امتیازی نشان یا زخم تھا جس کی مدد سے تم اسے شناخت کر سکو؟''

وہ شرمائی نہ ہکلائی جس سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ لاش کے اس مخصوص زخم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہاں ایک پیدائشی نشان تھا۔'' اس نے اپنی پسلیوں کی جانب اشارہ کیا۔

''اس کا پیشہ کیا تھا؟''

''وہ ایک سیلز مین تھا اور شہر شہر گھوم کر مشینوں میں ڈالنے کے لیے مختلف قسم کے تیل فروخت کرتا تھا۔ اس کے گاہکوں میں زیادہ تر ٹیکسٹائل اور ریلوے کمپنیاں شامل تھیں۔ اپنے کام کے سلسلے میں وہ بہت زیادہ سفر کیا کرتا تھا جس کی وجہ سے مجھے اور میری ماں کو اس سے ملنے کا بہت کم موقع ملتا تھا پھر وہ بھی مر گئی۔''

''اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟''

''بارہ سال۔ اس کا انتقال نمونیا سے ہوا۔ اس وقت بھی میرا باپ وقت پر نہیں پہنچ سکا اور ایک بوڑھی نانی کے سوا خاندان میں میرا کوئی نہیں۔''

میں نے اظہارِ ہمدردی کے طور پر سر ہلا دیا۔ وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''اس کی موت نے کئی لحاظ سے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی۔ میرے باپ کی شراب نوشی بڑھ گئی۔ نشے میں وہ بالکل بدل جاتا تھا لیکن چونکہ گھر میں اور کوئی نہیں تھا اس لیے اس نے کاروباری دوروں پر مجھے بھی ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔ اگر مجھے کتابیں پڑھنے کی عادت نہ ہوتی تو ان ہوٹلوں میں اکیلے رہ کر مر جاتی جہاں وہ مجھے لے کر جاتا تھا کیونکہ دن کا بیشتر وقت وہ ہوٹل سے باہر گزارتا تھا۔''

وہ دوبارہ مسکرائی۔ ''مجھے یہ ٹاؤن بہت پسند تھا کیونکہ ہوٹل کی مالکن مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کے لیے دیتی تھی۔ اسی ہوٹل میں آخری بار میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے گلا کھنکھار کر اسے دوبارہ بولنے پر آمادہ کیا۔ ''ہمیں یہاں رہتے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔ عموماً ہم کسی جگہ پر اتنی دیر قیام نہیں کرتے تھے پھر ایک رات میرا باپ واپس نہیں آیا۔ میری سمجھ میں

نہیں آیا کہ کیا کروں اور کس سے بات کروں۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا اور رات بھر بھوکی رہی۔ دوسرے روز صبح سویرے ہوٹل کی مالکن میرے لیے ناشتا لے کر آئی اور کہا کہ میں اپنا سامان باندھ لوں۔ اس نے بتایا کہ میرے باپ کو ایک خطرناک حادثہ پیش آگیا ہے اور اسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے وہ کچھ عرصے تک مجھ سے ملنے نہیں آسکتا۔ اس نے بتایا کہ وہ مجھے اپنے کسی جاننے والے کے گھر لے جارہی ہے جہاں میں اس وقت تک قیام کروں گی جب تک مجھے نانی کے پاس پہنچانے کا بندوبست نہیں ہوجاتا۔ میں حیران تھی کہ اسے میری نانی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ وہ اس ریاست میں نہیں رہتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی میری ماں یا مجھ میں کوئی دلچسپی لی۔ البتہ وہ ماں کی تدفین کے موقع پر تھوڑی دیر کے لیے آئی ضرور تھی۔ مجھے تو اس کی شکل بھی یاد نہیں تھی لیکن میں نے اس کے پاس جانے کے لیے اپنا ذہن بنالیا اور کوئی سوال نہیں کیا۔ ہوٹل کی مالکن اور اس کا ایک سیاہ فام ملازم مجھے ایک چھوٹے سے صاف ستھرے مکان میں لے گئے جہاں ایک سیاہ فام خاندان میرا منتظر تھا۔ دو دن بعد ایک ڈپٹی شیرف آیا اور مجھے گاڑی میں بٹھا کر ایک سنسان اسٹیشن پر لے گیا اور مجھے ٹرین پر سوار کرادیا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ انہوں نے مجھے ہوٹل کے قریب واقع اسٹیشن سے ٹرین میں کیوں نہیں بٹھایا۔ ڈپٹی نے مجھے ایک لفافہ دیا جس میں کافی ڈالرز تھے۔ ایک دن کے سفر کے بعد جب میں اپنی منزل پر پہنچی تو نانی میرا انتظار کررہی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ اس کے رویے میں اچانک تبدیلی کیسے آگئی۔ اس نے میرا بہت خیال رکھا اور مجھے بہترین اسکول میں داخل کروادیا۔''

اس کے چہرے پر ایک جاندار مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہی نہیں بلکہ جب جم سے میری شادی ہوئی تو اس نے مجھے ایک بڑی رقم کا چیک بھی دیا جو میرے خیال میں اس کی حیثیت سے بہت زیادہ تھا۔ ہم نے اس رقم سے ایک چھوٹا سا فارم خرید لیا۔''

''مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ حالات تمہارے حق میں بہتر ہوگئے۔ تمہیں اس ڈپٹی شیرف کا نام یاد ہے جس نے تمہیں ٹرین پر سوار کروایا تھا؟''

''بہت اچھی طرح۔ اس کا نام کڈ تھا۔ جو اس کے ہیٹ پر لکھا ہوا تھا۔''

وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ اس نے اپنے بیگ سے ایک کارڈ نکال کر اس پر اپنا نام پتا لکھا اور ایک چھوٹے سائز کی تصویر نکالتے ہوئے بولی۔ ''یہ میں تمہیں دکھانے کے لیے لائی تھی۔ اگر تمہیں کوئی ایسا شخص مل جائے جسے میں اب بھی یاد ہوں۔''

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا لیکن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ تصویر کس طرح کارآمد ہوسکتی ہے۔ وہ حال ہی میں لی گئی تھی اور اس میں وہ اپنے پانچ بچوں کے ساتھ نظر آرہی تھی.. جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔

''میں تمہاری سوچ کی قدر کرتا ہوں لیکن اس بات کو کافی عرصہ گزر گیا اور تم ان بیس سالوں میں کافی بدل گئی ہو۔''

''میں جانتی ہوں کہ کوئی بھی مجھے نہیں پہچان پائے گا لیکن میری نانی نے ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے بتایا ہے کہ میری بڑی بیٹی مرسی بالکل مجھ پر گئی ہے۔ میں بھی بچپن میں ایسی ہی تھی۔''

میں نے غور سے اس لڑکی کو دیکھا۔ اس میں اپنی ماں کی بہت جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے اس عورت سے کہا۔ ''کیا میں یہ تصویر کچھ عرصے اپنے پاس عاریتاً رکھ سکتا ہوں؟ اگر کسی شخص نے اس کے ذریعے تمہیں پہچان لیا تو شاید وہ تمہارے باپ کی موت کے حوالے سے کچھ ایسی تفصیلات بتاسکے جو ہمیں معلوم نہیں ہیں۔ میں تمہیں یہ تصویر ڈاک کے ذریعے واپس بھیج دوں گا۔''

''اوہ...... تمہارا یہ کہہ دینا کافی ہے۔'' وہ دروازے کی طرف جانے کے لیے مڑی۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اس دوران تمہارا باپ کبھی یہاں واپس آیا؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ اس کے بعد میں نے کبھی اسے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے کہ وہ اپنے سامان کی تلاش میں آیا ہو یا وہ اپنے کیے کی تلافی کرنا چاہ رہا ہو۔ ایسی صورت میں اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی' میں اسے بہت پہلے معاف کرچکی تھی۔''

اس کے جانے کے بعد مجھے ایک بات بڑی شدت سے محسوس ہوئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے خودکشی کی ہے کیونکہ میں پوسٹر میں یہ بات لکھ چکا تھا لیکن اس نے مجھ سے اس کی تفصیل نہیں پوچھی اور نہ ہی تدفین کے اخراجات برداشت کرنے کی پیشکش کی۔

اس روز مس پوک کو کسی ذاتی کام سے جانا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے اپنے ٹرک میں لے چلوں

تو اس کا کافی وقت بچ جائے گا۔ میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات کیا ہو سکتی تھی کہ اس جیسی خوب صورت عورت میری ہم سفر بنے۔ میں نے راستے میں اسے مس ٹینر اور مُردہ شخص کی شناخت کے بارے میں بتایا۔ جب میں نے اسے ہوٹل کی مالکن مسز بیسلے کے بارے میں بتایا کہ کس طرح وہ اپنے ایک سیاہ فام ملازم کی مدد سے اسے اپنے ساتھ لے گئی تھی تو اس نے اچانک ہی میرا بازو پکڑ لیا اور بولی۔

''میرے مریضوں میں سے ایک رولو نورس پورٹر ہوا کرتا تھا۔ بعد میں وہ کئی سالوں تک مسٹر ہوم کا ملازم رہا۔ یقیناً یہ وہی پورٹر ہے جس کا تم ذکر کررہے ہو۔''

رولو نورس کاؤنٹی کے منظور شدہ مریضوں میں واحد سیاہ فام تھا جو باقاعدگی سے اپنا علاج کرواتے تھے۔ اس بارے میں کاؤنٹی کمشنر کا فلسفہ یہ تھا کہ سیاہ فام لوگوں کو اپنا علاج خود کروانا چاہیے انہیں کاؤنٹی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس فہرست میں نورس کی موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ جیمس گارلینڈ ہوم نے اس کی سفارش کی تھی۔

نورس ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا تھا۔ ایک لڑکی ہمیں اندر لے گئی۔ مس پوک نے بتایا کہ وہ اس کی پوتی ہے۔ وہ ہمیں تکیوں اور کمبلوں کے ڈھیر کے پاس بٹھا کر چلی گئی پھر اس میں سے آہستہ آہستہ ایک سفید سر نمودار ہوا جیسے کوئی بوڑھا کچھوا اپنے خول سے باہر آرہا ہو۔ اس نے سر جھکا کر مس پوک کو تعظیم دی۔ جب وہ اس کا حال چال پوچھ چکی تو میں نے جینیٹ ٹینر کی تصویر اس کی طرف بڑھا دی جسے اس نے لرزتے ہاتھوں سے پکڑ لیا اور آنکھوں سے قریب کر کے دیکھنے لگا۔

''میں اس بچی کو جانتا ہوں۔ یہ ایک بڑی دردناک کہانی ہے۔'' اس نے مرسی ٹینر کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ جینیٹ ٹینر بھی اس وقت مرسی جیسی ہی تھی۔ میں اس کی تصحیح کرنا چاہ رہا تھا لیکن مس پوک نے اشارے سے مجھے روک دیا اور بولی۔ ''وہ دردناک کہانی کیا ہے رولو؟''

اس نے حیرت سے اسے دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس وقت تم یہاں نہیں تھیں بلکہ شاید پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔''

''ہاں۔ پھر بھی میں یہ کہانی سننا چاہتی ہوں۔''

وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''اس کا کچھ حصہ عورتوں کے لیے قابلِ سماعت نہیں ہے لیکن اس کا ناشائستہ قصہ شروع ہونے سے پہلے ہی یہ افسوسناک واقعہ پیش آ گیا تھا۔''

مس پوک نے اپنی نظریں جھکا لیں اور ہمہ تن گوش ہوگئی۔

''ماں کے مرنے کے بعد وہ بچی کچھ عرصے ہمارے ہوٹل میں اپنے باپ کے ساتھ ٹھہری۔ وہ ایک سیلز مین تھا اور اکثر یہاں آیا کرتا تھا لیکن پہلے کبھی بیٹی کے ساتھ نہیں آیا۔ میں اس وقت پورٹر کے طور پر کام کرتا تھا اور لوگوں کا سامان ڈپو سے ہوٹل لاتا اور لے جاتا تھا۔ میں نے کبھی ہوٹل میں آنے والے مہمانوں کی سرگرمیوں پر نظر نہیں رکھی البتہ میری کزن میری اس ہوٹل میں خادمہ کے طور پر کام کرتی تھی اور صفائی کے لیے کمروں میں جاتی تھی۔ وہ وہاں قیام کرنے والوں اور ان کی حرکات وسکنات کو بھی نوٹ کرتی تھی۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ اس لیے اسے ان باتوں سے کوئی حیرت نہیں ہوتی تھی۔ اس نے بتایا کہ سیلز مین اور اس کی بیٹی ایک ہی بستر پر سوتے ہیں۔ میرے لیے اس میں حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں نے میری سے کہا کہ شاید اس کی بیٹی کو ڈر لگتا ہو کیونکہ یہ اس کے لیے اجنبی جگہ ہے اور حال ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہوا ہے لیکن پھر......''

اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا تا کہ مس پوک نہ سن سکے اور سرگوشی میں بولا۔ ''میری گندی چادریں لے کر آئی جو اس نے ان کے بستر سے اتاری تھیں اور بولی...... ''دیکھو۔ میں نے تم سے کہا تھا نا......''

میں نے دیکھا کہ مس پوک کے ہونٹ بھینچ گئے۔ رولو کی تمام احتیاط کے باوجود اس نے گفتگو کا یہ حصہ سن لیا تھا۔

''اس بارے میں تم دونوں نے کیا کیا؟''

''میری کبھی کوئی کام خود نہیں کرتی۔ وہ مسئلہ کھڑا کر کے اسے دوسروں پر ڈال دیتی ہے۔ میں سارا دن پریشان رہا۔ مجھ سے کھانا کھایا گیا اور نہ ہی میں سو سکا۔ میں کسی ایسے شخص کو یہ بات بتانا چاہ رہا تھا جو مجھ سے زیادہ با اختیار ہو۔''

''پھر تم نے کسے یہ بات بتائی؟''

''ظاہر ہے کہ مسٹر ہوم کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔'' اس نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''میں اندھیرا ہونے پر ان کے یہاں گیا اور ان کے خانساماں سے کہا کہ وہ انہیں عقبی دروازے پر لے آئے۔ یہ بہت اہم معاملہ ہے اور مجھے ان سے ابھی بات کرنی ہے۔ مسٹر ہوم جانتے تھے کہ اگر خاص بات نہ ہوتی تو میں کبھی رات کے اس پہر انہیں زحمت نہ دیتا۔ انہوں نے میری بات غور سے سنی۔ میں

دیکھ سکتا تھا کہ ان کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور جبڑے سخت ہو گئے لیکن انہوں نے اس کے سوا کچھ نہیں کہا کہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت ہے اور اگر میری کو ہوٹل میں ملازمت کرنی ہے تو اسے بھی اپنی زبان بند رکھنا ہوگی۔''

''پھر مسٹر ہوم نے کیا کیا؟''

''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں۔ اگلے روز سورج نکلنے سے پہلے ہوٹل کی مالکن اپنی بگھی میں سوار ہو کر میرے پاس آئی اور اس نے کہا کہ مجھے اس کے ساتھ ہوٹل چلنا ہوگا تاکہ میں لڑکی کو اس کے سامان سمیت اس کے جاننے والوں کے گھر پہنچادوں۔ مسز بیسلے نے بتایا کہ لڑکی کے باپ کو ایک حادثہ پیش آیا ہے اور اسے کچھ عرصہ اسپتال میں رہنا ہوگا تاہم اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں۔''

نورس نے باری باری ہم دونوں کو دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کے بعد میں نے اس بچی یا اس کے باپ کے بارے میں کچھ نہیں سنا اور نہ ہی کسی سے کچھ پوچھا لیکن کبھی کبھی اب بھی میں اس بارے میں سوچتا ہوں۔''

''تمہیں یہ جان کر اطمینان ہوگا رولو۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ موجود ہے کہ وہ چھوٹی لڑکی اب ایک اچھی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا اپنا ایک خاندان ہے اور وہ کئی لوگوں سے اچھی زندگی گزار رہی ہے۔''

یہ سن کر رولو مسکرا دیا اور ایک بار پھر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کا ذہن کسی اور جانب چلا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے تصویر نکل کر زمین پر جا گری جسے میں نے اٹھالیا۔

''اس کی باتیں سننے کے بعد تو کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔'' مس پوک نے ٹرک میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''خیر، اب ہمیں اس مردہ شخص کی شناخت تو مل گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کا ممکنہ محرک کیا تھا۔ ولیم فوسٹر کو بیٹی کے ساتھ غیر فطری تعلق کی سزا دی گئی تھی۔''

''یقیناً مسٹر ہوم نے ہی کسی شخص کو اس کام پر لگایا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ اس کا منشا یہ نہ ہو کہ اسے اتنی سخت سزا دی جائے۔ جس نے بھی یہ کام کیا، اس نے انتہا کر دی۔ میں بھی یقین نہیں کر سکتی کہ جیمس گارلینڈ ہوم نے خود یہ کام کیا ہوگا۔''

میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ ہوم اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔ ورنہ مجھے یقین نہیں کہ اس سے ان الزامات کے بارے میں کچھ پوچھ سکتا۔ البتہ مس پوک کسی اور خطوط پر سوچ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''ہوم نے یقیناً فوری طور پر فوسٹر کے لیے طبی امداد کا بندوبست کیا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ کیا ایسا نہیں ہے؟''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ ہوم کو کسی ایسے شخص کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی جو فوری طبی امداد مہیا کر سکے۔ اس وقت بھی آج کی طرح قصبے میں ایک ہی شخص مطلوبہ مہارت کا حامل تھا یعنی سائرس میکونی۔

میں بری طرح تھک چکا تھا لیکن ڈاکٹر سے ملے بغیر مجھے نیند نہ آتی۔ چنانچہ مس پوک کو اس کے ٹھکانے پر چھوڑ کر میں اس ڈاکٹر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں اسے اس گفتگو میں شامل نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کی بہت عزت کرتی تھی اور ڈاکٹر بھی اسے پسند کرتا تھا۔ لہٰذا مس پوک کی موجودگی میں ڈاکٹر سے کھل کر گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ اپنے کلینک سے نکل ہی رہا تھا کہ میں پہنچ گیا لیکن جب میں نے اسے بتایا کہ کوئی بات میرے دماغ میں گردش کر رہی ہے اور جب تک اس کی وضاحت نہ ہو جائے، مجھے چین نہیں آئے گا تو اس نے مجھے اندر بلالیا۔ اس دن پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ اس کی عمر ستر سے تجاوز کر چکی ہے لیکن وہ اب بھی پہلے کی طرح چاق و چوبند تھا۔

یہ ایسا موقع نہیں تھا کہ میں اس سے گھما پھرا کر سوالات کر کے کچھ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ جو کچھ رولو نورس نے کہا تھا، وہ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ فوسٹر کی بیٹی نے کس طرح پیدائشی نشان کی مدد سے اپنے باپ کی لاش کو شناخت کیا۔

''مجھے یہ جان کر حیرانی ہو رہی ہے کہ مرنے والا وہی شخص ہے جس کا میں نے علاج کیا تھا اور اس پر بھی حیران ہوں کہ تم مجھ سے اس کی موت کا سرٹیفکیٹ لینے کیوں نہیں آئے۔ پھر میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرتا کہ اس کا تصور میرے ذہن سے کیسے نکل گیا۔''

یہ کہہ کر وہ بڑی مشکل سے اپنی کرسی سے اٹھا اور بہ مشکل تمام چلتا ہوا قدآدم الماریوں تک پہنچا۔ وہ ایک سیڑھی کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں نے اسے روک دیا اور پیشکش کی کہ اسے جس چیز کی تلاش ہے، وہ میں نکال دیتا ہوں۔

''تمہارا شکریہ۔ دراصل ان دنوں میرے گھٹنوں

میں درد رہنے لگا ہے۔ بائیں جانب سب سے اوپر والی دراز میں ایک لفافہ رکھا ہوا ہے۔'' اس نے مجھے اپنی گھڑی کی چین میں سے ایک چابی نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے کئی سالوں سے وہ دراز کھول کر نہیں دیکھی۔ اگر چوہوں اور گھن سے محفوظ رہ گیا ہو تو اس لفافے کو وہیں ہونا چاہیے۔''

وہ لفافہ اپنی جگہ موجود تھا البتہ فوسٹر کے مُردہ چہرے کی طرح وہ زرد اور داغوں سے بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ چوہوں نے اس کے کونے کتر دیے تھے لیکن باقی لفافہ محفوظ تھا۔ جب میں نے وہ لفافہ ڈاکٹر کو دینا چاہا تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے پڑھو۔ ممکن ہے کہ اس کی ہینڈ رائٹنگ بھی پہچان جاؤ۔''

میرے لیے وہ تحریر اجنبی تھی لیکن لفظ اس طرح کاغذ پر گھسیٹے گئے تھے جیسے کسی نے ہیجانی کیفیت میں انہیں لکھا ہو۔ ''اس شخص کا بہترین طریقے سے علاج کرو۔ ڈپٹی کڈ کو یہ اسی حالت میں کاؤنٹی روڈ پر پڑا ہوا ملا ہے۔ لگتا ہے کہ اسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر مرنے کے لیے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ یہ بات صرف تم تک ہی رہنی چاہیے۔ جب یہ سفر کے قابل ہو جائے تو میں ایک لڑکے کو تمہارے پاس بھیجوں گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ آسانی سے سفر کر سکے گا، اگر اسے کوئی سکون پہنچانے والی دوا دے دی جائے۔ تمہاری جو بھی فیس ہو وہ کڈ کو بتا دینا۔ اس کی ادائیگی ہو جائے گی۔''

میکونی ناک سکیڑتے ہوئے بولا۔ ''یہ خط ہوم نے لکھا تھا۔ مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس لیے میں نے قدرتی طور پر کڈ یا کسی اور شخص سے فیس کا مطالبہ نہیں کیا۔''

''کیا تمہیں کوئی شبہ ہوا تھا؟''

''بالکل ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ شخص کسی حادثے میں زخمی نہیں ہوا۔ کڈ اس شخص کو اس خط سمیت نصف شب کے قریب لے کر آیا اور فوراً ہی واپس چلا گیا۔ اس نے مجھے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ کچھ پوچھ سکوں۔ وہ خود کسی نیم پاگل شخص کی طرح وحشت زدہ لگ رہا تھا جس پر مجھے بہت حیرانی ہوئی اور میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اتنا خوفزدہ کیوں ہے لیکن مجھے اس خط میں لکھی ہوئی ہدایات پر عمل کرنا تھا۔''

''پھر تم نے اس خط کو مقفل کر دیا...... کیوں؟''

''اگر وہ شخص دورانِ علاج مر جاتا تو کم از کم میرے پاس ایک ثبوت ہونا چاہیے کہ اسے جس حالت میں میرے پاس لایا گیا، اس کا ذمے دار میں نہیں تھا۔ میں نے اسے درد دور کرنے والی دوائیں دیں اور اس کے زخموں کا علاج کیا۔ اس دوران وہ ایک مرتبہ بھی پوری طرح ہوش میں نہیں آیا اور نہ ہی اس نے مجھے دیکھا۔ میں نے بخار کا بہانہ بنا کر اپنا کلینک بند کر دیا اور چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہا پھر ایک سیاہ فام اسے لینے آیا جسے میں نہیں جانتا تھا اور اسے ایک ویگن میں سوار کر کے لے گیا جس میں تمام سہولتیں موجود تھیں۔ میں پُراعتماد تھا کہ وہ بچ جائے گا۔'' اس کے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''بشرطیکہ اسے کوئی گاڑی ٹکر نہ مار دے۔''

دوسرے روز میں کڈ سے ملنے اس کے گھر پہنچ گیا۔ دروازہ اسی نے کھولا۔ غالباً اس نے اندازہ لگا لیا کہ میں کسی خاص مقصد کے تحت اس سے ملنے آیا ہوں۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا کہ میں نے آنے سے پہلے اسے ٹیلی فون کیوں نہیں کیا۔ میں نے کندھے اچکا دیے۔ اس کی بیوی نے کافی کی پیشکش کی جسے میں نے مسترد کر دیا۔ جب وہ گھر کے عقبی حصے میں چلی گئی تو میں نے کڈ سے کہا کہ اس سے چند باتیں پوچھنے آیا ہوں۔

''تم ڈپٹی بننے سے پہلے ایک کسان کے یہاں کام کرتے تھے؟''

وہ تھوڑا سا پُرسکون ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔ مجھے وہ زندگی بالکل پسند نہیں تھی۔ روئے زمین پر سور سب سے گندا جانور ہے۔''

''کیا تم نے کبھی کسی سور کو جنسی طور پر ناکارہ کیا؟''

وہ نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''ممکن ہے کہ کیا ہو لیکن مجھے یہ پسند نہیں تھا۔''

''کبھی کسی انسان کو......؟'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

وہ اپنے قدموں پر اچھلتے ہوئے بولا۔ ''تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟''

''میں اس شخص کی بات کر رہا ہوں جس نے ہوم کی تدفین کے موقع پر جنگل میں خودکشی کر لی تھی۔''

''میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔''

''یہ مت کہو۔ ڈاکٹر میکونی نے مجھے ایک مختلف کہانی سنائی ہے۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں۔ ویسے بھی میکونی اس بڑھاپے میں سٹھیا گیا ہے۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی چل کر اس سے بات کرو تاکہ معاملہ واضح ہو سکے۔''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''ہوم نے مجھے اس کام کے لیے آمادہ کیا تھا۔ اس منحوس کے مجھ پر کئی احسانات تھے اور میں بھی قصبے کے دوسرے لوگوں کی طرح اسے انکار نہیں کرسکتا تھا۔'' وہ بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ ''لیکن اگر تم نے کسی کے سامنے کبھی یہ بات کہی تو میں مکر جاؤں گا۔''

''مجھے امید ہے کہ تم ایسا ہی کرو گے لیکن ڈاکٹر میکونی تمہارا ساتھ نہیں دے گا اور قصبے کے لوگ تمہارے مقابلے میں اس پر زیادہ بھروسے کرتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ڈاکٹر اس خط پر انحصار کررہا ہے جو تم اس رات لے کر اس کے پاس آئے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ یہ خط ظاہر کردے۔''

کڈ نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں نے اس کے چہرے کے سامنے کوئی خطرناک سانپ لہرادیا ہو۔ ہمارا شیرف سر سے پاؤں تک پسینے میں شرابور ہوچکا تھا۔

''تم کیا چاہتے ہو اسٹو کی...... پیسے؟ تم جانتے ہو کہ میری کیا کمائی ہے؟''

''مجھے تمہارے پیسے نہیں چاہئیں۔ یہاں تک کہ اس پنشن کا ایک چھوٹا سا حصہ بھی نہیں جس کے تم چند ماہ بعد حقدار ہوجاؤ گے۔''

''پھر تمہیں کیا چاہیے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اپنی صحت پر توجہ دو۔''

''اوہ! کیا تم مجھے جسمانی نقصان پہنچانے کی دھمکی دے رہو؟''

''بالکل نہیں۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنی خراب صحت کے بارے میں فیصلہ کرو جو تمہارے فرائض کی انجام دہی میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ قصبے کی بہتری اسی میں ہے کہ تم دوبارہ شیرف کے انتخاب میں حصہ نہ لو۔''

اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''پھر مجھے کسی بات کا اعتراف نہیں کرنا ہوگا؟''

''بالکل نہیں اور میں بھی اس بارے میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں نکالوں گا اور ڈاکٹر کی طرف سے بھی ضمانت دیتا ہوں کہ وہ خاموش رہے گا...... بشرطیکہ تم میرے کہنے پر عمل کرو۔''

''اگر میرا ذہن تبدیل ہوگیا تو کیا ہوگا؟''

میں اس امکان پر پہلے ہی غور کرچکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ایسی صورت میں ہم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکیں گے اور اس کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ تم دوبارہ منتخب نہیں ہوسکو گے بلکہ تمہیں پنشن سے بھی ہاتھ دھونا پڑجائیں گے۔

ووٹرز بھی تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے کہ تم نے ہوم کے کہنے پر یہ قبیح فعل سرانجام دیا تھا جبکہ وہ مرچکا ہے اور اپنا دفاع نہیں کرسکتا۔ میں نے سنا ہے کہ اس خدمت کے عوض اس نے تمہیں لائبریری اور مفت کلینک کے لیے بھاری رقم دی تھی۔''

وہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ میرے اور کڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوگیا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ فوسٹر قصبے میں واپس کیوں آیا تھا۔ میرے خیال میں وہ کسی اور مقصد سے نہیں بلکہ بدلہ لینے کی غرض سے آیا تھا اور اسے اپنے اندر ہمت پیدا کرنے میں بیس سال لگ گئے لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ہوم کا انتقال ہوچکا تھا پھر بھی اس نے تابوت پر گولی چلادی۔ بدلہ نہ لینے سے بہتر تھا کہ وہ اپنا غصہ اس طرح اتارے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سال چھ مہینے سے زیادہ زندہ نہیں رہے گا۔ اس سے پہلے کہ لوگ پکڑ کر اس کی تکا بوٹی ایک کردیتے، اس نے اپنے آپ کو بھی گولی ماری لی۔

البتہ یہ بات سمجھ سے بالاتر تھی کہ فوسٹر نے یہ اندازہ کیسے لگا لیا کہ اس کے پیچھے ہوم کا ہاتھ تھا جب تک کہ کڈ اسے نہ بتاتا اور یہ بعید از قیاس نہیں تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ کڈ کو اپنے کیے پر پچھتاوا ہورہا ہوگا اور اس نے روتے روتے سارا الزام کسی اور کے سر ڈال دیا ہوگا۔ شاید اس نے براہِ راست فوسٹر سے نہ کہا ہو اور کسی دوسرے ذریعے سے یہ بات اس تک پہنچادی ہو۔

وہ ہفتہ میرے لیے بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ میں مس پوک سے ملنے گیا تو وہ اپنے ٹٹو کو لے کر اصطبل سے باہر آرہی تھی۔ اس نے چہکتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگیا ہے۔ اس نے مجھے چکن سینڈوچ کی پیشکش کی جسے میں نے فوراً قبول کرلیا۔ آدھ گھنٹا بعد میں نزدیکی کیفے میں اس خوب صورت عورت کے ساتھ بیٹھا چکن سینڈوچ کھا رہا تھا جس پر میں عرصہ دراز سے فریفتہ تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے بھی اس سے بے نیازی برتی ہو اور اس کا رویّہ بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے تصور کی آنکھ سے آئندہ چند مہینوں میں اپنے آپ کو شیرف کی کرسی پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اگر قسمت نے یاوری کی اور میں مس ہیزلین پوک کو ترغیب دینے میں کامیاب ہوگیا تو منتخب نمائندہ ہونے کے ساتھ ساتھ مجھ پر شادی شدہ ہونے کا لیبل بھی لگ جائے گا اور یہ میرے لیے دُہری خوشی ہوگی۔

تاحدِ نگاہ اونچے، نیچے اور کچھ نوکیلے مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر جو صدیوں سے ایک ہی جگہ پڑے پڑے ..... جم کر پستہ یا بلند قامت مٹی کے انبار پہاڑ کے نام سے پکارے جاتے ہیں جو نہ صرف انسان کو ان کی اوقات سے آگاہ کرتے ہیں بلکہ اس پاک پروردگار کی شان میں تسبیح کرتے بھی محسوس ہوتے ہیں کہ دیکھو غرور اگر جچتا ہے، تو صرف اس ذات کو جس نے مٹی کو اتنا بلند کر دیا کہ نظر تھک جائے لیکن اس کی بلندی کم نہ ہو۔ ساتھ ہی ان عظیم الشان بلند مٹی سے بنے پہاڑوں کو صدیوں سے چلتی ہوا رفتہ بہ رفتہ، آہستگی سے کم و زیادہ کرتی جاتی ہے لیکن کسی کو احساس تک نہیں ہوتا۔ انہی کوہستانی سلسلے کے دروں میں بسنے والے چند خاندان بھی ہوتے ہیں جو نسل در نسل انہی دروں میں پیدا ہو کے مر جاتے ہیں۔ ان کی زندگی کتنی کٹھن اور مشکلات سے بھرپور ہوتی ہے، اس کا اندازہ مردوں کی بتدریج کمی سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے

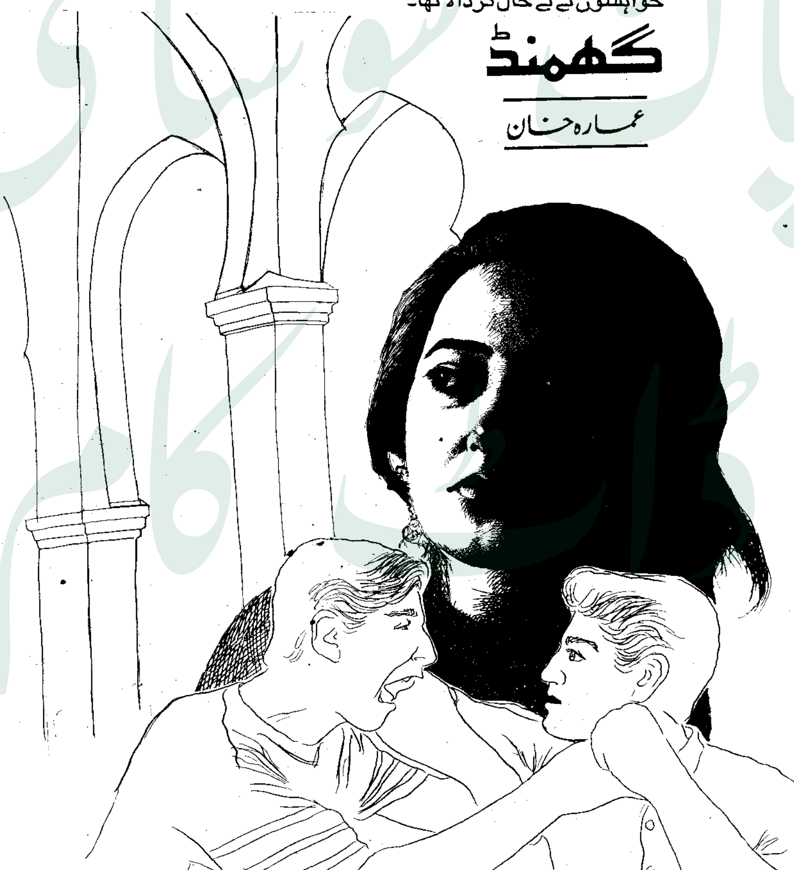
پہاڑی علاقے کی وجہ سے وسائل لوگوں کو میسر نہیں، جس کی

ایک چالاک اور کم ظرف کے پرفریب گھمنڈ کا قصہ

عزت اور دولت کسی ایک کی میراث کبھی نہیں رہی۔ البتہ قابلیت اور اہلیت انہیں اپنے دائرے میں قید کر لے تو اور بات ہے مگر... جب چھوٹے پیمانے کو زیادہ بھر دیا جائے تو آپ ہی چھلک جاتا ہے۔ یہی حال اس گھمنڈی انسان کا بھی ہوا جسے ضرورت سے زیادہ خواہشوں نے بے حال کر ڈالا تھا۔

گھمنڈ

عمارہ خان



بدولت ہر دوسرے گھر کا جوان ہونے والا مرد فوج میں جاتا ہے یا پھر کسی بھی بڑے شہر کی طرف مزدوری کے لیے نکل جاتا ہے۔ پیچھے بوڑھے، بچے اور عورتیں رہ جاتی ہیں۔

لیکن ترقی اور جدت نے ٹی وی اور موبائل کے ذریعے انٹرنیٹ تک پہنچ کر معلومات کے اضافے کے ساتھ تشنہ خواہشات کو پورا کرنے کی لگن نے مسائل بھی کھڑے کر دیے ہیں۔

اس چھوٹے سے درّے میں بھی جو جوان فوج یا شہر جانے سے رہ جاتے تھے، وہ باپ یا بھائیوں کے بھیجے ہوئے پیسوں سے اپنے اخراجات پورے کرنے کے ساتھ شوخی بھی دکھاتے تھے۔

جس مقام پر بسنے والوں کا متحرک رہنے کا دائرہ محدود ہو روزانہ سامنے آنے والی صورتیں ایک جیسی ہی ہوں، زیر گفتگو آنے والے موضوعات یکساں ہوں...... ایسے مقام، ایسے علاقے میں بسنے والے لوگوں پر یکسانیت طاری ہو جاتی ہے۔ سوچیں محدود، خواہشات کثیر ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ اپنے ہی ''گروہ'' میں نمایاں مقام حاصل کرنے کی خواہش کرنے لگتا ہے۔ یہ خواہش بھی انہونی کو بھی جنم دیتی ہے۔

ایسے ''محدود'' مقام پر رشک وحسد کا جذبہ بھی اپنی انتہا پر ہوتا ہے۔ ''محدود'' رشتوں ناتوں سے ہی دشمنی شروع ہو جاتی ہے۔ ''کوہستانیوں'' کی نسل درنسل کی دشمنیاں بھی شہرت رکھتی ہیں۔

شاداب خان بھی اسی طرح کے ایک کوہستانی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کے علاوہ یہاں کوئی روزگار نہیں تھا۔ پیدا ہو کر بالغ ہونے والے شہروں کا رخ کرتے تھے۔

سال کے سال گاؤں واپس آنے والے آتے تھے' پیچھے والوں کو ان ہی کی محدود خواہش کے مطابق کپڑا لتا دیتے تھے لیکن واپس بسنے کے لیے کوئی نہیں آتا تھا۔

ابھی شاداب خان صرف بارہ سال کا ہی تھا اور گاؤں کی ریت دیکھ رہا تھا۔ اس کے پڑوس کے چاچا بشام کا بڑا بیٹا شہر مزدوری کے لیے چلا گیا۔ پھر وہ جب بھی آتا تو بہت سارا سامان بھی لاتا تھا۔

چاچا بشام خان کے گھر اب ایک درجن چائنا کی پرچ پیالیاں بھی آ گئی تھیں جن پر بہت ہی خوبصورت سے پھول بوٹے سجے ہوئے تھے اور بہت سارے اسٹیل کے برتن بھی جمع ہو چکے تھے۔

خاص مہمانوں کے واسطے شیشے کی چھ پلیٹیں بھی چاچی کمرے میں سجا کر رکھتی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں دائیں طرف دیوار پر لکڑی کے دو فٹ چوڑے تختے کو کیلوں سے لگا کے اس پر اخبار کو جھالر کی طرح کاٹ کے بچھا رکھا تھا اور اس اخبار پہ خوب صاف کر کے سارے برتن ایسے رکھے تھے کہ آنے والوں کی پہلی نظر ان پر ہی پڑے۔

آرائش کی بہت سی چیزیں تھیں اور اجلی سی سفید لال پٹیوں والی خوب چمک والی شالیں بھی۔ کچھ وقت بعد ان کے گھر ٹی وی بھی آ گیا۔ بشام چاچا کے چھوٹے بیٹے عموماً مسواک منہ میں ڈالے قمیص کے نیچے سے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بتاتے رہتے تھے کہ بھائی نے اس مہینے بھی پیسے بھیجے ہیں یا فلاں سامان بھیجا ہے۔

شاداب خان گھر میں بڑا بیٹا تھا۔ اس لیے ان کے گھر باپ کی فوج کی طرف سے آنے والی تھوڑی سی پنشن ہی تھی۔ وہ بھی سوچتا تھا کہ جب بڑا ہو گا تو شہر مزدوری کے لیے جائے گا اور گھر والوں کو پیسے بھیجے گا۔ فارغ وقت میں اپنے چھوٹے سے گھر کا جائزہ لے کے خیالی پلاؤ پکانا اس کا مرغوب مشغلہ بن چکا تھا۔

ماں اس جگہ ٹی وی رکھے گی اور چاچی کی طرح برتن کی نمائش اس دیوار پہ تختے لگا کے کرے گی۔ ماں کو چائنا کی پیالیوں کا سیٹ اور چھوٹے بہن بھائیوں کو ٹی وی خرید کے دینا اس کا اولین خواب تھا۔

پھر وہ پندرہ برس کی عمر میں ہی شہر کی طرف چل دیا۔ شہر میں اسے گاؤں کے جاننے والے نے سبزی منڈی میں مزدوری پر لگوا دیا۔ وہ پھلوں سبزیوں کی پیٹیاں اور بوریاں لادنے، اتارنے کا کام کرنے لگا۔

روز کی دہاڑی جمع کر کے اس نے پہلے اپنا ٹھیلا لگانے کا سوچا اور پھر آڑھتی سے مال لے کر اس پہ عمل بھی کر ڈالا۔ خوب کمائی شروع ہو چکی تھی پھر اسے منڈی میں ہی نئی تعمیر ہونے والی دکانوں میں سے ایک دکان مل گئی تو اس کے کام میں مزید بہتری آ گئی۔

تعلیم اس کی واجبی سی ہی تھی۔ مسجد میں موسم گرما میں آنے والے قاری صاحب سے اس نے قرآن پڑھنا سیکھ لیا تھا اور روزانہ پانچ میل کی مسافت پر بنے اسکول سے اس نے پانچ جماعتیں بھی پڑھی ہوئی تھیں اسی لیے حساب کتاب میں کوئی اسے زیادہ چونا نہیں لگا سکا۔

شہر آنے کے بعد سات آٹھ سالوں میں ہی اس نے اتنی ترقی کی کہ وہ اسی سبزی منڈی میں ایک معروف آڑھتی بن چکا تھا۔ گاؤں سے اس کے پاس آنے والوں کو بھی اس نے اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا۔ اس کے پاس اب پچیس تیس ملازم ہوتے تھے۔ اب اس کے پاس گزارے لائق اپنی گاڑی بھی تھی۔

ایک دن اس کے گودام کے سامنے اسی کے علاقے

کے ایک شخص نے ریڑھی لگا کر اس کے آنے جانے کی راہ میں رکاوٹ ڈالی اور اس کے کہنے کے باوجود ریڑھی ہٹانے کے بجائے مزید بدتمیزی کی جس کی وجہ سے اس نے غصے میں آ کے اس شخص پہ ہاتھ اٹھالیا۔

وہ شخص نیا ہونے کے ساتھ اکیلا بھی تھا، اسی لیے تشدد کا سامنا کر کے خاموشی سے جگہ چھوڑ گیا کیونکہ شاداب کے پاس اپنے ہی علاقے کے بندوں کا بہت بڑا گروہ جمع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا رعب بھی تھا اور اس کے علاقے کے ملازم بھی اس کی چاپلوسی کی حد تک عزت کرتے تھے۔ ایک شخص پر تشدد کرنے کی وجہ سے لوگ اس سے دبنا شروع ہو گئے تھے۔

اس کے گوداموں کے آس پاس ریڑھیاں کھڑی کرنے والے اور رات کو انہی ریڑھیوں پر بستر بچھا کر سونے والوں نے خود بخود ہی اس کے بندوں کے ذریعے ایک دوبار کچھ پیسے دے کر اس سے اجازت مانگی تو اس نے بھی کچھ سوچے سمجھے بغیر پیسے لے کر جیب میں ڈال لیے اور اجازت دے دی۔

اس کے ساتھ ہی ایک نظام سا بنتا چلا گیا۔ اسے ہر ریڑھی والا ''ماہانہ'' دینا شروع ہو گیا اور اس نے بھی اسے اپنا جائز حق سمجھنا شروع کر دیا۔ بعض اوقات کوئی ریڑھی والا مزدور ''ماہانہ'' نہیں دیتا تو وہ اپنے بندے لے جا کر اسے... زدوکوب کرتا۔

کاروبار کے ساتھ ''ماہانہ'' بھی ملنے سے پیسا تو اس کے پاس بہت کم عرصے میں بے تحاشا آ گیا تھا لیکن اب اس پر اپنی دہشت نما شہرت و ناموری کا عجیب سا نشہ طاری رہنے لگا تھا۔

ایک دن پھر اس کے گودام کے سامنے پھلوں کی ریڑھی کھڑی تھی اور اس کے ملازم جو اب اسلحہ بھی نمائش کے لیے ساتھ رکھتے تھے، انہوں نے بتایا کہ نیا بندہ ہے اور ابھی ماہانہ بھی نہیں دیتا۔

وہ ریڑھی والے کے پاس گیا اور اسے گالی دے کر ریڑھی ہٹانے کا اور اس علاقے میں ریڑھی لگانے کی صورت میں ماہانہ دینے کا کہا۔

ریڑھی والا بھی ''کوہستانی'' تھا۔ اس نے کہا نہیں دیتا، جواباً گالی بھی دے دی۔

اس کے تکبر کو بہت بڑی چوٹ لگی اور وہ بلبلا اٹھا۔ وہ دھاڑا اور اپنے ملازموں کو ریڑھی والے کو پکڑنے کا حکم دیا۔

ریڑھی والے کے پاس پستول تھا۔ وہ اس نے تان لیا اور کہا اسے تنگ نہ کیا جائے۔

شاداب کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ اس کے ملازموں نے بھی گنیں تان لیں۔ وہ سینہ تان کر ریڑھی والے کے سامنے گیا اور کہا۔

''مرد کا بچہ ہے تو گولی چلا کر دکھا۔''

ریڑھی والے نے اسے کہا..... ''گولی ماردوں گا ورنہ اپنی راہ پکڑ!''

لیکن وہ باز نہ آیا اور غصے سے گالم گلوچ کرتے ہوئے پھر بولا۔

''مرد کا بچہ ہے تو گولی چلا کے دیکھ..... میرے بندے تیرا کیا حشر کرتے ہیں۔''

ریڑھی والے نے اسے دیکھا اور اس کے بندوں کو دیکھا۔

پستول کا رخ اس کی پیشانی کی طرف کیا اور ٹریگر دبا دیا...

اس کا بھیجا اڑ کر سڑک پر پھیل گیا۔

ملازم حق دق کھڑے رہ گئے۔

ریڑھی والے نے سوالیہ نظروں سے ''ملازموں'' کی طرف دیکھا۔ سب خاموشی سے کھڑے رہے۔

ریڑھی والے نے آرام سے اپنی چادر اٹھائی، جھٹکے سے جھاڑا اور خاموش کھڑے تماشائیوں کے بیچ میں سے راستہ بناتے ہوئے ہجوم میں غائب ہو گیا۔

''پیسا'' دینے والا اور ''پیسے'' والا ہی نہیں رہا تو ''ملازم'' کس کی خاطر اور کیوں قتل کرتے؟ لاش وہیں پڑی رہی اور ہجوم کے ساتھ، ملازم بھی رفتہ رفتہ بھیڑ کا حصہ بن گئے۔

شاداب کی ادھ کھلی آنکھیں شاید یہ سوچ رہی تھیں کہ اسے کسی نے کیوں نہیں بتایا تھا کہ دنیا میں سیر پر سوا سیر لازمی ہوتا ہے؟ اسے کسی نے کیوں نہیں بتایا تھا کہ خدا جب رزق حلال دے تو عاجزی، انکساری اور شکر گزاری اختیار کرنی چاہیے اور جب خدا رزق میں فراوانی عطا فرمائے تو اچھائی، نیکی، شرافت میں ناموری کی کوشش کرنی چاہیے۔

سڑک پر لحہ بہ لحہ شاداب کا پھیلا خون بھی ہر ایک سے پوچھتا نظر آ رہا تھا..... کسی نے شاداب کو کیوں نہیں بتایا تھا کہ جب دنیا کی پُرہجوم راہوں سے گزر ہو تو ''کہنیاں'' اٹھا کر چلنے سے دنیا والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور خدا نے دوسروں کو بھی ''کہنیاں'' دی ہوئی ہیں۔ کوئی دوسرا بھی ''کہنیاں'' اٹھا سکتا ہے۔ ''کہنیاں'' اٹھانے والوں کے لیے ہی ''کہنیاں'' اٹھتی ہیں۔ ہتھیار، ہتھیار... والوں کے خوف سے ہی بکتے ہیں مگر جب نفس کی الجھی ڈور میں مزید گرہیں لگ جائیں تو اس کی کمزوری بڑھتی جاتی ہے۔ جسے انسان غفلت میں طاقت سمجھ بیٹھتا ہے۔



محفلِ شعر وسخن

❄ جاوید اختر رانا......پاکپتن شریف

سودا چمن کا جب ہوا گل ہی گنے گئے
خود کو بہت سمجھتی تھیں سرخاب تتلیاں

❄ ایس سجاد.....اوکاڑہ

تہوار سزا بن جاتے ہیں
ایک تیرے نہ ہونے سے

❄ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان .....فورٹ عباس

ہر شخص اپنے اپنے غموں میں ہے مبتلا
زنداں میں اپنے ساتھ رلائیں کسی کو کیا

❄ ملک محمد ظفر اللہ......راجن پور

صبح مغرور کو وہ شام بھی کر دیتا ہے
شہرتیں چھین کے وہ گمنام بھی کر دیتا ہے
وقت سے آنکھ ملانے کی جرأت نہ کرو
وقت انسان کو غلام بھی کر دیتا ہے

❄ رمضان پاشا......گلشن اقبال کراچی

خدا پرستوں میں مسلک کی جنگ جاری ہے
صفِ بتاں میں مگر کوئی انتشار نہیں

❄ روا جاوید......بٹل ہزارہ

گنوا چکی ہے محبت بھی اپنی بینائی
کسی کو بھیجو کہ یوسف کا پیراہن لائے

❄ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ......خانیوال

مدت کے بعد جو اس نے آواز دی مجھے
قدموں کی کیا مجال تھی سانسیں بھی رک گئیں

❄ ملائکہ حریم ......حجرہ شاہ مقیم

سرد سرد موسم میں زرد زرد ہونٹوں پر
چپ کا جو پہرا ہے، یہ بھی جرم ٹھہرا ہے

❄ داؤد اشفاق ......حجرہ شاہ مقیم

تم نے چکھی ہی نہیں ہجر کی سوغات کبھی
تم پہ گزرے نہیں موسم، وہ سزاؤں والے

❄ ماہین فاطمہ ......حجرہ شاہ مقیم

میری جگہ پہ کوئی اور ہو تو چیخ اٹھے
میں اپنے آپ سے اتنے سوال کرتا ہوں

❄ اشفاق شاہین......لاہور

بچھڑ چلا ہے تو میری دعا بھی لیتا جا
وہاں وہاں مجھے پائے، جہاں جہاں تو جائے

❄ ادریس احمد خان......ناظم آباد کراچی

نینداس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں

❄ محمد رشید سیال......روہڑی، سکھر

عجب ہے رات سے ان آنکھوں کا عالم
یہ دریا رات بھر چڑھتا رہا ہے

❄ وقاص احمد......چنیوٹ

اسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں ہوا جب رقص کرتی ہے

❄ خلیق الرحمان......پشاور

وہ اشک بن کے میری چشم نم میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

❄ محمد اشفاق سیال......شورکوٹ، سٹی

کس کو فرصت کہ دھواں دیکھنے جائے محسن
جھونپڑی شہر سے کچھ دور جلی ہے اب کے

❄ ریاض بٹ......حسن ابدال

تم سادہ مزاجی سے مٹے جاتے ہو جس پر
وہ شخص تو دنیا میں کسی کا بھی نہیں ہے

❄ ناہید یوسف......اسلام آباد

وہ تو کچھ ہوگئی ہے تم سے محبت ورنہ
ہم وہ خود سر ہیں کہ اپنی بھی تمنا نہ کریں

❄ جبین شہباز......نواب شاہ

اک جنبشِ نگاہ کی ہے منتظر بہار
پلکیں اٹھا کے موسم گل کو صدا بھی دو

❄ شہانہ فیض......ٹنڈوالہیار

پھر پلٹ آئی ہیں ساون کی سہانی راتیں
پھر تیری یاد میں جلنے کے زمانے آئے

❄ وقار عزیز......ملتان

میرے چہرے پہ غزل لکھی گئیں
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اس کی

❄ ثنا صادق......کراچی

آنکھوں کا ہے قصور کہ عکسِ جمال ہے
آتی ہے کیوں نظر تیری صورت جگہ جگہ

❄ زرین آفریدی......حیدرآباد، سندھ

غم ہائے روزگار میں الجھا ہوا ہوں میں
اس پر ستم یہ ہے اسے یاد آ رہا ہوں میں
ہاں اس کے نام میں نے کوئی خط نہیں لکھا
کیا اس کو یہ لکھوں کہ لہو تھوکتا ہوں میں

❄ نوشتہ گلزار......بھکر

ہے مجھ پر طعنہ زن خود مرا احساس
تمنا اپنی قیمت کھو رہی ہے
کہوں کیا ہر پلک اس بے خبر کی
مری آنکھوں میں کانٹے بو رہی ہے

❄ زویا علی......سکھر

اپنے ہاتھوں اجڑ رہا ہے چمن
دلِ ماشاد و چشم ما روشن
اب خزاں کو نہ دے کوئی الزام
جل رہا ہے بہار میں گلشن

❄ فیاض خان......اوکاڑہ

ہمارے زخمِ تمنا پرانے ہو گئے ہیں
کہ اس گلی میں گئے اب زمانے ہو گئے ہیں
تم اپنے چاہنے والوں کی بات مت سنو
تمہارے چاہنے والے دِوانے ہو گئے ہیں

❄ میمونہ خان......منڈی بہاؤالدین

یہ تو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے میعادِ ستم
جُز حریفانِ ستم کس کو پکارا جائے
وقت نے ایک ہی نکتہ تو کیا ہے تعلیم
حاکمِ وقت کو مسند سے اتارا جائے

❄ کہکشاں انور......جھنگ سٹی

امامِ شہر سے پوچھ اس نمازِ خوف کا حال
کیا تھا جس کے لیے خون سے وضو ہم نے

❄ ناظر علی......کراچی

یہ کیا انداز ہے اے نکتہ چینو
کوئی تنقید تو بے لاگ نکلے
پلایا تھا ہمیں امرت کسی نے
مگر منہ سے لہو کے جھاگ نکلے

❄ عظیم احمد......میرپورخاص

ہے زمانہ میرے حق میں بے نوید
میں ہوں اپنی آرزوؤں کا شہید

❄ امتیاز احمد......پھالیہ

آرزو کے کنول کھلے ہی نہ تھے
فرض کر لو کہ ہم ملے ہی نہ تھے

❄ مہوش خان......حیدرآباد
دل میں کھلی ہوئی ہیں دکانیں خیال کی
تازہ حسابِ دست و گریباں ہے خواب خواب
❄ منیر شگفتہ......وہاڑی
اب جو ڈر ہے مجھے تو اس کا ہے
اندر آ جائیں گے وہ اندر سے
❄ مہتاب احمد......حیدرآباد
اے مسیحا ترے دکھ سے ہے سوا دکھ کس کا
کس سے پوچھوں، ترے بیمار کہاں ہیں جانے
❄ عاطف علی......میرپور خاص
میں تو سودا لیے پھرا سر میں
خاک اڑتی رہی مرے گھر میں
❄ سلیم قادر......میانوال رانجھا
تنہائی کا اک جنگل ہے سناٹا ہے اور ہوا
پیڑوں کے پیلے پتے ہیں نغمہ سرائے شامِ خزاں
❄ شاہد علی......فیصل آباد
شہرِ وفا میں ہر طرف سودوزیاں کا ہے شمار
لائیں گے اب کہاں سے ہم کوئی مثال شہر میں
❄ عاصمہ احمد......سیالکوٹ
اب یہی طے ہوا کہ ہم تجھ سے قریب تر نہیں
آج ترے تکلفات دل پہ گراں گزر گئے
❄ عینی سہیل......کراچی
اب اس متاعِ رنگ کا اندازہ کیجیے
شوقِ طلب سے جس کے خریدار سرخ ہیں
❄ ارم خان......کوئٹہ
لڑکھڑاتے گنگناتے جھومتے گاتے ہوئے
بے خودی کی آخری حد تک چلے جایا کریں
❄ اسلم خان......بہاولپور
یوں مجھے بھیج کے تنہا سرِ بازارِ فریب
کیا مرے دوست مری سادہ دلی بھول گئے

❄ سائرہ نواب......پشاور
ستم شعار نے خود کتنے زخم کھائے ہیں
کبھی شمار تو کرنا شمار میں کیا ہے
❄ اسد خان......مانسہرہ
کیا ہے گر زندگی کا بس نہ چلا
زندگی کب کسی کے بس میں ہے
❄ انعم کمال......حیدرآباد
ہم کو مٹا نہ دیں یہ زمانے کی مشکلیں
لیکن یہ مشکلیں تو ہزاروں کے ساتھ ہیں
❄ سلیم احمد......ملتان
وحشت میں کچھ خبر ہی نہیں کیا لکھا گیا
اوراقِ چند صبح سے کالے ہوئے تو ہیں
❄ نوید ممتاز......سکھر
اسے دیکھ زمانے بھر کا یہ چاند
ہماری چاندنی سائے کو ترسے
❄ عمران شیروانی......حیدرآباد
جنھوں نے خود ہی بگاڑا ہے اپنے شہروں کو
وہ لوگ آئینہ خانے تلاش کرتے ہیں
❄ آمنہ عمران......لاہور
دنیا تباہ کر کے ہوش آگیا ہے دل کو
اب تو ہماری سن لو اب ہم سدھر چلے ہیں
❄ فریال احمد......بہاولنگر
وہ میرا ایک گمان کہ منزل تھا جس کا نام
ساری متاعِ شوقِ سفر اس میں گم ہوئی
❄ آسیہ علی......سرگودھا
مجھ سے کہتی تھیں وہ شراب آنکھیں
آپ وہ زہر مت پیا کیجیے
❄ شاہین تبسم......کراچی
فکرِ ایجاد میں گم ہوں مجھے غافل نہ سمجھ
اپنے انداز پر ایجاد کروں گا تجھ کو

کوپن برائے شمارہ ستمبر 2017

محفلِ شعر و سخن

نام : ------------------------------------

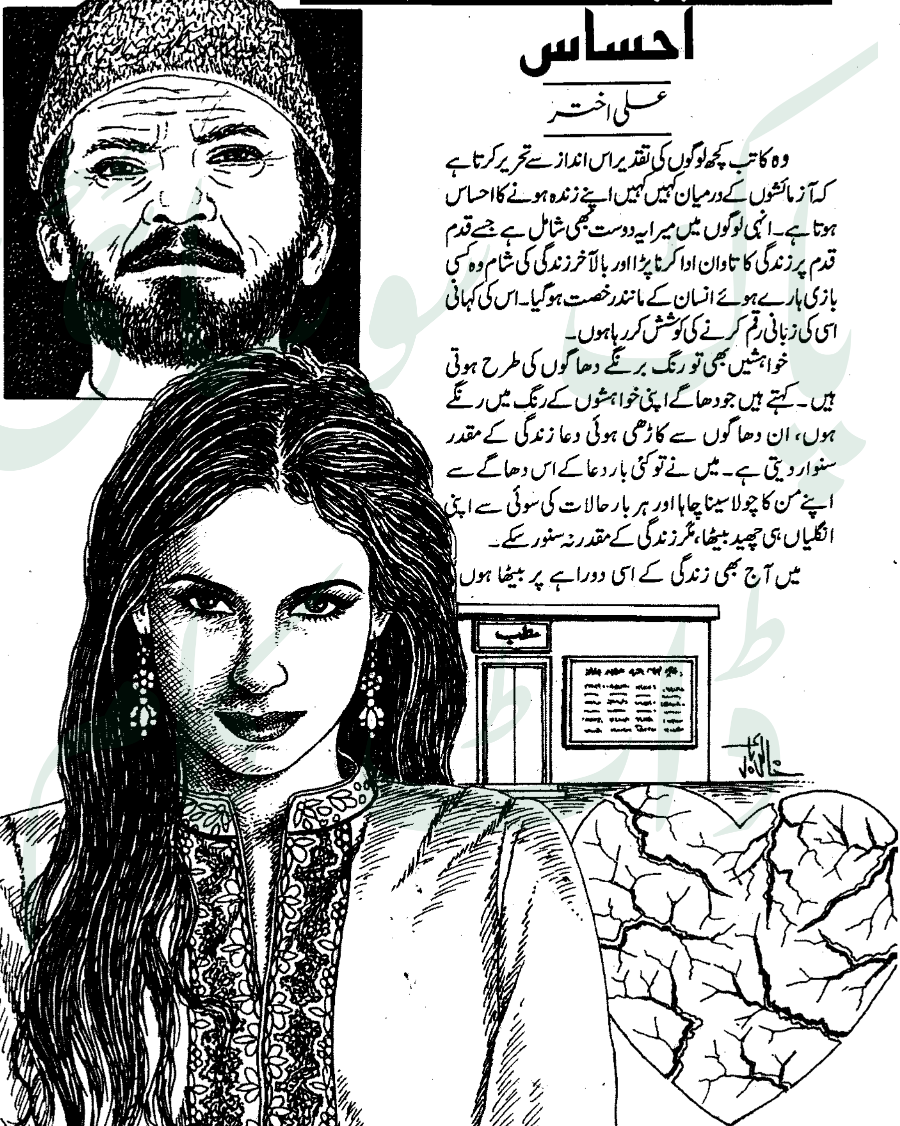
پتا : ------------------------------------

بعض اوقات ہم سے بہت بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا۔ قصور کسی کا اور خمیازہ کسی اور کے حصے میں آتا ہے اور اس زیادتی کا سبب بننے والے گناہ گار کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دانائی اور ہوشیاری سے کسی کے احساسات سے کھیلنے کا عمل جاری رکھے ہوئے ہے۔ حتیٰ کہ جان سے گزر جانے پر بھی اس کی قدر نہیں ہو پاتی... وہ بھی اس بے حسی کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔

ایفائے عہد میں پل پل آزمائشوں سے گزرنے والے تعلق کا احوال

احساس

علی اختر



وہ کاتب کچھ لوگوں کی تقدیر اس انداز سے تحریر کرتا ہے کہ آزمائشوں کے درمیان کہیں کہیں اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ انہی لوگوں میں میرا یہ دوست بھی شامل ہے جسے قدم قدم پر زندگی کا تاوان ادا کرنا پڑا اور بالآخر زندگی کی شام وہ کسی بازی ہارے ہوئے انسان کے مانند رخصت ہو گیا۔ اس کی کہانی اسی کی زبانی رقم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

خواہشیں بھی تو رنگ برنگے دھاگوں کی طرح ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں جو دھاگے اپنی خواہشوں کے رنگ میں رنگے ہوں، ان دھاگوں سے کاڑھی ہوئی دعا زندگی کے مقدر سنوار دیتی ہے۔ میں نے تو کئی بار دعا کے اس دھاگے سے اپنے من کا چولا سینا چاہا اور ہر بار حالات کی سوئی سے اپنی انگلیاں ہی چھید بیٹھا، مگر زندگی کے مقدر نہ سنور سکے۔

میں آج بھی زندگی کے اسی دوراہے پر بیٹھا ہوں

جہاں برسوں پہلے بیٹھا تھا۔ اسی طرح محبت کے لیے ترسا ہوا جیسے بچپن سے لے کر اب تک رہا ہوں لیکن ٹھہریے میں آگے بڑھنے سے پہلے اپنا تعارف کروا دوں۔ میرا نام یوسف ہارون ہے۔ میرے والد ہارون الرشید تھے۔ زندگی رینگ رینگ کر گزر رہی تھی کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اپنے تین بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے بڑا ہوں مگر جب والد فوت ہوئے تو میرے شعور کا کچا پکا زمانہ تھا۔ میرے لیے یہ حادثہ ناقابلِ برداشت تھا۔ میرے اردگرد جمع ہونے والے عزیز و اقارب جب میرے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتے۔ ''گھبرانا نہیں۔ ہم ہیں نا...... حوصلے سے کام لینا۔ یہ مت سمجھنا کہ تم یتیم ہو گئے ہو۔ تم ہی اب اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے وارث ہو۔'' تو میں ان سب کی طرف حیرت سے خالی خالی نظروں سے یوں دیکھنے لگتا جیسے کسی نے مجھے ویرانے میں بھٹکنے کے لیے تنہا چھوڑ دیا ہو...... والد کی وفات کے بعد ماموں نے ہماری کفالت کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی مگر وہاں بھی غربت کی گھنی چھاؤں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا یہ بہتر سمجھا گیا کہ مجھے نانا جی کی دکان پر بٹھا دیا جائے۔ اس وقت تک میں نے جیسے تیسے آٹھویں جماعت پاس کر لی تھی۔ اس سے آگے پڑھنا میرے کنبے کی بساط سے باہر تھا۔ چنانچہ مجھے نانا جی...... جو اپنے علاقے کے نامور معالج تھے، ان کی دکان پر بھیجنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میں صبح سورج نکلنے سے پہلے ان کی دکان پر چلا جاتا اور عشا کی نماز تک بغیر کسی ہفتہ وار چھٹی کے وہاں ڈیوٹی دینے لگا۔

جیسے جیسے میرا ذہن پختہ ہونے لگا، مجھے اس بات کا شدت کے ساتھ احساس ہونے لگا کہ میرا رجحان حکیم حاذق بننا نہیں۔ مجھے تو الیکٹرونکس کا کام اچھا لگتا تھا مگر یہاں مسئلہ پیٹ پالنے کا تھا۔ انکار کی جرأت کیسے کرتا۔ مجبوراً مجھے حکمت کرنا پڑ رہی تھی پھر نانا جی کا محبت بھرا اصرار کہ میں ان کے بعد دکان کا وارث اور ان کی تمام حکمت سنبھالنے والا تھا۔ اس کا اظہار وہ اٹھتے بیٹھتے کرتے رہتے تھے۔

''یوسف پتر...... دھیان سے کام سیکھ لے۔ میرے مرنے کے بعد تم نے ہی یہ دکان اور کاروبار سنبھالنا ہے۔''

اور میں ایک اداس سی ہنسی ہنس دیتا۔ مختلف جڑی بوٹیوں کی کٹائی اور چھنائی کر کے ادویات تیار کرتا اور جب کبھی نانا جی دکان پر نہ ہوتے تو کچھ مریضوں کو ادویات بھی دے دیتا۔ رفتہ رفتہ مریضوں کا اعتماد مجھ پر بھی بیٹھتا چلا گیا اور یوں میں نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑا تھوڑا حکیم بنتا چلا گیا مگر تقدیر...... وہ تو الگ کھڑی مجھ پر ہنس رہی تھی اور ایک اداس دن نانا جی کا انتقال ہو گیا۔ حالات نے ایک دم یوں اپنا رخ بدلا کہ میں حیران ہو کر رہ گیا۔ میں تو اپنے مستقبل کو سنوارنے کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن قدرت نے بازی ہی پلٹ کر رکھ دی۔

نانا جی کے انتقال کو ابھی چند ہی روز ہوئے تھے، جب ماموں صاحبان نے دکان سنبھال لی اور بے روزگاری کی دلدل میں ایک بار پھر سے میں اکیلا رہ گیا۔ شاید میں کہیں کچھ بھول گیا ہوں۔ جب میں نے آٹھویں کلاس پاس کر لی تو میری شادی اقرا سے کر دی گئی تھی۔ اقرا کے والد رشتے میں میرے خالو لگتے تھے اور وہ عرصہ دراز سے مختلف بیماریوں کی زد میں تھے۔ ایک تو بیماریاں اوپر سے بڑھاپے کی طرف بڑھتی عمر...... ان کی خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی خوشی تو دیکھ لیں پھر پتا نہیں کس موڑ پر زندگی ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ ان کی یہی خواہش ایک سوالی کی طرح ایک روز ہمارے گھر کی دہلیز پر پہنچ گئی تو اماں جان کے من میں بھی بہن کی محبت نے بڑی شدت سے انگڑائی لی اور یوں مجھے کم سنی ہی میں شادی کے بندھن سے باندھ دیا گیا۔ میری اس شادی پر سارے رشتے دار اور عزیز معترض تھے مگر خوشیوں کی طلب اور خالو جان کی مسلسل علالت نے دونوں خاندانوں کو خود غرض بنا دیا تھا اور اس خود غرضی کی صلیب پر مجھے لٹکا دیا گیا تھا۔ میں اگر اکیلا ہوتا تو ممکن تھا کچھ عرصہ اپنی بے روزگاری کو طوعاً و کرہاً برداشت کر لیتا مگر اب میری ذمے داری اور زیادہ بڑھ چکی تھی۔ ہمارے گھر میں جہاں پہلے ہی زیادہ افراد تھے، ایک فرد کا اس میں اور اضافہ ہو چکا تھا۔ اقرا میرے خالو جان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو میری سوچوں سے بھی بڑھ کر خوب صورت تھی۔ بڑی بڑی موٹی آنکھیں، ستواں ناک اور سیندور ملے میدے کی طرح رنگت......

خوبصورتی ہر انسان کی فطری کمزوری ہوتی ہے۔ اقرا میرے گھر آئی تو میں اپنے آپ کو ان خوش بخت انسانوں میں سے ایک سمجھنے لگا تھا جن کے من کی مرادیں قدرت از خود پوری کر دیتی ہے مگر میری یہ خام خیالی جب حقیقت میں بدلی تو مجھے احساس ہوا کہ میرا یہ سوچنا کس قدر غلط تھا۔ اقرا والدین کی آخری اولاد ہونے کے ناتے اپنے والدین کے بے جا لاڈ پیار سے انتہائی خود سر، ضدی اور خود پسند ہونے کے ساتھ ساتھ گھریلو کاموں میں بھی پھوہڑ ثابت ہوئی۔ وہ پڑھی لکھی بھی نہ تھی۔ خالو جان اپنے علاقے کے انتہائی معزز جانے پہچانے خطیب اور امام مسجد تھے۔ اردگرد اور محلے کے لوگ ان کی بے انتہا عزت کرتے تھے۔ آخری اولاد ہونے کی وجہ سے وہ اقرا کی ہر

جائز وناجائز خواہش کے آگے سر جھکائے رہتے تھے۔ اقرا کی والدہ نے اسے وقت سے بہت پہلے اس کی خوب صورتی سے آگہی دلادی تھی۔ وہ میرے گھر آئی تو اسے اس بات کا شدت سے احساس تھا کہ وہ بے حد خوب صورت ہے۔ اس کے ملنے جلنے والوں اور خاص طور پر خاندان کے لڑکوں نے اس کے اس احساس کو اور بھڑکا دیا تھا۔ اس کا احساس مجھے جلد ہی ہوگیا تھا پھر ایک روز باتوں باتوں میں اماں جان نے یہ انکشاف کیا کہ خالو کی پہلی بیوی قیام پاکستان کے ہنگاموں میں قتل ہوگئی تھی۔ لہٰذا ان کی دوسری شادی اماں کی بڑی بہن ہاجراں سے کردی گئی۔ ہاجراں کا شوہر بھی ہجرت کے وقت شہید کردیا گیا تھا۔ خالو جان کے ساتھ ہاجراں کی شادی بھی زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی کیونکہ دو سال بیمار رہنے کے بعد وہ بھی وفات پاگئیں۔ خالو نے ان کی تیمارداری میں دن رات ایک کردیے تھے۔ ان کی خدمات اور خلوص ومحبت کی بدولت خاندان کے سبھی لوگ خالو جان کے گرویدہ ہوچکے تھے۔ چنانچہ اسے دیکھتے ہوئے نانا نے اپنی دوسری بیٹی خورشید کے ساتھ خالو کا نکاح کرنے کی ہامی بھرلی۔ اماں کی یہ بہن خالو سے عمر میں کہیں چھوٹی تھی۔ خاندان بھر نے اس شادی پر اعتراض کیا مگر اماں کے بڑے بھائی نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا اور خالہ کی شادی خود اپنے سر لے کر خالو سے کردی۔ حالانکہ ان کی اور نانا کی ساری عمر نہ بن سکی تھی مگر خالو جان تمام عمر بڑے ماموں کے اسی وجہ سے احسان مند رہے۔

اپنی عمر سے انتہائی چھوٹی ہونے کی وجہ سے خالہ نے خالو جان کو اپنا اس قدر گرویدہ بنالیا کہ خالو جان ان کی ہر بات کو ایک حکم کا درجہ دینے لگے تھے۔ اس کی وجہ وہ احساس بھی تھا کہ خالہ عمر میں ان سے بہت چھوٹی ہیں۔ خالو جان نے اپنی محبتوں کے سارے سوتے ان پر نچھاور کر ڈالے تھے۔ انہیں امامت کے علاوہ اور کام بھی کیا تھا۔ مسجد میں جاکر پانچوں وقت کی نماز پڑھاتے اور پھر خورشید بی بی (میری خالہ) کی ہر طرح دلجوئی میں لگے رہتے۔ یہاں تک کہ گھر میں عورتوں والے کام کاج بھی بخوشی خود ادا کرنے لگے تھے۔ شادی کے دو سال بعد اقرا پیدا ہوئی تو خالو جان کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔

بڑھاپے کی اولاد تو ہوتی ہی پیاری ہے۔ ایک تو آخری عمر میں اقرا کی پیدائش اور اوپر سے خوب صورتی بھی اس پر ٹوٹ کر آتی تھی۔ تبھی اس کے ناز نخرے میں عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا۔ بتانے والے گواہی دیتے تھے کہ اگر رات کے کسی پہر اقرا... کسی چیز کی فرمائش کردیتی تو اس کی ضد اس وقت تک قائم رہتی جب تک وہ اسے حاصل نہ کرلیتی۔ خالو جان اس کی ضد پوری کرنے کے لیے راتوں کو اٹھ اٹھ کر محلے کے دکانداروں کو سوتے سے جگا کر ان کی دکان کھلوانے اور اقرا کی فرمائش پوری کرنے کو اپنا پیار سمجھتے تھے۔ اس طرح اقرا کی خودسری اور خود پسندی بڑھتی چلی گئی۔ اس کے مقابلے میں...... میں ٹھہرا...... ایک حساس، یتیمی اور رشتے داروں کے احسانوں تلے دبا ہوا عام سا انسان...... جسے حالات کے تھپیڑوں میں قدرت نے بے یار و مددگار چھوڑ دیا تھا جو ہر لمحہ دوسروں کی محبت بھری نظروں اور ہمدردی کا طلب گار رہا۔

اقرا...... میری بیوی کی حیثیت سے جب میرے گھر آئی تو میں نے جانا کہ میری تنہائیوں کا ایک ساتھی مجھے مل گیا ہے جو کم مائیگی کے دنوں میں میرا ساتھ دے گی۔ یقیناً یہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح اپنے من میں محبتوں اور خوشیوں سے میرے گھر کو جنت رنگ بنادے گی۔

مگر وقت کے ساتھ ساتھ میری یہ آرزو دم توڑنے لگی۔ کیونکہ اقرا نہایت اکھڑ مزاج، خودسر اور خود غرض لڑکی ثابت ہوئی۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار رہتی تھی۔ اسے اپنے بے حد خوب صورت ہونے کا احساس ہر قدم پر ہوتا اور اپنا سارا وقت سجنے سنورنے میں گزار دیتی۔ بات بات پر ناراض ہونا اور اپنی مخالفت میں کی ہوئی ہر بات کو اپنی ضد بنا کر ہنگامہ کھڑا کرنا اس کے لیے معمولی بات تھی، جبکہ میں پیار کا متقاضی...... محبتوں کو ترسا ہوا...... اپنے دل ہی دل میں اقرا کے رویے سے دل برداشتہ ہونے لگا تھا۔ پہلے پہل میرا خیال تھا کہ ہر لڑکی جب اپنے میکے کو چھوڑ کر سسرال میں آتی ہے تو اسے یکسر بدلے ہوئے ماحول کو اپنانے میں وقت لگتا ہے۔ ایسے ہی اقرا کے ساتھ بھی ہوا ہوگا اور وہ جلد ہی اس ماحول کو اپنالے گی۔ لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، اس کی ہٹ دھرمی ختم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ شاید اقرا کو یقین تھا کہ اس کی خوب صورتی اس کی زندگی کی دوسری کمیوں کو پورا کردے گی مگر یہ بھی اس کی خام خیالی تھی۔ خوب صورتی زمانے کی آنکھوں کو بھلی ضرور لگتی ہے مگر حقیقی حسن خوب سیرتی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ آہستہ آہستہ میرے گھر میں اب جھگڑے سر اٹھانے لگے تھے۔ ایک تو میں خود بے روزگار تھا۔ نوکری تلاش کرنے صبح گھر سے نکل جاتا اور جب مسلسل ناکامی کی دھول اوڑھے گھر میں داخل ہوتا تو یہاں چھوٹی چھوٹی باتوں کو انا کا مسئلہ بنا کر جھڑپیں ہونے

لگتیں۔ اقرا ہمیشہ اپنی عادت سے مجبور ہو کر ایسی باتوں کی کھوج میں رہتی جس سے کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا ہو سکے۔ میں تھکا ہارا گھر آتا تو اماں جان اور بہنوں کی طرف سے اقرا کی شکایتوں کا انبار میرے سامنے رکھ دیا جاتا۔ آہستہ آہستہ اقرا کے رویّے کی کہانیاں ہمارے گھر کی دیواروں سے نکل کر دوسری زبانوں تک پہنچنے لگیں۔ میں نے ایک دوبار اقرا کے رویّے کی شکایت خالو جان سے بھی کی۔ تو وہ اس بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں ہوتے ہوئے بھی میرے آگے ہاتھ جوڑ دیتے اور نقاہت بھری آواز میں کہتے۔

''یوسف...... میں جانتا ہوں۔ اقرا بے وقوف ہے۔ کم عقل اور پھوہڑ بھی ہے۔ اس میں قصور ہمارے بے جا لاڈ پیار اور اس کی اندھی حمایت کا بھی ہے مگر میں بوڑھی جان اور قریب المرگ ہوں۔ میرے بندھے ہاتھوں کی لاج رکھ کر جس طرح بھی ہو، اس کے ساتھ نبھا کرو...... اس کے لیے میں تمہارا احسان مند رہوں گا۔ میرے کہے کی لاج رکھ لو۔ اللہ اس کا تمہیں اجر دے گا۔'' میں ہارے ہوئے لہجے میں جواب دیتا۔

''مگر خالو جان جب آپ کو اس بات کا علم تھا کہ آپ کی بیٹی ایسے کردار اور ایسی طبیعت کی مالک ہے۔ ضدی، کم عقل اور پھوہڑ ہے تو آخر مجھے ہی قربانی کا بکرا کیوں بنایا گیا؟''

جواب میں خالو جان معذرت خواہانہ لہجے میں کہتے۔

''بیٹا...... اگر اس کا رشتہ کسی دوسری جگہ کرتے تو اگلے دن ہی طلاق کے کاغذات لے کر وہ ہماری دہلیز پر ہوتی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے طعنے دیں کہ ایک قابلِ احترام عالم اور خطیب کی بیٹی طلاق لے کر گھر آ گئی ہے۔ پھر تم تو یار...... میرے اپنے تھے۔ مجھے پتا تھا تمہارے علاوہ کوئی بھی اسے ایک پل برداشت نہیں کر پائے گا۔ اس لیے میں نے اسے تمہارے ساتھ باندھنے کی ہامی بھری تھی۔ ہو سکے تو میری اس خود غرضی کو معاف کر دینا اور اسے جس طرح بھی ممکن ہو اپنے نکاح ہی میں رکھو۔ یہ تمہارا احسان ہوگا مجھ پر......''

خالو جان کے ان الفاظ اور لجاجت بھرے رویّے نے میرے ارادوں کو ہمیشہ زنجیر ڈالے رکھی۔ اس واقعے کے کچھ دنوں کے بعد میں ملازمت کے لیے مارا مارا پھرنے کے بعد جب گھر لوٹا تو میں نے بڑے دلار سے پوچھا۔

''اقرا...... کچھ کھانے کو ملے گا؟ بہت بھوک لگی ہے۔''

''جہاں گئے تھے وہاں سے کھانے کو کچھ نہیں ملا؟''

اس نے ترت جواب دیا۔

''کہاں گیا تھا......؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''مجھے کیا پتا کہاں تھے مگر میں پوچھتی ہوں کہ میں تمہاری یا تمہارے گھر والوں کی زرخرید ہوں؟'' وہ تنک کر بولی۔

''مطلب......؟'' میں نے پھر اسی لہجے میں استفسار کیا۔

''میرے والدین نے تمہارے گھر والوں سے میری قیمت تو نہیں لی تھی جو میں ہر وقت گدھوں کی طرح کام کرتی رہوں اور گھر کی شہزادیاں دوسری عیاشیوں میں مصروف رہیں اور ایک یہ تمہاری بوڑھی اماں جان...... ہر وقت میرے کاموں میں کیڑے نکالتی رہتی ہیں۔'' وہ کھل کر سامنے آ گئی تھی۔

''اقرا...... ہوش کرو، میری والدہ تمہاری کیا لگتی ہیں، اگر ساس بہو کے رشتے کا تقدس تمہاری نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو دوسرے رشتے کا ہی احساس کر لو......'' میں نے تیز لہجے میں کہا کہ شاید اس کے لہجے کا چڑھاؤ دھیما پڑ جائے مگر وہ چیخ کر بولی۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... میری تو اس گھر میں شادی کیا ہوگئی تقدیر ہی پھوٹ گئی ہے۔ ایک دن بھی آرام سے نہیں گزرا۔ میری کوئی خواہش، کوئی آرزو پوری نہیں ہوئی۔ آہ...... کیسے کیسے خواب دیکھے تھے میں نے...... اور اوپر سے تمہاری بہنوں کے نخرے، تمہاری والدہ کے طعنے میرے لیے عذاب بن گئے ہیں۔'' وہ اسی تندی سے مجھ پر حملہ آور تھی۔

''اقرا...... ہوش میں تو ہو...... کیا بکواس کیے جا رہی ہو......'' میں نے غصے سے کہا۔

''ہاں...... ہاں...... سارا دن نوکری ڈھونڈنے کے بہانے عیاشیوں میں مصروف رہتے ہو اور میں گھر میں کولہو کے بیل کی طرح کاموں میں جتی رہتی ہوں۔'' وہ پھر بولی۔

''کون سا احسان کر رہی ہو۔ ہر شادی شدہ عورت اپنے گھر کے کاموں میں فخر محسوس کرتی ہے اور ایک تم ہو......'' میں نے بات ادھوری چھوڑی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے غصے کو دیکھ کر وہ دھیمی پڑ جائے گی مگر وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اٹھی، میرے کچھ اور کہنے سے قبل غصے سے باہر کا دروازہ کھول کر یہ کہتی ہوئی نکل گئی۔

''میں اس گھر کی لونڈی نہیں ہوں۔ میں نہیں رہتی اس جیل میں...... میں جا رہی ہوں نانی کے پاس......''

میری اور اس کی نانی ایک ہی تو تھیں، ان کا گھر ہمارے گھر سے دو تین پڑوس چھوڑ کر تھا پھر اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا وہ دروازہ کھول کر جا چکی تھی اور میں حیران و پریشان سوچتا رہ گیا کہ ہمارا جھگڑا شروع کہاں سے ہوا تھا اور اس کا ذمے دار کون ہو سکتا

ہے۔ کس نے زیادتی کی ہے۔

وہ تو ہوا کے جھونکے کی طرح نکل چکی تھی۔ میں بھی اس وقت غصے میں تھا۔ ہمارا جھگڑا سن کر سارے گھر والے بھی اٹھ بیٹھے تھے اور کتنی دیر سے ہماری گفتگو سن رہے تھے، اس کے جاتے ہی اماں جان نے مجھے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''یوسف...... تمہیں اپنی بیوی کے ساتھ اس طرح کا رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''مگر اماں جان...... زیادتی اس کی ہے۔ گفتگو کو لڑائی کا رنگ اسی نے دیا تھا۔''

''میں جانتی ہوں یوسف ہر لڑکی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے گھر میں عیش وعشرت ملے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ ہر سسرال میں ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ ہر گھر میں کی بیٹی ہوتی ہے پھر جہاں بے روزگاری اور غریبی نے ڈیرے ڈال رکھے ہوں، وہاں تو آرزوؤں کو دفن کرنا پڑتا ہے۔ خواہشوں کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے اور یہ ہر لڑکی کے بس میں نہیں ہوتا۔ اس لیے معمولی معمولی باتیں بڑے جھگڑوں کا روپ دھار لیتی ہیں۔ تمہیں درگزر سے کام لینا چاہیے تھا۔ میں بھی کوشش کروں گی کہ اس کی شکایت کا ازالہ کروں...... ذرا تم بھی......'' اماں جان نے دھیرے دھیرے مجھے سمجھایا۔

''مگر اماں...... ایسی باتیں اسے کون سمجھائے گا۔ کون احساس دلائے گا اسے کہ یہ اس کے والد کا گھر نہیں ہے جہاں اس کی ہر خواہش ہر فرمائش کو اس کے لبوں تک آنے سے پہلے پورا کر دیا جائے گا۔ اس کے اور ہمارے گھر کے ماحول میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ خالو جان کو اگر اپنی بڑھتی عمر میں کمسن دلہن مل گئی اور اس کی بے جا خواہشات کو پورا کرتے کرتے عمر بیت گئی اور آخری عمر میں اقرا پیدا ہوئی اور وہ ان کی بیوی سے بھی زیادہ لاڈلی بن گئی تو اس میں ہمارا کیا قصور...... اس کی بے جا فرمائشوں اور نازنخروں کو وہی اٹھا سکتے ہیں پھر اگر خدا نے اسے حسن دیا ہے تو اس میں دوسروں پر رعب ڈالنے کی کیا تک ہے۔ اگر اسے یہاں رہنا ہے تو اسے آپ کو اور گھر کے ہر فرد کو وہ عزت و احترام دینا ہوگا جو ہر بہو اپنے سسرال والوں کو دیتی ہے۔ یہ کوئی اس کا ہم پر احسان نہیں ہے......'' میں نے اپنا استدلال دیا تو اماں جان گرتی ہوئی ٹھنڈی شبنم کی طرح بولیں۔

''وہ سمجھ جائے گی آہستہ آہستہ خود ہی۔ تم اپنا من نہ جلاؤ۔ وہ غصے میں تھی اماں کے پاس چلی گئی ہے۔ صبح جا کر میں خود اسے منالاؤں گی۔ تم آرام کر لو...... تھکے ہوئے آئے ہو۔''

اماں جان نے یہ کہہ کر میری تسلی تو کر دی تھی مگر میں چارپائی پر پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں ہم دونوں ریل کی پٹری کی طرح تو نہیں جو دور دور تک ساتھ تو چلتے ہیں مگر آپس میں مل نہیں پاتے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ہم دونوں کے مزاج نہیں ملتے، کیا ہماری ساری زندگی ایسے ہی گزرے گی؟ کیا وہ پیار اور وہ چاہت جس کی برسوں سے مجھے تلاش رہی ہے وہ میرے حصے میں کبھی نہ آسکے گی؟ یہ اگلی صبح کا ذکر ہے۔ میں کسلمندی سے اٹھا تو اماں یہ کہتے ہوئے اپنی والدہ کی طرف چلی گئیں۔

''میں اماں کی طرف جا رہی ہوں۔ اقرا کو لے آؤں گی۔''

''نانی اماں کو کہنا کہ وہ اسے سمجھائیں۔ سسرال میں کس طرح رہا جاتا ہے اور سسرالیوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے۔'' میں نے اماں کو کہا۔

آج میرا کہیں جانے کو من نہیں کر رہا تھا اس لیے میں گھر پر ہی رہا۔ میری سوچوں کے دائرے پھیلتے جا رہے تھے۔

اقرا جب سے اس گھر میں بیاہ کر آئی تھی اسی روز سے ہمارے ساتھ اس کا رویہ بڑا جارحانہ تھا۔ وہ مفروضات اور خیالی تصورات کی بنیاد پر گھر کے ہر فرد کے ساتھ الجھتی رہتی تھی اور اگر کوئی اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ تو اسے اپنی توہین سمجھتی تھی لڑائی جھگڑے ہر گھر کا حصہ ہوتے ہیں۔ خوش قسمت میاں بیوی وہ ہوتے ہیں جن کے درمیان کا جھگڑا پانی کے بلبلے کی طرح ہوتا ہے۔ ادھر جھگڑا ہوا کچھ لمحوں بعد دوبارہ صلح صفائی ہوگئی مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ اگر وہ کسی معاملے پر زیادتی کرتی، تو میں درگزر کر جاتا مگر میری درگزری کو وہ میری کمزوری جان کر اور بھی چڑھائی کر دیتی اور اسے مناتے مناتے تو میری شخصیت بھی مجروح ہونے لگی تھی۔ میں اپنی شناخت بحال رکھنے کی کوشش کرتا تو اماں جان اس کی طرف داری کر کے مجھے صبر وتحمل کی تلقین کرنے لگتیں۔

اس روز اماں اقرا کو ساتھ تو لے آئی تھیں۔ مگر ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر سے خوش نہیں ہیں۔ یقیناً نانی نے اماں کو موردالزام ٹھہرا کر بے جا باتیں کی ہوں گی۔ میں نے اپنی اماں کے چہرے سے اندازہ لگا لیا تھا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ کسی طرح اماں سے پوچھوں کہ وہ کن شرائط پر اقرا کو واپس لائی ہیں۔ اقرا مجھے نفرت سے دیکھتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اب کمرے میں اماں کے سوا میرے پاس کوئی نہ تھا۔ بہنیں اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھیں۔

''کیا ہوا...... لے آئیں اپنی چہیتی کو......'' میں نے طنز کرتے ہوئے پوچھا۔

تب میں نے دیکھا اماں کی آنکھوں میں پانی تیر رہا ہے تو مجھے اپنے کہے پر افسوس ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر اماں کو گلے سے لگالیا...... ''کیا ہوا، بتاتی کیوں نہیں ہو آپ......'' میں نے استفسار کیا۔

''کچھ نہیں، وہ میری ماں ہیں۔ بڑی ہیں۔ ان کی باتوں کا بھلا میں کیا برا منا سکتی ہوں مگر مجھے اقرا سے گلہ ہے۔ اس نے اماں کے سامنے پتا نہیں ہم پر کیا کیا الزام لگائے کہ اماں تو جاتے ہی مجھ پر برس پڑیں۔''

''تم کیا سمجھتی ہو کہ اقرا یہاں اکیلی ہے۔ اس پر جتنی مرضی زیادتیاں کرلوگی۔ اقرا میری خورشید کی بیٹی ہے جو مجھے دل و جان سے عزیز ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی برا سلوک کرے گا، مجھے وہ کسی طرح اچھا نہیں لگے گا اور میری یہ بات دھیان سے سن لو...... وہ گھر میں جو تمہاری بیٹیاں بیٹھی روٹیاں توڑتی رہتی ہیں، کیا ان کے ہاتھوں میں مہندی لگی ہے کہ وہ گھر کے کام کاج نہ کریں اور میری یہ ہیرے جیسی بچی گھر کے کام میں سڑتی رہے۔'' اماں جان نے روتے ہوئے بتایا۔

''کمال ہے اماں جان...... نانی جان کو تو چاہیے تھا کہ وہ اقرا کو سمجھاتیں۔ الٹا وہ آپ کو مورد الزام ٹھہرانے لگیں۔''

''تو اور کیا...... وہ ان کی لاڈلی بیٹی خورشید کی بیٹی ہے جو انہیں دل و جان سے عزیز تھی۔ اب خورشید کے حصے کی ساری محبتیں اقرا کو دینے لگی ہیں۔'' اماں نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ جائز اور ناجائز طریقے سے ہم پر ہی دباؤ بڑھائیں۔ آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ یوسف تو بے کار پھرتا ہے۔ اسے آپ کے بیٹوں نے بے روزگار کر ڈالا ہے۔ گھر کا خرچ پانی چلانے میں اگر آپ کی بیٹیاں محنت نہ کریں اور آپ کا ہاتھ نہ بٹائیں تو ہم لوگ بھوکوں مر جائیں۔ میں تو اپنی بہنوں کا شکر گزار ہوں جو وہ اتنی محنت کرتی ہیں۔ ان کی بھی خواہشیں ہوں گی۔ کیا اقرا ان سے بڑھ کر ہے......'' میں نے استدلال دیا۔

''کہا تھا...... وہ اس بات کو جانتی بھی ہیں کہ میری بیٹیاں کس طرح کڑھائی سلائی کرکے اور میں چرخہ چلا کر گھر کا خرچ پانی چلاتی ہوں اور ان کی لاڈلی تو صرف گھر کا کام کاج ہی کرتی ہے پھر بھی اسے اعتراض ہے مگر اماں ماننے کو تیار نہیں، الٹا الزام ہمیں ہی دے رہی ہیں۔ تم فکر نہ کرو...... میں سب سنبھال لوں گی......'' اماں جان نے مجھے مطمئن کردیا۔

اماں کی باتیں سن کر مجھے اپنے خاندان کے بزرگوں کے رویے پر افسوس ہو رہا تھا۔ وہ بھی اقرا ہی کو سچا گردانتے تھے اور نانی جان کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اگر اس کے گھر والوں نے اس کی تربیت میں کوتاہی برتی تھی تو کم از کم نانی جان کو اسے سمجھانا چاہیے تھا۔ نانی جان کی حوصلہ افزائی نے اقرا کے رویے میں اور بھی جارحانہ پن شامل کردیا تھا۔ اب تو معاملہ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ اقرا نہ صرف گھر والوں کے ساتھ بلکہ میرے ساتھ بھی بدکلامی پر اتر آئی تھی۔ بات کا بتنگڑ بنانے میں تو وہ پہلے سے ماہر تھی لیکن اب باتوں میں سے نکتے ڈھونڈ کر لڑائی کا جواز بنانے کا ہنر بھی اسے آگیا تھا۔

وقت دھیرے دھیرے لنگڑاتے ہوئے گزر رہا تھا۔ میں جب بھی اپنے کسی فیصلے کی انتہا کے بارے میں سوچتا تو خالو جان کے بندھے ہوئے ہاتھ میری نظروں میں گھوم جاتے۔ میں ان سے کیا گیا وعدہ نہیں توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ جب ہمارے آنگن میں پھول کھلیں گے تو شاید اولاد کی زنجیر میں بندھ کر اس کا رویہ درست ہوجائے۔ کیونکہ میں نے سنا تھا کہ اولاد کی بندش سے بڑی سے بڑی خودسر عورتیں درست ہوجاتی ہیں مگر یہ بھی میری بھول ہی تھی۔ ہمارے گھر اولاد کے پھول کھلے تو بھی اقرا کا رویہ درست نہ ہوا۔ وہ ہمارے ساتھ اپنے ناروا سلوک، ہٹ دھرمی اور ضد منوانے کے لیے اب بھی ہر حد عبور کرنے کو تیار رہتی تھی۔ اسی دوران مجھے یہ بھی پتا چلا کہ اقرا کے بہن بھائی جب اسے ملنے آتے ہیں تو ان کی آمد پر وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی مگر جب میری بہنیں آتی ہیں تو اس کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں پڑ جاتی ہیں اور وہ ان کی تضحیک کا کوئی پہلو ہاتھ سے نہیں جانے دیتی...... شاید یہی وجہ تھی کہ اب مجھے بھی اس کے بہن بھائیوں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ جب میرے اس رویے کا اس پر انکشاف ہوا تو اس نے جان بوجھ کر اپنے بہن بھائیوں کو بلانا شروع کردیا اور مجھے ان کی خاطر مدارات پر مجبور کرتی۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو ہنگامہ کھڑا کردیتی۔

مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا یا اپنی شرافت کو کسی قدم پر بھی داغدار نہ کرنا چاہتا تھا پھر میری اپنی طبیعت کا یہ خاصہ تھا کہ جتنی جلد مجھے غصہ آتا تھا اتنی ہی جلدی ختم بھی ہوجاتا تھا۔ کسی بات کو اپنی ضد بنانے کی مجھے عادت نہ تھی۔ شاید میری یہی کمزوری میری خوشیوں کی راہ میں اصل رکاوٹ تھی۔

میں نے بھی اب خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں خوشیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چکا تھا۔ میں

نے اب نوکری تلاشنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اب ایک چھوٹا موٹا کاروبار کرنے پر دھیان دینے لگا تھا۔ میں نے اپنے محلے کے بازار میں ایک دکاندار سے منت سماجت کر کے تھوڑی جگہ اس کی دکان میں حاصل کی اور چند کتابیں وہاں رکھ کر لائبریری کی صورت دی اور کام شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں برکت ڈال دی اور گزر اوقات کے لیے کچھ آمدن ہونے لگی۔ فارغ اوقات میں ان کتابوں کے مطالعے سے میرے اندر کی تنہائی اور بروقت بھڑکنے والی پیاس بجھنے لگی۔ الفاظ کی خوب صورت نشست و برخاست کو پڑھنے سے مجھے سکون سا ملنے لگا تھا۔ پھر میں نے انہی کی گود میں پناہ لینا شروع کر دی لیکن اس کے باوجود ہوتا یوں تھا کہ جونہی میں گھر میں قدم رکھتا' وہاں اقرا کا رویہ اور اس کی باتیں میرے من کی طمانیت کو اجاڑ کر رکھ دیتیں۔ میں نے کئی بار اقرا سے پوچھا۔

''اقرا...... ہماری شادی کو ایک عرصہ بیت گیا۔ اگر تمہیں اس شادی پر کوئی اعتراض تھا تو اپنے والدین کو پہلے بتا دیتیں۔ اگر تمہیں کوئی اور پسند تھا تو تم اسی ضد کے ساتھ اپنی شادی وہاں کروا سکتی تھیں۔ کم از کم میں تو اس روز روز کے عذاب سے بچ جاتا مگر تم نے کیا کیا...... نہ صرف اپنی زندگی کو کانٹوں پر گھسیٹا بلکہ میری زندگی کے موسموں کو بھی بہار آشنا نہ ہونے دیا۔'' میں حیران تھا آج وہ بڑے سکون کے ساتھ میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں ذرا سانس لینے کو رکا تو وہ جھٹ سے بولی۔

''میں اپنے رویّے کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ میری عادت کبھی شکست ماننے کو تیار نہیں ہو پاتی اور پھر تم جیسے بیکار انسان نے زندگی بھر مجھے دیا ہی کیا ہے۔ بھوک، تنگ دستی اور خواہشات کا گلہ گھونٹنے کا طریقہ...... میں جو آزاد فضاؤں میں رہنے اور اپنے خوب صورت خیالوں کو سجانے سنوارنے والی لڑکی تھی، مجھے اپنے مسائل کی حدود میں باندھ دیا گیا۔ ایک اپاہج بن کر رہ گئی ہوں میں تمہارے اس بندی خانے میں۔ اس کے مقابلے میں یوسف...... میں نے تمہیں کیا نہیں دیا۔ اولاد کے پھول تمہاری جھولی میں ڈال کر بھی خود تہی داماں رہی۔'' وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے کہا۔

''ہونہہ...... اولاد...... جو شعور کی منزلوں کو پہنچ کر بھی باپ کی مجبوریوں کو سمجھنے کے بجائے ہمیشہ تمہاری محبتوں اور طرف داری کا دم بھرتی ہے۔ وہ مجھے اہمیت دیتے ہی کب ہیں۔ انہیں بھی صرف اور صرف اپنی ماں سے محبت ہے۔ باپ سے تو انہیں بھی تمہاری طرح نفرت ہے۔''

''یہ تمہارے نامناسب رویّے کی وجہ سے ہے۔ جوان ہوتی اولاد اور شعور سنبھالتے بچوں کے سامنے اگر ان کی والدہ کے ساتھ والد کا رویہ ٹھیک نہ ہوگا تو اولاد کی ہمدردیاں ماں کی طرف مڑ جاتی ہیں۔ زندگی کو خوشحال بنانے کا طریقہ اگر تمہیں نہیں آتا تو اس میں بھلا میرا کیا قصور...... بچوں کو لاڈ پیار دینے کا گر تمہیں نہیں آتا تو میرا دوش بتاؤ...... میں تو ایسی ہی ہوں۔ تم ہی اپنے آپ کو بدل لیتے۔ جسے چاہت کی خواہش ہو، جسے پیار کی تمنا ہو، اسے اپنے رویے تبدیل کرنے کا اختیار بھی ہوتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی حالات کے مطابق ڈھلنا پڑتا ہے۔ مگر تم اس معاملے میں ہمیشہ ناکام رہے اور ناکام ہی رہو گے۔ تشنگی تمہاری رگوں میں اتری ہوئی ہے اور یہ تمہیں ہمیشہ ایسے ہی حالات کے صحرا میں اسی طرح گھسیٹتی رہے گی۔'' اقرا نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ اور اپنی چرب زبانی سے اپنی اصلاح کے بجائے سارا الزام مجھ ہی پر دھر دیا۔

اس رات میں بڑی دیر تک اپنے حالات کے بارے میں سوچتا رہا کہ ہم دونوں میں سے کون غلط ہے۔ یہ بات درست تھی کہ ہماری روزمرہ کی لڑائی اور جھگڑے ہماری اولاد پر بھی اثر انداز ہونے لگے تھے۔ میرا بڑا بیٹا شہزاد شاید میری ہی طرح کی حساس طبیعت کا مالک تھا۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوتا جا رہا تھا، اس کی حرکتیں نارمل انسانوں سے ہٹ کر ہونے لگی تھیں۔ لگتا تھا کہ اس کے دماغ میں کوئی خلل یا کوئی کمی ضرور رہ گئی ہے۔ جس کی بنا پر وہ دن بدن بیمار رہنے لگا تھا۔ پہلے پہل تو میں نے جانا شاید وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہے اور اس کی بڑی وجہ ہم میاں بیوی کے درمیان ہونے والی لڑائیاں ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اس کا مرض دن بدن بڑھتا جا رہا ہے۔ تب میں نے اس کی طرف توجہ دینا شروع کی۔ یہ میرے لیے ایک نیا عذاب تھا۔ محدود آمدنی اور گھر میں مسلسل رہنے والی ناچاقی۔ اوپر سے شہزاد کا علاج میرے لیے بے حد پریشانی کا سبب بن رہا تھا۔... ماہر نفسیات سے لے کر دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹروں اور تعویذ دھاگے کرنے والے عاملوں تک میں شہزاد کو لے کر پہنچا مگر اس کی بیماری میں کہیں سے بھی شفا نہ مل سکی۔ اقرا اس کی ماں ہوتے ہوئے بھی جہاں سے میں دوا لے کر آتا اسے دینے میں کوتاہی برتتی تھی۔ شاید وہ مجھے عذاب میں دیکھ کر سکون حاصل کرتی تھی۔ میں اس کو کبھی احساس دلاتا تو وہ چڑ جاتی۔ میری توجہ کی وجہ سے اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ شہزاد کی بیماری مکمل طور پر ختم تو نہ ہوئی تھی

البتہ رک سی گئی تھی۔ لیکن وہ مسلسل بیمار رہنے سے چڑچڑا اور ماں کی طرح خودسر ضرور ہو گیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ماہر نفسیات کے پاس لے کر گیا تو اس نے تنہائی میں شہزاد سے کچھ سوالات کا جواب مانگا اور اس نے برملا طور پر ڈاکٹر کو بتایا تھا کہ اس کی بیماری کی بڑی وجہ اس کے والد کا وہ رویہ ہے جو وہ میری والدہ سے روا رکھتے ہیں جس کو دیکھ کر مجھے دورہ پڑتا ہے۔

معائنے کے بعد ڈاکٹر نے مجھ سے کہا۔ ''یوسف صاحب...... آپ دونوں میاں بیوی کے جارحانہ رویے کی وجہ سے آپ کا بیٹا ڈپریشن کا مریض بن چکا ہے۔ اگر آپ اپنے بیٹے کو صحت یاب دیکھنا چاہتے ہیں تو اپنے گھریلو ماحول اور اپنے اپنے رویوں کو تبدیل کریں۔''

ڈاکٹر کے کلینک سے باہر نکل کر میں تمام راستے یہ سوچتا رہا، کیا اس گھر کو تباہی کی طرف لے جانے میں صرف میرا ہی قصور ہے؟ ہر بار یہ بوجھ مجھ پر ہی کیوں ڈال دیا جاتا ہے؟ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ ہر بار گھر کے حالات سدھارنے میں صرف میں نے ہی قربانی دی ہے؟ دوسروں کے سامنے جب بھی کبھی موقع آیا اقرا کمال چالاکی سے مجھے ملزم ہی نہیں مجرم ٹھہرا دیتی اور میں نے ایسے موقعوں پر ہمیشہ خاموشی اور مصلحت کے تحت اپنی گردن جھکا دی۔ اولاد کو یہاں تک لانے میں اقرا کا زیادہ ہاتھ اس لیے بھی تھا کہ اس نے اپنی اولاد...... اپنے والدین اور عزیز و اقارب کے سامنے مجھے ظالم ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب بھی رہی۔ میں گھرداری چلانے کے لیے صبح سے شام تک گھر سے باہر رہتا تھا لیکن اقرا ہر طرح سے اپنے تمام تر حربوں سے مجھے ظالم ثابت کرنے کی زنجیروں میں جکڑے جا رہی تھی۔ میری بھی خواہش تھی کہ میں ماحول کی بگڑتی صورتِ حال اور اقرا کے جلے کٹے جملوں کی کہنہ زنجیروں سے خود کو آزاد رکھوں...... مجھ میں اپنا احتساب کرنے کی جرأت تھی مگر یہ احتساب اسی صورت میں کامیاب ہو پاتا جب اقرا اس پر یقین کرتی جو میرے خیال میں اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ہمارے روزمرہ کے جھگڑوں نے میرے اندر ایک خلا پیدا کر دیا تھا۔ اس خلا سے دوسرے فائدہ اٹھانے میں بڑے کامیاب ہو رہے تھے۔ اس کے نامناسب رویّے نے جہاں نہ صرف سارے رشتے داروں کو میرے خلاف کر ڈالا تھا۔ وہاں ایک ایسی ہستی بھی تھی جس کے دل میں میری ہمدردی کی چنگاری روشن ہو رہی تھی۔

تاج...... میری پھوپی کی بیٹی تھی جو ہمارے گھر سے دو تین گھر آگے رہتی تھی۔ ہمارا بچپن تقریباً ایک ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ وہ میرے حالات کی لمحہ بہ لمحہ پوری اور پکی گواہ تھی۔ اس نے کئی بار مجھے جتانے کی کوشش بھی کی مگر میں نے کبھی اس کے جذبے کو قابلِ غور نہیں جانا۔ اس نے کئی بار اشاروں ہی اشاروں میں اقرا کے رویے اور اس کی زیادتیوں کے بارے میں آگہی دلاتے ہوئے اپنی محبت کا احساس دلانے کی کوشش بھی کی تھی مگر میں نے اس کی طرف صرف اس وجہ سے توجہ نہ دی کہ ایک تو میری بیوی اقرا اس سے کہیں زیادہ خوب صورت تھی' دوسرے میں اب صاحب اولاد بھی ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے اس معاملے میں کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جس کا اسے ہمیشہ گلہ رہتا تھا۔

کہتے ہیں کہ محبت اور چاہت کا سلسلہ یک طرفہ بھی ہو تب بھی اپنی مہک ضرور چھوڑتا ہے، ایک دو بار اس نے میری ہمدردی کا اظہار کیا تو اقرا کو بھی اس کا شک ہو گیا۔ اس بات کو لے کر اقرا نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اسے تو میرے خلاف کوئی نہ کوئی بات چاہیے تھی اور تاج کی میرے ساتھ ہمدردی اس کے لیے بڑا ثبوت تھی۔ اس روز اسی کو بہانہ بنا کر وہ بولی۔

''یہ تاج جب بھی ہمارے گھر آتی ہے صرف تمہاری ہی سن گن میں رہتی ہے۔ اس کی آنکھیں تمہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں اور تم سے ہی باتیں کرنا اسے اچھا لگتا ہے۔ مجھے دال میں کچھ کالا دکھائی دیتا ہے۔''

''مجھے اس سے کیا غرض، یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نہیں جانتا اس کے دل میں کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''تم جھوٹ بولتے ہو، اتنے بچوں کے باپ ہو کر بھی تمہیں ایسے کرتوتوں پر شرم نہیں آتی۔ جو تم اسے منہ لگا رہے ہو۔'' اقرا نے جذباتی ہوتے ہوئے غصے میں کہا۔

''میں سچ کہتا ہوں، اقرا...... اگر اس کے من میں کوئی چور ہے تو وہ جانے...... مگر میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میرا من صاف ہے۔'' میں نے دلیل دی۔

''جھوٹ کون کہتا ہے اور کون سچا ہے، مجھے اس سے غرض نہیں مگر میں اب یہاں رہنے کی نہیں...... تم جانو اور تمہاری محبوبہ تاج جانے۔ اگر اسے میری ہی جگہ لینے کا شوق ہے تو وہ یہاں آ کے مزہ چکھ لے۔ جو میں خوشحالی اور محبتوں کی سیج پر بیٹھی ہوں اور خوشحالی کے جن جھولوں کو جھول رہی ہوں، وہ بھی آ کے دیکھ لے......'' اقرا تو پورے طور پر پھٹ پڑی تھی۔

''دیکھو اقرا...... تم بلاوجہ بات بڑھا رہی ہو۔ حالانکہ

میں تمہیں ہر طرح سے یقین دلا سکتا ہوں کہ اس کی اس چاہت کا نہ تو مجھے علم ہے اور نہ ہی میں اس میں شریک ہوں......'' میں نے دوبارہ اسے یقین دلایا۔

''بات میں بڑھا رہی ہوں اور جو تم اس کے حوصلے بڑھا رہے ہو، اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ میں کل ہی اپنے باپ کے پاس جا رہی ہوں۔ پھر تم دونوں کھل کھیلنا۔'' اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اگلے روز ہوا بھی ایسا ہی...... وہ بچوں کو ساتھ لے کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ اس کی خبر مجھے میرے چھوٹے بھائی احسان نے دکان پر آ کر سنائی۔

یہیں سے ایک اور دراڑ ہمارے نجی تعلقات میں آن پڑی۔ میرے تو پہلے سے اقرا کے والدین کے ساتھ تعلقات کشیدہ تھے۔ میں اسے منانے وہاں نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی اس نے مفاہمت کا کوئی راستہ چھوڑا تھا۔ اس کے والدین نے مجھ سے کوئی استفسار کیے بنا اسے نہ صرف گھر بٹھا لیا بلکہ از خود اقرا کو واپس نہ بھیجنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ اگر یوسف نے ہماری بیٹی کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا ہے تو کیا ہوا۔ جن بیٹیوں کے والدین زندہ ہوں، انہیں اپنے شوہروں کے نامناسب رویے سے ڈرنے کے بجائے اپنے والدین کے گھر پلٹ آنا چاہیے۔ گھٹ گھٹ کر نہیں مرنا چاہیے۔ میں اس کے والدین کی سوچ پر حیران رہ گیا۔ وہ کیسے والدین تھے جو اپنی بیٹی کا گھر بسانے کے بجائے اجاڑنے پر تلے ہوئے تھے۔ میں نے مختلف طریقوں سے اس کے والدین کو منانے کی کوشش بھی کی مگر وہ ہر حال میں اپنی ہی بیٹی کی طرف داری کر رہے تھے۔ پھر ایک بار...... مجھے ہی ہار ماننا پڑی۔ میں نے وجہ تنازع کی ہر بات کو اپنی جھولی میں ڈال کر ان سے مصالحت پر اکتفا کیا اور اقرا کو گھر لے آیا۔ اس وقت تک میری دو بیٹیاں تھیں۔ جن میں سے ایک کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری کے لیے میں فکر مند ہو رہا تھا۔

جب میری بیٹی شائستہ کی منگنی کا پروگرام بن رہا تھا تو میں نے ایک رات اقرا سے کہا...... اگر ہم اپنے بیٹے شہزاد کی بات جو تمہاری پھوپی زاد بہن کی بیٹی سے طے ہو چکی ہے، اسی تقریب میں ان دونوں کی بھی منگنی کر دیں تو اس طرح ہم دہرے اخراجات سے بچ جائیں گے۔

''لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں اپنے بیٹے کی منگنی دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہوں اور پھر میری کزن بھی اس پر راضی نہیں ہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ پہلے شائستہ کی اور پھر شہزاد کی منگنی کریں۔ اس کے لیے کچھ انتظار بھی کیا جا سکتا ہے۔''

اقرا نے تنک کر جواب دیا۔

چنانچہ اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ہوئے شائستہ کی منگنی کا دن مقرر کر دیا گیا۔ میں اسی منگنی پر معاشی طور پر بے حد ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ منگنی تو ہو چکی تھی مگر یہاں بھی اقرا کے غیر معمولی اخراجات نے مجھے بے حد پریشان کر ڈالا تھا۔ ابھی میں پوری طرح سانس بھی نہ لے پایا تھا کہ ایک روز اقرا نے مجھ سے کہا۔

''وہ میری کزن آج آئی تھی اور شہزاد کے ساتھ اپنی بیٹی کی منگنی کا تقاضا کر رہی تھی۔''

''اقرا...... تمہیں تو علم ہے کہ ہمارے مالی حالات شائستہ کی منگنی کر کے ابھی سنبھلنے نہیں پائے۔ اسی لیے میں چاہتا تھا کہ دونوں بہن بھائی کی منگنی ایک ساتھ کر دی جاتی مگر اس وقت تم نے کہا تھا کہ شہزاد کی منگنی کچھ عرصے بعد کر دیں گے لیکن اب!'' میں نے اسے یاد دلایا۔

''تو ٹھیک ہے۔ میں اسے جواب دے دیتی ہوں کہ وہ بیٹی کی منگنی جہاں چاہے کر سکتی ہے۔ ہمارے حالات ابھی اس قابل نہیں ہیں۔'' اقرا نے غصے میں جواب دیا۔

''اقرا...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ تمہیں بھی تو اپنے حالات کا علم ہے۔'' میں نے بھی تندی سے کہا۔

''یوسف...... وہ تو کبھی درست نہیں ہونے کے......''

وہ آہستہ سے بولی تو میرا پارہ اور تیز ہو گیا۔

''اقرا...... اب تم عمر کے اس حصے میں تو ہو نہیں...... جہاں ہر اونچ نیچ مجھے ہی تمہیں سمجھانا پڑے۔ تم کیسی عورت ہو، جسے اپنی عزت اور شوہر کی مجبوریوں کا کوئی احساس نہیں۔''

''مجھے کچھ پتا نہیں، پیسا کہاں سے آئے گا۔ یہ ذمے داری تمہاری ہے مگر میں شہزاد کی منگنی ہر صورت میں اپنی بہن کی مرضی کے مطابق ابھی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے گویا اپنا آخری فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی ضد کے سامنے بالآخر مجھے ہی ہتھیار ڈالنا پڑے۔ چنانچہ اس منگنی کے لیے مجھے دوستوں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔

ابھی میں اپنی پریشانیوں کے گرداب سے نکلنے نہ پایا تھا کہ شائستہ کے سسرال والوں نے شادی کا تقاضا شروع کر دیا۔ میں نے اقرا سے بات کی تو وہ بے حسی سے بولی۔

''شادی تو بہر حال کرنا ہی ہے۔ یہ کس طرح کرنا ہے۔ یہ تمہارا مسئلہ ہے لیکن یہ بات سن لو ہم اپنی بیٹی کو اپنے گھر سے دھوم دھام سے رخصت کریں گے۔ اس میں کسی قسم کی کنجوسی یا کمی نہیں ہونی چاہیے۔''

شادی کے سلسلے میں، میں نے میانہ روی اختیار

کرنے کا مشورہ دیا تو اقرا نے جان بوجھ کر اخراجات کو اتنا ہی بڑھا دیا۔ ”دیکھو یوسف اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو ہماری سبکی ہوگی......“ مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ کیسی ماں ہے...... اور کیسی بیوی ہے......

میں حالات کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مار کر خود کو جس قدر بچانے کی تگ ودو کرتا وہ اتنا ہی مجھے ڈبونے کی کوشش میں تھی اور ہر معاملے میں مجھے ذلیل کروانے پر تلی ہوئی تھی۔ اگر کسی معاملے میں میں ذرا ہاتھ کھینچنے کی کوشش کرتا تو وہ بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتی کہ تمہارا باپ کنجوسی کر رہا ہے۔ اس کے اس رویے کو دیکھ کر میں نے بھی خود کو حالات کے سمندر میں چھوڑ دیا۔

میں سمجھ چکا تھا کہ حالات سے نبرد آزما ہونا میرے اکیلے کا کام نہیں۔ جب میری زندگی کا دوسرا ساتھی میری ہر بات اور میرے ہر معاملے میں میری ہی سبکی کروانے پر تلا ہوا ہے تو ایسے ہی سہی...... پھر میرے بچے بھی میری اس عادت کو میری کنجوسی سمجھ رہے تھے...... جس روز میں شائستہ کی شادی سے فارغ ہوا اس وقت تک میں تقریباً چار لاکھ کے قرض تلے دب چکا تھا۔ پھر بھی میری بیوی کا تقاضا تھا کہ گھر میں چونکہ ایک ہی کمرا ہے۔ بیٹیوں کے سسرالی آجاتے ہیں تو اس ایک کمرے میں سونا مشکل ہے، لہٰذا ایک اور کمرا بنالیا جائے۔ ایک روز تنگ آکر میں نے کہا۔

”اقرا...... خدا کے لیے ذرا سوچو...... میں دولت کے کنویں پر تو نہیں بیٹھا کہ دولت سے بھرے ڈول اس میں سے نکالتا رہوں اور تمہاری بے جا ضد پر لٹاتا رہوں۔“

”تو میں کیا کروں...... مہمان گھر آئیں تو ان سے کہہ دوں ہمارے پاس انہیں بٹھانے اور سلانے کی جگہ نہیں ہے۔ وہ شہر کے ریلوے اسٹیشن پر رات گزار لیں......“ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

”میں کن حالات سے گزر رہا ہوں، کبھی تمہیں اس کا احساس ہوا ہے۔ الٹا تم مجھ سے جھگڑنے کا بہانہ ڈھونڈتی رہتی ہو۔“ میں نے کہا۔

”میں پاگل جو ٹھہری۔ اس روز روز کے جھگڑوں سے تو اچھا ہے کہ میں یہ گھر ہی چھوڑ جاؤں، سن لو...... میں کل ہی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی...... مجھ سے اب یہ برداشت نہیں ہو رہا......“ وہ غصے میں دہاڑی۔

یہ سن کر میں ایک بار پھر اپنی پوری جان سے لرز گیا۔ عمر کے اس حصے میں وہ مجھے ایک بار پھر دھمکی دے رہی تھی۔ وہ یہاں سے چلی جائے گی مگر مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر...... اور مجھے ظالموں کے کھاتے میں ڈال کر...... کسی کو بھی میری مجبوریوں کا احساس تک نہ تھا۔ میں نے بھی غصے میں جواب دیا۔

”ٹھیک ہے...... جہنم میں جاؤ...... میں بھی اب تمہیں نہیں روکوں گا...... لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا۔ اب اگر تم نے اس گھر سے باہر قدم رکھا تو دوبارہ یہاں آنے کی جرأت نہ کرنا۔“ یہ کہہ کر میں دکان پر چلا گیا، شام کو لوٹا تو اقرا واقعی گھر چھوڑ کر جا چکی تھی۔ لیکن اب کی بار وہ اپنے والدین کے گھر نہیں بلکہ اپنے رشتے کی بہن کے گھر چلی گئی تھی جو ہمارے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر تھا۔ میں بھی خاموش ہو رہا کہ معاملہ جب ٹھنڈا ہوگا تو وہ واپس آجائے گی۔ مجھے یقین تھا کہ شام تک اقرا کی کزن کا شوہر جو میرا سگا بھائی بھی تھا، کام سے واپس آئے گا، تو وہ مجھے اور دوسرے بھائی اکرم کو بلا کر ہم میاں بیوی کے درمیان ہونے والی ناچاقی کو ختم کرا دے گا۔ اقرا...... احسان کے گھر چلی گئی تھی۔ احسان...... جو میرا چھوٹا بھائی تھا......

مگر معاملہ سلجھنے کے بجائے اور بھی الجھ گیا۔ احسان نے یہ گوارا ہی نہیں کیا کہ وہ ہمارے درمیان کے جھگڑے کو ختم کرا دیتا۔ الٹا وہ مجھے ہی موردِالزام ٹھہرا رہا تھا۔ اقرا نے آنسو بہا بہا کر تمام رشتے داروں کو باور کرا دیا تھا کہ اس عمر میں یوسف نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ میں حیران و پریشان اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ میرے چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے جو مجھ پر ہی الزامات لگا رہے تھے اور اقرا ہر طرح سے نردوش ٹھہرائی جا رہی تھی۔

میری واحد اور ہمدرد ہستی...... صرف میری والدہ تھیں۔ جو مجھے اس کارزارِ ہستی میں اکیلا چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ میرے دونوں بیٹے جو میرے پاس موجود تھے، وہ بھی میرے طرفدار نہ تھے۔ میں عجیب گورکھ دھندے میں پھنس چکا تھا۔

یہ جنوری کی ایک صبح کا ذکر ہے جب میں دکان پر جانے کے لیے سائیکل پر سوار جا رہا تھا کہ ایک تیز رفتار چنگچی رکشا نے پچھلی جانب سے مجھے ٹکر مار کر گرا دیا۔ اس وقت بھی میں ذہنی طور پر نہ جانے کن سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں قلابازیاں کھاتا ہوا سڑک کے درمیان گر پڑا۔ چند لمحوں کے لیے مجھے احساس ہوا کہ شاید میرا آخری وقت آگیا ہے۔ لوگ بھاگے ہوئے آئے مجھے سہارا دے کر اٹھایا گیا۔ بے یقینی کے عالم میں دو ایک قدم لنگڑا کر چلا تو مجھے اپنے زندہ ہونے کا احساس ہوا۔ اللہ کا شکر کہ میں صحیح سلامت تھا۔ چند ایک گہری چوٹوں کے باوجود میں ٹھیک تھا۔ جب اقرا کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس کا جواب تھا۔

''......اچھا ہوا......!''

گھر میں کوئی نہ تھا۔ میں روئی کے ذریعے اپنی چوٹوں پر دوا لگا رہا تھا۔ جب وہ آہستگی سے گھر میں داخل ہوئی اور میرے سامنے بیٹھ کر مجھے دیکھنے لگی...... اسے اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ وہ اٹھ کر میرے زخموں پر دوا لگا دیتی۔ میں کئی دنوں تک اسی اذیت میں رہا مگر اس دوران اس نے ایک بار بھی میرا حال نہیں پوچھا۔ مجھے اکیلا کر دینے کی سازش کی جانے لگی تھی۔

اقرا کے ہی ایما پر میرے داماد...... میرے بچے اور عزیز و اقارب میرے خلاف ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی طرف سے ہر وہ کوشش کر ڈالی تھی جس سے اقرا کے احساس کو جگایا جا سکے مگر بے سود...... میری ساری کوششیں رائیگاں گئیں مگر اقرا نے کسی وقت بھی میرا ساتھ نہیں دیا۔

اور میں ہمیشہ سوچتا رہا کہ زندگی کے ان گزرے لمحات میں کہاں کہاں میں نے غلطی کی جس کا خمیازہ میں آج تک بھگت رہا ہوں۔ میں آج بھی اسی طرح محبتوں کے لیے ترسا ہوا...... جی رہا ہوں۔ سوچتا ہوں خواہش تو رنگ برنگے دھاگوں کی طرح ہوتی ہیں۔ میں نے کئی بار دعا کے دھاگوں سے اپنے من کا چولا سینا چاہا مگر ہر بار ناکامی میرے حصے میں آئی اور حالات کی سوئی نے صرف میری انگلیوں کی پوروں کو ہی زخمی کیا۔ کیا میری یہ سوچ غلط تھی کہ والدین ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی بیٹیوں کو شوہروں کے گھروں میں بسنے کا درس دینے کے بجائے انہیں ہر گام پر اجاڑنے پر اکساتے رہتے ہیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میں کچھ نہ کہتے ہوئے بھی سب رشتے داروں کی نظروں میں مجرم بنا رہا...... ہاں یہ ٹھیک ہے...... میں ہی مجرم تھا...... سارا قصور صرف اور صرف میرا تھا کہ میں نے اقرا کے بوڑھے والد کی آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں اور اس کے بندھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھی تھی۔ یہ بھی سب بجا اگر میں اس روز اقرا کی یہ باتیں نہ سن لیتا۔

میں اس روز اپنے کام سے دوپہر کو اچانک واپس آ گیا تھا۔ حالانکہ میری پوری زندگی کا ریکارڈ تھا کہ میں اگر گھر سے کام پر جانے کے لیے نکل جاتا تو پھر رات گئے ہی واپس گھر آتا تھا۔ اس روز جانے کیا ہوا میں جب دوپہر کو گھر لوٹا تو اقرا کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ گھر کا مین دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شاید وہ اسے بند کرنا بھول گئی تھی۔ وہ اپنے موبائل پر کہہ رہی تھی۔

''میں نے یوسف اور اس کے گھر والوں کو پورے طور پر اس کی سزا محض اس لیے دی کہ وہ مجھے کسی لمحے اور کسی وقت طلاق دے دیں۔ میں نے انہیں اپنی نفرت کی سولی پر لٹکائے رکھا۔ محض اور محض صرف ایک تمہاری محبت میں...... میں نے اپنے گھر کے امن وسکون کے ہاتھوں پیروں میں نفرت کی بڑی میخیں گاڑیں مگر کس قدر بے وقوف لوگ تھے جو مجھے چھوڑنے کے بجائے مجھ سے اور چمٹتے رہے مگر تم نے میرے لیے کیا کیا جواد...... چپکے سے شادی کر کے اطمینان وسکون سے پڑے رہے۔ دیکھ لو میرا حوصلہ...... آج تک بدنامی کی کوئی چھینٹ بھی تمہارے دامن پر نہیں پڑنے دی۔ کسی کو اس بات کا احساس تک نہیں ہونے دیا کہ میں تم سے محبت کرتی تھی، کرتی ہوں اور شاید تمام عمر کرتی رہوں۔ میں نے وفا نبھائی مگر آج تک کسی کو شک نہیں ہونے دیا۔''

میں نے اسے احساس تک نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس کی تمام باتیں سن لی ہیں۔ اندر آتے ہی میں نے صحن کے درمیان پڑی تپائی کو ٹھوکر ماری۔ ''اسے تو سنبھال لیا ہوتا......'' میں نے اونچی آواز میں کہا تو اس نے ہڑبڑا کر موبائل آف کر دیا......

''اوہ تم، جواد کا فون تھا...... اس کی گھر والی بیمار ہے۔ اس کا پوچھ رہی تھی۔''

میں خاموشی سے اندر چلا گیا اور سوچنے لگا کہ اقرا نے محض ہٹ دھرمی اور اپنی نام نہاد انا کے سبب میری ساری زندگی کا سکون برباد کر ڈالا...... جانے غلط کون تھا...... میں آج تک نہیں جان سکا اور نہ میں نے اقرا کو اس بات کا کبھی طعنہ دیا۔ شاید انہی کانٹوں پر زندگی گزارنا میرا مقدر ہے۔ خالو جان نے سچ ہی کہا تھا۔ اسے ہمیشہ اپنے نکاح میں رکھنا اور میں یہ قول آج بھی خالو جان کی وفات کے بعد تک نبھا رہا ہوں...... جانے اس کا انجام کہاں جا کر ہو......

اپنی اتنی کہانی سنانے کے بعد وہ خاموش ہوا تو میں نے دیکھا اس کے چہرے پر مایوسیوں اور تشنگی کے سائے بری طرح جھلملا رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیر رہا تھا۔

آج بالآخر وہ دن آ ہی گیا جب یوسف ہارون کی کہانی کو اس کا انجام مل گیا۔ اقرا نے خلع کے لیے اس پر کیس کر دیا تھا اور وہ تاریخ بھگتنے عدالت کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ جب اس کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ اس سے جانبر نہ ہو سکا...... کیا اسی انتظار میں تھی اقرا...... میں اس کے جنازے میں شریک سوچوں کی اسی صلیب پر لٹکا ہوا ہوں......

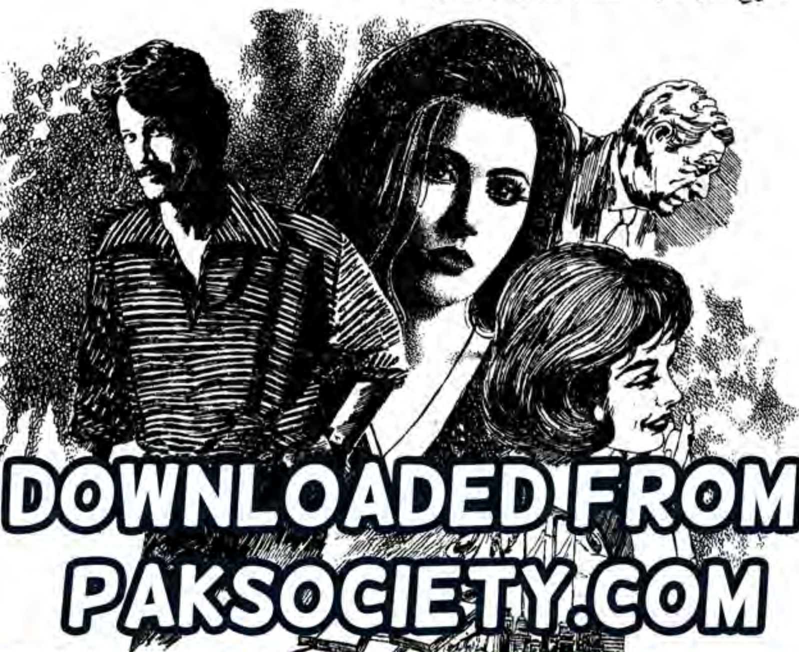
قسط نمبر: 5

وقت

حسام بٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُرعزم بازی گر کی بازی گری ...... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک دلربا طویل داستان

وقت بادشاہ اور کائنات کی ہر شے اس کی رعایا ہے لیکن ... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش انسان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی پل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کردیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمرِ رواں کا نام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھاٹو ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن ... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو بوند پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہوجائے اس کے لڑکھڑاتے قدموں سے بھی قدم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحے کا اسیر تھا ... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی، اس کے باوجود اس کی داستانِ حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج ... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں یاد رہے گا۔





وہ ٹفنی تھی...... انکل سلطان کی بیٹی ٹفنی......!

مجھے رتی برابر بھی شبہ نہیں تھا۔ میری آنکھیں مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔ کیا ہوا جو میں کبھی اس سے ملا نہیں تھا۔ میں نے اسے فوٹوگرافس میں دیکھا تھا، انکل سلطان سے اس کا تذکرہ سنا تھا۔ مجھے صدفی صد یقین تھا کہ وہ ٹفنی ہی تھی۔ وہ ٹفنی تھی تو اس کے ساتھ دوسری دراز قامت لیڈی ایما اسپل بام کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

میں نے خندہ پیشانی سے ان دونوں کا استقبال کیا۔ ہمارے بیچ گرم جوش مصافحہ ہوا پھر وہ میری معیت میں بنگلے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھنے لگیں۔

''تم وہی ہونا جس کا ڈیلفی نے فون پر ذکر کیا تھا۔'' ایما نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ......؟''

''جی بالکل، میں وہی ہوں۔'' میں نے اثبات میں جواب دیا۔

اگرچہ میں نے ٹفنی کو پہچان لیا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات یا کسی ردعمل سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ میں اسے جانتا ہوں اور اس کے رویّے سے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ مجھے جانتی ہے، یہ اچھا ہی تھا۔ اس طرح مجھے اس کے حوالے سے کھوجنے میں کافی آسانی رہتی۔ ٹفنی کو وہاں دیکھ کر مجھے حیرت تو ہوئی تھی کیونکہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا زندگی میں، اس انداز میں ہمارا آمنا سامنا ہوگا۔ ٹفنی کو ایما کے ساتھ دیکھ کر میرے ذہن میں ایک خطرناک تشویش نے انگڑائی لی تھی۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کہیں ٹفنی بھی ان لوگوں کے سیٹ اپ کا حصہ تو نہیں......!

''پھر تو تمہارے ساتھ گپ شپ میں خوب مزہ آئے گا۔'' ایما نے خوش گوار لہجے میں کہا۔

''یہ تو وقت ہی بتائے گا۔'' میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔

''مجھے سائیکالوجی سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔'' ٹفنی نے بیزاری سے کہا۔ ''اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے انسان خود سائیکو ہو گیا ہے۔''

''اس میں سائیکالوجی کا نہیں بلکہ اس انسان کے محسوسات کا قصور ہے جو خود کو سائیکو سمجھنے لگتا ہے۔'' میں نے ٹفنی کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو کوئی اصول نہ ہوا کہ چھری اگر پھل سبزی کاٹے تو بہت اچھی اور اگر پھل سبزی کاٹتے ہوئے اس سے انگلی کٹ جائے تو چھری کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا جائے۔ انگلی کٹ جانے میں چھری کا نہیں بلکہ اسے استعمال کرنے والے کا قصور ہوتا ہے۔''

''بھئی، بہت خوب!'' ایما نے سراہنے والے انداز میں کہا۔

اسی ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں ہم لیونگ روم میں پہنچ گئے۔ ہمیں باہمی بات چیت کرتے ہوئے دیکھ کر ڈیلفی نے کہا۔

''مجھے تو یہ لگتا ہے، تم لوگ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو!''

''ایسی کوئی بات نہیں ڈیلفی جی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو ان معزز خواتین سے آج پہلی بار مل رہا ہوں۔''

وہ یک زبان ہو کر بولیں۔ ''ہمارا بھی ایسا ہی معاملہ ہے۔''

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ٹفنی نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔ وہ کسی ناشناسا کی طرح کا انداز اپنائے ہوئے تھی۔ ڈیلفی نے کہا۔

''تم تینوں اس طرح گھل مل کر باتیں کر رہے تھے کہ مجھے لگا، شاید تم لوگ ایک دوسرے کے شناسا ہو......!''

''تم تعارف کراؤ گی تو شناسائی بھی پیدا ہو جائے گی۔'' ایما نے ایک ادا سے ڈیلفی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم سب تو تمہارے مہمان ہیں۔''

ایما تیکھے نقوش کی مالک ایک جاذب نظر اور پُرکشش عورت تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پائی جاتی تھی جو دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ اس دوران میں ٹفنی خاموش اور سنجیدہ بیٹھی تھی۔

''شیور!'' ڈیلفی نے ایما کی بات کے جواب میں کہا۔ ''لیکن پہلے تم اپنی دوست کا تعارف کراؤ گی۔ اس کے بعد میں......''

ڈیلفی کی بات سے واضح ہو گیا کہ وہ ٹفنی کو ذاتی طور پر نہیں جانتی تھی ورنہ وہ اس کے تعارف کا تقاضا نہ کرتی۔ یہ جان کر میرے اطمینان میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

''یہ ٹفنی ہے...... میری بہت اچھی دوست۔'' ایما نے ٹفنی کو متعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''یہ ایک بہت بڑے نیوز چینل سے وابستہ ہے۔ آج کل کسی دفتری کام سے یہ ڈیلس آئی ہوئی تھی۔ مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔''

''اوہ...... گریٹ!'' ڈیلفی نے ٹفنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''تم کس چینل کے لیے کام کر رہی ہو؟''

''فوکس نیوز۔'' لُغنی نے مختصر سا جواب دیا۔
لُغنی نہایت ہی سنجیدہ، موڈی اور کم گو نظر آتی تھی۔
یوں محسوس ہوتا تھا، وہ اپنے کام سے کام رکھنے کی عادی ہو۔ بعض انسان اپنے مزاج کے اعتبار سے بہت لیے دیے رہتے ہیں۔ لُغنی کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں کیا جاسکتا تھا۔

''یہ مسٹر علی ہیں!'' ڈیلفی نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دو دن سے یہ میرے پاس ٹھہرے ہوئے تھے۔ کل رخصت ہوجائیں گے۔ یہ سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہے لیکن اس کی اپنی سائیکالوجی کافی بگڑی ہوئی ہے۔''

''دیکھا، تمہاری دوست بھی میری بات کی تائید کررہی ہے۔'' لُغنی نے ایما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات؟'' ڈیلفی کے کان کھڑے ہوگئے۔

''اس طرف آتے ہوئے میں ایما سے کہہ رہی تھی کہ سائیکالوجی کا سبجیکٹ مجھے بہت بور لگتا ہے۔'' لُغنی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس موضوع پر چند منٹ گفتگو سن لیں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود نفسیاتی مریض بن گئے ہیں......'' لمحاتی توقف کرکے اس نے گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''اور...... جو اس سبجیکٹ کا اسٹوڈنٹ ہوگا اس بے چارے کی سائیکالوجی پر کیا گزرتی ہوگی اس کا اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

یہ اس نے براہِ راست مجھ پر حملہ کیا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ پہلی ملاقات میں لُغنی مجھے سائیکو لگی تھی۔ اس کی گفتگو کا انداز منفی اور غیر صحت مند تھا۔ میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا لیکن وہ خوامخواہ ہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑگئی تھی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ وہ انکل سلطان کے حوالے سے مجھے جانتی نہیں تھی۔ میں نے طے کرلیا کہ پہلی ملاقات ہے تو کیا ہوا۔ آج میں اس کی کاسٹک سوڈے سے دھلائی کروں گا۔ میں نے اس کے دماغ کے کیڑے نہ جھاڑے تو میرا نام بھی اسد علی نہیں ہے۔

''ایک جرنلسٹ اور سائیکالوجسٹ میں یہی فرق ہوتا ہے!'' میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟'' ڈیلفی نے دلچسپی بھرے لہجے میں پوچھا۔

''جرنلسٹ بغیر سوچے سمجھے جو منہ میں آتا ہے، بول دیتا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ سائیکالوجسٹ جب تک اچھی طرح خاطر تواضع نہ کرلے، سوالات کا آغاز نہیں کرتا اور وہ جو بھی بولتا ہے، بہت ناپ تول کر بولتا ہے۔''

''ناپ تول کا اندازہ تو اسی وقت ہوگا جب تم کچھ بولنا شروع کروگے۔'' لُغنی نے تیکھے انداز میں کہا۔

''میں نے عرض کیا نا...... خالی پیٹ نہیں۔ پہلے آپ لوگوں کی کچھ خاطر مدارات ہوجائے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر ڈیلفی کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''آپ میزبان ہیں۔ خاطر تواضع کی زحمت تو آپ ہی کو کرنا ہوگی۔''

''ضرور، ضرور...... کیوں نہیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے اٹھی اور کچن کی جانب بڑھ گئی۔

''علی! تم نے جرنلسٹ اور سائیکالوجسٹ کی مثال دی اور فلاسفر کو بھول گئے۔'' ایما نے شکایتی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا کیوں؟''

''فلاسفی اور سائیکالوجی آپس میں کزن ہیں اور بڑے اتفاق سے رہتی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے محبت کرتی ہیں جبکہ یہاں کشیدگی زیرِ بحث ہے۔'' میں نے لُغنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر ایما کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کردی۔

''اگر کبھی ہمارے بیچ الجھاؤ پیدا ہوا تو ضرور مثال دوں گا۔''

''میری دوست بہت اچھی ہے۔'' ایما نے لُغنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ مت الجھو۔ تمہیں اس کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مجھے تمہاری دوست کی طاقت کا بہ خوبی اندازہ ہوچکا ہے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔ ''باقی جہاں تک الجھاؤ والی بات ہے تو پہل تمہاری دوست نے کی ہے اور میں سمجھتا ہوں، اس میں ڈیلفی کا کوئی قصور بھی نہیں......''

''ڈیلفی یا لُغنی؟'' ایما نے الجھن زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''اوہ سوری۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ''میں لُغنی ہی کہنا چاہ رہا تھا لیکن منہ سے ڈیلفی نکل گیا۔''

''لگتا ہے، تمہارے دماغ پر ڈیلفی کچھ زیادہ ہی سوار ہے!'' ایما نے چوٹ کی۔

''نہیں تو......'' میں نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ڈیلفی تو کچن کی طرف گئی ہے۔ میرے سر پر تو کوئی بھی سوار نہیں......''

''ایکٹنگ بھی کافی اچھی کر لیتے ہو......!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب یہ بھی بتادو کہ تم نے ٹفنی کی طاقت کا اندازہ کیسے لگالیا اور تم نے یہ کیوں کہا کہ اس میں ٹفنی کا کوئی قصور نہیں؟''

''بائی گاڈ! میں ایکٹنگ نہیں کر رہا۔'' میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اور جہاں تک ٹفنی کی طاقت کو اسٹیمیٹ کرنے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں انسانی نفسیات یہ کہتی ہے کہ جو بچے والدین کی محبت سے محروم رہ کر پروان چڑھتے ہیں ان کی ذہنی نشوونما میں کہیں نہ کہیں کمی رہ جاتی ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر چاہے کامیابی کے کتنے ہی زینے کیوں نہ طے کرلیں، ان کے اندر سے احساسِ محرومی نکل نہیں پاتا بلکہ یہ احساسِ محرومی، احساسِ کمتری میں بدل جاتا ہے اور ردِعمل کے طور پر وہ انسان احساسِ برتری کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر وہ ہر کسی سے الجھنے لگتا ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ بھئی، کسی سے پہلی بار ملاقات ہو رہی ہے۔ اس کے جذبات کا تھوڑا بہت خیال تو رکھنا چاہیے...... رکھنا چاہیے یا نہیں؟''

آخری جملہ میں نے ٹفنی کی طرف دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ اس نے میرے استفسار پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا لیکن ایپل بام پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

''علی! تم آج پہلی مرتبہ ٹفنی سے ملے ہو۔ پھر تم نے کیسے اندازہ لگالیا کہ یہ بچپن میں والدین کی محبت سے محروم رہی ہوگی؟''

''ٹفنی کے ماتھے کی ریکھائیں یہ اسٹوری سنا رہی ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اس وقت میں فل مذاق کے موڈ میں تھا اور ایسا سنجیدہ مذاق جو کسی کی پکڑ میں نہ آئے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ٹفنی کو خوب رگڑا لگاؤں گا۔ ناشناسائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اس کے کس بل نکالنے کی کوشش کروں گا۔

''تو کیا تم فیس ریڈنگ کرتے ہو؟'' ایما نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اسی لمحے ڈیلفی کھانے کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے لیونگ روم میں داخل ہوئی اور ہمیں آپس میں محوِ گفتگو پا کر اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''کیا چل رہا ہے......؟''

''فیس ریڈنگ!'' ایما نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کون کس کے فیس کی ریڈنگ کر رہا ہے؟'' وہ سافٹ ڈرنکس اور مختلف اسنیکس کو ٹرالی سے نکالتے ہوئے مستفسر ہوئی۔

''یہ کھیل ان دونوں کے بیچ ہو رہا ہے۔'' ایما نے میری اور ٹفنی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈیلفی کو بتایا۔

''تو کیا تمہاری دوست فیس ریڈنگ کا علم رکھتی ہے؟'' ڈیلفی نے پوچھا۔

''میری دوست نہیں بلکہ تمہارا دوست......!''

''کیا مطلب؟'' ڈیلفی کی آواز حیرت میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''علی... ٹفنی کے ماتھے کی ریکھاؤں کو دیکھ کر بڑی سنسنی خیز پیش گوئیاں کر رہا ہے۔'' ایما نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سنو گی تو حیران...... بلکہ پریشان رہ جاؤ گی......''

''واؤ...... پھر تو میں ضرور سنوں گی۔'' ڈیلفی نے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''حیران اور پریشان ہوئے کافی عرصہ ہو گیا۔ ہاں تو علی نے ٹفنی کے بارے میں ایسی کون سی سنسنی خیز پیش گوئی کر دی ہے؟''

''یہ کہتا ہے، ٹفنی کے ماتھے کی ریکھائیں بتاتی ہیں کہ اس نے اپنا بچپن والدین کی محرومی کے ساتھ گزارا ہے۔'' ایما نے کہا۔

''علی! تم نے یہ پیش گوئیوں والا کام کب سے شروع کر دیا؟'' ڈیلفی نے براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''آج اس پریکٹس کی اوپننگ ہے۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اور میرا پہلا کلائنٹ ٹفنی صاحبہ ہیں۔''

''میرے لیے واقعی یہ ایک بڑی خبر ہے۔'' ڈیلفی نے کہا پھر مجھ سے پوچھا۔ ''علی! تم نے یہ علم کہاں سے اور کس سے سیکھا ہے؟''

''کہاں سے اور کس سے......!'' میں نے پُرسوچ انداز میں اس کے الفاظ دُہرائے اور سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے فیس ریڈنگ کا علم اسی بنگلے میں آنے کے بعد سیکھا ہے اور میرے استادِ محترم ہیں، ربی آئزک باروخ لاؤ۔''

''اوہ رئیلی۔'' ڈیلفی بے یقینی سے مجھے تکنے لگی۔ ''لیکن تم نے کس وقت ان سے یہ علم سیکھا ہے؟''

''جب تم کسی خبیث الاخبث کے ساتھ دھینگا مشتی میں مصروف تھیں۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ علم سیکھ لیا۔''

''اوہ......'' اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ''لیکن ربی کے ساتھ تو تمہاری صرف ایک ہی

ملاقات ہوئی ہے۔ اس مختصر سی گفتگو میں انہوں نے تمہیں فیس ریڈنگ کا علم کیسے سکھا دیا؟''

''کیسے سکھا دیا؟ اس سوال کا جواب تو ربی ہی دے سکتے ہیں۔'' میں نے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھتے ہوئے کندھے اچکائے۔'' میں تو صرف اپنے معاملات کے لیے جواب دہ ہوں اور فیس ریڈنگ کے نتائج کا ذمے دار ہوں۔''

''علی ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' فلسفے کی پروفیسر صاحبہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' اس نے فیس ریڈنگ کا علم کب، کیسے، کہاں سے اور کس سے سیکھا...... اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ جو پیش گوئی کررہا ہے اس میں کتنے فیصد سچائی ہے۔''

''اس بات کا جواب تو ٹفنی ہی دے سکتی ہے۔'' ڈیلفی نے ایک منطقی بات کی پھر براہِ راست سوال بھی کردیا۔'' ٹفنی! تم کیا کہتی ہو۔ علی کی پیش گوئی میں کتنے فیصد صداقت ہے؟''

''صفر فیصد......!'' وہ کمال ڈھٹائی سے بولی۔

''تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ علی بالکل غلط کہہ رہا ہے۔'' ڈیلفی نے پوچھا۔'' تمہارا بچپن والدین کے سائے میں گزرا ہے اور اس حوالے سے تم نے کوئی محرومی نہیں دیکھی؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہے۔'' وہ بے شرمی سے بولی۔ ''مسٹر علی صاحب کا علم فضول ہے...... ایک دم بے معنی......''

یا تو ٹفنی جان بوجھ کر اس اکھڑپن کا مظاہرہ کررہی تھی اور اس رویے کے پیچھے اس کا کوئی خاص مقصد تھا یا پھر وہ بنیادی طور پر تھی ہی ایسی بدمزاج۔ ڈیلفی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

''علی! اب تم کیا کہتے ہو؟''

''میرے کچھ کہنے سے معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

''یہ ضروری نہیں ہے۔'' ڈیلفی بڑی رسان سے بولی۔'' تمہارے پاس کہنے کے لیے جو کچھ بھی ہے، اسے مناسب الفاظ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ ہم سب لوگ معقول اور پڑھے لکھے انسان ہیں۔ تم بولو جو تمہارا علم کہتا ہے۔ مجھے یقین ہے، معاملہ بگڑے گا نہیں۔''

''بولنے کے لیے انسان کے پاس کچھ ہونا بھی ضروری ہے!'' ٹفنی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔'' علی کا علم تک بندی سے زیادہ کچھ نہیں۔''

''علی! تمہارے علم کو چیلنج کیا جارہا ہے۔'' ایما نے اکسانے والے انداز میں کہا۔'' یہ تو عزت اور بے عزتی والا معاملہ بن گیا ہے۔''

''عزت اور ذلت میرے مالک کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔'' مخلوط نسل کا علم بردار کوئی انسان میرے علم کو کیا چیلنج کرے گا......!''

''مخلوط نسل......؟'' ڈیلفی نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' ایما نے پوچھا۔

ٹفنی ٹس سے مس نہ ہوئی اور خاموش بیٹھی رہی۔

''اگر میزبان کی اجازت ہو تو وضاحت کرتا ہوں!''

ڈیلفی... جلدی سے بولی۔'' اجازت ہے۔''

''میرا علم قیافہ یہ کہتا ہے کہ......'' میں نے ٹفنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا...... '' کہ آپ کی ماں اور باپ دو مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے اور تمہارے بچپن ہی میں ان دونوں میں علیحدگی ہوگئی تھی۔ ماں تمہیں اپنے ساتھ لے کر کہیں اور چلی گئی تھی۔ تم نے باپ کے سائے سے محروم رہ کر اپنی ماں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ تم آج جو کچھ بھی ہو، وہ تمہاری ماں کی محنت کا نتیجہ ہے لیکن افسوس کہ اب تمہاری ماں اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔''

ایما اور ڈیلفی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھیں جبکہ ٹفنی بے چینی کے عالم میں پہلو بدل کر رہ گئی تھی۔ ڈیلفی نے ٹفنی سے پوچھا۔

''کیا علی ٹھیک کہہ رہا ہے......؟''

''ہاں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات درست ہیں۔'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔'' لیکن اس میں فیس ریڈنگ کا کوئی کمال نہیں۔ میری زندگی سے متعلق یہ باتیں تو بہت سے لوگوں کے علم میں ہیں۔ اس نے بھی کہیں سے سن لیا ہوگا۔''

''یہ سب میرے علم نے بتایا یا میں نے کہیں سے سن لیا ہوگا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔'' مجھے ٹفنی سے یا اس کی ابتدائی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے...... ابتدائی کیا، مجھے تو اس کی درمیانی اور آخری زندگی سے بھی کچھ لینا دینا نہیں لہٰذا مٹی ڈالیں اس ٹاپک پر۔''

''کیسے مٹی ڈال دیں۔'' ایما مچل گئی۔'' ٹاپک تو آگے بڑھے گا۔ اگر تمہیں ٹفنی سے کوئی دلچسپی نہیں تو کیا ہوا، تم میرے ماتھے کی ریکھاؤں کو دیکھ کر میرے بارے میں کوئی پیش گوئی کرو۔''

''آئی ایم سوری۔'' میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔'' یہ ممکن نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' ایما الجھن زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

''میں بتاتی ہوں۔'' ٹفنی بیچ میں کود پڑی۔ ''یہ ممکن اس لیے نہیں کہ فیس ریڈر صاحب آپ کے ماضی سے واقفیت نہیں رکھتے اس لیے یہ آپ کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''پھر کیسی بات ہے؟'' ڈیلفی نے مجھ سے استفسار کیا۔

''گروجی کی اجازت نہیں۔'' میں نے بہ دستور گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں گروجی کے حکم کو ٹال نہیں سکتا۔''

''کون گروجی؟'' ڈیلفی نے پوچھا۔

''ربی آئزک!'' میں نے جواب دیا۔

ایما نے استفسار کیا۔ ''کیا ربی نے تمہیں میری فیس ریڈنگ کرنے سے منع کر رکھا ہے؟''

''کسی خاص آدمی کی قید نہیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اس ممانعت کا تعلق نمبر آف کلائنٹس سے ہے۔ ربی نے مجھے اس بات کا پابند کر رکھا ہے کہ ایک دن میں صرف ایک کلائنٹ کی فیس ریڈنگ کرنا ہے۔ آج بارہ جون ہے اور جمعرات کا دن اور آج میں نے آپ کی دوست ٹفنی کی فیس ریڈنگ کی ہے۔ اگر کسی اور شخص کو فیس ریڈنگ کرانا ہو تو چھ گھنٹے تک انتظار کرنا ہوگا۔ رات کو بارہ بجے جب تیرہ جون کی تاریخ شروع ہوگی تو پھر میں آپ کی یا کسی اور کی فیس ریڈنگ کر سکتا ہوں البتہ......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹفنی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آج رات بارہ بجے تک تمہارا اکاؤنٹ آن ہے۔ اگر تم کچھ پوچھنا چاہو تو میں ضرور بتاؤں گا......''

''مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔'' ٹفنی اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''اگر تم کچھ نہیں پوچھنا چاہو گی تو پھر میں بس اتنا ہی بتاؤں گا کہ تمہاری ماں عیسائی اور باپ مسلمان تھا۔ تمہارا پیدائشی نام آمنہ تھا لیکن بعد میں تمہاری ماں نے تمہیں ٹفنی بنا دیا......''

''اسٹاپ اٹ!'' ٹفنی نے جارحانہ انداز میں کہا۔

''مجھے فیس ریڈنگ میں کوئی دلچسپی نہیں۔''

میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''اٹس اوکے۔''

ٹفنی ایک گھنٹا مزید وہاں رکی۔ اس دوران میں ہمارے بیچ پھر کوئی بات نہیں ہوئی البتہ وہ تینوں آپس میں گپ شپ کرتی رہی تھیں۔ میں گاہے بگاہے ایما اور ڈیلفی کی باتوں کا جواب دے رہا تھا تاہم فیس ریڈنگ کے موضوع پر پھر کوئی بات نہیں ہوئی۔

آٹھ بجے ڈیلفی نے کہا۔ ''ڈنر کے لیے باہر چلتے ہیں۔''

''تم لوگ جاؤ۔ میں اب واپس جاؤں گی۔'' ٹفنی نے کہا۔ ''میں تو بس ایما کو یہاں ڈراپ کرنے آگئی تھی۔ اینی ہاؤ، آپ لوگوں کے ساتھ اچھا وقت گزرا۔''

ٹفنی نے ''آپ لوگوں'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ظاہر ہے، میں ان ''آپ لوگوں'' میں شامل نہیں تھا۔ ڈیلفی نے بہت کوشش کی لیکن ٹفنی ڈنر کے لیے رکی نہیں۔ اس نے اپنی بعض پروفیشنل مصروفیات کا حوالہ دیا تو ڈیلفی اسے اپنے پاس مزید نہیں روک سکی۔ ایما، ٹفنی کو سی آف کرنے بنگلے کے گیٹ کی طرف گئی تو ڈیلفی نے مجھے گھیر لیا۔

''کیا تمہیں واقعی فیس ریڈنگ آتی ہے؟''

''بالکل نہیں۔''

''پھر یہ سب کیا تھا؟''

''انٹرٹینمنٹ......'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''میں تمہاری دوست کی دوست ٹفنی کو انٹرٹین کر رہا تھا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''لیکن تمہارے اندازے تو بالکل درست تھے!''

''میرے اندازے اکثر درست ہی ہوتے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جیسا کہ......!''

''کیا جیسا کہ؟'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھی۔

''جیسا کہ میرا اندازہ ہے، تم بہت خوب صورت ہو۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔ ''اور میرا یہ اندازہ بالکل درست ہے۔''

وہ جزبز ہوتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں بولی۔

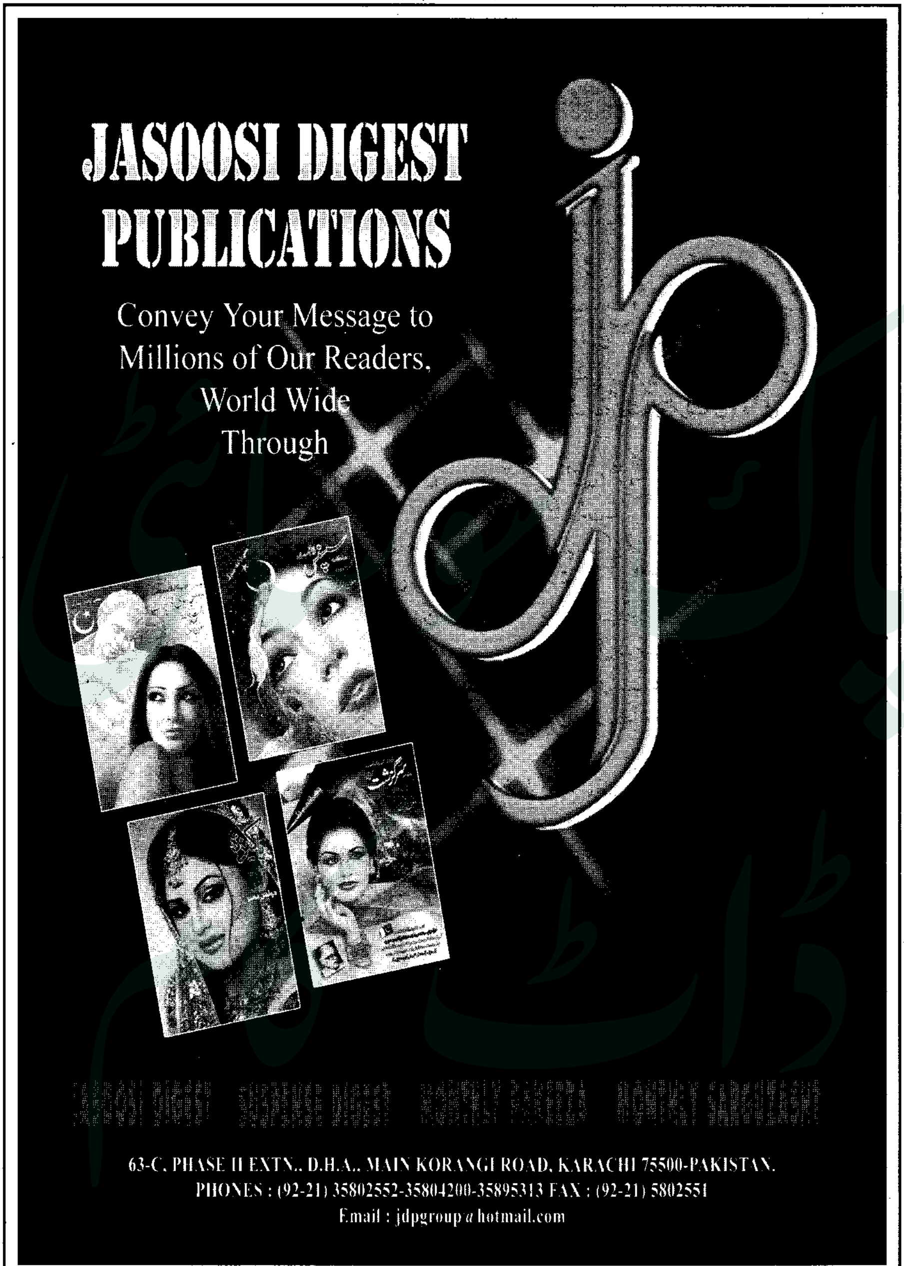
''میں سنجیدہ ہوں علی۔ مجھے بتاؤ، تم نے ٹفنی کے بارے میں اتنے درست اندازے کیسے لگائے؟''

''سچ بتا دوں......!''

''ایک دم سچ۔'' وہ قطعیت سے بولی۔

''ٹفنی صحیح کہہ رہی تھی۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کہ مجھے اس کے بارے میں کہیں سے معلومات مل گئی ہوں گی اور میں انہی معلومات کی بنا پر اس کی ابتدائی زندگی کے حوالے سے پیش گوئیاں کر رہا ہوں۔''

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ٹفنی کے بارے میں پہلے


JASOOSI DIGEST PUBLICATIONS
Convey Your Message to Millions of Our Readers, World Wide Through
63-C, PHASE II EXTN., D.H.A., MAIN KORANGI ROAD, KARACHI 75500-PAKISTAN.
PHONES : (92-21) 35802552-35804200-35895313 FAX : (92-21) 5802551
Email : jdpgroup@hotmail.com

سے کافی کچھ جانتے ہو؟'' ڈیلفی نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''میں لُفنی کے بارے میں کم اور اس کے مسلم باپ کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''لُفنی کا باپ کون ہے؟'' ڈیلفی نے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔''علی سلطان...... وہی انکل سلطان جو میرے مربی، میرے گارجین، میرے محسن، میرے خیرخواہ اور میرے سب کچھ ہیں۔''

''اوہ......!'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''انکل سلطان نے ایک عیسائی عورت ریٹا میگڈالین سے اوٹاہ کے شہر سالٹ لیک سٹی میں شادی کی تھی۔ لُفنی کی پیدائش کے بعد انکل اور ریٹا کے بیچ اختلافات پیدا ہوگئے۔ پھر یہ رنجشیں اس قدر بڑھیں کہ دونوں نے اپنے راستے الگ کرلیے۔ اب ریٹا اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔ مجھے یہ ساری معلومات انکل سلطان نے فراہم کی ہیں۔ میں نے لُفنی کو صرف فوٹوگرافس میں دیکھا ہے۔ آج ہماری پہلی ملاقات تھی لیکن میں نے اسے پہچان لیا۔''

''حیرت ہے، اس نے تمہیں نہیں پہچانا......!''

''اسے میرے بارے میں کسی نے بتایا نہیں ہوگا۔'' میں نے اظہارِ خیال کیا۔

''لیکن تم نے اسے چڑانے والی باتیں کیوں کیں؟'' ڈیلفی نے پوچھا۔

''بدمزگی کا آغاز اس کی طرف سے ہوا تھا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔''میں نے تو اس سلسلے کو بس آگے بڑھایا ہے۔''

''بُری بات۔'' وہ سرزنش کرنے والے انداز میں بولی۔

''تمہیں استانی بننے کا بہت شوق ہے کیا؟'' میں نے میٹھی ناراضی سے کہا۔''میں نے جو کیا وہ بری بات اور وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ سب اچھا تھا...... ہیں نا!''

''وہ میرے گھر آئی تھی اور میری مہمان تھی۔''

''اسی لیے تو میں نے ہاتھ ہلکا رکھا ہے۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔''ورنہ اس نے جیسے میرا اور سائیکالوجی کا مذاق اڑایا تھا اگر وہ تمہاری مہمان نہ ہوتی تو میں اس کے سارے کس بل نکال کر رکھ دیتا۔''

اسی وقت ایما واپس آگئی۔ ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تم کتنے چالاک ہو علی......!''

''کیا مطلب؟'' میں اچھل پڑا۔''میں نے کیا چالاکی کی ہے؟''

''پتا ہے، لُفنی تمہارے بارے میں کیا کہہ رہی تھی......!''

''نہیں پتا...... تم بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''وہ تمہارے لیے لالچی اور موقع پرست کے الفاظ استعمال کر رہی تھی۔'' ایما نے بتایا۔

میں نے باری باری ایما اور ڈیلفی کے چہرے کی طرف دیکھا پھر سادہ سے لہجے میں کہا۔''میں نے لُفنی سے جو کچھ کہا، تم دونوں کے سامنے کہا ہے۔ اس میں لالچ اور موقع پرستی والی کون سی بات تھی؟''

''تم کسی علی سلطان کو جانتے ہو؟'' ایما نے پوچھا۔

''میں صرف ایک علی سلطان کو جانتا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔''اور وہ میرے انکل ہیں، میرے گارجین ہیں۔''

''اور یہی علی سلطان لُفنی کا باپ ہے۔'' ایما نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔''لُفنی نے تمہیں پہچان لیا تھا لیکن اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ تمہیں جانتی ہے جیسے تم نے سب کے سامنے اس سے اپنی شناسائی چھپائی۔ اس کا کہنا ہے کہ تم اس کے باپ کی دولت اور جائداد پر نیت لگائے بیٹھے ہو۔''

''نیت کا حال صرف مالک جانتا ہے۔'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔''اگر اسے اپنے باپ کا اتنا ہی خیال ہے تو پھر انکل کی کیئرٹیکر بن جائے نا......!''

''کلوز دس ٹاپک پلیز۔'' ڈیلفی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''جو ہوگیا اسے بھول جاؤ۔ آگے کیا کرنا ہے اس کے بارے میں سوچو۔''

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔''آگے کیا کرنا ہے؟''

''اٹ از ٹائم ٹو ڈنر......!'' وہ اعلان کرنے والے انداز میں بولی۔

☆☆☆

رات کا ایک بجا تھا۔ اس بنگلے پر میرے قیام کے باسٹھ گھنٹے گزر چکے تھے۔ مزید مجھے دس گھنٹے یہاں ٹھہرنا تھا۔ اس کے بعد میں کہیں بھی جانے کے لیے آزاد ہوتا۔ میرے یہاں قیام کے دوران میں جو واقعات پیش آئے ان میں میرے لیے بہت کچھ نیا اور حیرت انگیز تھا لیکن ابھی تک وہ اہم مقصد میرے سامنے نہیں آسکا تھا جس کی خاطر ڈیلفینا نے میرے لیے اس بنگلے پر بہتّر گھنٹے قیام کی شرط لگائی تھی۔ وہ مجھے اپنی سوسائٹی کا ممبر بنانے کا ارادہ رکھتی تھی اور اسی

سلسلے میں وہ مجھ سے کوئی معاہدہ کرنا چاہتی تھی۔ ابھی تک میں نے اس مبینہ ایگری منٹ کا تذکرہ ہی سنا تھا، کوئی عملی چیز نکل کر سامنے نہیں آسکی تھی۔

میں نے بیڈروم کی لائٹس آف کردی تھیں اور اپنے بیڈ پر لیٹا خود کو پیش آمدہ حالات کے بارے میں غور کررہا تھا۔ ہم لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے ڈنر سے واپس آئے تھے پھر میرے اور ایما ایپل بام کے بیچ خاصی سنجیدہ اور معلومات افزا گفتگو ہوئی تھی۔ ایما یہودن تھی اور ڈیلفی کی طرح وہ بھی سیکرٹ سوسائٹی کی ممبر تھی تاہم وہ ڈیلفی سے کافی جونیئر تھی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس بنگلے پر جو کچھ بھی پیش آرہا تھا، وہ ایک طے شدہ پروگرام کا حصہ تھا اور اس پروگرام کا تعلق میری ذات سے تھا۔

سب سے زیادہ ڈیلفینا عرف ڈیلفی نے اپنے اختیارات کی طاقت سے مجھے متاثر کیا تھا۔ لیک جیکسن کے پلانٹیشن ڈرائیو پر واقع ''چرچ چکن ریسٹورنٹ'' کے کچن میں میرے اور پیبلو کے بیچ ہونے والی خون ریز لڑائی کی ویڈیو حاصل کرنا کوئی معمولی بات نہیں تھی اور یہ غیر معمولی کام ڈیلفی نے کردکھایا تھا پھر شارو کے حوالے سے اس کی فراہم کردہ اطلاعات کو بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا اور سب سے بڑھ کر ''پیبلو مرڈر کیس'' سے میری بریت تھی۔ اس نیوز بلیٹن نے تو میرا دماغ گھما کر رکھ دیا تھا۔ ایلخیندرو نامی ہسپانوی شخص نے جس طرح پیبلو کو قتل کرنے کا اقرار کیا تھا وہ ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز تھا۔ لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی کسٹڈی میں ایلخیندرو نے جو بیان دیا تھا اس نے مجھے پیبلو کے قتل والے معاملے سے بالکل ہی الگ اور لاتعلق کردیا تھا۔ امریکا جیسے ملک میں یہ ناممکن کام ڈیلفینا کے اثر رسوخ کے باعث ہوا۔ ان واقعات نے میری نگاہ میں اس کی قدروقیمت کو واضح کردیا تھا۔

ان تحیر آمیز واقعات کا یہ سلسلہ یہیں پر رکا نہیں تھا بلکہ آئندہ روز ربی آئزک نے ملاقات میں مجھ سے جو گفتگو کی تھی اس نے تو میرے دماغ کی چولیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اول تو میں اپنے والدین کے بارے میں کچھ جانتا ہی نہیں تھا۔ میری اس لاعلمی پر ربی نے میڈم غریدہ اور الفریڈ کے حوالے سے جو کہانی سنائی تھی، وہ میرے ذہن کو جھنجوڑ دینے کے لیے کافی تھی۔ ربی تو اس بات پر مصر تھا کہ انہیں غریدہ اور الفریڈ کے جس بیٹے کی تلاش ہے، وہ میں ہی ہوں۔ اس سلسلے میں ربی کے پاس چونکہ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا اس لیے اس نے فتویٰ جاری نہیں کیا تھا ورنہ میں اس کی آنکھوں میں شک آمیز یقین کو بڑے واضح انداز میں دیکھ چکا تھا۔

مثبت اور منفی ڈیلفینا کے درمیان ہونے والی محاذ آرائی اور فتح وشکست کو میں اپنے واقعات کے ساتھ منتھی نہیں کروں گا کیونکہ وہ ڈیلفی کے ذاتی مسائل تھے لیکن ایما ایپل بام کی آمد اور مجھ سے ہونے والی گفتگو نے ایک بار پھر میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجادی تھی اور میں یہ محسوس کیے بنا نہیں رہ سکا تھا کہ وہ ربی کی آمد کے سلسلے ہی کی کڑی ہے۔ دونوں میں بہت سی باتیں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی تھیں۔

ان دونوں کا تعلق ایک ہی سیکرٹ سوسائٹی یعنی ''اسکل اینڈ بونز'' سے تھا جس کا ہیڈ کوارٹر ریاست کنکٹیکٹ کے شہر نیوہیون میں واقع ییل یونیورسٹی کے اندر تھا۔ ربی تل ابیب سے ییل یونیورسٹی اور پھر پریسٹن ہالو تک پہنچا تھا۔ اسرائیل سے کنکٹیکٹ اور پھر ڈیلس آنا معنی رکھتا تھا۔ ایپل بام کا تعلق بھی ییل یونیورسٹی سے تھا اور وہ وہاں پر فلسفے کی پروفیسر تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ایما ایپل بام سے ہونے والی گفتگو میں تین اہم باتیں سامنے آئی تھیں۔

نمبر ایک، اس نے مجھے تجویز دی تھی کہ میں نے سائیکالوجی میں بیچلر ڈگری حاصل کرلی تھی۔ اب مجھے ییل یونیورسٹی کا رخ کرنا چاہیے تاکہ سائیکالوجی کے ساتھ فلسفہ بھی پڑھ سکوں۔ نمبر دو، اس نے مجھے سیکرٹ سوسائٹی میں شمولیت کا مشورہ بھی دیا تھا۔ نمبر تین، اس نے بتایا تھا کہ یہودی پوری دنیا پر حکمرانی کے لیے ایک خصوصی جنگ کا آغاز کرنے والے ہیں۔ اس حوالے سے اس نے اپنی مقدس کتاب تالمود کا ذکر کیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ تالمود میں بڑے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ جب مسلسل چار مکمل چاند گرہن یہودیوں کے مذہبی تہوار والے مہینوں میں لگیں گے تو وہ پوری دنیا کا کنٹرول حاصل کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں کود پڑیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سال اور اگلے سال ایسا ہوگا۔ یعنی دو مکمل چاند گرہن اس سال اور دو مکمل چاند گرہن آئندہ سال ایسے مہینوں میں ہوں گے جو یہودیوں کے مذہبی تہوار کے مہینے ہیں۔ ہمارے درمیان یہ گفتگو دو ہزار چودہ میں ہورہی تھی۔ اس نے چاند گرہن کے حوالے سے دو ہزار چودہ اور دو ہزار پندرہ کا ذکر کیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے بعد ایسا موقع دو ہزار بتیس اور دو ہزار تینتیس میں آئے گا۔

یہ ساری باتیں تو اپنی جگہ تھیں۔ ان میں سے کیا ہونا تھا اور کیا نہیں ہونا تھا، یہ تو آنے والا وقت ہی بتاتا۔ میرے

لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ لوگ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے تھے اور یہ ٹفنی کا معاملہ...... ڈیلفی، ٹفنی کو نہیں جانتی تھی۔ اگر جانتی تھی تو پھر اس نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ ایما نے ٹفنی کو اپنی دوست کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا لیکن یہ واضح نہیں ہوسکا تھا کہ ٹفنی کو وہاں لانے سے ایما کا مقصد کیا تھا۔ میرے اور ٹفنی کے بیچ جس قسم کی گفتگو ہوئی تھی، کیا وہ یہی سب کرنے کے لیے یہاں آئی تھی اور جاتے ہوئے مجھے لالچی اور موقع پرست بھی ڈکلیئر کرگئی تھی......!

نہیں...... وہ صرف اس مقصد کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔ یہ ایک سوچا سمجھا کھیل تھا جو قسط وار میرے سامنے پیش کیا جا رہا تھا۔ ربی کو پہلا شک یہی تھا کہ میں غریدہ اور الفریڈ کا بیٹا ہوں۔ اگر ایسا نہیں تو دوسرا شک یہ تھا کہ میں علی سلطان کا غیر اعلانیہ بیٹا ہوں۔ شاید اسی سلسلے میں ٹفنی کو یہاں پہنچایا گیا تھا اور اس سے یہ بتانا بھی مقصود تھا کہ...... دیکھو علی! ہماری ٹفنی تک بھی اپروچ ہے۔ ہم جب چاہیں اور جو چاہیں، وہ کرسکتے ہیں لہٰذا ہمارے سامنے غلط بیانی اور چالاکی نہیں چلے گی......!

کون چالاک ہے اور کتنا چالاک ہے اس بات کا فیصلہ تو آنے والے وقت نے کرنا تھا اور وقت جو فیصلہ کرتا ہے، وہ اٹل ہوتا ہے...... اور وقت کسی سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ نہیں کرتا اور نہ ہی اس کے فیصلے کے خلاف کسی اعلیٰ عدالت میں رجوع کیا جاسکتا ہے۔ وقت کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے اور چاروناچار اس کے سامنے سرِتسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے۔

میں نے بستر چھوڑ دیا۔ وقت ایک بجے سے کافی آگے جاچکا تھا۔ میں نے لائٹس کو آف ہی رہنے دیا تاکہ یہ تاثر قائم رہے کہ میں اپنے بیڈروم کے اندر گہری نیند سو رہا ہوں۔ یہ تاثر قائم رکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ ان لمحات میں مجھے ایک نہایت ہی اہم کام کرنا تھا۔

میں نے بہ آہستگی دروازہ کھولا اور بیڈروم سے باہر نکل آیا۔ میرے سامنے بنگلے کا کشادہ لان تھا جس کے وسط میں ایک عظیم الشان سوئمنگ پول بنا ہوا تھا۔ اس سوئمنگ پول پر نگاہ پڑتے ہی میرے ذہن میں منفی ڈیلفینا کا سراپا روشن ہوجاتا تھا پھر اس کی سرخ انگارا آنکھیں میرے ہوش وحواس پر سحر پھونکنے لگتی تھیں۔ اگر ربی اور ڈیلفی کی بیان کردہ کہانی میں حقیقت تھی تو پھر یہ بہت پراسرار چکر تھا اور بعض اشارے صداقت کی جانب اشارہ کرتے تھے جیسے میں نے جو خواب دیکھے تھے، ان کی سچائی کو جھٹلایا نہیں جاسکتا تھا۔ میں نے بیڈروم کا دروازہ بند کیا اور اپنے پڑوسی بیڈروم کی جانب بڑھ گیا۔

یہ وہی بیڈروم تھا جہاں آج صبح بلکہ پچھلی رات آگ بھڑک اٹھی تھی تاہم ڈیلفی کی حکمتِ عملی نے نہ صرف یہ کہ اس پر قابو پالیا تھا بلکہ اس آتشزدگی کے باعث ہونے والی تباہ کاریوں کا بھی کماحقہ ''ازالہ'' کردیا تھا۔ وہ بڑی باتدبیر قسم کی لیڈی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے پاس گیدڑ سنگھی ہو یا اس نے کوئی فرماں بردار قسم کا جن قابو کر رکھا ہو اور یا پھر وہ خود ہی کوئی جن زادی ہو......!

میں نے پڑوسی بیڈروم کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ کر اسے گھمانے کی کوشش کی لیکن میری یہ کوشش بارآور ثابت نہ ہوسکی کیونکہ وہ دروازہ لاک تھا۔ میں دھیرے سے مسکرا کر رہ گیا کیونکہ اس دروازے کا لاک ہونا میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

میں نے اپنی جیب سے چابیوں والا وہ گچھا نکال لیا جو میں نے اس بیڈروم کے اندر سے پار کیا تھا۔ یہ چابیوں والا گچھا بہت کام کی چیز تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں جس نوعیت کا سنسنی خیز منصوبہ تھا، اس میں یہ گچھا بہت مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ میں اس گچھے میں موجود چابیوں کو یکے بعد دیگرے کی ہول میں آزمانے لگا۔

تیسری چابی پر مجھے کامیابی حاصل ہوگئی۔ کی ہول کے اندر چابی کے گھومتے ہی دروازہ کھل گیا۔ اگلے ہی لمحے میں اس بیڈروم کے اندر تھا۔ اندر آنے کے بعد میں دروازے کو بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

مذکورہ بیڈروم کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں لائٹ آن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ ڈیلفی کی معلومات کے مطابق، میں اس وقت اپنے بیڈروم میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ کم ازکم اس کی حد تک یہ معلومات درست رہیں۔ باقی مجھے جو کرنا تھا، وہ تو ہر حال میں کرنا ہی تھا۔

میں سرخ بیڈ والے اس کمرے میں اندازے کی بنیاد پر آگے بڑھ رہا تھا۔ میں یہاں پہلے بھی آچکا تھا لہٰذا میرے اندازے کو کسی دقت یا دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ میں محتاط قدموں کے ساتھ بیڈروم کے آخری حصے میں پہنچا اور باتھ روم کے دروازے تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس مشن میں یہ باتھ روم کلیدی حیثیت کا حامل تھا کیونکہ اس کی پشت کے ساتھ ایک اور باتھ روم کی پشت جڑی ہوئی تھی اور وہ باتھ روم ڈیلفی کے بیڈروم کا تھا۔ ان دونوں باتھ رومز کے بیچ والی دیوار میں ایک دروازہ بھی

موجود تھا جس کے ذریعے ایک باتھ روم سے دوسرے باتھ روم تک رسائی ممکن ہو جاتی تھی۔

میں نے چابی کی مدد سے اس باتھ روم کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کیے بغیر اس باتھ روم میں داخل ہو گیا۔ گزشتہ رات جب میں یہاں آیا تھا تو میں نے سیل فون کی ٹارچ لائٹ کی مدد سے یہاں کا اچھی طرح معائنہ کر لیا تھا۔ اب میں لائٹ آن کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ دوسری طرف والے بیڈ روم میں ڈیلفی موجود تھی اور میں اسے کسی قسم کی شکایت کا موقع فراہم نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اس بنگلے پر میرے قیام کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ اگرچہ آدھی رات کے بعد چوروں کے انداز میں میرا ایک بیڈ روم سے دوسرے بیڈ روم میں جھانکنا سراسر غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن میں یہ سب کسی بری نیت سے یا کسی ذاتی فائدے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ اس بنگلے کے در و دیوار میں چکراتی ہوئی پراسراریت نے مجھے یہ قدم اٹھانے پر مجبور کیا تھا۔ میں اندرونی تجسس کے سامنے ہار گیا تھا اور مجھ پر یہ جاننے کی دھن سوار ہو گئی تھی کہ سو کالڈ ٹنٹڈ گلاس وال والے بیڈ روم کے سرخ بیڈ پر سرخ نائٹی میں محو خواب ڈیلفینا کی اصلیت کیا تھی۔ کیا وہ یہی ڈیلفی تھی جو اس وقت اپنے بیڈ روم میں سو رہی تھی یا وہ متقی ڈیلفینا تھی، ربی اور ڈیلفی کے بیان کے مطابق جس کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔ میں نے اس حوالے سے ڈیلفی سے سوال کیا تھا اور اس نے اپنی ذات کے حوالے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے دعویٰ تو نہیں کیا لیکن اس کا خیال یہی تھا کہ وہ متقی ڈیلفینا ہی ہوگی مگر باتھ روم اندر باتھ روم یہ راستہ...... کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا اور اسی کہانی نے مجھے اس خطرناک مشن کی طرف دھکیلا تھا۔ میری نظر میں ڈیلفی شک کے دائرے سے باہر نہیں تھی۔

رات جب ہم لیونگ روم سے اٹھے تو ڈیلفی نے ایما کو اپنی راہ نمائی میں ایک بیڈ روم تک پہنچا دیا تھا۔ مذکورہ بیڈ روم ڈیلفی کے بیڈ روم کے برابر میں تھا۔ میری معلومات کے مطابق، وہ دونوں اس وقت اپنے اپنے بیڈ روم میں گہری نیند کے مزے لوٹ رہی ہوں گی۔

میں نے باتھ روم کے اس دروازے کے ہینڈل پر طبع آزمائی کی جو میرے یقینی اندازے کے مطابق، ڈیلفی کے باتھ روم میں کھلنا چاہیے تھا۔ مذکورہ دروازہ دوسری جانب سے لاک تھا۔ میں نے چابیوں والے رنگ میں موجود ایک ایک چابی کو یکے بعد دیگرے اس دروازے کے لاک پر آزمانا شروع کر دیا۔ جلد ہی مجھے کامیابی حاصل ہو گئی۔ میں نے بہ آہستگی دروازہ کھولا اور ڈیلفی کے باتھ روم میں پہنچ گیا۔

اگرچہ اس باتھ روم کی لائٹ آف تھی لیکن اس کے اندر اچھا خاصا اجالا ہو رہا تھا اور یہ اجالا اس لائٹ کے باعث تھا جو بیڈ روم کے اندر سے سفر کر کے اس باتھ روم کے اندر پہنچ رہی تھی کیونکہ باتھ روم کا دروازہ نیم وا تھا۔ اصولی طور پر اس وقت ڈیلفی کے بیڈ روم کی لائٹ آف ہونا چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔

میں نے ارادہ کیا کہ باتھ روم کے نیم وا دروازے کی اوٹ لے کر بیڈ روم میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسی لمحے مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ اس احساس کا تعلق میری سماعت سے تھا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ڈیلفی کسی سے بات کر رہی ہے لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ بس ''اوں...... آں...... ہاں...... ہوں'' جیسی مبہم آوازیں دھیمے سروں کے ساتھ میری سماعت تک رسائی حاصل کر رہی تھیں۔

فوری طور پر میرے ذہن میں یہی خیال آیا کہ ڈیلفی فون پر کسی سے بات کر رہی ہے اس لیے اس نے بیڈ روم کی لائٹ آن رکھی ہوئی ہے۔ لگ بھگ دو بجے رات وہ کس سے فون پر بات کر رہی تھی؟ اس سوال نے میرے اندرونی تجسس کو مہمیز کیا اور میں دروازے کی اوٹ میں رہ کر اپنی مشتاق نگاہ کو سرچ لائٹ کے مانند بیڈ روم میں پھرانے لگا لیکن ڈیلفی مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ وہ یقیناً اپنے بیڈ پر تھی اور میں جس جگہ دبکا کھڑا تھا وہاں سے اس کا بیڈ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ڈیلفی کا روبرو نظارہ کرنے کے لیے اس باتھ روم سے باہر نکلنا ضروری تھا یا کم از کم ایسے زاویے پر آنا لازمی تھا جہاں بیڈ پر لیٹی ہوئی ڈیلفی کو دیکھنا ممکن ہوتا اور یہ جاننا بھی کہ وہ کس سے بات کر رہی تھی......!

میں نے سانس روک لی اور بے آواز قدموں کے ساتھ دروازے کی اوٹ سے نکل آیا تاہم میرا جسم ابھی تک باتھ روم کے اندر ہی تھا۔ جلد ہی میں ایک ایسا مقام تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا جہاں سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن میں بیڈ کو بڑے واضح انداز میں ملاحظہ کر سکتا تھا۔ میں نے ڈیلفی کو دیکھا اور یہ دیکھنا میرے دل و دماغ پر ایک قیامت ڈھا گیا۔

مجھے صد فیصد یقین تھا کہ ڈیلفی اس وقت اپنے بیڈ روم میں اکیلی ہو گی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ فون پر وہ کسی سے بات کر رہی ہو گی لیکن نہیں...... وہ کسی

اور کے ساتھ محوِ گفتگو تھی اور وہ ''کسی اور'' ...... ایما ایپل بام تھی اور ان کے بیچ جاری ''اوں، آں''، پر مشتمل یہ گفتگو بڑی سنسنی خیز اور ہوش و حواس اڑا دینے والی تھی۔ میرا دماغ گھوم کر رہ گیا۔

میں نے انہیں نہایت ہی قابلِ اعتراض بلکہ شرم ناک حالت میں باہم پیوست دیکھا۔ تب ایما کے اس جملے کی اہمیت مجھ پر آشکار ہوئی جو اس نے اپنی آمد کی اطلاع دیتے وقت فون پر ڈیلفینا سے کہا تھا۔ اس نے بڑی فراخ دلی سے کہا تھا۔ ''جہاں تک تمہارے لطف اندوز ہونے کی بات ہے تو اس سلسلے میں، میں تمہیں مایوس نہیں کروں گی......'' وہ دونوں اخلاقیات کی چادر کو تار تار کرتے ہوئے بے راہ روی کی انتہا کو چھو رہی تھیں۔ میں نے انٹرنیٹ پر ان کی سیکرٹ سوسائٹی کے بارے میں بڑی گہرائی تک پڑھا تھا اور یہ بات میرے علم میں تھی کہ وہ لوگ اپنے ممبرز کو خود لذتی کے نت نئے طریقے سکھاتے تھے لیکن یہاں تو معاملہ دس ہاتھ آگے خود در خود لذتی تک پہنچا ہوا تھا۔ میں نے دل میں ان دونوں پر لاحول پڑھی اور انہیں اختلاطِ ہم نفساں میں مشغول چھوڑ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

☆☆☆

تیرہ جون فرائی ڈے کی صبح بہت روشن اور اجلی تھی۔ میں ڈیلفی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھا تھا۔ دیوار گیر کلاک نو بجے کا وقت بتا رہا تھا۔ گزشتہ رات ڈیلفی کے بیڈ روم والے منظر نے میرے حواس پر جو بجلیاں گرائی تھیں، اس کی جلن ابھی تک مجھے اپنے ذہن کے مختلف حصوں میں محسوس ہو رہی تھی اور اس جلن میں ایک عجیب قسم کی تپن پائی جاتی تھی۔ اس جلن اور تپن نے میرے جذبات اور محسوسات کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ میں صحیح طور پر اندازہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس وقت ڈیلفی کے لیے میرے دل میں کس نوعیت کے جذبات تھے۔ میں نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ میرے لیے غیر متوقع اور حیرت انگیز تھا۔ اسے ناپسندیدگی اور کراہیت کی ملی جلی کیفیت کہا جا سکتا ہے۔

ڈیلفی خلافِ معمول خاصی چپ چپ تھی۔ میں نے اس کی خاموشی توڑنے کی غرض سے پوچھا۔ ''کیا ہم دونوں اکیلے ہی ناشتا کریں گے؟''

''اکیلے...... مطلب......!'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''مطلب یہ کہ...... کیا ایما ناشتا نہیں کرے گی؟''

''ایما جا چکی ہے۔'' ڈیلفی نے بتایا۔

''اتنی صبح وہ کہاں چلی گئی۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''رات کو تو وہ یہیں تھی...... تھی نا؟''

دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ کہوں ''رات کو تو وہ تمہارے بیڈ روم میں تھی...... تھی نا؟'' لیکن اخلاقیات اس سوال کی اجازت نہیں دیتی تھیں لہٰذا میں نے بات کو بہت سادہ رکھا تھا۔ ڈیلفی کے چہرے پر کسی قسم کی ندامت، پشیمانی یا خجالت نظر نہیں آتی تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ میں نے اس کی چوری پکڑ لی ہے۔ وہ اپنی دانست میں، میری نگاہ میں ابھی تک دودھ کی دھلی ہوئی تھی۔

''ایما صبح جلدی اٹھنے کی عادی ہے۔'' وہ بات بناتے ہوئے بولی۔ ''پھر اسے کسی ضروری کام سے بھی جانا تھا لہٰذا اس نے ناشتا کیا اور روانہ ہو گئی۔''

میں نے اس کی وضاحت پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔ میں نے اسے شرمندہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ اس نے جو کچھ کیا، یہ اس کا اور ایما کا ذاتی معاملہ تھا۔ مجھے ان کے افعال و اعمال سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ وہ اپنے کردار کے لیے خود جواب دہ تھیں۔ میں نے کرید اور ٹٹول کے عمل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈیلفی سے کہا۔

''اس بنگلے پر میرے قیام کے صرف دو گھنٹے باقی ہیں لیکن ابھی تک تم نے وہ راز نہیں کھولا جس کی خاطر مجھے بہتر گھنٹے تک یہاں رکنا تھا......!''

''علی! تمہارے والدین کا پتا چل گیا ہے۔'' وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

اس نے اتنی بڑی بات کہہ دی تھی کہ میں اپنے سوال کو بھول گیا اور اضطراری لہجے میں سوال کیا۔

''کک...... کون ہیں...... میرے والدین؟''

''یہ ابھی امکانی بات ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں بگڑ کر بولا۔

''مطلب...... یہ تو کنفرم ہو گیا ہے کہ تم علی سلطان کے بیٹے نہیں ہو۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

''اس میں نیا کیا ہے۔'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''یہ بات تو مجھے شروع ہی سے معلوم ہے کہ میں انکل سلطان کی اولاد نہیں ہوں۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا ہے۔ وہ میرے گارجین ہیں، میرے خیر خواہ ہیں اور میرا سب کچھ ہیں...... پھر امکانی کیا ہے؟''

''امکانی یہ ہے کہ......'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''ڈلفنی عمر میں تم سے بڑی ہے۔ جب

ریٹا میگڈالین اور علی سلطان کے بیچ بریک اپ ہوا، اس وقت ٹفنی ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ ریٹا ٹفنی کو لے کر کہیں اور چلی گئی تھی اور علی سلطان اکیلا رہ گیا تھا۔ بعد میں وہ اوٹاہ سے ٹیکساس چلا گیا تھا......''

''یہ سب میں جانتا ہوں۔'' میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا پھر پوچھا۔''تم کسی امکانی بات کا تذکرہ کر رہی تھیں؟''

''میں اسی طرف آ رہی تھی لیکن تم نے ٹوک دیا۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔ تم بڑی رسان سے اپنی بات مکمل کرلو۔''

''جب تم علی سلطان کے پاس پہنچے تو یہ وہی وقت تھا جب غریدہ اور الفریڈ اپنے بچے کے ساتھ سان ڈیاگو سے غائب ہوئے تھے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

''میں نے تھوڑی دیر پہلے جس امکانی بات کا ذکر کیا ہے، وہ یہی ہے کہ......غریدہ اور الفریڈ نے اپنا بچہ علی سلطان کے حوالے کیا اور خود کہیں روپوش ہوگئے۔''

''گویا تم لوگ مجھے غریدہ اور الفریڈ کا بیٹا ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟'' میں نے چڑ کر کہا۔''جبکہ میں واشگاف الفاظ میں بتا چکا ہوں کہ میں اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''ہم نے تمہاری بات کو من وعن مان لیا ہے کہ تمہیں اپنے والدین کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولی۔''علی! ہم تمہارے بیان پر شک نہیں کر رہے۔ ہم تو حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہم حقیقت کے آس پاس ہی ہیں۔''

''میری طرف سے ایڈوانس مبارک باد قبول کرو کہ تم حقیقت کے بہت قریب پہنچ چکی ہو۔'' میں نے نیم طنزیہ لہجے میں کہا۔''اب ذرا ہم اس ایگری منٹ کے بھی نزدیک پہنچ جائیں تو کیسا رہے گا جس کا ابھی تک صرف تذکرہ ہی تذکرہ سننے کو ملا ہے۔''

وہ چند لمحات تک گہری ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتی رہی پھر ایک دم اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کہا۔''تم لیونگ روم میں جا کر بیٹھو۔ میں آتی ہوں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا اور ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ گیا۔ مجھے لیونگ روم تک جانے کے لیے کوئی میلوں کا فاصلہ طے نہیں کرنا تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ تھا کیونکہ ڈائننگ ٹیبل لیونگ روم ہی کے ایک کونے میں لگی ہوئی تھی۔ جب میں لیونگ روم میں صوفے پر بیٹھا تو دیوار گیر کلاک ساڑھے نو کا وقت بتا رہا تھا۔

ایک بات میں بہ خوبی سمجھ گیا تھا کہ ڈیلفی نے جس ایگری منٹ کا ذکر کیا تھا، وہ کوئی لمبے چوڑے پراسس والا معاملہ نہیں تھا کیونکہ اس بنگلے سے میرے رخصت ہونے میں صرف ڈیڑھ گھنٹا باقی رہ گیا تھا۔ جو بھی ہونا تھا، بس جھٹ پٹ میں ہو جانا تھا۔ مجھے بہتر گھنٹے تک اس بنگلے پر روکنے کا مقصد صرف وہ ایگری منٹ ہرگز نہیں تھا۔ یہ لوگ مجھے مختلف مراحل سے گزار کر اپنی تسلی کرنا چاہ رہے تھے کہ آیا میں ان کا مطلوبہ بندہ ہی ہوں یا نہیں یعنی......میں غریدہ اور الفریڈ کا وہی بچہ ہوں جس کی انہیں بڑی شدومد سے تلاش تھی ورنہ جہاں تک اس ایگری منٹ کا تعلق تھا تو وہ اس روز بھی کیا جا سکتا تھا جب دس جون کو گیارہ بجے میں اس بنگلے پر پہنچا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ڈیلفی ایک فائل اٹھائے لیونگ روم میں داخل ہوئی۔ میرے سامنے صوفے پر بیٹھنے کے بعد اس نے مذکورہ فائل کو اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولی۔

''علی! جو لوگ ہماری سیکرٹ سوسائٹی کی اہمیت اور شان وشوکت سے واقف ہیں، وہ اس کی ممبر شپ کے لیے مرے جا رہے ہوتے ہیں۔ سوسائٹی میں شمولیت ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب ہوتا ہے لیکن ہم کسی ایرے غیرے کو ممبر نہیں بناتے۔ اس سلسلے میں ہمارا ایک معیار ہے۔ جو شخص اس معیار پر پورا اترتا ہے، ہم صرف اسی کو ممبر شپ دیتے ہیں لیکن بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمارے مقرر کردہ معیار سے کافی اوپر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ان کے اندر ذہنی اور روحانی قوتوں کے ذخیرے چھپے ہوتے ہیں۔ ایسے افراد کو اپنی سوسائٹی میں جگہ دینا ہماری خواہش ہوتی ہے اور......تمہارا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا ہے اسی لیے پچھلے اکہتر گھنٹوں سے تم میرے مہمان بنے ہوئے ہو اور مجھے امید ہے کہ بہتر گھنٹے پورے ہونے سے پہلے تم ہماری سوسائٹی میں شامل ہو چکے ہوگے۔''

''اور اس ایگریمنٹ کا کیا ہوگا؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اپنے گھٹنوں پر رکھی فائل کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔

''وہ ایگری منٹ اس فائل کے اندر موجود ہے۔ تم اس کے

مندرجات کو توجہ سے پڑھو اور دستخط کردو۔ دیٹس آل۔''

اس نے ''دیٹس آل'' اس طرح کہا تھا جیسے کوئی کہتا ہے...... اللہ اللہ، خیر سلا۔ کھیل ختم، پیسا ہضم!

اپنی بات کے اختتام پر اس نے مذکورہ فائل اور ایک نفیس قسم کا قلم میری جانب بڑھا دیا تھا۔ میں نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیں پھر فائل کھول کر اس کا مطالعہ کرنے لگا۔

فائل کے اندر صرف ایک ہی فارم نما کاغذ لگا ہوا تھا جس کی پیشانی پر ایک خطرناک لوگو بنا ہوا تھا جیسا کہ عموماً بجلی کے کھمبوں پر اور پی ایم ٹی پر ''خطرہ گیارہ ہزار وولٹ'' یا ''خطرہ چار سو چالیس وولٹ'' کی تختی لگی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ایک کھوپڑی اور دو ہڈیوں کا خاکہ بھی بنا ہوتا ہے۔ یہ بھی بالکل ویسا ہی مونوگرام یا لوگو تھا۔ دو انسانی ہڈیاں کراس کی شکل میں بنی ہوئی تھیں۔ ان ہڈیوں کے نیچے تھری ڈبل ٹو یعنی تین سو بائیس کا نمبر لکھا ہوا تھا اور ان دو ہڈیوں کے اوپر ڈراؤنی شکل والی انسانی کھوپڑی۔ اس لوگو کے نیچے ''اسکل اینڈ بونز'' کے جلی حروف پرنٹ تھے۔ پھر تھوڑا سا فاصلہ دے کر ''گیو اینڈ ٹیک'' ایگری منٹ کے الفاظ درج تھے۔

اس کے نیچے پانچ لائنوں میں پانچ الفاظ نمبر وار درج تھے اور ہر لفظ کے سامنے ایک چھوٹا سا بکس بنا ہوا تھا جیسا کہ ٹک کرنے کے لیے بنا ہوتا ہے۔ سب سے آخر میں نام کا کالم تھا اور اس کے سامنے دستخط کے لیے ایک مستطیل بکس بنا ہوا تھا۔ یہ تھی اس ایگری منٹ فارم کی تفصیل۔

''اسکل اینڈ بونز'' تو اس سیکرٹ سوسائٹی کا نام تھا یعنی کھوپڑی اور ہڈیاں۔ لوگو بھی اس نام کی عملی تفسیر دکھائی دیتا تھا۔ نیچے نمبر وار جو پانچ الفاظ درج تھے ان میں سرفہرست قدرت تھا۔ پھر ترتیب وار عزت، شہرت، دولت اور عورت کا نام تھا۔ عجیب و حسین اتفاق یہ تھا کہ یہ پانچوں الفاظ ''ت'' پر ختم ہوتے تھے۔

میں نے قیمتی قلم کو اپنی انگلیوں میں گھماتے ہوئے سوالیہ نظر سے ڈیلفی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اس کا کیا کرنا ہے؟''

''سب سے پہلے تم نام کے خانے میں اپنا مکمل نام درج کردو۔'' اس نے کہا۔

میں نے اس کی بات مانتے ہوئے مذکورہ کالم میں ''اسد علی'' لکھ دیا پھر پوچھا۔ ''آگے بتاؤ......؟''

''جیسا کہ تم جان چکے ہو کہ یہ ''گیو اینڈ ٹیک'' ایگری منٹ ہے یعنی کچھ دو اور کچھ لو۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اس فارم پر نمبر وار پانچ چیزیں درج ہیں۔ ان میں سے تم اپنے لیے کوئی سی بھی تین چیزوں کا انتخاب کرسکتے ہو اور انہیں منتخب کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے سامنے بنے ہوئے بکس میں ٹک کرنا ہوگا۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے ایک گہری سانس لی پھر دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''چلو...... کرو ٹک۔''

میں نے قدرت، عزت اور شہرت کے سامنے بنے ہوئے خانوں میں ٹک کردیا۔ اس نے ایگری منٹ فارم پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی۔

''تم بہت ذہین اور مثبت سوچ کے مالک ہو علی۔''

''اچھا......'' میں نے مختصراً کہا۔

''جو لوگ ہوس پرست اور عیاش طبع ہوتے ہیں، وہ سب سے پہلے دولت اور عورت کو ٹک کرتے ہیں۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد وہ کسی تیسری چیز کا انتخاب کرتے ہیں۔ تمہارے انتخاب سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تم سوسائٹی کے اندر بہت تیزی سے ترقی کروگے۔ تمہیں عزت بھی ملے گی، شہرت بھی اور قدرت بھی اور...... ایسی قدرت کہ ہم تمہیں زمینی خدا بنا دیں گے۔''

میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پچھلے تین دن میں یہ الفاظ میں نے کئی مرتبہ سنے تھے۔ میں اپنے مالک کا بندہ تھا، مجھے زمینی خدا بننے کا کوئی شوق نہیں تھا مگر پتا نہیں کیوں، یہ لوگ مجھے ایسا بنانے پر تلے ہوئے تھے۔

''ڈیلفی!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اس فارم میں ایک بہت بڑی خامی نظر آرہی ہے۔''

وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''کون سی خامی؟''

''اگر یہ گیو اینڈ ٹیک ایگری منٹ ہے تو اس میں صرف ''ٹیک'' کی پانچ چیزیں ہی کیوں درج ہیں۔'' میں نے ایک خاص نکتے کی جانب اس کی توجہ دلائی۔ ''اس میں مجھے کہیں ''گیو'' کا کالم دکھائی نہیں دے رہا۔ یعنی اگر آپ لوگ مجھے قدرت، عزت اور شہرت دوگے تو اس کے بدلے میں مجھے آپ کو کیا دینا ہوگا؟''

''میں تمہارا مطلب سمجھ رہی ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولی۔ ''تمہیں جو کچھ دینا ہے، وہ دستخط والے خانے میں پوشیدہ ہے۔ یعنی تمہارا دستخط کرنا اس بات کا اقرار ہوگا کہ تم نے وہ چیز ہمیں دے دی۔''

''مگر کون سی چیز...... یہ بھی تو بتاؤ......؟'' میں نے جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں پوچھا۔

''سول......!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''کیا مطلب!'' میں الجھ کر رہ گیا۔ ''تمہارا مطلب ہے، روح؟''

''ہاں ...... سول کا مطلب روح ہی ہوتا ہے۔'' اس کی سنجیدگی میں شمہ برابر کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔

''لیکن ...... میں تو ایک زندہ انسان ہوں۔'' میں نے نیم احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میں اپنی روح آپ لوگوں کو کیسے دے سکتا ہوں؟''

''جب تک تم زندہ ہو، یہ روح تمہارے اندر موجود رہے گی اور تم ہماری ملکیت رہو گے۔'' وہ بڑے ٹھوس انداز میں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اور جب تمہارا وقت پورا ہوجائے گا تو پھر تمہاری سول پر ہمارا اختیار ہوگا۔ ہم جیسے چاہیں گے، اسے استعمال کریں گے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میری الجھن حیرت میں بدل گئی۔ ''جب کوئی شخص زندگی کی بازی ہار جاتا ہے تو اس کی روح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔''

''یہ ایک عام کانسپٹ ہے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''کہ تمام ارواح اس دنیا میں آنے سے پہلے عالمِ ارواح میں ہوتی ہیں۔ جب کوئی جان دار پیدا ہوتا ہے تو اس کے اندر ایک روح ڈال دی جاتی ہے لہٰذا جب تک وہ جان دار زندہ رہتا ہے تو اس کی روح، اس کے جسم کے اندر عالمِ دنیا میں موجود رہتی ہے۔ پھر جب اس جان دار کے جسم کو موت آجاتی ہے تو اس کی روح عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے اور روزِ قیامت تک یہ روح عالمِ برزخ ہی میں رہتی ہے......'' اس نے ذرا دیر کو رک کر ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''عموماً ایسا ہی ہوتا ہے لیکن بعض خصوصی کیسز میں یہ معاملہ بہت مختلف ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی انسان کسی ایگری منٹ کے تحت اپنی روح کسی کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے تو اس کی موت کے بعد اس کی روح اس شخص کی ملکیت میں چلی جائے گی جس نے زندگی میں کسی شرط کے عوض اسے خریدا ہوتا ہے۔''

''میں نہیں مانتا تمہاری اس تھیوری کو۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔''

''یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ انسان کی زندگی میں سول کو خریدا اور بیچا نہیں جاسکتا؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''بالکل، میں یہی کہنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اصراری لہجے میں کہا۔ ''روح کسی انسان کی نہیں بلکہ میرے مالک کی ملکیت ہے۔ کوئی اسے خرید اور بیچ نہیں سکتا۔ روح مالک کی مرضی سے عالمِ ارواح سے انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور پھر اس کی موت کے بعد مالک کے حکم پر ہی یہ روح انسان کے جسم سے نکل کر عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔ انسان کی زندگی اور موت پر بھی صرف اور صرف مالک ہی کا اختیار ہے۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔'' وہ اطمینان بھرے لہجے میں بولی۔ ''اگر تمہارا اس کانسپٹ پر یقین نہیں ہے تو پھر سول کی خرید و فروخت سے تمہیں کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ تم بڑی آسانی سے اس فارم پر دستخط کرسکتے ہو۔''

''دستخط کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ تم لوگ جس روح کو خرید لیتے ہو، بعد میں اس کے ساتھ کیا کرتے ہو؟''

''دلچسپی پیدا ہو رہی ہے نا......!'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''دلچسپی پیدا ہونا تو فطری بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے قصہ ہی ایسا بیان کیا ہے۔''

''یہ قصہ نہیں، میں نے حقیقت بیان کی ہے علی۔'' وہ اصراری انداز میں بولی۔

''قصہ ہو یا حقیقت، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے بتاؤ، تم لوگ اس خریدی ہوئی روح کے ساتھ کیا کرتے ہو؟''

''ہم اس روح کو کسی بھی عظیم انسان کے جسم میں داخل کر کے اس کی عظمت کو دوچند کردیتے ہیں۔'' اس نے فخریہ لہجے میں بتایا۔ ''اس طرح اس شخص کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ بعدازاں ہم اس کی صلاحیتوں سے بہت کام لیتے ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''ایک وقت میں، ایک جسم کے اندر ایک ہی روح رہ سکتی ہے۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔''

''بالاتر اس لیے ہے کہ تم نے میری بات کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''میں تو ناسمجھ اور نادان سا بچہ ہوں۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''تم نے فلسفے کی ایک پروفیسر کے ساتھ رات گزاری ہے۔ کچھ تو استانی پن تمہارے اندر بھی منتقل ہوگیا ہوگا۔ اب اس نادان اور ناسمجھ کو تم ہی آسان الفاظ میں سمجھادو......''

"ساتھ رات گزاری ہے ...... کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بدک کر چونکتے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوئی پھر شک زدہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔

اس کے چونکنے میں بڑا بے ساختہ پن تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے بے دھیانی میں بجلی کے ننگے تار کو چھولیا ہو۔ میں نے بات ہی ایسی کردی تھی کہ اس کا اچھل جانا ایک فطری عمل تھا۔ میں نے اس کی دکھتی رگ پر دباؤ ڈال دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس حوالے سے میرے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجاتی، میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ تمہاری دوست ایما اپیل بام نے رات اس بنگلے پر گزاری ہے۔ پیشے کے اعتبار سے ایما فلسفے کی پروفیسر ہے۔ اس کی صحبت میں یقیناً تم نے کچھ نہ کچھ تو سیکھا ہی ہوگا!"

وہ ایک اطمینان بھری سانس خارج کرنے کے بعد بولی۔ "اوکے۔ میں تمہیں سمجھاتی ہوں۔ ہم اس خریدی ہوئی روح کو کسی زندہ انسان کے جسم میں داخل نہیں کرتے ......"

"تو پھر؟" میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال کردیا۔ "کیا آپ لوگ اس روح کو مردہ جسم میں داخل کرتے ہو؟"

"اب تم ٹھیک سمجھے ہو۔"

"اور وہ مردہ زندہ بھی ہوجاتا ہے!" میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یس ...... آف کورس!" وہ پُروثوق انداز میں بولی۔

"کیا تم لوگوں نے خود کو ابنِ مریم سمجھا ہوا ہے۔" میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "جو تم مُردوں کو جلانے کا دعویٰ کررہے ہو؟"

"ابن مریم تو صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہی تھے جو مُردوں کو جلایا کرتے تھے۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ معجزہ انہی سے منسوب ہے لیکن ہم نے اس معجزے کے پیچھے جو سائنس ہے اس کو پالیا ہے لہٰذا یہ کام ہمارے لیے مشکل یا ناممکن نہیں رہا۔ میں نے جو کہا ہے، ویسا ہم کرتے بھی ہیں۔"

"میں سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ ہوں اور یہ سائنس کی ہی ایک شاخ ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ سائنس بہت بڑا علم ہے اور اکثر معجزوں کے پیچھے ایک سائنس موجود ہوتی ہے۔ اگر آپ اس سائنس سے واقف ہوجائیں تو معجزات رونما کرنا آپ کے بائیں ہاتھ کا کھیل بن جاتا ہے لیکن مُردے جلانا صرف خدائی وصف ہے اور یہ معجزہ صرف اور صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات سے منسوب ہے۔"

"ہم کئی جلیل القدر انبیاءؑ کے علوم کے وارث ہیں۔" وہ فخر سے سینہ تان کر بولی۔ "ہمارے پاس پراسرار روحانی علوم کے جو خزانے ہیں، تم ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ انہی علوم وفنون کے بل بوتے پر ہم حکمرانی کررہے ہیں۔"

"یس ...... یہ میں جانتا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم نے مُردوں کو زندہ کرنے والی جو بات کی ہے، جب تک میں اپنی آنکھوں سے ایسا ہوتے ہوئے دیکھ نہ لوں، میں یقین نہیں کرسکتا۔"

"تم یہ سب اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لوگے لیکن وہ باریک لائن عبور کرنے کے بعد۔" وہ معنی خیز انداز میں بولی۔

"کون سی باریک لائن؟" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

"جو ہمارے درمیان کھنچی ہوئی ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "تم اس فارم پر دستخط کرنے کے بعد ہماری سوسائٹی کے ممبر بن جاؤ گے یعنی وہ باریک لائن عبور کرکے ہمارے پاس آجاؤ گے ...... ہمارے اپنے بن جاؤ گے۔"

"میں اس ایگری منٹ پر دستخط کرنے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "لیکن میری ایک شرط ہے ......!"

"کیسی شرط ہے؟" وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

"اس ایگری منٹ میں پانچ چیزیں دی گئی ہیں۔" میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "جن میں سے تین کے انتخاب کا مجھے اختیار دیا گیا تھا اور میں نے ان میں سے قدرت، شہرت اور عزت کے سامنے ٹک کردیا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ان تین میں سے ایک چیز تبدیل کردوں۔"

"اوہ ...... یہ تو بہت ہی آسان سی شرط ہے۔" وہ معنی خیز نظر سے مجھے دیکھتے بولی۔ "تم ان تین میں سے کیا چھوڑنا پسند کروگے؟"

"میرے نزدیک چھوڑنے کی کوئی اہمیت نہیں۔ تم جو بھی کہوگی، ان تین چیزوں میں سے چھوڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔ "اور اس کے بدلے کچھ اور چاہوں گا۔"

"کیا تمہیں عورت چاہیے؟" وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہیں!" میں نے نفی میں گردن ہلادی۔

''دولت......؟''
''نہیں!''
''پھر کیا چاہیے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولی۔
''یہی دو آپشنز تو باقی ہیں......عورت اور دولت۔''
''میں اپنی منتخب کی ہوئی تینوں چیزوں کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر میرے لیے ایک نیا آپشن پیدا کر دیا جائے۔''
''یعنی تم......کوئی ایسی چیز چاہتے ہو جو اس فہرست میں شامل نہیں؟'' اس نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔
''ہاں۔ میں ایسا ہی کچھ چاہتا ہوں۔''
''کیا چاہتے ہو، بتاؤ۔'' وہ فراخ دلی سے بولی۔ ''ہم تمہاری ہر خواہش پوری کریں گے۔''
''تم بہت بڑی بات کر رہی ہو......!''
''ہمارے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔'' وہ پُرغرور لہجے میں بولی۔ ''اپنی خواہش بیان کرو علی!''
''میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری سیکرٹ سوسائٹی کا سربراہ مجھے سجدہ کرے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دھماکا کیا۔
''آر یو نارمل؟'' وہ اچھل پڑی۔ ''تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ کیا کہہ رہے ہو۔''
''تم نے میری مانگ پوچھی اور میں نے بتا دی۔'' میں نے سادگی سے کہا۔ ''یس۔ آئی ایم نارمل اینڈ......ان مائی سینسیز۔''
''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا تم نے ہمیں شیطان سمجھا ہے جو آدم کو سجدہ کرنے کو کہہ رہے ہو؟''
''میں نے تو سیدھا سیدھا تمہارے سوال کا جواب دیا ہے اور تم شیطان اور آدم کے قصے کو لے بیٹھی ہو۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر میری خواہش کو پورا کرنا ممکن نہیں تو صاف انکار کر دو......ویری سمپل۔''
''تم نے جو مطالبہ کیا ہے، وہ ممکن نہیں۔'' وہ خجالت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تمہاری بات سے تمہاری سوچ کی عکاسی ہوتی ہے کہ تم ہمارے سربراہ کو ابلیس اور خود کو آدم سمجھتے ہو۔''
''اس امر میں تو کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں کہ میں خود کو آدم سمجھتا ہوں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تمہارا یہ تصور بالکل غلط ہے کہ میں نے تمہاری سیکرٹ سوسائٹی کے سربراہ کو ابلیس کہا ہے۔ سجدہ کرنے کی بات میں نے اس لیے کی تھی کہ تم نے مجھے فری ہینڈ دیا تھا کہ میں جو چاہوں، مانگ سکتا ہوں سو، میں نے ایک خواہش کا اظہار کر دیا اور......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
''اور......پتا یہ چلا کہ زمینی خدا کہلانے والے بڑے بے بس اور لاچار ہیں۔ قادر مطلق ہونا تو بہت دور کی بات ہے، یہ تو میری ایک چھوٹی سی خواہش بھی پوری نہیں کر سکتے۔ اینی ہاؤ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
''ڈیلفی! مجھے کسی سے سجدہ کروانے کی کوئی تمنا نہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ میں اپنے مالک کا بندہ ہوں۔ مالک میرے اندر رہتا ہے۔ میں اپنے مالک کی بندگی کر کے خوش ہوں......بہت خوش!''
''علی! گیارہ بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے ہیں۔'' وہ دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''انہی پانچ منٹ میں تمہیں دستخط کرنے یا دستخط نہ کرنے کا فیصلہ کرنا ہے۔ سو کم ٹو دی پوائنٹ۔''
''پانچ منٹ باقی ہوں یا پانچ گھنٹے یا پانچ دن یا پانچ سال، اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میرا فیصلہ کسی بھی صورت میں بدلنے والا نہیں۔''
''کیا فیصلہ کیا ہے تم نے؟'' اس نے دوٹوک انداز میں پوچھا۔ ''دستخط کر رہے ہو یا نہیں......؟''
''نہیں!'' میں نے اٹل لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

تیرہ جون کا سورج غروب ہونے سے پہلے میں لیک جیکسن میں تھا۔ میں فوراً سے پیش تر سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا تاکہ اپنی سرخ سانتانی اسپورٹ کار حاصل کر سکوں۔ میری ہنڈائے اس وقت لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ کی تحویل میں تھی جو پولیس نے ہسپانوی غنڈے ایلخیندرو سے برآمد کرائی تھی۔ ایلخیندرو اینگلٹن سے ایلون جا رہا تھا کہ پولیس نے ہائی وے تھری فائیو پر اسے دھر لیا تھا۔ ایلخیندرو پر پیبلو کے قتل اور ونی لاؤنج ریسٹورنٹ کی پارکنگ سے میری ہنڈائے چرانے کا الزام تھا اور مزے کی بات یہ تھی کہ ایلخیندرو نے آن ائر اپنے جرائم کا اعتراف بھی کیا تھا جبکہ حقیقت اس کے بالعکس تھی۔ پیبلو میرے ہاتھوں چرچ چکن کے کچن میں جہنم واصل ہوا تھا۔ ونی لاؤنج اور چرچ چکن نامی یہ ریسٹورنٹس پلانٹیشن ڈرائیو پر واقع تھے۔ پیبلو،

لیونارڈو کا خاص آدمی تھا اوران دنوں میری لیونارڈو سے ٹھنی ہوئی تھی۔ اسی مارا ماری کے نتیجے میں لیونارڈو نے میری دوست شارو کو بے سٹی سے اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا پہنچادیا تھا اور آگے اسے بہاماز کے شہر ناسو پہنچانے کا ارادہ تھا۔ یہ ساری معلومات مجھے ڈیلفی سے حاصل ہوئی تھیں۔ وہی ڈیلفی جس کے اختیارات کی طاقت نے مجھے مجرم سے محرم بناڈالا تھا۔ میری جگہ ایلٹھینڈرو، پیبلو کے قتل کے الزام میں پکڑا گیا تھا۔ جی ہاں وہی ڈیلفی ...... میں نے جس کی گولڈن آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ میں ایگری منٹ فارم پر دستخط کرنے سے انکار بھی کرسکتا ہوں۔

وہم وگمان چیز ہی ایسی ہیں کہ بہت کم چیزیں ان کے اندر سماپاتی ہیں۔ کیا کہہ سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کا وہم وگمان بہت تنگ ہوتا ہے اور بعض چیزوں کا سائز بہت بڑا ہوتا ہے!

لیک جیکسن پولیس ڈیپارٹمنٹ جاتے ہوئے میرے ذہن کے ایک گوشے میں یہ خدشہ بہر حال موجود تھا کہ کہیں وہاں کوئی اپ سیٹ نہ ہوجائے۔ اس کیس میں سے ڈیلفی نے مجھے مکھن میں سے بال کی طرح کھینچ نکالا تھا اور بہ قول شخصے، میں اس کے منہ پر اپنے انکار کا طمانچہ مار آیا تھا۔ میرے اس رویے کے ردعمل کے طور پر وہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتی تھی۔ اس نے اگر کسی چمتکار کے ذریعے مجھے قتل کے کیس سے باہر نکالا تھا تو ایسی ہی کسی چمتکاری کے طفیل وہ مجھے اس معاملے میں الجھا بھی سکتی تھی۔ میں نے ڈیلس سے یوسٹن اور پھر یوسٹن سے لیک جیکسن کے سفر کے دوران میں بارہا یہ محسوس کیا تھا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے، میری کڑی نگرانی کررہا ہے۔ ایک آدھ بار اس احساس کے نتیجے میں بے اختیار میں نے پلٹ کر اپنے عقب میں دیکھا بھی تھا لیکن میں کسی شخص کو آئڈینٹی فائڈ نہیں کرپایا تھا اور اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

ایل جے پی ڈی کے حوالے سے میرے ذہن میں جو اندیشے سر اٹھا رہے تھے، وہ صفر کے برابر ثابت ہوئے۔ ڈیلفی نے میرے خلاف کوئی انتقامی اقدام نہیں کیا تھا۔ میں بہ آسانی اپنی ہنڈائے حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

میں نے پہلی فرصت میں بے سٹی جانے کے بارے میں سوچا۔ میں جیسے ہی گاڑی میں بیٹھا، شارو چھم سے میرے خیالات میں اتر آئی۔ سرخ ہنڈائے کے ساتھ شارو کی بہت سی سہانی یادیں وابستہ تھیں۔ ایسا ہوتا ہے۔ انسان اپنے پیاروں کو مختلف چیزوں کے حوالوں سے اپنی یادداشت کے خانے میں محفوظ کرلیتا ہے پھر جب اس چیز پر نگاہ پڑتی ہے یا کوئی اس کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ پیارا خود بہ خود خیالوں میں آجاتا ہے۔

شارو کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ شارو سے مجھے کوئی دھانسو قسم کا عشق ہوگیا تھا۔ ہمارے بیچ دوستی کا رشتہ تھا۔ ایک سچی اور پُرخلوص دوستی۔ ہماری ملاقات کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ہمارے تعلقات کی عمر چند روز کی تھی لیکن ہم بہت جلدی ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے اور ایک دوسرے کو ایک دوسرے کے اندر پاتے تھے۔ ہماری دوستی اور ہمارے ناتے کو کسی بدخواہ کی نظر لگ گئی تھی اور میں اس بدخواہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بدنام زمانہ غنڈا لیونارڈو تھا۔ لیونارڈو سے میری دشمنی کا سبب بھی شارو ہی تھی اور اس چند روزہ دشمنی میں لیونارڈو نے مجھ پر بہت زیادہ "قرض" چڑھا دیا تھا۔ مجھے یہ "قرض" جلد از جلد اتارنا تھا اور اس بات کا تعین وقت نے کرنا تھا کہ یہ قرض میں قسط وار ادا کرپاؤں گا یا یک مشت......!

رات اپنے سفر کا آغاز کرچکی تھی۔ شارو کی یادوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے میں اپنی سرخ ہنڈائے کو بے سٹی جانے والی سڑک پر دوڑا رہا تھا۔ لیک جیکسن سے بے سٹی باسٹھ کلومیٹر مغرب میں واقع تھا اور یہ لگ بھگ اڑتالیس منٹ کی ڈرائیو تھی۔ انکل سلطان کی رہائش بے سٹی کے "نیکولز اسکوائر" اپارٹمنٹس میں تھی۔ مجھے امید تھی کہ رات گیارہ بجے تک میں انکل سلطان کے پاس ہوں گا۔

انکل سلطان کا تعلق پاکستان سے تھا اور وہ کافی عرصے سے یو ایس اے میں مقیم تھے۔ انہوں نے بڑی بھرپور زندگی گزاری تھی۔ وہ ایک کامیاب بزنس مین تھے۔ پیشہ ورانہ شہرت، عزت اور دولت ...... سب کچھ انہیں حاصل تھا۔ لیکن فیملی لائف کے حوالے سے وہ بڑے بدقسمت ثابت ہوئے تھے۔ کرسچین بیوی ریٹا میگڈالین انہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی اور ٹفنی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اگر بیٹی کی پرورش باپ کے زیر سایہ ہوتی تو یقیناً وہ آمنہ کی شناخت سے پروان چڑھتی لیکن ریٹا نے اپنی نگرانی میں اسے پالا تھا اور ٹفنی بنا کر اس کی تربیت کی تھی۔ یہ سچ ہے کہ ٹفنی نے اپنی محنت سے اچھی خاصی ترقی کرلی تھی لیکن میں اس سے مل کر بہت مایوس ہوا تھا۔ ڈیلفی کے بنگلے پر ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی اور اس ملاقات میں جو کچھ پیش آیا وہ بہرحال معقول یا نارمل نہیں تھا۔ مجھے وہ ذہنی مریض لگی تھی۔ شاید یہ بات مجھے اس لیے بھی زیادہ محسوس ہوئی تھی کہ میں

سائیکالوجی کا اسٹوڈنٹ تھا لہٰذا میں سائیکو افراد کو بہ آسانی پہچان لیتا تھا۔

انکل سلطان کی طبیعت ان دنوں ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ ایک تو کار ایکسیڈینٹ نے ان کے جسم کے زیریں حصے کو مفلوج کر کے انہیں وہیل چیئر تک محدود کر دیا تھا پھر دمے کے مرض نے بھی ان کی زندگی کو کافی مشکل بنا رکھا تھا۔ انسان کے پاس زندگی کی ہر نعمت موجود ہو لیکن صحت نہ ہو تو زندگی کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ ہر چیز بے رنگ، بے نور اور پھیکی محسوس ہوتی ہے۔ انکل کے جسم کا زیریں حصہ مفلوج تھا جس کے باعث وہ گھر کے ہو کر رہ گئے تھے۔

میں پچھلے تین چار روز سے انکل سے بچھڑا ہوا تھا اور یہ جدائی جن حالات میں واقع ہوئی تھی، وہ بہت ہی سنسنی خیز اور تباہ کن تھی۔ انکل میرے ہاتھوں پیبلو کی موت والے واقعے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ پھر جس طرح مجھے ڈیلفی نے پیبلو مرڈر کیس سے نکالا تھا اس کا احوال بھی انکل کے علم میں تھا۔ وہ میرے سچے خیر خواہ اور سرپرست تھے۔ میں تین چار روز سے ان سے رابطے میں نہیں تھا۔ یقیناً وہ میرے لیے بہت فکر مند ہوں گے۔ اگرچہ میں نے انہیں یقین دلایا تھا کہ میں اپنے ایک دوست کے پاس ہوں لہٰذا پریشانی والی کوئی بات نہیں لیکن کسی سے یہ کہنا کہ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں'' بہت آسان ہوتا ہے مگر کسی کے کہہ دینے سے ''پریشان ہونے'' کے عمل کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہر انسان کا اپنا ایک ماحول ہوتا ہے جس کے تناظر میں اس کے حالات کروٹ لیتے ہیں اور ان حالات کے پیش نظر انسان کا ذہن سوچتا ہے اور انہی حالات کے مطابق، سوچ کا زاویہ متعین ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص پریشان کن حالات میں گھرا ہوا ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ان حالات کا اثر نہیں لے گا اور اس کا ذہن پریشان نہیں ہوگا......!

پچھلے بہتر گھنٹے (یعنی پریسٹن ہالو والے بنگلے پر) میں نے ایک طرح سے ڈیلفی کی قید میں گزارے تھے۔ اگرچہ میں کوئی باقاعدہ قیدی نہیں تھا لیکن ڈیلفی کی عائد کردہ شرط نے مجھے بنگلے سے باہر کی دنیا سے کاٹ کر رکھ دیا تھا اسی لیے میں انکل سلطان سے رابطہ نہیں کر پایا تھا لیکن اب میں آزاد فضا میں سانس لے رہا تھا۔ میں کسی سے بھی رابطہ کر سکتا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مجھے سب سے پہلے انکل سے رابطہ کرنا چاہیے۔

میں نے اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا اور ہنڈائی کو سڑک کے کنارے پر روکنے کے بعد سیل فون کو آن کر دیا۔ ڈیلس سے روانہ ہوتے وقت میں نے موبائل فون کو آف کر دیا تھا۔ اس سے پہلے اگر میرا فون بیچ میں کبھی چند منٹس کے لیے آن رہا بھی تھا تو میں نے معاہدے کا پاس کرتے ہوئے کسی سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

سیل فون آن ہوا تو سب سے پہلے ایک ٹیکسٹ میسج پر میری نظر پڑی۔ یہ میسج ڈیلفی کے نمبر سے آیا تھا۔ میں نے میسج کو اوپن کر لیا۔ ڈیلفی نے لکھا تھا:

''علی! تم نے جو کیا وہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ ہم جو کریں گے وہ ہمارا اپنا فیصلہ ہوگا۔ تم یہ نہیں سمجھنا کہ تمہارے چلے جانے سے ہمارے خیالات میں کسی قسم کی کوئی تبدیلی آ جائے گی اور ہم اپنے منصوبے کو پس پشت ڈال دیں گے۔ ہماری نظر میں تم وہی شخص ہو جس کی ہمیں تلاش ہے۔ تم کہیں بھی چلے جاؤ، ہم تمہیں بھولیں گے نہیں کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ایک دن تم ضرور ہماری سیکرٹ سوسائٹی کے ممبر بن جاؤ گے۔ ہم تم پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ڈالیں گے جیسا کہ ان بہتر گھنٹوں میں تمہارے ساتھ کوئی زور زبردستی نہیں کی گئی لیکن ہم جانتے ہیں کہ تمہارے حالات تمہیں واپسی کے لیے مجبور کر دیں گے۔ تمہارے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہے گا اور تم ہماری طرف رخ کرو گے اور...... اس وقت بھی میں خوش دلی اور گرم جوشی سے تمہیں ویلکم کہوں گی۔ میرا سیل نمبر تمہارے پاس محفوظ ہے۔ ہمارے دروازے تمہارے لیے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ تم اپنی مرضی سے واپس آؤ یا حالات کی سختی سے گھبرا کر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے اور ہاں...... ہم لوگ وعدے کے بہت پابند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی وعدہ کر لیں تو اسے نبھانا بھی جانتے ہیں۔ میں نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ تمہاری دوست شارو کو واپس لاؤں گی تو...... میں اپنا یہ وعدہ ہر حال میں پورا کروں گی۔ تم دنیا کے کسی بھی حصے میں ہو گے، میں شارو کو تم تک ضرور پہنچاؤں گی۔''

یہ طویل میسج دو تین حصوں میں تھا اور اس میں کام کی صرف دو ہی باتیں تھیں جن میں ایک دل خوش کن اور دوسری تشویشناک تھی۔ مطلب یہ کہ کسی بھی وسیلے سے شارو کا مجھ تک پہنچ جانا میرے لیے باعث اطمینان قلب و نظر تھا اور ڈیلفی کا یہ کہنا کہ میرے بارے میں اُن کی رائے نہیں بدلے گی، کافی غور طلب اور تشویشناک تھا۔ مطلب یہ کہ وہ لوگ مجھے غریدہ اور الفریڈ کا بیٹا سمجھتے تھے، سمجھتے ہیں اور سمجھتے رہیں گے۔

میں نے ڈیلفی اور اس کی سیکرٹ سوسائٹی کے

خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور انکل سلطان کے نمبر پنچ کرنے لگا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کال اٹینڈ نہیں کی گئی۔ میں نے دوبارہ مزید کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی۔

''کیا انکل آج جلدی سو گئے ہیں جو وہ میرا فون اٹینڈ نہیں کر رہے؟'' میں خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

پھر خود ہی میرے ذہن نے اس سوال کا جواب بھی دے دیا۔ ''اگر انکل آج جلدی سو بھی گئے ہیں تو ایملی کو فون اٹھانا چاہیے۔''

ایملی کل وقتی گھریلو ملازمہ تھی اور اسے چند روز پہلے ہی انکل کی دیکھ ریکھ کے لیے رکھا گیا تھا۔ ایملی سے پہلے انکل کے پاس ایک ادھیڑ عمر عورت مارتھا کام کرتی تھی اور ان دونوں کے بیچ میں اسی مقصد کے لیے شارو کو انکل سلطان کی خدمات پر مامور کیا گیا تھا اور اپنے انہی فرائض کی انجام دہی کے دوران میں وہ ایک سہ پہر منظر سے غائب ہوگئی تھی۔ بعدازاں معلوم ہوا تھا کہ لیونارڈو نے اسے اغوا کر کے ہوانا پہنچا دیا تھا۔

جب کئی بار کی کوشش کے باوجود بھی انکل نے کال اٹینڈ نہیں کی تو میں نے ایملی کے نمبر پنچ کیے۔ میں انکل کی طرف سے گہری تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ایملی کو ہم نے مولی میڈ سروسز کے توسط سے رکھا تھا جو ایک قابل اعتماد ادارہ تھا، لہٰذا ایملی ہی مجھے انکل کی خیریت سے آگاہ کر سکتی تھی۔

دوسری ہی گھنٹی پر ایملی نے کال ریسیو کر لی۔ میرے ''ہیلو'' کہنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔

''علی! تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

''میں غائب نہیں ہوا تھا بلکہ انکل کو بتا کر گیا تھا کہ چند دنوں کے لیے سیر سپاٹا کرنے یوسٹن جا رہا ہوں۔'' میں نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''پھر میں یوسٹن سے ڈیلس چلا گیا تھا۔''

میرے اور انکل سلطان کے بیچ یہی طے ہوا تھا کہ میرے غیاب کے حوالے سے لوگوں کو یہ اسٹوری سنائی جائے گی۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' ایملی نے کہا۔ ''لیکن پچھلے دو چار دن سے تمہارا فون مسلسل بند آ رہا تھا۔ اس بات نے مسٹر سلطان کو تمہاری طرف سے بہت فکر مند کر دیا اور......''

''اور کیا......؟'' میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''انہیں دمے کا شدید اٹیک ہوا ہے۔'' ایملی نے بتایا۔

''کک...... کب؟'' میری آواز بکھر کر رہ گئی۔

''کل رات کو۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے فوراً انہیں اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا تھا۔''

''کون سے اسپتال میں ہیں وہ؟'' میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

''میٹا گورڈا ریجنل میڈیکل سینٹر۔'' اس نے بتایا۔

''میں ابھی اسپتال ہی جا رہی ہوں۔ ان کی طبیعت اب کافی بہتر ہے۔ میں انہیں ڈسچارج کروانے ہی جا رہی ہوں۔''

''اوکے...... میں بھی سیدھا اسپتال ہی آ رہا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''تم ادھر ہی میرا انتظار کرنا۔ میں بے سٹی سے زیادہ دور نہیں ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم آ جاؤ۔'' ایملی نے معتدل انداز میں کہا۔

میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور اسے بے سٹی کی سمت دوڑا دیا۔ انکل سلطان کی رہائش بے سٹی میں میٹا گورڈا کاؤنٹی کے اندر تھی اور یہ میڈیکل سینٹر بھی اسی ایریا میں تھا لہٰذا اس کا نام میٹا گورڈا ریجنل میڈیکل سینٹر رکھا گیا تھا۔ یہ بہت ہی معیاری اسپتال تھا۔

بے سٹی میں داخل ہونے کے بعد میں نے اپنی سرخ ہنڈائے کو سیونتھ اسٹریٹ پر ڈال دیا کیونکہ مذکورہ اسپتال اسی اسٹریٹ پر پلاٹ نمبر ون زیرو فور یعنی ایک سو چار نمبر پلاٹ پر واقع تھا۔

انکل سلطان کو اسپتال سے ڈسچارج کروانے میں ہمیں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہم انکل کے اپارٹمنٹ کے اندر موجود تھے۔ میں نے انکل کو ان کے بیڈ پر لٹایا اور ان کے قریب ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت ان کی سانس تو کافی ہموار چل رہی تھی لیکن دمے کے اٹیک نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ بہت زیادہ کمزور نظر آ رہے تھے۔

میں نے ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھام کر خلوصِ دل سے کہا۔ ''انکل! آئی ایم ویری سوری۔''

''کیوں میرے بچے۔'' وہ بڑے دلار سے بولے۔ ''سوری کس بات کی؟''

''یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔'' میں نے ندامت آمیز انداز میں کہا۔ ''میں یوں غائب نہ ہوتا تو آپ کی یہ حالت بھی نہ ہوتی۔''

''جو وقت گزر گیا، اس پر مٹی ڈالو میرے بچے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''تمہاری صورت دیکھ لی ہے نا۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بتاؤ، تم کہاں گم ہو گئے تھے؟''

''میری کہانی بہت ہی پیچیدہ، پراسرار اور الجھی ہوئی ہے۔'' میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جب آپ کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی تو اطمینان سے آپ کو سناؤں گا۔''

''تم آ گئے ہو نا تو سمجھو، میری طبیعت ایک دم فٹ ہوگئی ہے۔'' وہ خاصی کراری آواز میں بولے۔ ''تم اپنی اسٹوری مجھے ابھی سناؤ گے۔''

''آپ آرام کر لیتے تو اچھا تھا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''اسٹوری کا کیا ہے۔ یہ تو کسی بھی وقت سنائی جا سکتی ہے۔''

''کسی اور وقت نہیں، ابھی اور اسی وقت!'' وہ اصراری لہجے میں بولے۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''زیادہ وقت نہیں ہے۔'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب ہے، آپ کا؟''

''میرے بچے! تمہیں پاکستان جانا ہوگا۔'' وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔

''پاکستان..... مگر کیوں؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں ان کی طرف دیکھا۔

''یہ میرا نہیں، مرزا عامر بیگ کا فیصلہ ہے۔'' انہوں نے بتایا۔ ''میری تو خواہش ہے کہ تم ساری زندگی میری آنکھوں کے سامنے رہو لیکن میں بیگ صاحب کے فیصلے کے سامنے مجبور ہوں۔ ان کی بات کو ٹال نہیں سکتا۔''

''یہ بیگ صاحب کون ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے بہت ہی مخلص اور گہرے دوست ہیں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''بروکلین، نیویارک میں رہتے ہیں۔''

''یہ نام میں نے آپ کی زبان سے پہلی مرتبہ سنا ہے۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''میں پہلے کبھی ان سے مل چکا ہوں کیا؟''

''نہیں..... کبھی نہیں۔'' انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

''انکل! میں بیس سال کا ہونے والا ہوں۔'' میں نے بہ دستور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ''ان بیس سالوں میں جس شخص کو میں نے کبھی دیکھا نہیں، کبھی اس کا تذکرہ نہیں سنا ..... وہ ہوتا کون ہے، میری زندگی کا فیصلہ کرنے والا؟ میں اس کے کہنے پر پاکستان کیوں چلا جاؤں اور کس لیے؟''

''ریلیکس میرے بچے۔'' وہ شفقت بھرے لہجے میں بولے۔ ''میں تمہارے تمام سوالوں کا جواب دوں گا۔ تم میری بات کو توجہ سے سننا۔'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر بڑے گمبھیر انداز میں بولے۔

''شاید اب وقت آ گیا ہے کہ تمہاری زندگی کا سربستہ راز تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے۔''

میرے پورے وجود میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میری زندگی کا سب سے بڑا راز تو یہی تھا کہ مجھے اپنے والدین کا اتا پتا معلوم نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کے بارے میں کچھ جانتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انکل سلطان نے کسی باپ سے بڑھ کر ذمے داری نبھاتے ہوئے زندگی کے ہر شعبے میں میرا بہت خیال رکھا تھا۔ کبھی مجھے کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہونے دی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میرا ان سے کوئی خونی رشتہ نہیں تھا۔ وہ میرے خیر خواہ تھے، میرے مربی تھے اور میرے گارجین تھے۔ اس بات کا مجھے بہ خوبی اندازہ تھا کہ وہ میرے والدین کے بارے میں سب کچھ یا بہت کچھ جانتے تھے مگر میں نے اس حوالے سے جب بھی ان سے سوال کیا تو انہوں نے بڑی خوب صورتی سے ٹال دیا تھا۔ ہر مرتبہ انہوں نے ایک ہی بات کی تھی کہ مناسب وقت آنے پر تمہیں سب پتا چل جائے گا اور ..... لگتا ہے، اب وہ مناسب وقت آن پہنچا تھا جبھی انہوں نے کہا تھا ..... شاید اب وقت آ گیا ہے کہ تمہاری زندگی کا سربستہ راز تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا جائے!

میں گہری توجہ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے۔ ''میرے بچے! میں ترتیب وار تمہارے سوالوں کا جواب دے رہا ہوں۔ تم نے پوچھا، وہ ہوتا کون ہے تمہاری زندگی کا فیصلہ کرنے والا؟ مرزا عامر بیگ وہ شخص ہے جس نے تمہیں میرے حوالے کیا تھا۔ اس وقت تمہاری عمر کم و بیش ایک سال تھی۔ بیگ میرا جگری یار ہے۔ اس نے مجھے یہ فریضہ سونپا تھا کہ میں تمہاری پرورش کروں، تمہاری تعلیم و تربیت کا خیال رکھوں اور تمہیں پروان چڑھا کر جوان بنا دوں۔ اس سلسلے میں اخراجات کی مد میں وہ ماہانہ ایک ہینڈسم اماؤنٹ دیتا رہا ہے۔ میں نے اپنے دوست کی بات مان لی اور تمہارا گارجین بن گیا۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنے اس فرض کی راہ میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ تم اس وقت بیس سال کے ایک صحت مند اور بھرپور نوجوان ہو۔ تم نے سائیکالوجی میں گریجویشن کر لیا ہے اور آگے تمہارا مستقبل روشن نظر آتا ہے..... '' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمے پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

''تمہیں پتا چل گیا کہ مرزا عامر بیگ کون ہوتا ہے۔ تمہارا دوسرا سوال یہ تھا کہ تم اس کے کہنے پر پاکستان کیوں جاؤ؟ تو اس کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ وہ کچھ سوچ کر ہی

تمہیں پاکستان بھیجنا چاہتا ہوگا۔ تمہارا تیسرا سوال یہ تھا کہ تم کس لیے پاکستان جاؤ؟ میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ تمہاری حفاظت کی غرض سے کررہا ہے۔''

''بیگ صاحب جو کچھ بھی کررہے ہیں مجھے اس سے زیادہ دلچسپی یہ جاننے سے ہے کہ وہ میری خاطر یہ سب کیوں کررہے ہیں۔'' انکل کے خاموش ہونے پر میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کا مجھ سے کیا رشتہ ہے؟ وہ میرے کیا لگتے ہیں؟''

''وہ تمہارے کچھ نہیں لگتے اور نہ ہی تمہارا ان سے کوئی رشتہ ناتا ہے۔'' انکل نے بڑی رسان سے بتایا۔ ''وہ یہ سب کچھ کسی لیڈی کے کہنے پر کررہے ہیں۔''

''لیڈی...... کون لیڈی؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''میں اس لیڈی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' انکل نے کہا۔ ''مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ وہ بیگ صاحب کے کسی جاننے والے کی رشتے دار ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں رہتی ہے۔ جس جاننے والے کا میں نے ذکر کیا، اس نے تمہیں بیگ صاحب کے حوالے کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ مذکورہ خاتون ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ ایک ہینڈسم اماؤنٹ پاکستان سے بھیجتی رہے گی تاکہ تمہاری ہر لحاظ سے بھرپور پرورش ہوتی رہے۔ وہ جاننے والا شخص جس نے تمہیں بیگ صاحب کے حوالے کیا تھا، اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا۔ جن لیڈی کا میں نے ذکر کیا وہ تین ماہ پہلے تک بیگ صاحب کو ایک ہینڈسم اماؤنٹ بھیجتی رہی ہے لیکن گزشتہ دو ماہ سے اس کی طرف سے مکمل خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس صورتِ حال نے بیگ صاحب کو پریشان کردیا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ تم پاکستان چلے جاؤ۔''

''مجھے تو اس میں پریشانی والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب ان لیڈی سے رابطہ کرکے معلوم کرلیں کہ وہ پچھلے دو ماہ سے کہاں غائب ہیں!''

''بیگ صاحب ان لیڈی سے رابطہ نہیں کرسکتے۔'' انکل نے بتایا۔

''کیوں نہیں رابطہ کرسکتے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس لیے کہ بیگ صاحب کے پاس ان لیڈی کا کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔'' انکل نے بتایا۔ ''اور نہ ہی بیگ صاحب اس کے پتے ٹھکانے سے واقف ہیں۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ ''بیگ صاحب پچھلے بیس سال سے پاکستان میں بسنے والی کسی لیڈی سے نہایت پابندی کے ساتھ ماہانہ رقم تو وصول کررہے ہیں لیکن اس کے پتے ٹھکانے اور کانٹیکٹ نمبر سے واقف نہیں ہیں؟''

''تمہارا الجھنا بجا ہے میرے بچے۔'' وہ نرمی سے بولے۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بیگ صاحب غلط بیانی سے کام نہیں لے رہے۔ وہ لیڈی کچھ عرصہ پہلے تک ہنڈی کے ذریعے رقم بھیجا کرتی تھی۔ پھر نائن الیون کے بعد جب حوالہ اور ہنڈی کے کام پر سختی سے پابندی عائد کردی گئی تو پھر وہ لیڈی ویسٹرن یونین اور دوسرے منی ٹرانسفر ذرائع سے رقم بھیجنے لگیں۔ تم جانتے ہو کہ ان ذرائع سے رقم بھیجنے والے کے پتے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔ دو ماہ پہلے تک یہ سلسلہ نہایت پابندی سے جاری تھا لیکن لیڈی کی پراسرار خاموشی نے بیگ صاحب کو تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔ اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ تم پاکستان جاکر ان لیڈی سے ملو تاکہ تمہیں پتا چلے کہ وہ پچھلے بیس سال سے تمہاری خیر خواہی کیوں کررہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، ان ذرائع سے رقم بھیجنے والے کے پتے ٹھکانے کا سراغ نہیں لگایا جاسکتا۔'' میں نے انکل کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں یہ جانتا ہوں کہ کم از کم رقم بھیجنے والے کے نام اور فون نمبر کا سراغ ضرور لگایا جاسکتا ہے اور اگر ویسٹرن یونین یا دوسرے منی ٹرانسفر ذرائع سے ...... اپیل کی جائے تو ان کے تعاون سے رقم بھیجنے والے کو ٹریس کرنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو میرے بچے۔'' انکل نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''لیکن بیگ صاحب لیڈی والے معاملے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کرنا چاہتے۔ تم جانتے ہو کہ نائن الیون کے بعد امریکا میں نیشنل سیکیورٹی کا معاملہ کتنا حساس ہوچکا ہے۔ ایسی چھیڑ چھاڑ سے اگر انویسٹی گیشن کا دروازہ کھل گیا اور یہ بات سامنے آئی کہ کراچی، پاکستان میں رہنے والی کوئی لیڈی پچھلے بیس سال سے تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت کا خرچہ اٹھا رہی ہے تو حساس اداروں کے ذہن میں سب سے پہلے یہ سوال ابھرے گا کہ وہ لیڈی کون ہے اور تم کون ہو؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے نتیجے میں جو طوفان اٹھے گا، وہ ان لیڈی کا کچھ بگاڑے یا نہ بگاڑے لیکن تمہارے مستقبل کو یقیناً تباہ و برباد کرڈالے گا۔ ان لیڈی پر ''فنڈنگ'' اور تم پر ''ٹیرارسٹ'' کی چھاپ لگ سکتی ہے۔ ریکارڈ کے مطابق، تم امریکی شہری ہو لیکن اس

کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ نسلاً تم ایشیائی ہو۔ اگر حساس اداروں کو یہ پتا چل گیا کہ پچھلے بیس سال سے کوئی لیڈی پاکستان میں رہتے ہوئے یہاں امریکا میں تمہاری پرورش کر رہی ہے تو تمہارا تعلق انتہا پسند تنظیم سے اور پتا نہیں کس کس سے جوڑا جاسکتا ہے۔ جب تمہارے بارے میں تفتیش ہوگی تو سب سے پہلے تمہارے والدین کا پتا چلانے کی کوشش کی جائے گی اور اس تفتیش سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ میں تمہارا گارجین ہوں، بیگ صاحب سہولت کار ہیں اور وہ لیڈی اس ''پراجیکٹ'' کی فنڈنگ کر رہی ہے۔'' لحاتی توقف کر کے انہوں نے گہری سانس لی پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''ایک سو ایک فیصد سمجھ رہا ہوں انکل۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ صورتِ حال خاصی گمبھیر ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ میری وجہ سے کوئی مصیبت میں آجائے۔ نہ آپ، نہ بیگ صاحب اور نہ ہی وہ لیڈی ...... لیکن کم از کم مجھے یہ تو معلوم ہونا چاہیے نا کہ اس لیڈی کا مجھ سے کیا تعلق ہے۔ میں اپنی جمی جمائی لائف کو چھوڑ کر پاکستان کیوں چلا جاؤں؟''

''اس سلسلے میں کئی بار میری بیگ صاحب سے بات ہو چکی ہے۔'' انکل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کا اندازہ یہ ہے کہ ان لیڈی کا تم سے کوئی خونی رشتہ ہے۔ شاید وہ تمہاری والدہ ہیں!''

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''کیا ان کا نام غریدہ ہے؟''

''غریدہ ...... یہ کون ہیں؟'' انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔ میں جو اسٹوری آپ کو سنانے والا ہوں اس میں غریدہ صاحبہ کی تفصیل موجود ہے۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پہلے آپ میرے سوال کا جواب دیں۔''

''میں نہیں جانتا کہ ان لیڈی کا نام کیا ہے۔'' انکل نے جواب دیا۔

''کیا بیگ صاحب نے کبھی آپ کو بتایا کہ رقم بھیجنے والی لیڈی نے کبھی اپنا نام غریدہ استعمال کیا ہو؟''

''میری کبھی اس حوالے سے بیگ صاحب سے بات نہیں ہوئی۔'' انکل سلطان نے بتایا۔ ''انہوں نے ایک بار خود ہی بتایا تھا کہ وہ لیڈی ہر بار نام بدل کر رقم بھیجتی ہے۔ اب یہ مجھے معلوم نہیں کہ کبھی اس نے غریدہ کا نام بھی استعمال کیا یا نہیں۔''

''انکل! میں نے ساری زندگی آپ کے سائے میں گزاری ہے۔'' میں نے ان کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آپ میرے باپ نہیں ہیں لیکن آپ نے کسی سگے باپ سے زیادہ میرا خیال رکھا ہے۔ میں آپ کی بات کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے بتائیں، اس لیڈی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میں بھی بیگ صاحب کے انداز میں سوچتا ہوں۔'' وہ معتدل انداز میں بولے۔ ''مجھے لگتا ہے، وہ لیڈی تمہاری ماں ہوسکتی ہے۔ کوئی ماں ہی اتنی ذمے داری کے ساتھ کسی کا خیال رکھ سکتی ہے۔''

''اگر وہ لیڈی واقعی میری ماں ہے تو پھر پچھلے بیس سال سے وہ مجھ سے ہزاروں میل کی دوری پر کیوں زندگی گزار رہی ہے۔'' میں نے تڑپ کر پوچھا۔ ''کیا میرے لیے اس کی مامتا نے کبھی جوش نہیں مارا؟''

''میں نے اس نکتے پر بیگ صاحب سے بات کی تھی۔'' انہوں نے بتایا۔ ''انہوں نے کہا کہ یہ سوال انہوں نے اس شخص سے بھی پوچھا تھا جو پہلے بیگ صاحب اور ان لیڈی کے بیچ رابطے کا ذریعہ تھا۔ اس شخص کا نام جاوید واسطی تھا۔ جاوید واسطی اب اس دنیا میں باقی نہیں ہے۔''

''جاوید واسطی نے بیگ صاحب کو کیا بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جاوید واسطی نے بیگ صاحب کو بتایا تھا کہ پاکستان میں تمہاری زندگی کو شدید ترین خطرہ تھا۔'' انکل وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ ''ان لیڈی کی کسی سے پرانی دشمنی تھی اور وہ تمہیں دشمنوں کی دست برد سے محفوظ رکھنا چاہتی تھیں اس لیے انہوں نے تمہاری پرورش اور تعلیم و تربیت کا بندوبست پاکستان سے ہزاروں میل دور یہاں امریکا میں کر دیا۔''

ابھی تک اس امر کی تصدیق نہیں ہوسکی تھی کہ وہ پراسرار لیڈی میری کیا لگتی ہے لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے نے اسے اپنی ماں تسلیم کر لیا تھا۔ یہی حال میرے دل کا بھی تھا۔ اس لیڈی کے بارے میں تفصیل جاننے کے بعد میرا دل اس کے لیے بے طرح دھڑک رہا تھا۔ آپ میرے جذبات کو سمجھ سکتے ہیں۔ میں اپنے محسوسات کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ ایک شخص جو بچپن سے جوانی تک اپنے والدین کی صورتیں دیکھنے کو ترسا ہو، اسے اچانک یہ پتا

چلے کہ اس کی ماں اس سے ہزاروں میل کے فاصلے پر موجود ہے تو ان لمحات میں یقیناً اس کی یہی خواہش ہوگی کہ کسی معجزے کے تحت اس کے پَر نکل آئیں اور وہ پہلی فرصت میں اڑان بھر کر اپنی ماں کے پاس پہنچ جائے اور...... اس کے سینے میں چھپ کر بیس سالہ جدائی کا حساب برابر کردے۔ اس وقت میرے جذبات بھی اسی قسم کے تھے۔

''کن سوچوں میں گم ہو میرے بچے؟'' انکل سلطان کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔

''میں پاکستان جاؤں گا۔'' میں نے جذبات سے مغلوب آواز میں کہا۔ ''آپ میری فوری روانگی کا بندوبست کریں۔''

''بندوبست بہت آسان ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''تمہاری کالج کی چھٹیاں ہیں۔ اپنا پاسپورٹ پاکستان کے ویزے کے لیے ڈال دو۔ تم پاکستان کے شمالی علاقہ جات کی سیر کو اس سفر کا سبب بتا سکتے ہو۔ پلک جھپکتے میں تمہارا ویزا لگ جائے گا۔ اس کے بعد جہاز میں بیٹھو اینڈ گو...... وینٹ...... گون......'' انہوں نے لمحاتی توقف کر کے چٹکی بجائی پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''جتنی زیادہ مشکلات سے گزرنے کے بعد ایک پاکستانی کو امریکا کا وزٹ ویزا ملتا ہے، اتنی ہی زیادہ آسانیوں کے ساتھ ایک امریکی کو پاکستان کا ویزا مل جاتا ہے لہٰذا ٹینشن والی کوئی بات نہیں۔''

''ٹینشن والی بات تو ہے نا انکل!'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''کیا مطلب...... کیا ٹینشن ہے تمہیں؟'' انہوں نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''انکل! جو خاتون پچھلے بیس سال سے نہایت پابندی کے ساتھ اپنے بیٹے کی نگہداشت کا فریضہ انجام دے رہی تھی، وہ گزشتہ دو ماہ سے غائب ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ کہیں وہ کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوگئی ہو ورنہ کوئی ماں اپنی اولاد کی طرف سے ایسی غفلت کا مظاہرہ نہیں کرسکتی لہٰذا مجھے فوراً اس کی مدد کے لیے پاکستان روانہ ہوجانا چاہیے۔''

''شاباش میرے بچے!'' وہ توصیفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم ایک فرض شناس اور ذمے دار بیٹے کے انداز میں سوچ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لیڈی تمہاری ماں کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی۔ ہم دونوں نے کل ایک ایک اہم کام کرنا ہے۔''

''کون کون سا اہم کام؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

''تم کل صبح اپنا پاسپورٹ پاکستان کے ویزے کے لیے پراسس میں ڈالو گے۔'' انہوں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، اپنے پاکستان جانے کے منصوبے کا آغاز کردو گے اور میں......'' لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

''میں کل بیگ صاحب سے رابطہ کر کے انہیں بتا دیتا ہوں کہ تم نے پاکستان جانے کا فیصلہ کرلیا ہے، اس طرح انہیں تمہاری طرف سے اطمینان ہوجائے گا۔''

''صرف ان کا اطمینان ضروری نہیں بلکہ میرے اطمینان کا بھی کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''تم کیا چاہتے ہو میرے بچے؟'' انہوں نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''آپ بیگ صاحب سے کہیں کہ ان کے پاس رقم وصول کرنے کے حوالے سے پچھلے بیس سال کا جو بھی ریکارڈ ہے، وہ میرے حوالے کردیں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''منی ٹرانسفر کے جتنے بھی ذرائع اس وقت دنیا میں کام کر رہے ہیں وہ رقوم بھیجنے والے اور رقوم وصول کرنے والے افراد کو ایک رسید دینے کے قانوناً پابند ہوتے ہیں۔ اس حوالے سے بیگ صاحب کے پاس کافی مواد موجود ہوگا۔ میں اس مواد کو کھنگالنا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ کوشش ضرور رنگ لائے گی اور میں کراچی، پاکستان میں اپنی ماں کی لوکیشن تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔''

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''میں بیگ صاحب کو اس حوالے سے خاص طور پر کہہ دیتا ہوں۔''

''شکریہ انکل۔'' میں نے ممنونیت بھری نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

''میرے بچے! اس میں ''شکریہ'' والی کوئی بات نہیں۔'' وہ محبت بھرے لہجے میں بولے۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں پچھلے بیس یا انیس سال سے جس مقصد کے ساتھ جڑا ہوا تھا، وہ مشن پورا ہونے کا وقت آگیا ہے۔ تم اپنی ماں کے پاس پہنچ جاؤ گے تو میں سکون کی سانس لوں گا اور اس سلسلے میں تمہیں ایک مشورہ بھی دوں گا۔''

''کیسا مشورہ انکل؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''پاکستان کے اندرونی اور بیرونی حالات تمہارے سامنے ہیں۔'' وہ مدبرانہ انداز میں بولے۔ ''میری دلی دعا ہے کہ تم جلد از جلد اپنی ماں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ۔ جو خاتون پچھلے بیس سال سے تمہارے ہر قسم کے اخراجات برداشت کر رہی ہے اس کا صاحب حیثیت ہونا تو لازمی بات ہے۔ تم کسی طرح کوشش کرنا کہ وہ امریکا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کرے۔ اس سلسلے میں یہاں کی جو قانونی ریکوائرمنٹس ہوں گی، وہ میں پوری کردوں گا۔ اگر اسے امیگریشن ویزا مل جاتا ہے تو اس سے اچھی اور کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہاں جو سیف اینڈ سیکیور زندگی ہے، اس کا پاکستان میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔''

''میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی چاہوں گا کہ اپنی والدہ کو یہاں لے آؤں لیکن اس سلسلے میں حتمی فیصلہ پاکستان پہنچنے اور خاص طور پر والدہ سے ملنے کے بعد وہاں کے حالات و واقعات کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے پھر کہا۔ ''اب بتاؤ، تمہاری کیا اسٹوری ہے اور یہ غریدہ کون ہے۔ تم نے اپنی ماں کے تذکرے پر غریدہ کا نام کیوں لیا؟''

''انکل! میری اسٹوری پیچ در پیچ کافی الجھی ہوئی ہے۔'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ''اس پر کل صبح بات کریں گے۔ رات کافی بیت چکی ہے۔ آپ تھوڑی دیر پہلے اسپتال سے آئے ہیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور مجھے بھی نیند آرہی ہے۔''

میری بات انکل کی سمجھ میں آگئی۔ انہوں نے ایک لمحہ غور کیا پھر معتدل انداز میں بولے۔ ''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔''

انکل کو ان کے بیڈ پر لٹانے کے بعد میں دوسرے بیڈ روم میں آگیا۔ میں اس بیڈ روم میں پہلے بھی کئی راتیں گزار چکا تھا اور ان میں ایک رات تو ایسی تھی کہ جب شارو بھی میرے ساتھ تھی اور ہم تاریک بیڈ روم میں، ایک دوسرے کی تلاش میں بہت دور نکل گئے تھے پھر حالات کی ستم ظریفی نے اسے مجھ سے دور پہنچا دیا۔ بے سٹی سے ہوانا ایک ہزار تین سو چھیانوے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا اور اب میں بوسٹن سے ڈائریکٹ کراچی جانے والا تھا۔ گویا ہمارے درمیان فاصلہ بڑھنے والا تھا۔ بوسٹن سے کراچی کم و بیش تیرہ ہزار سات سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہوا کہ میرے اور شارو کے بیچ حائل فاصلہ تیرہ سو کلومیٹرز سے تیرہ ہزار کلومیٹرز کے فگر میں بدلنے والا تھا......!

میں ایک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں یہ اطمینان جاگزیں تھا کہ ڈیلفی اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گی اور شارو ایک دن میری نظر کے سامنے ہوگی۔ اس اطمینان کے پہلو میں ایک خلش بھی براجمان تھی۔ ڈیلفی اگر شارو کو مجھ تک پہنچا دیتی تو یہ اس کا مجھ پر عظیم احسان ہوتا۔ اس سے پہلے بھی اس نے مجھے پیبلو مرڈر کیس سے بڑی صفائی کے ساتھ نکال کر مجھ پر احسان ہی کیا تھا۔ میں گویا اس کے احسانات کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا اور میں نے اس کی عالی شان پیشکش کو ٹھکرا کر کس رویّے کا مظاہرہ کیا تھا؟

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب دینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے سر دست ڈیلفی کے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور اپنی توجہ صرف اور صرف اس لیڈی پر لگادی جو پچھلے انیس سال سے میری پرورش کا ذمہ اٹھائے ہوئے تھی۔ ابھی تک اس لیڈی کے حوالے سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کی روشنی میں وہ میری والدہ کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتی تھی اور میرا دل بھی دھڑک دھڑک کر یہی گواہی دے رہا تھا کہ عنقریب میں اس ہستی سے ملنے والا ہوں جس نے نو ماہ تک مجھے اپنی کوکھ میں رکھا تھا اور مجھے اس دنیا میں لانے کا عظیم کارنامہ بھی اسی کے نام پر تھا۔ میں ایک طویل عرصے سے انکل کی زبان سے جس راز کے افشا ہونے کا انتظار کرتا رہا تھا، بالآخر آج میری وہ خواہش پوری ہوہی گئی تھی لیکن میری اس خواہش کو سند اسی وقت حاصل ہوسکتی تھی جب میں کراچی میں مقیم اس خاتون سے مل لیتا جس کے بارے میں انکل سلطان اور ان کے قابلِ اعتماد دوست کا اندازہ یہ تھا کہ وہ میری والدہ ہوسکتی تھی۔

انکل کے بیان کے مطابق، ان کے دوست مرزا عامر بیگ کی یہ خواہش تھی کہ میں فوراً سے پیشتر پاکستان چلا جاؤں۔ اگر مجھ سے کراچی جانے کے لیے نہیں بھی کہا جاتا تو اس انکشاف کے بعد میں یہاں رکنے والا نہیں تھا۔ میرے تن بدن میں ایک عجیب سا سرور گردش کر رہا تھا، حواس پر ایک مستی سی چھائی ہوئی تھی اور دل و دماغ ایک ہی ہستی کے تصور میں مگن تھے۔ میں اپنے والدین سے ملنے کے لیے بہت تڑپا تھا لیکن آج پہلی مرتبہ اس تڑپ کا اور یجنل فلیور میرے احساسات سے بغل گیر ہوا تھا۔ میں خود کو کیف و نشاط کی کیفیت میں ڈوبا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ پچھلے ایک ہفتے سے

میرے والدین کا معاملہ اچانک زیر بحث آ گیا تھا۔ پریسٹن ہالو والے بنگلے پر سب سے پہلے ربی آئزک باروخ لاؤ نے میرے والدین کو موضوع بنا کر مجھ پر اچھی خاصی ریسرچ کر ڈالی تھی اور نتیجہ یہ برآمد کیا تھا کہ میں غریدہ اور الفریڈ کی وہی اولاد ہوں جس کی انہیں تلاش تھی۔ ڈیلفینا عرف ڈیلفی ربی کی ہونہار چیلی تھی لہٰذا اس کے خیالات ربی سے مختلف ہو نہیں سکتے تھے۔ ایما ایبل بام نے بھی اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا تھا اور اب...... مرزا عامر بیگ کے حوالے سے ایک سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا۔ میں چونکہ ڈیلفی اور اس کی سیکرٹ سوسائٹی کے اختیارات کا جلوہ بہت قریب سے دیکھ چکا تھا لہٰذا ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں اس خدشے نے بھی سر ابھارا کہ...... کہیں مرزا عامر بیگ اور جاوید واسطی ڈیلفی کے آلۂ کار تو نہیں ہیں اور ڈیلفی مجھے گھیرنے کے لیے کوئی پیچیدہ گیم کھیل رہی ہے؟

یہ خدشہ زیادہ دیر تک میرے ذہن میں ٹک نہیں پایا۔ اگلے ہی لمحے میری سوچ نے اس کی تردید کر دی اور اس تردید کی بڑی ٹھوس وجوہات تھیں۔

اگر چند لمحات کے لیے بہ فرضِ محال یہ مان بھی لیا جاتا کہ مرزا عامر بیگ اور جاوید واسطی مرحوم ڈیلفی کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں تو پھر انکل سلطان کا کردار ان دونوں سے میچ نہیں کرتا تھا۔

میں انکل سلطان پر اندھا بھروسا کرتا تھا اور ان کا بیان یہ تھا کہ پچھلے انیس سال سے مرزا عامر بیگ کے توسط سے ان کے پاس ایک معقول رقم پہنچ رہی تھی اور یہ رقم کراچی پاکستان میں رہنے والی کوئی لیڈی میری پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے بھیج رہی تھی۔ مذکورہ لیڈی کسی بھی صورت میں غریدہ نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ربی آئزک اور ڈیلفی نے غریدہ کے حوالے سے مجھے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق میڈم غریدہ کا تعلق راولپنڈی کے ایک بیوروکریٹ خاندان سے تھا۔ خیر، اگر ربی اور ڈیلفی نے راست گوئی سے کام لیا تھا تو میری خیر خواہ وہ لیڈی ہرگز میڈم غریدہ نہیں ہوسکتی تھی اور اگر وہ لوگ کسی منصوبے کے تحت غلط بیانی کر رہے تھے تو ان کا عمل ان کے ساتھ۔ ہر شخص نے اپنی قبر میں جانا ہے اور اپنے کیے کا حساب دینا ہے۔

میں نے اپنے دماغ کو مخصوص قسم کی ہدایت دی اور نیند کی وادی کی سیر کو نکل گیا۔

☆☆☆

اگلی صبح ناشتے کے بعد انکل نے اپنے دوست مرزا عامر بیگ کو فون کیا۔ رسمی کلمات کے بعد انکل نے بیگ صاحب کو بتایا کہ میں نے پاکستان جانے کی ہامی بھر لی ہے۔ انہوں نے انکل سے کہا۔

''علی سے میری بات کراؤ۔''

انکل نے فون کا ریسیور میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے ریسیور کو انکل کے ہاتھ سے لے کر اپنے کان سے لگالیا اور کہا۔

''السلام علیکم انکل۔''

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ''جیتے رہو۔ آج تم سے پہلی مرتبہ میری بات ہو رہی ہے۔ ویسے سلطان مجھے تمہاری خیر خیریت سے آگاہ کرتا رہتا تھا۔''

''انکل! میں نے بھی گزشتہ رات پہلی مرتبہ آپ کا تذکرہ سنا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ پچھلے انیس سال سے میری زندگی سے جڑے رہے اور مجھے خبر نہیں ہوئی۔''

''دیر آید، درست آید۔'' انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''سلطان نے مجھے بتایا ہے کہ تم مجھ سے چند خاص سوالات پوچھنا چاہتے ہو۔''

''جی انکل۔'' میں نے کہا۔ ''اس وقت میرے ذہن میں جس نوعیت کے سوالات نے ادھم مچا رکھا ہے ان کے جوابات صرف اور صرف آپ ہی مجھے دے سکتے ہیں۔''

''اوکے!'' وہ پُرسوچ انداز میں بولے پھر پوچھا۔ ''تم ویزے کے لیے ٹریول ایجنٹ کو اپنا پاسپورٹ کب دے رہے ہو؟''

''آج ہفتہ ہے۔ آج اور کل یعنی اتوار کو تو آف ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں منڈے ہی کو اپنے ٹریول ایجنٹ کے پاس جاؤں گا۔ ویسے تو میں یہ کام نیٹ پر آن لائن بھی کر سکتا ہوں لیکن میرا خیال ہے، ایجنٹ کے ذریعے ہی پراسس کرنا زیادہ مناسب رہے گا۔ آج تک میرے سارے ویزا ایجنٹ ہی نے لگوا کر دیے ہیں۔ میں کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، پورا یورپ اور جنوبی امریکا گھوم چکا ہوں۔''

''مجھے سب معلوم ہے علی سلطان سے مجھے تمہارے معمولات اور پروگرامز کی تفصیل ملتی رہتی ہے۔'' انہوں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''امریکا میں پاکستان کا قونصلیٹ جنرل نیویارک اور کیلی فورنیا دونوں اسٹیٹ میں ہے۔ ویسے میں تمہارے خیال سے اتفاق کرتا ہوں کہ ویزا کا پراسس اپنے ٹریول ایجنٹ ہی سے کروانا چاہیے۔ مجھے امید ہے کہ زیادہ سے

زیادہ منڈے تو منڈے، ایک ہفتے کے اندر تمہیں ویزا مل جائے گا۔تم ایک کام کر سکتے ہو......"

"جی بتائیں؟" انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے پوچھ لیا۔

"آج اور کل کا دن تمہارے پاس فری ہے۔" انہوں نے کہا۔"ایسا کرو کہ ایک دن کے لیے تم میرے پاس آجاؤ۔ اس طرح ہماری ملاقات بھی ہو جائے گی اور ہم تمام ضروری امور پر تفصیلی گفتگو بھی کرلیں گے۔"

"آئیڈیا بہت عمدہ ہے۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔"میں انکل سلطان سے مشورہ کرنے کے بعد آج کسی وقت نکلتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ جو بھی پروگرام فائنل کرو، مجھے بتا دینا۔ مجھ تک پہنچنے کے لیے سلطان تمہیں مناسب انداز میں گائڈ کر دے گا۔"

"او کے......میں انکل سے ہدایات لے لوں گا۔"

"اب تم سلطان کو فون دو۔" انہوں نے کہا۔

میں نے ان کے حکم کی تعمیل کر دی۔

انکل سلطان اور مرزا عامر بیگ کے بیچ چند منٹ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر ٹیلی فونک رابطہ موقوف ہو گیا۔ ریسیور کو کریڈل کرنے کے بعد انکل نے مجھ سے کہا۔

"آج آفٹرنون میں تم نیویارک کے لیے روانہ ہو جاؤ۔"

"او کے انکل! جیسا آپ کہیں۔"

"اور اب تم مجھے اپنی اسٹوری سناؤ گے۔" وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔"وہ اسٹوری جس میں کوئی میڈم غریدہ بھی موجود ہے۔"

بات کے اختتام پر ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہو گئی تھی۔ انکل آج خاصے ہشاش بشاش نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ دمے کے شدید اٹیک کے نتیجے میں اسپتال یاترا کر کے لوٹے ہیں۔ وہ ایک بہادر اور ہمت والے انسان تھے۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں انہیں اپنی بپتا سنا ڈالی جس میں ڈیلفی کے اختیارات کے کمالات، ربی آئزک سے ہونے والی میری نہایت ہی اہم گفتگو۔ ڈیلفی کے منقی روپ والا واقعہ، ایما اپیل بام اور ٹفنی سے ملاقات کی تفصیل شامل تھی۔ میں نے انہیں سیکرٹ سوسائٹی "اسکل اینڈ بونز" کے بارے میں بھی سب کچھ بتا دیا۔

انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی پھر جذبات سے مغلوب لہجے میں بولے۔"میرے بچے! قریب آؤ......"

میں اس وقت ان کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا لیکن شاید وہ ایسی قربت کا تقاضا کر رہے تھے جس میں من و تو کا فرق مٹ جاتا ہے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ مجھ سے معانقہ کرنا چاہتے ہیں لہٰذا میں صوفے سے اٹھا اور ان کے انتہائی نزدیک چلا گیا۔ میرا اندازہ صد فیصد درست ثابت ہوا تھا۔

انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا لیا پھر میری پیٹھ کو تھپک تھپک کر بڑے فخر سے بولے۔"شاباش میرے بچے......شاباش۔ تم نے اس منحوس فارم پر دستخط نہ کر کے میرے کلیجے میں ٹھنڈ ڈال دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کے پجاری ہیں۔ تم ان سے جتنا بھی دور رہو، تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی بھی سیکرٹ سوسائٹی سے تعلق رکھنے والے لوگ بہت خطرناک اور بااختیار ہوتے ہیں۔ وہ بہت سے ناممکن کاموں کو ممکن کر کے دکھا دیتے ہیں۔ ان کی تنظیمی طاقت کی کوئی حد نہیں ہوتی اور بعض اوقات دنیا کے مضبوط ترین انسان بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال جے ایف کینیڈی ہے۔ اس امریکی صدر کو دنیا کا سب سے زیادہ طاقتور انسان تصور کیا جاتا تھا۔ دنیا کے ریکارڈ میں یہی رقم ہے کہ بائیس نومبر انیس سو تریسٹھ کو "لی ہاروے آسولڈ" نامی ایک شخص نے ایلم اسٹریٹ پر جے ایف کینیڈی کو شوٹ کر دیا تھا مگر حقیقت کچھ اور ہی ہے۔ لی ہاروے آسولڈ کے پیچھے کوئی اور ہی ہستی تھی جس نے دنیا کے سب سے زیادہ بااختیار اور طاقتور انسان کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا۔ یہ لوگ اتنی مہارت اور صفائی سے کام کرتے ہیں کہ ہر چیز کو بے نام و نشاں کر دیتے ہیں لہٰذا......" وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"لہٰذا تمہیں ہمیشہ ان لوگوں سے دور رہنا ہے میرے بچے!"

"میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں انکل۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔"اگر میں کچے ذہن کا انسان ہوتا تو اس ایگری منٹ فارم پر دستخط کر کے قدرت، عزت اور شہرت سب کچھ حاصل کر لیتا۔ آپ فکر نہ کریں انکل! میرے پایۂ استقلال میں آپ کو کبھی لغزش نظر نہیں آئے گی۔ میں آپ کو کبھی مایوس نہیں کروں گا۔"

"مجھے تم سے یہی امید ہے میرے بچے!" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔"ہو سکتا ہے، اس سیکرٹ سوسائٹی کو غریدہ اور الفریڈ کے کسی بچے کی تلاش ہو لیکن ایک بات ذہن میں نقش کر لو کہ تمہارا غریدہ یا الفریڈ سے کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ تم اسی لیڈی کے بیٹے ہو جو کراچی میں رہتی ہے اور

پچھلے انیس سال سے جس نے تمہاری کفالت کی ذمے داری اٹھا رکھی ہے۔"

"غریدہ اور الفریڈ والی کہانی نے مجھے بھی متاثر نہیں کیا تھا انکل۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں چونکہ اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا اس لیے کھل کر ان کے دعوے کی مخالفت نہیں کر سکا تھا۔"

"اب تو تمہیں بہت کچھ پتا چل چکا ہے نا؟" انکل نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

"جی انکل...... بالکل۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ایک بات میرے ذہن کو الجھا رہی ہے۔"

"کون سی بات میرے بچے؟"

"ٹفنی کو ان لوگوں کے ساتھ دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگا۔" میں نے دل کی بات کہہ دی۔ "میں محسوس کر رہا ہوں کہ وہ بھی ان کی ٹیم کا حصہ بن چکی ہے۔"

وہ ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے بولے۔

"علی! یہ ایک حقیقت ہے کہ ٹفنی میری بیٹی ہے لیکن اس کی زندگی پر مجھے کوئی اختیار نہیں۔ ہمارے بیچ کوئی باقاعدہ رابطہ بھی نہیں ہے۔ اس کی تربیت ریٹا کے سائے میں ہوئی ہے۔ ٹفنی اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتی ہے۔ اگر وہ ان لوگوں کے ساتھ گھل مل گئی ہے یا ان کی ٹیم کا حصہ بن چکی ہے تو یہ میرے لیے کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا...... وہ مجھ سے اتنے فاصلے پر جا چکی ہے کہ میں اس کے بارے میں جان کر کروں گا بھی کیا......!"

بات کے اختتام پر ان کی آواز بھیگ گئی تھی۔ وہ ٹفنی سے لاکھ دور سہی لیکن وہ ان کی بیٹی تھی، ان کا خون تھی اور خون ضرور جوش مارتا ہے۔ انسان کی مجبوریاں اور لاچاریاں اس جوش کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہیں۔ ایک باپ اپنے دل میں اولاد کے لیے خصوصاً بیٹی کے لیے کس قسم کے جذبات رکھتا ہے، انہیں باپ کا دل چیر کر دیکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی زبانی کلامی سمجھایا جا سکتا ہے۔ اس جذبے کا احساس اسی وقت ہوتا ہے جب انسان خود باپ بن جاتا ہے!

"کچھ بھی ہے انکل۔" میں نے کہا۔ "لیکن ٹفنی کو ان لوگوں کے بیچ دیکھ کر مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"تمہیں فوری طور پر ایک کام کرنا ہے میرے بچے۔" وہ ٹفنی کے موضوع کی طرف سے میری توجہ کو ہٹاتے ہوئے بولے۔

"کون سا کام انکل؟" میں نے پوچھا۔

میں نے بھی فوری طور پر ٹفنی کے موضوع سے دست بردار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے یہ بات واضح طور پر محسوس کی تھی کہ ٹفنی کے تذکرے نے انہیں کافی دل گرفتہ کر دیا تھا۔ میں ہرگز ہرگز انہیں مزید رنجیدہ نہیں کرنا چاہتا تھا اسی لیے میں نے بھی ٹفنی کے ذکر کو گول کر دیا تھا۔

"جب تک تم امریکا میں ہو، بھولے سے بھی لیک جیکسن کا رخ نہیں کرنا ہے۔" وہ سمجھانے والے انداز میں بولے۔ "وہاں تمہارے دشمن موجود ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ میں نے انیس سال تک جس بوٹے کی آب یاری کی ہے، اسے کوئی نقصان یا تکلیف پہنچتے نہیں دیکھ سکتا۔"

بات کے اختتام پر ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔ میں اپنے لیے ان کی محبت اور دلی کیفیت کو بہ خوبی سمجھ رہا تھا لہٰذا میں نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ فکر نہ کریں انکل! مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں آپ کی نصیحت کو ہمیشہ اپنے ذہن میں رکھوں گا۔ میرا مالک حفاظت کرنے والا ہے۔"

"ان شاء اللہ!" انہوں نے خلوصِ دل سے کہا۔ "ایک اور بات کا بھی خیال رکھنا میرے بچے۔"

"کون سی بات؟" میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

"یہ جو سیکرٹ سوسائٹی والے معاملات ہیں نا، ان کا ذکر بیگ صاحب سے ہرگز نہیں کرنا۔" وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔

"آپ مجھے تاکید نہیں بھی کرتے تو اس موضوع پر کسی کے سامنے بھی میں زبان کھولنے والا نہیں ہوں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "اس سلسلے میں آپ کو پوری طرح مطمئن رہنا چاہیے۔"

"شاباش میرے بچے...... شاباش۔" وہ سراہنے والے انداز میں بولے۔ "مجھے تم پر بھروسا ہے۔ تم دنیا میں کہیں بھی رہو، فخر سے سر اٹھا کر زندگی گزارو گے اور کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرو گے کہ بعد میں جس پر ندامت کا احساس ہو۔"

"ان شاء اللہ......!" میں نے صدقِ دل سے کہا۔

اس کے بعد وہ مجھے مرزا عامر بیگ کے گھر کا ایڈریس سمجھانے لگے۔ بیگ صاحب کا فون نمبر میں نے اپنے سیل فون میں محفوظ کر لیا تھا تاکہ بہ وقتِ ضرورت ان سے رابطہ کیا جا سکے۔ یہ سب کچھ بڑا سنسنی آمیز اور ولولہ انگیز تھا۔

لنچ کے بعد میں گھر سے نکل آیا۔ میں اگر چاہتا تو اپنی سرخ ہنڈائے میں بھی سفر کر سکتا تھا لیکن انکل نے سرخ

ہنڈائے کے حوالے سے بھی مجھ پر پابندی عائد کردی تھی۔ لیک جیکسن اور سرخ ہنڈائے فی الحال میرے لیے ممنوع قرار دے دیے گئے تھے اور اس کا سبب میری حفاظت کو یقینی بنانا تھا۔ اگرچہ پیبلو مرڈر کیس میں مجھے کلین چٹ مل چکی تھی لیکن لیک جیکسن اور سرخ ہنڈائے چونکہ اس کیس کے مرکزی کردار تھے اس لیے انکل کوئی رسک نہیں لینا چاہتے تھے اور وہ بھی ایسے موقع پر جب میرے سامنے ایک عظیم الشان مشن موجود تھا اور میں چند روز بعد ہزاروں میل کے طویل سفر پر روانہ ہونے والا تھا۔ اگرچہ یہ سفر تو محض بائیس گھنٹے کا تھا لیکن ان بائیس گھنٹوں میں مجھے امریکا سے پاکستان تک کم وبیش تیرہ ہزار سات سو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا تھا لہٰذا اسے ''طویل سفر'' کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

ہنڈائے کو میں نے نیکولز اسکوائر کی پارکنگ ہی میں چھوڑا اور بس ٹرمنل پر آ گیا۔ یہاں سے مجھے بوسٹن تک کا سفر بہ ذریعہ بس طے کرنا تھا اور اس کے بعد بوسٹن سے نیویارک تک بائی ائر جانا تھا۔ بوسٹن سے نیویارک لگ بھگ دو ہزار کلومیٹر کا فضائی فاصلہ تھا۔ اگر یہ سفر بھی بہ ذریعہ بس کیا جاتا تو کم از کم چوبیس گھنٹے کا وقت لگ جاتا اسی لیے میں نے بائی ائر سفر کا فیصلہ کیا تھا جو کم وبیش پانچ گھنٹے کا تھا۔

امریکا میں انٹرسٹی اور انٹر اسٹیٹ سفر کے لیے تیز رفتار بس سروس کے طور پر ''گرے ہاؤنڈ'' کا نام سرفہرست ہے۔ گرے ہاؤنڈ کمپنی کی لگژری بسوں میں واش روم سمیت تمام سفری سہولیات میسر ہوتی ہیں اور جن لوگوں کے پاس وقت کی کمی نہیں ہوتی وہ عموماً گرے ہاؤنڈ ہی میں سفر کو ترجیح دیتے ہیں کیونکہ یہ سفر ہوائی جہاز کی بہ نسبت ''کم خرچ، بالانشین'' ثابت ہوتا ہے۔

مالک کا شکر کہ مجھے گرے ہاؤنڈ بس کے اگلے حصے میں سیٹ مل گئی۔ ویسے تو گرے ہاؤنڈ بس کے اگلے، پچھلے اور درمیانی تمام حصوں میں ایک جیسی سفری سہولیات میسر ہوتی ہیں لیکن بلیکیز یعنی سیاہ فام عموماً بس کے پچھلے حصے میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں اور اس ترجیح کا سبب یہ ہے کہ بس کے عقبی حصے میں ڈرائیور کی نظر بچا کر ڈرنک کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ ان بسوں میں شراب نوشی کی سختی سے ممانعت ہوتی ہے لیکن بلیکیز بڑے سرپھرے اور سرکش مزاج کے لوگ ہیں۔ جہاں بھی اور جتنا بھی موقع مل جائے، یہ من مانی کرنے سے باز نہیں آتے، سو جب یہ بس کے عقبی حصے میں بیٹھ کر ڈرنک کرتے ہیں تو پھر غل غپاڑا اور خرمستی بھی لازم ٹھہرتی ہے اسی وجہ سے میں نے مالک کا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے بس کے اگلے حصے میں سیٹ ملی تھی۔

گرے ہاؤنڈ بس نے ہائی وے ٹو ڈبل ایٹ پر اپنے سفر کا آغاز کیا تو میں نے اطمینان کی سانس لی۔ یہ ہائی وے رچ ووڈ، اینگلٹن، روشارون اور مینول سے ہوتے ہوئے سیدھی بوسٹن پہنچ جاتی تھی۔ میں نے لیور کھینچ کر اپنی سیٹ کو ایزی کیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے پیچھے میرے پیش آمدہ حالات کی فلم سی چلنے لگی۔

اس فلم کا مرکزی کردار تو ڈیلفینا عرف ڈیلفی ہی تھی۔ میں نے ڈیلس میں پریسٹن ہالو والے بنگلے پر اس کی معیت میں جو بہتر گھنٹے گزارے تھے ان کی یادیں میرے ذہن سے کسی بھی طور محو نہیں ہوسکتی تھیں اگرچہ اس ''معیت'' کو ڈیلفی کے اینگل سے دیکھا جائے تو یہی کہا جاسکتا ہے......

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا۔ یہ مصرع معترضہ تھا کیونکہ ڈیلفی اور محبت میں بعد المشرقین کا فرق تھا اور جہاں تک لفظ ''رونا'' کا تعلق ہے تو یہ لفظ بھی اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ تر و تازہ اور دھلی دھلائی دیکھا تھا اور خاص طور پر تیرہ جون کی صبح یعنی گزشتہ روز جب وہ ناشتے کی میز پر مجھ سے ملی تھی تو کچھ زیادہ ہی دھلی دھلائی دکھائی دی تھی۔ اس کی آنکھیں چغلی کھاتے ہوئے ہجر و وصال کی کھٹی میٹھی ان کہی کہانیاں بہ زبانِ خاموشی سنا رہی تھیں۔ گزشتہ رات اس نے خود سے ایک جونیئر ساتھی ایما ایپل بام کے ساتھ بسر کی تھی۔ اس شب بسری کے چند لمحات میری بصارت کا نصیب بنے تھے۔ یہ مناظر رگوں میں خون کی گردش کو تیز کردینے اور کن پٹیوں کو پھڑپھڑا دینے والے تھے۔ میں فلسفے کی پروفیسر کے نام کا مذاق اڑانے کے لیے اسے سیب کا نام (ایپل بام) کہہ کر ڈیلفی کو چھیڑتا تھا۔ میں نے اس ہنسی مذاق کے کھیل میں کبھی غلطی سے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ایما ایپل بام صرف نام ہی کی نہیں بلکہ کام کی بھی بام ہے......ایک دردکش اور راحت افزا بام۔

انکل سلطان کو اپنی اسٹوری سناتے وقت میں نے ڈیلفی اور ایما کے اس خصوصی شغل کا ذکر گول کردیا تھا اور یہ خالصتاً امریکی اسٹائل تھا یعنی دوسروں کی ذاتیات میں جھانکنا مناسب نہیں۔ کوئی شخص اپنی ذات کے ساتھ یا باہمی رضامندی سے کسی دوسرے کی ذات کے ساتھ جو بھی فعل کر رہا ہو تو اسے روکنا یا ٹوکنا غیر اخلاقی ہوگا۔ ہاں البتہ، اگر کسی فرد کے انفرادی فعل سے یا دو افراد کے اجتماعی فعل سے کوئی تیسرا فرد متاثر ہو رہا ہو تو پھر بہ زورِ بازو بھی مداخلت لازم ٹھہرتی ہے اور رضامندی کے بغیر تو امریکا میں ایک شوہر اپنی بیوی کو چھو بھی نہیں سکتا۔ ایسی

صورت میں بیوی کی ایک فون کال اس غیر رضامندانہ حرکت پر شوہر کو حوالات کی سیر کرا سکتی ہے......!

بات یہ ہے کہ ہر ملک کے اپنے قاعدے اور اپنے قوانین ہوتے ہیں۔ وہ کسی انسان کے مزاج سے مطابقت رکھتے ہیں اور کسی کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتے لیکن اس ملک کا شہری ہونے کے ناتے ہر شخص کو ان قواعد وضوابط کا احترام کرنا پڑتا ہے۔ شخصی آزادی کے ثمرات سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کے مضمرات سے بھی چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔

گرے ہاؤنڈ کی تیز رفتار بس نے مجھے یوسٹن پہنچا دیا۔ یوسٹن میں بس ٹرمنل ڈاؤن ٹاؤن میں تھا۔ میں بس سے نکلا اور یوسٹن ولیم ہابی ائرپورٹ کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ ائرپورٹ ڈومیسٹک فلائٹس کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس ائرپورٹ پر چند روز پہلے بھی میں آیا تھا لیکن تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ اس وقت میں ایک قتل کے کیس میں مطلوب تھا اور بہت ڈرا سہما ہوا تھا۔ ان لمحات میں، میں پوری طرح ڈیلفی کے رحم و کرم پر تھا اور اسی نے میرے یوسٹن سے ڈیلس تک کے سفر کا بندوبست کیا تھا لیکن اب میں آزاد تھا اور میرے دل و دماغ میں کسی قسم کا ڈر، خوف جاگزیں نہیں تھا۔

یوسٹن ولیم ہابی ائرپورٹ سے میں نے نیویارک کی فلائٹ پکڑی اور اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا۔ نیویارک میں دو بڑے اور لاتعداد چھوٹے ائرپورٹس ہیں۔ انٹرنیشنل فلائٹس کے لیے جے ایف کینیڈی ائرپورٹ استعمال ہوتا ہے جبکہ تمام ڈومیسٹک فلائٹس کے لیے لاگارڈیا ائرپورٹ استعمال ہوتا ہے۔ میری فلائٹ کو بھی لاگارڈیا ائرپورٹ پر لینڈ کرنا تھا۔ لاگارڈیا ائرپورٹ نیویارک مین ہیٹن اپ ٹاؤن میں واقع ہے جبکہ مجھے نیویارک بروکلین جانا تھا۔ نیویارک کے چار بڑے حصے ہیں۔ مین ہیٹن، بروکلین، برونکس اور اسٹیٹن آئی لینڈ۔ اپنی نوعیت کے لحاظ سے...... ایک سے بڑھ کر ایک۔ بروکلین کو پرانا نیویارک سمجھ لیں۔

میری فلائٹ بہ خیر و عافیت لاگارڈیا ائرپورٹ پر لینڈ کر گئی۔ میں نے اپنی آمد کے اسکیجول سے بیگ صاحب کو آگاہ کر رکھا تھا لہٰذا وہ مجھے ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ کے باہر موجود تھے۔ میں ان سے پہلی بار مل رہا تھا اور ان کا بھی یہی معاملہ تھا لہٰذا یہ ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی۔ میری تازہ ترین معلومات کے مطابق، میری زندگی میں بیگ صاحب کا بڑا اہم کردار تھا۔ وہ شخص میرے اور میری والدہ کے درمیان رابطے کا واحد وسیلہ تھا لیکن یہ بات انیس سال کے بعد گزشتہ رات پہلی مرتبہ مجھے معلوم ہوئی تھی۔

مرزا عامر بیگ کی گاڑی میں ہمارے سفر کا آغاز ہوا۔ مین ہیٹن اپ ٹاؤن سے نکل کر ہم نے دریائے ہڈسن کو بروکلین برج پر سے عبور کیا اور بروکلین کے علاقے میں پہنچ گئے۔

''تم پہلے اچھی طرح فریش ہو جاؤ۔'' بیگ صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر پہنچ کر مجھ سے کہا۔ ''اس کے بعد ہم ڈنر کریں گے۔ گپ شپ کا سلسلہ ڈنر کے بعد شروع ہوگا۔''

''اوکے انکل۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا اور واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

مرزا عامر بیگ دراز قامت اور بھرے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ آپ اسے موٹا تو نہیں کہہ سکتے، ہاں البتہ ان کے لیے ''صحت مند'' کے الفاظ موزوں تھے۔ بیگ صاحب کسی سرکاری محکمے سے وابستہ تھے اور بڑی شان دار زندگی گزار رہے تھے۔ بروکلین کے پوش ایریا میں ان کا لگژری اپارٹمنٹ تھا۔ اس وقت وہ گھر میں اکیلے ہی تھے۔ ان کے بیوی بچے گرمیوں کی چھٹیاں انجوائے کرنے کینیڈا گئے ہوئے تھے۔ بیگ صاحب اپنے محکمہ جاتی فرائض کے باعث فیملی کے ساتھ نہیں جا سکے تھے لہٰذا اس وقت وہ گھر میں اکیلے ہی تھے۔

ایک شان دار ڈنر کے بعد ہمارے بیچ گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ بیگ صاحب بہت ہی سمجھدار اور بردبار انسان تھے۔ میں نے چھوٹتے ہی ان سے یہ سوال کیا۔

''انکل! آپ تو ایک سرکاری محکمے سے وابستہ ہیں اور پچھلے انیس سال سے پاکستان سے آنے والی رقوم وصول کر رہے ہیں۔ میرا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں کہ آپ اس لیڈی کے اتے پتے اور لوکیشن سے واقف نہ ہوں۔ یہ سب جاننا آپ کے لیے ہرگز مشکل نہیں ہے۔''

''ریلیکس بیٹا جی...... ریلیکس!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں نے تمہیں اگر یہاں بلایا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تم سے ایسی باتیں کرنا چاہتا ہوں جو علی سلطان کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی تھیں۔''

میرے دل کو اطمینان سا محسوس ہوا اور مجھے لگا کہ میں صحیح جگہ پر آ گیا ہوں۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''آئی ایم سوری انکل۔ میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔''

''جذباتی ہونا بہت اچھی بات ہے۔'' وہ بہ دستور زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''ایک انسان اور پتھر میں جذبات اور احساسات ہی کا فرق ہے لیکن جذبات کا اظہار مناسب موقع پر ہو تو موزوں لگتا ہے۔ میں بھلا تمہیں کیا سمجھاؤں گا۔ تم تو سائیکالوجی کے اسٹوڈنٹ ہو۔''

"میں پوری توجہ سے آپ کی بات سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اور سمجھ بھی رہا ہوں۔"

"ویٹس گڈ!" وہ خوش دلی سے بولے۔ "اگر تم توجہ سے میری بات سن رہے ہو تو اس نکتے کو ذہن میں رکھنا بیٹا جی کہ اب میں تم سے جو باتیں کرنے والا ہوں، ان میں سے بیشتر باتیں پچھلے انیس سال سے میں نے علی سلطان سے بھی نہیں کیں لہٰذا بہتر یہی ہوگا کہ تم بھی ان معاملات کو اپنے سینے میں دبا کر رکھو۔"

لمحاتی توقف کرکے عامر بیگ نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا۔ "او کے انکل! میں آپ کی ہدایت کو دھیان میں رکھوں گا۔"

"شاباش بیٹا جی۔" وہ ستائشی نظر سے مجھے دیکھنے کے بعد اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔ "اس بات کا کامل یقین کرلو کہ جو لیڈی پچھلے انیس سال سے نہایت ہی پابندی کے ساتھ تمہاری کفالت کررہی ہے وہ کوئی اور نہیں، بلکہ تمہاری سگی والدہ ہے۔ اس کا نام سلمٰی ہے۔"

بیگ صاحب کی زبان سے اپنی ماں کا نام سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے کہا۔ "جب آپ اتنے وثوق سے یہ بات کہہ رہے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی پتا ہوگا کہ میری والدہ نے اتنے طویل عرصے تک مجھے خود سے دور کیوں کیے رکھا اور آپ کو یقیناً ان کے ایڈریس وغیرہ کا بھی پتا ہوگا؟"

"جہاں تک تمہاری والدہ کے کراچی والے ایڈریس یا فون نمبر کی بات ہے تو میں اس سلسلے میں کوئی حتمی بات نہیں کرسکتا لیکن میں تمہیں چند ایسے اشارے ضرور دوں گا جن کی مدد سے تم سلمٰی صاحبہ کو آسانی کے ساتھ تلاش کرلو گے۔"

بیگ صاحب میرے سوالات کے جواب میں بولے۔ "اور جہاں تک تمہیں خود سے دور رکھنے کا معاملہ ہے تو میں اسے ان کی مجبوری سمجھتا ہوں۔"

"کیسی مجبوری انکل؟" میں تڑپ کر بولا۔

"جاوید واسطی میرا بہت اچھا دوست تھا۔ اللہ اسے غریق رحمت کرے۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولے۔ "اور واسطی ہی ایک سال کی عمر میں تمہیں کراچی سے نیویارک میرے پاس لایا تھا۔ تمہاری پیدائش کراچی میں ہوئی تھی۔ جاوید واسطی کی زبانی مجھے تمہارے اور تمہاری والدہ کے حالات کے بارے میں چند باتیں پتا چلی تھیں جن میں سرفہرست یہ کہ تم بائیس دسمبر انیس سو چورانوے کو کراچی کے ایک معروف پرائیویٹ اسپتال میں پیدا ہوئے تھے۔ تمہارے والد محترم حیدر علی کی بہت ہی خطرناک لوگوں کے ساتھ کوئی پرانی دشمنی تھی اور تمہاری پیدائش سے چھ ماہ پہلے تمہارے باپ حیدر علی کو انہی دشمنوں نے قتل کردیا تھا۔ حیدر علی کی موت کے بعد تمہاری والدہ دربدر ہوگئی۔ اس وقت تم سلمٰی کے شکم میں تھے۔ وہ تمہاری حفاظت کی خاطر جگہ جگہ چھپتی پھری اور بالآخر ایک روز اس نے تمہیں جنم دیا۔ تم دنیا میں آچکے تو تمہاری حفاظت اور بھی مشکل ہوگئی۔ سلمٰی کی سمجھ میں یہی آیا کہ تمہیں بہت دور پہنچا دیا جائے تاکہ تم دشمنوں کے شر سے محفوظ رہ کر پروان چڑھ سکو چنانچہ انہوں نے تمہیں واسطی کے توسط سے یہاں میرے پاس نیویارک بھیج دیا۔"

وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھمے تو میں نے سوال کیا۔ "یہ جاوید واسطی صاحب جیسا کہ آپ نے بتایا کہ آپ کے بہت گہرے دوست تھے لیکن ان کا میری والدہ سے کیا تعلق تھا اور وہ اتنی چھوٹی عمر میں کیسے مجھے اپنے ساتھ کراچی سے نیویارک لے کر آئے؟"

"واسطی تمہاری والدہ کا خیر خواہ تھا اور تمہارے خاندانی پس منظر سے بھی اچھی طرح واقف تھا۔" بیگ صاحب نے میری زندگی کی پیچ در پیچ کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے بتایا۔ "سلمٰی نے جب واسطی کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو واسطی نے اپنے ایک ریکروٹنگ ایجنٹ دوست سے مشورہ کیا۔ وہ ایجنٹ میچنگ اور "پی سی" کے کام کا ماہر تھا اور لوگوں کو "پی سی" پاسپورٹس پر پاکستان سے امریکا بھجوانے کا کام کرتا تھا۔ تم "پی سی" کا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"پکچر چینج۔" میں نے "پی سی" کی فل فارم کا نام لیتے ہوئے کہا۔ "اور "فوٹو چینج" بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب تک پاکستان میں کمپیوٹرائزڈ پاسپورٹس کا اجرا شروع نہیں ہوا تھا، ریکروٹنگ ایجنٹس کے بڑے مزے تھے۔ وہ کسی کے پاسپورٹ پر فوٹو بدل کر کسی کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا کرتے تھے اور خوب رقم کماتے تھے لیکن اب پی سی کا کام ختم ہوگیا ہے..... اور میں نے تو یہاں تک بھی سنا ہے کہ آج کل بعض ایجنٹس پاکستان سے امریکا پہنچانے کے پچیس ہزار ڈالرز لیتے ہیں اور وہ بھی امریکا پہنچ جانے کے بعد۔ پچیس ہزار ڈالرز کوئی معمولی رقم نہیں ہوتی انکل۔ یہ تو سیدھے سیدھے پچیس لاکھ روپے ہوتے ہیں۔"

"اسے "ڈن" کا کام کہتے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔ "ریکروٹنگ ایجنٹ شروع میں پارٹی سے ایک روپیہ بھی وصول نہیں کرتا البتہ دونوں پارٹیوں کے درمیان ایک قابل بھروسا گارنٹر موجود ہوتا ہے جو ایجنٹ کو اس بات کی گارنٹی دیتا ہے کہ امریکا پہنچنے کے بعد پارٹی ضرور پے منٹ کرے گی۔ اس پراسس کو مکمل کرنے کے لیے ایجنٹ کیا کیا حربے آزماتا ہے یہ

ایک طولانی بحث ہے۔ بہرحال، جب مذکورہ شخص اپنے مطلوبہ ایڈریس پر امریکا پہنچ جاتا ہے تو وہ گارنٹر (ضامن) کو فون کرتا ہے اور ضامن پچیس لاکھ کی رقم یا جو بھی رقم طے ہوئی ہو، وہ ایجنٹ کے حوالے کر دیتا ہے۔"

"میرا خیال ہے، اتنی بھاری رقم خرچ کر کے وہی لوگ امریکا آتے ہیں جو لیگل وے اختیار کرنے کے قابل نہیں ہوتے یا ان معاملات سے بالکل ہی پیدل ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہارا خیال بالکل درست ہے بیٹا جی۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔"غیر قانونی راستہ وہی شخص اختیار کرتا ہے جو قانونی راہ اپنانے کا اہل نہیں ہوتا ورنہ تمہیں بھی پتا ہے اور ساری دنیا کو بھی معلوم ہے کہ امریکی ویزا کی فیس صرف ایک سو ساٹھ ڈالرز ہے یعنی کم و بیش سولہ ہزار روپے۔ کہاں سولہ ہزار روپے اور کہاں پچیس لاکھ روپے۔ خیر، میں تمہیں واسطی کے بارے میں بتا رہا تھا ......" لمحاتی توقف کر کے بیگ صاحب نے گہری سانس خارج کی پھر سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے بولے۔

"مذکورہ ریکروٹنگ ایجنٹ کے پاس ایک فیملی کا کیس آیا ہوا تھا۔ میاں بیوی اور ان کا لگ بھگ ایک سال کا بچہ۔ ایجنٹ نے ان تینوں افراد کے پاسپورٹس کی "پی سی" کی۔ مرد کی جگہ جاوید واسطی نے لی، بچے کی جگہ تم نے اور عورت کی جگہ ایک ایسی عورت کو تمہارے ساتھ کر دیا گیا جو اس ایجنٹ کی کلائنٹ تھی۔ اس طرح تم لوگ بہ آسانی امریکا پہنچ گئے۔"

"اور جن کے پاسپورٹس پر ہم امریکا آئے تھے، اس فیملی کے ساتھ ایجنٹ نے کیا کیا ہوگا؟" میں نے ایک اہم سوال کیا۔

"اس قسم کے معاملات میں ایجنٹ حضرات ایک آزمودہ کار حربہ استعمال کرتے ہیں۔" انکل بیگ نے بتایا۔"وہ متعلقہ پارٹی سے کہتے ہیں کہ آپ کا پاسپورٹ گم/ چوری ہو گیا ہے۔ اب آپ نیا پاسپورٹ بنواؤ۔ اس سلسلے میں جو پیسے خرچ ہوں گے، وہ میں دوں گا۔ پارٹی بیچاری مجبور ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایجنٹ کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔"

"میں کراچی میں پیدا ہوا اور ایک سال کی عمر میں پی سی پاسپورٹ پر امریکا آ گیا۔" میں نے بیگ صاحب کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔"اس کے بعد کیا ہوا؟"

"جاوید واسطی نے مجھے تمہارے پس منظر کے بارے میں جو معلومات فراہم کیں، وہ ساری باتیں میں نے تمہیں بتا دی ہیں۔" وہ میرے سوال کے جواب میں بولے۔"واسطی نے مجھ سے درخواست کی کہ اس بچے یعنی تمہاری پرورش کرنا ہے۔ اس کا بندوبست مجھے کرنا ہوگا۔ اس سلسلے میں ہر ماہ نہایت پابندی کے ساتھ مجھے ایک مخصوص رقم ملتی رہے گی۔ میں واسطی کی بات کو ٹال نہیں سکتا تھا لہٰذا میں نے یہ ذمے داری قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ واسطی چند روز کے بعد واپس پاکستان چلا گیا اور میں نے وعدے کے مطابق، تمہاری پرورش کے لیے علی سلطان کا انتخاب کر لیا۔ علی سلطان میرا جگری یار ہے۔ وہ میری بات ٹال نہیں سکتا تھا چنانچہ تم نیویارک سے ٹیکساس اس کے پاس پہنچ گئے۔ علی سلطان نے تمہاری نگہداشت کے لیے ایک تجربہ کار بے بی سٹر کو ہائر کر لیا۔ اس طرح تم امریکا کی فضاؤں میں پروان چڑھنے لگے۔"

"انکل! آپ علی انکل کو اپنا جگری یار بھی کہتے ہیں اس کے باوجود بھی آپ نے میری زندگی کے بہت سے رازوں کو ان سے چھپا کر کیوں رکھا؟"

"مصلحت کی بنا پر اور ...... اس وعدے کی خاطر جو جاوید واسطی نے مجھ سے تمہارے بیک گراؤنڈ کو مخفی رکھنے کے حوالے سے لیا تھا۔" انہوں نے جواب دیا۔"میں نے علی سلطان کو اتنی ہی بات بتائی جتنی ضروری سمجھی۔"

"آپ نے تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ آپ مجھے چند ایسے اشارے دیں گے جن کی مدد سے مجھے کراچی میں اپنی والدہ کو تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔" میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔"پلیز، ان اشاروں پر بات کریں۔"

"میں اسی طرف آ رہا تھا بیٹا جی۔" وہ بڑی رسان سے بولے۔"پہلا اشارہ تو تمہاری تاریخ پیدائش ہی ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھو کہ "اسد علی" تمہارا اصلی نام ہے لہٰذا تم وہاں پہنچ کر اس تاریخ کی روشنی میں مختلف پرائیویٹ اسپتالوں کے برتھ ریکارڈ کو چیک کر سکتے ہو۔ اس چیکنگ کے نتیجے میں تم اپنی والدہ سلمٰی تک پہنچ سکتے ہو۔ نمبر دو، میں تمہیں چالیس فون نمبرز دوں گا۔ شاید ان میں سے کوئی نمبر تمہارے کام آ جائے ......!"

"چالیس فون نمبرز ......" میں نے الجھن زدہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔"انکل! میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"ابتدا میں تمہارے ماہانہ اخراجات کی رقم جاوید واسطی ہنڈی کے ذریعے مجھے بھجوا دیا کرتا تھا اور میں وہ پیسے علی سلطان کو دے دیتا تھا۔" عامر بیگ صاحب وضاحت کرتے ہوئے بولے۔"لیکن نائن الیون کے بعد امریکی گورنمنٹ نے نیشنل سیکیورٹی کے پیش نظر فنڈز ٹرانسفر کے تمام لیگل ذرائع کو مانیٹر کرنے کا سسٹم وضع کر لیا لہٰذا حوالہ اور ہنڈی کا کام بالکل ختم

ہوگیا۔ اس وقت اگر یہ کام کہیں جاری بھی ہے تو بہت چھپ چھپا کر ہوتا ہوگا۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ جاوید واسطی کا انتقال ہوگیا تو میں پریشان ہوگیا کہ اب تمہاری پرورش کا کیا ہوگا لیکن میری ساری پریشانی اس وقت جاتی رہی جب مقررہ تاریخوں میں ویسٹرن یونین کے ذریعے وہ رقم مجھے موصول ہوگئی۔ ہنڈی کا کام بند ہونے کے بعد واسطی بھی ویسٹرن یونین کے ذریعے ہی مجھے رقم بھیجا کرتا تھا۔ میں نے کبھی یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ واسطی کے انتقال کے بعد رقم بھیجنے کا سلسلہ کس کے ذریعے جاری تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ تمہاری والدہ سلمیٰ ہوگی۔ یہ سلسلہ باقاعدگی کے ساتھ چلتا رہا لیکن ہر بار رقم بھیجنے والے کا نام اور فون نمبر مختلف ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ نام کسی اور نمبر کے ساتھ یا وہ نمبر کسی اور نام کے ساتھ بھی استعمال ہو جاتا تھا۔ اس دوران میں سلمیٰ کا نام کبھی بھی میری نگاہ سے نہیں گزرا۔ ان میں سے جو فون نمبرز زیادہ بار استعمال ہوئے وہ میں نے ایک جگہ نوٹ کر رکھے ہیں۔ میں نے تھوڑی دیر پہلے انہی چالیس نمبروں کا ذکر کیا ہے۔"

"انکل سلطان نے مجھے بتایا تھا کہ گزشتہ تین ماہ سے منی ٹرانسفر کا سلسلہ رک چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے ان چالیس نمبروں کو ٹرائی کرنے کی کوشش نہیں کی تاکہ یہ پتا چلایا جاسکے کہ میری پرورش کے لیے رقم بھیجنے والی وہ ہستی یعنی میری ماں کہاں غائب ہوگئی ہے؟"

"میں متعدد بار ٹرائی کر چکا ہوں بیٹا جی۔" انہوں نے بتایا۔ "ان میں سے کوئی بھی لینڈ لائن کا نمبر نہیں ہے، سب کے سب سیل فون نمبرز ہیں۔ میری بارہا کی ٹرائی کے باوجود بھی کوئی صحت مند رسپانس نہیں ملا۔ اکثر نمبرز سے یہ ریکارڈنگ سننے کو ملتی ہے کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں ہے......" لمحاتی توقف کر کے انہوں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"تم پاکستان پہنچ کر متعلقہ سیل فون سروس پرووائڈر کمپنیز سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کروگے کہ مذکورہ سم کارڈز کس کس شخص کے سی این آئی سی پر رجسٹرڈ ہیں تو مجھے یقین ہے کہ اس طرح کہیں نہ کہیں سے تمہیں اپنی ماں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سراغ مل جائے گا۔"

"اس کے علاوہ کوئی اور اشارہ؟" میں نے سوالیہ نظر سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ بولے۔ "میں تمہیں منی ٹرانسفر کرنے والی مختلف کمپنیز کی رسیدیں بھی دوں گا۔ تم ان کے ذریعے بھی ان کمپنیز کے کراچی والے سینٹرز سے اپنی والدہ کی لوکیشن معلوم کرنے کی کوشش کر سکتے ہو۔"

"تین ماہ سے رقم آنے کا سلسلہ رکا ہوا ہے۔" میں نے ایک اہم سوال کیا۔ "اور آپ نے اب مجھے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ خیال آپ کو دو یا تین ماہ پہلے کیوں نہیں آیا؟"

"میں نے علی سلطان کو رقم کی منتقلی کا سلسلہ منقطع ہونے کے حوالے سے تین ماہ کا بتایا تھا جبکہ پچھلے چھ ماہ سے یہ سلسلہ بند ہے۔ میں گزشتہ چھ ماہ سے یہ رقم اپنی جیب سے علی سلطان کو ادا کر رہا ہوں اور جہاں تک تمہارے دو یا تین یا چھ ماہ پہلے پاکستان بھیجنے کا تعلق ہے تو......" وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

"اس وقت تمہارے فائنل ایگزامز چل رہے تھے۔ میں تمہارے سالانہ امتحانات کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اب تم فری ہو اور پاکستان جا کر بڑی آسانی کے ساتھ اپنی والدہ کا سراغ لگا سکتے ہو۔ جاوید واسطی نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر اسے کچھ ہوگیا تو پھر بھی یہ رقم پابندی سے مجھے ملتی رہے گی لہٰذا تمہاری پرورش میں کسی قسم کی کمی نہیں آنا چاہیے۔ واسطی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کے کہے کے مطابق، تمہاری نگہداشت پر خرچ ہونے والی رقم کسی نہ کسی نام اور کسی نہ کسی فون نمبر کے ریفرنس سے مجھ تک پہنچتی رہی لیکن......" لمحے بھر کو وہ رکے، ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولے۔

"لیکن اب جو صورت حال ہے وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تمہیں پاکستان بھیجا جائے تاکہ تم کراچی میں اپنی والدہ کو تلاش کر سکو اور یہ جان سکو کہ وہ کس حال میں ہے۔ اگر گزشتہ چھ ماہ سے وہ رقم نہیں بھیج رہی یا بھیج نہیں پا رہی تو اس کا سبب کیا ہے؟ خدانخواستہ، وہ کسی مشکل میں گرفتار تو نہیں ہوگئی۔ اگر سب کچھ نارمل چل رہا ہوتا تو پھر واسطی کی ہدایات کے مطابق، میں نے تمہیں اسی وقت پاکستان بھیجنا تھا جب سلمیٰ مجھے گرین سگنل دیتی۔ پچھلے چھ ماہ سے مجھے سلمیٰ کی طرف سے جو سگنلز موصول ہو رہے ہیں، انہیں گرین نہیں، ریڈ کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا تم کو پہلی فرصت میں کراچی جا کر اپنی ماں کی خیر خبر لینا چاہیے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا......؟"

میں اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

☆☆☆

میں نے سولہ جون کو ضروری ہدایات کے ساتھ پاسپورٹ اپنے ٹریول ایجنٹ کے حوالے کیا تھا۔ تئیس جون کو مجھے پاکستان کا وزٹ ویزا مل گیا۔ ایک آدھ روز میں نے مکمل طور پر انکل سلطان کے ساتھ گزارا اور ہم نے جی بھر کر باتیں کیں۔

میں اپنی ماں کی تلاش میں عارضی طور پر پاکستان جارہا تھا لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ انکل بہت زیادہ سنجیدہ اور دل گرفتہ تھے حالانکہ میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ چندروز کے لیے ان سے دور جاچکا تھا مگر مجھے آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، کینیڈا، یورپ اور جنوبی امریکا بھیجتے ہوئے کبھی ان کی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی۔ شاید انہیں ایسا محسوس ہورہا تھا کہ میں ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔

بکری کا ایک بچہ بھی اگر چند روز تک آپ کے ساتھ رہے تو اس سے گہری انسیت ہوجاتی ہے۔ میں تو پھر بھی ایک انسان تھا اور ہماری رفاقت بھی کوئی چند روزہ نہیں تھی۔ انہوں نے انیس سال تک مجھے سنبھالا تھا، میری پرورش کی تھی اور سگی اولاد سے بڑھ کر میری ہر ضرورت کا خیال رکھا تھا۔ ان کا جذباتی ہوجانا عین فطری عمل تھا۔

میری کیفیت بھی انکل سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اپنے والدین کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہوگئی تھیں۔ میرے بہت سے ایسے سوالات جو سال ہا سال سے میری سوچ کو الجھا کر رکھ دیتے تھے، ان میں سے بیشتر کے جواب مجھے مل گئے تھے اور جو باقی بچے تھے، ان کے جوابات کراچی پہنچ کر مل جانا تھے۔ میں زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ماں سے ملنے والا تھا۔ ایسی ولولہ انگیز کیفیت سے میں پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ اپنی ماں سے ملاقات کے تصور نے مجھے خوشی سے نہال کر رکھا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی انکل سے بچھڑنے کا بھی دکھ تھا۔ عارضی طور پر ہی سہی، میں ان سے جدا ہونے جارہا تھا۔

زندگی بڑی عجیب شے ہے۔ یہ متضاد کیفیات کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ رات اور دن کا ملاپ ہے، تاریکی اور اجالے کا سنگم ہے، دکھ اور سکھ کی کہانی ہے، کھونے اور پانے کا فسانہ ہے، حزن وطرب کا ترانہ ہے...... اسی کھونے پانے کا نام زندگی ہے، بنا کھوئے پائے ناکام زندگی ہے!

پچیس جون آفٹرنون کی میری فلائٹ تھی۔ انکل اپنی معذوری کے باعث مجھے سی آف کرنے ایئرپورٹ نہیں جاسکتے تھے لہٰذا انہوں نے ڈھیروں دعاؤں اور لاتعداد نیک خواہشات کے سائے میں مجھے گھر ہی سے رخصت کردیا۔

میرا ٹکٹ ''ایچ او یو۔ ڈی ایکس بی۔ کے ایچ آئی'' روٹ کا تھا۔ مجھے ہوسٹن کے جارج بش انٹرنیشنل ایئرپورٹ سے ایمریٹس ایئرلائن کے ''بوئنگ سیون فور سیون'' پر سوار ہونا تھا جو مجھے دبئی پہنچادیتا۔ دبئی میں چند گھنٹے کا ٹرانزٹ تھا۔ دبئی سے کراچی تک مجھے ایمریٹس ایئرلائن کی ایئربس ''اے۔ تھری ایٹ'' میں سفر کرنا تھا اور قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ کراچی پر مجھے لینڈ کرنا تھا۔ میرا یہ سفر ایک لحاظ سے جارج بش سے شروع ہوکر قائداعظم پر ختم ہونا تھا۔

ایمریٹس ایئرلائن کے بوئنگ طیارے نے پچیس جون کی سہ پہر ساڑھے تین بجے ہوسٹن ... ایئرپورٹ سے ٹیک آف کیا اور ستائیس جون کی صبح ٹھیک تین بجے ایمریٹس ایئرلائن کی ایئربس نے کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کیا۔ اگر کیلنڈر اور گھڑی کو دیکھ کر حساب لگایا جائے تو یہ سفر میں نے ساڑھے پینتیس گھنٹے میں طے کیا تھا یعنی پچیس جون کی سہ پہر ساڑھے تین بجے ہوسٹن ایئرپورٹ سے میرے سفر کا آغاز ہوا اور ستائیس جون کی صبح تین بجے میں نے کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کیا اور میرے بائی ایئر سفر کا اختتام ہوگیا۔ بہ ظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ میں نے ساڑھے پینتیس گھنٹے سفر کیا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میں نے صرف ساڑھے پچیس گھنٹے سفر کیا تھا۔ کیونکہ ہوسٹن سے کراچی تک فضائی فاصلہ تقریباً تیرہ ہزار سات سو کلومیٹر ہے۔ اگر فلائٹ ڈائریکٹ ہو تو ایک بوئنگ طیارہ اپنی اوسط رفتار سات سو ساٹھ کلومیٹر فی گھنٹا سے اٹھارہ گھنٹوں میں یہ فاصلہ طے کرلیتا ہے۔ بوئنگ کی زیادہ سے زیادہ رفتار ایک ہزار اسّی کلومیٹر فی گھنٹا ہے جو کہ زمین کی محوری رفتار ایک ہزار آٹھ سو کلومیٹر فی گھنٹا کے بہت قریب ہے۔ زمین اپنے محور کے گرد ایک گردش چوبیس گھنٹوں میں مکمل کرلیتی ہے۔

میں چونکہ براستہ دبئی آیا تھا اس لیے کچھ تو فاصلہ بڑھ گیا تھا اور کچھ وہاں کے ٹرانزٹ کے سبب زیادہ وقت لگ گیا تھا۔ کل ملا کر یہ ساڑھے پچیس گھنٹے بن جاتے ہیں۔ باقی دس گھنٹے کہاں چلے گئے؟ اس معمے کو حل کرنے کے لیے کراچی اور ہوسٹن کے درمیان مقامی وقت کے تفاوت کو دیکھنا ہوگا۔ کراچی کا وقت ہوسٹن کے ٹائم سے دس گھنٹے آگے ہے۔ گھڑی اور کیلنڈر کے مطابق تو میں نے ساڑھے پینتیس گھنٹے کا ہی سفر کیا تھا مگر عملاً یہ سفر محض ساڑھے پچیس گھنٹے کا تھا۔

کراچی ایئرپورٹ پر مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ہوٹل پی سی میں میری تین دن کی بکنگ تھی۔ میں نے ایئرپورٹ سے ایک ٹیکسی ہائر کی اور اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوگیا۔

ان لمحات میں میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ سینے کے پنجرے میں بند پنچھی کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ پنجرے کی تیلیاں توڑ کر باہر نکل آئے اور ایک لمبی اڑان بھر کر اس ہستی کے پاس پہنچ جائے جس کی ممتا کی مٹھاس کو وہ پچھلے انیس بیس سال سے ترسا ہوا تھا۔ میں اپنی ماں کے سینے سے

لگ کر گزرے ہوئے ماہ و سال کی پیاس کو بجھانا چاہتا تھا لیکن افسوس......صد افسوس کہ فوری طور پر یہ ممکن نہیں تھا کیونکہ میں نہیں جانتا تھا کہ میری ماں اس وقت کراچی کے کس علاقے میں ہوگی اور کس حال میں ہوگی......!

میں نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور ٹیکسی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ فجر کے قریب کا وقت تھا۔ چاروں طرف تاریکی کا راج تھا۔ اچانک مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ یہ وہ سڑک نہیں جو ائرپورٹ سے سیدھی پی سی ہوٹل کی طرف جاتی تھی۔ انکل سلطان کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، مذکورہ سڑک کا نام شارع فیصل تھا اور وہ بڑی صاف ستھری سڑک تھی۔ اس سڑک پر اکثر وی آئی پیز کی موومنٹ رہتی تھی لہٰذا اسے سگنل فری بنا دیا گیا تھا۔

اس وقت میں جس سڑک پر محوِ سفر تھا وہ نہ تو سگنل فری تھی اور نہ ہی صاف شفاف......"تو کیا ٹیکسی ڈرائیور ہوٹل کے بجائے مجھے کہیں اور لے جا رہا ہے......؟" میں نے خود سے سوال کیا۔

اس سوال نے میرے رگ و پے میں ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ میں نے اضطراری لہجے میں ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"صاحب......آپ نے جہاں کا بولا میں آپ کو وہیں لے جا رہا ہوں۔" وہ سادگی سے بولا۔

"مجھے پی سی جانا ہے......ہوٹل پرل کانٹی نینٹل۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ "صاحب! میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔"

اس کے جواب سے میری تسلی نہ ہوئی۔ میں نے قدرے سخت انداز میں کہا۔ "میں پی سی جانے والے راستے سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تم مجھے کہیں اور لے جا رہے ہو۔ یہ وہ راستہ نہیں جو ائرپورٹ سے ہوٹل پی سی جاتا ہے۔"

میری بات کا کوئی معقول جواب دینے کے بجائے اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔ اس کی پراسرار خاموشی اور مجرمانہ حرکات و سکنات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ اب اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی کہ وہ ٹیکسی ڈرائیور ہوٹل پہنچانے کے بجائے مجھے کہیں اور لے جا رہا تھا۔ میں نے اس نوعیت کے بہت سے قصے سن رکھے تھے جن میں ٹیکسی ڈرائیور، مسافروں کو لوٹنے کے لیے ان کی منزل سے دور کسی ویران اور سنسان علاقے میں لے جاتے تھے یا کسی کم مصروف سڑک پر اپنا کام دکھا جاتے تھے۔ شاید اس ٹیکسی والے کا بھی کچھ ایسا ہی ارادہ تھا......!

میں اتنی آسانی سے اس کے ہاتھوں لٹنے والا نہیں تھا۔ میں نے عقابی نظر سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ مجھے اپنے عقب میں ایک سیاہ کار دکھائی دی۔ مذکورہ کار بڑی تیز رفتاری سے ٹیکسی کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ہو نہ ہو، سیاہ کار میں ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھی سوار ہوں گے!

میں نے سیکنڈ کے دسویں حصے میں اس ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے اعصاب تن گئے تھے اور ذہن ریڈ الرٹ ہو چکا تھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔

"ٹیکسی روکو......!"

اگلے ہی لمحے اس نے بریک لگا دیے۔ ٹائروں کی مخصوص چرچراہٹ فضا میں گونجی اور ٹیکسی سڑک کے کنارے پر رک گئی۔ مجھے ٹیکسی ڈرائیور سے ایسی فرماں برداری کی امید نہیں تھی۔ میں کسی پیش قدمی کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ عقب سے آنے والی سیاہ کار ٹیکسی کے سامنے پہنچ کر آڑی پوزیشن میں رک گئی۔

وہ سیاہ ٹویوٹا کرولا تھی اور اس کے اندر دو نوجوان موجود تھے۔ گویا مجھے لوٹنے کا بڑا منظم منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ سوچنے کا نہیں، عمل کا وقت تھا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور میرا ہاتھ بجلی کی سی سرعت سے حرکت میں آیا پھر میں نے رائٹ ہینڈ کی ایک چوپ ڈرائیور کی گدی پر رسید کر دی۔

اپنے ساتھیوں کی آمد کے بعد ٹیکسی ڈرائیور میری جانب سے کسی فوری ردعمل کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ گدی پر میرے ہاتھ کا کاری وار کھانے کے بعد اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

میں نے ایک جھٹکے سے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔

اسی لمحے سیاہ ٹویوٹا کرولا کے دروازے یکے بعد دیگرے کھلے اور وہ دونوں نوجوان جارحانہ انداز میں میری جانب بڑھے۔

میں ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے تیار ہو گیا۔

امنگوں، حوصلوں اور آہوں کے بیچ رلاتی، کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سناتی اس ناقابلِ فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

"کون سی پیتے ہو؟" بوڑھے نے جماہی لے کر کہا تھا۔ میری ملاقات اس سے ہیتھرو ائرپورٹ پر ہوئی تھی۔ میں کینیڈا سے لندن کے راستے کراچی جا رہا تھا، وہ لندن سے ہانگ کانگ جا رہا تھا۔ دبئی تک ہم دونوں کی مشترکہ فلائٹ تھی۔ دبئی سے مجھے کراچی جانا تھا اور اس کو ہانگ کانگ۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس لاؤنج میں ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ مجھے تو میری کمپنی نے ٹکٹ دیا تھا اور ہم لوگ ہمیشہ فرسٹ کلاس میں ہی سفر کرتے تھے۔ فرسٹ کلاس کی عیاشی کا مجھے تو اندازہ ہی نہیں تھا جب تک میں اس کلاس میں بیٹھا نہیں تھا۔ اپنے خرچے پر تو میں ہمیشہ اکانومی کلاس میں ہی سفر کرتا رہا تھا، فرسٹ کلاس کے مقابلے میں ہوائی جہاز کا اکانومی کلاس ایسا ہی تھا جیسے تھرڈ کلاس کا ڈبا۔ قریب قریب کی سیٹیں، اس کے اوپر شوروغوغا۔ فرسٹ کلاس کی سیٹیں کشادہ ہوتی ہیں، آگے پیروں کو پھیلانے کی بے شمار جگہ، کھانا مینیو کے چوائس پر ملتا ہے اور مختلف مشروب۔ پوری دنیا کلاسوں میں بٹی ہوئی ہے اور ہر جگہ فرسٹ کلاس کی اور بات ہے۔ اورنگی ٹاؤن ہو کہ ڈیفنس، لیاری ہو کہ کلفٹن اور ہوائی جہاز ہو کہ سینما ہال...... کلاسوں کا یہ نظام بہت جلد

محبتوں کی ایسی یادگار کہانی جو برسوں یاد رہے گی

انسانی فطرت کو سمجھنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اس کائنات کے رمز کو سمجھنا... کہتے ہیں کہ دل کے رک جانے پر موت واقع ہو جاتی ہے لیکن درحقیقت چاہنے والوں کے لیے اصل موت تو روح کا روح سے بچھڑ جانے پر ہو جاتی ہے۔ دو مختصر معاشروں اور تہذیبوں کے چاہنے والے لوگ جن کے مذہب بھی الگ الگ مگر روح اور دل ایک... اس کے باوجود ان کا ایک ہونا ناممکن... ایسے میں پھر کوئی ایک اپنی جان پر کھیل جائے تو اس میں حیرت کیسی۔

وہ دل کہاں سے لاؤں

ڈاکٹر شیر شاہ سید



میری سمجھ میں آ گیا تھا۔

ہم دونوں ہی فرسٹ کلاس کے لاؤنج میں بیٹھے سنگاپور ائرلائنز کی پرواز کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ میرے برابر میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ ساٹھ پینسٹھ سال اس کی عمر ہوگی، کراچی میں تو بوڑھا ہی کہلاتا۔ سرخ و سفید رنگت، جاذب نظر شخصیت میں کچھ ایسا تھا کہ میں خود ہی اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔ جاوید احمد خان نام تھا اس کا۔ اس کے کارڈ پر یہی لکھا تھا، ساتھ ہی ایڈنبرا کی کسی انڈسٹری کا نام جس کا وہ مینجنگ ڈائریکٹر تھا۔

میں نے مشروب کا نام بتا دیا تھا۔ اس نے انگلی کے اشارے سے ویٹرس کو بلایا اور مزید مشروب کا آرڈر دیا تھا۔ ہم لوگ کافی دیر سے پی رہے تھے۔ چیک ان ہونے کے بعد جب سوار ہونے کو تیار تھے تو کسی وجہ سے جہاز تین گھنٹے کے لیے روک لیا گیا تھا۔ جاوید خان صاحب خود ہی میرے پاس آ کر بیٹھے تھے۔ ان کے اجلے رنگ میں بھی جو مشرقیت شامل تھی، اس سے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ پاکستان ہندوستان کے ہی ہوں گے۔ میں سمجھا تھا کہ شاید پٹھان ہوں گے اور کارڈ پر بھی خان ہی لکھا ہوا تھا مگر وہ پٹھان نہیں تھے۔ بہاری تھے، بہار کے پٹھان۔ میرا انہیں خیال تھا کہ بہار میں بھی خان ہوتے ہوں گے۔ میرے جاننے والوں میں اور میرے دوستوں میں جو بھی بہاری تھے، وہ کالے تھے۔ چھوٹے قد کے، دبلے پتلے لوگ۔ میں نے شاید پہلی دفعہ کسی خوب صورت بہاری کو دیکھا تھا۔ میں اپنے اس تعجب کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

وہ زور سے ہنسے۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے۔ بہار میں بھی ہر ساخت کے لوگ مل جائیں گے۔ میں بھی سمجھ لو عام ساخت سے الگ ہوں اور اب تو برسوں سے ایڈنبرا میں رہتا ہوں۔ اسکاٹ لینڈ کا ہوا پانی شاید کچھ زیادہ ہی اچھا ہے۔'' میں نے بھی دل میں سوچا تھا کہ اسکاٹش بھی تھوڑے تھوڑے بہاری ہوتے ہیں، یہ خوب رچ بس گئے ہوں گے ان لوگوں میں۔ انہوں نے میرے خالی ہونے والے گلاس کو دیکھ کر اپنے لیے اور میرے لیے مزید منگوانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہم دونوں نے جام ٹکرا کر گھونٹ بھرے، پھر انہوں نے کہا کہ جب مجھے والدین نے علی گڑھ یونیورسٹی پڑھنے بھیجا تھا تو وہاں بھی یہی ہوا تھا۔ پہلے ہی دن دوسروں نے مجھے بہاری کہہ کر مذاق اڑایا تھا مگر میں بھی خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ اس وقت صرف انیس سال عمر تھی میری اور خون بہت گرم۔ میں نے مرزا نجیب کا ہاتھ اس وقت تک نہیں چھوڑا تھا جب تک اس نے معافی نہیں مانگی تھی۔ اس کے بعد سارے ہی یوپی والے خاموش ہوگئے تھے اور میں نے اپنی عزت منوالی تھی۔ وہ مسکرائے پھر بولے کہ ایسا ہے کہ بہاری بہار سے تو نکل جاتا ہے اور کہیں بھی جا کر بس جاتا ہے، مگر بہار بہاری سے نہیں نکل سکتا ہے۔

میرا بھی وہی خیال تھا جو جاوید صاحب کا تھا۔ کراچی میں، میں جتنے بہاریوں کو جانتا تھا، وہ سب تھے تو کراچی میں مگر ان کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی بہاری چھپا ہوا تھا۔ میں نے ہنس کر انہیں بتایا تھا۔ وہ مسکرائے تھے۔ ''اچھا تو تم کراچی میں رہتے ہو؟ میں بھی کبھی اس شہر میں رہتا تھا۔ اب تو میں نے سنا ہے سب کچھ بدل گیا ہے، کراچی بڑا ہوگیا ہے، پھیل گیا ہے اور نہ جانے کیا کیا ہوگیا ہے اور سنا ہے، بہت کچھ ہوتا ہے وہاں پر۔'' میں سمجھ گیا تھا، وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

''کب سے کراچی نہیں گئے ہیں آپ؟'' میں نے بات جاری رکھنے کے لیے پوچھا تھا۔

''چالیس سال سے زیادہ ہوگیا ہوگا۔ ایک دفعہ جب نکلا تو پھر کراچی واپس نہیں گیا۔ اصل میں کراچی میں کچھ رہا ہی نہیں تھا۔ ایک بہن اور ایک پھوپی ہندوستان میں رہ گئے ہیں۔ کبھی کبھار بہار پٹنہ چلا جاتا ہوں۔ کراچی مجھے تو جانا چاہیے لیکن دل نہیں کرتا۔'' انہوں نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا، گلاس کا آخری گھونٹ بھرا اور فضا میں ایسے دیکھا تھا جیسے دور بہت دور تک دیکھ رہے ہیں...... کسی بہت پرانی تصویر کو۔

میں نے ویٹرس کو اشارہ کیا تھا، اپنے لیے اور جاوید صاحب کے لیے مزید مشروب منگوایا۔

''تم کیا کرتے ہو کراچی میں؟'' انہوں نے پوچھا تھا۔

''کاروبار ہے ہم لوگوں کا۔ میرے سسر کا بڑا کام ہے۔ وہ بھاری مشین سے لے کر دوائیں تک امپورٹ کرتے ہیں اور اس کام کی کافی ذمے داری مجھ پر بھی ہے۔'' میں کافی نشے میں تھا اور نہ جانے کیوں اپنی ساری کہانی انہیں سنا بیٹھا تھا۔ ''کھوکھرا پار سے کلفٹن تک ''ہم لوگ کھوکھرا پار میں رہتے تھے وہیں کے اسکول سے میں نے میٹرک پاس کیا تھا پھر کالج سے بی کام کر کے کراچی کے جنگل میں روزگار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ میرے والد الٰہ آباد سے کراچی آئے تھے۔ شریف آدمی تھے اور شرافت کے ساتھ انہوں نے ساری زندگی گزار دی۔ وہ کسٹم میں کام کرتے تھے اور اپنے ہی محکمے میں سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ رشوت لیتے تھے اور نہ ہی رشوت لینے

دیتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی بھی خوش نہیں دیکھا۔ شاید مطمئن تھے مگر خوش نہیں تھے۔ ہمیشہ ان کا ٹرانسفر ہوجاتا تھا۔ ایسے حالات میں میری غفور سیٹھ سے ملاقات ہوئی تھی۔ غفور سیٹھ میمن تھے اور شہر کے میمنوں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ان کا بڑا کاروبار تھا۔ شہر کی ہر خالی نظر آنے والی جگہ پر انہوں نے فلیٹ بنائے تھے۔ پراپرٹی میں لاکھوں کروڑوں بنانے کے بعد انہوں نے ہیوی مشینری کی امپورٹ بھی شروع کردی تھی پھر وہ دواؤں کی امپورٹ میں بھی لگ گئے تھے۔ اس کام میں بہت منافع تھا۔ خصوصی امراض کی دوا سے لے کر اینٹی بائیوٹک تک اور کوریا سے لے کر تائیوان اور امریکا تک سے ہر قسم کی دوائیں ہم لوگ امپورٹ کرتے ہیں۔ پاکستان آزاد ملک ہے اور آزادی سے ہر چیز بیچی جاتی ہے۔ میں آہستہ آہستہ غفور سیٹھ کے اتنے قریب آ گیا تھا کہ ایک دن انہوں نے مجھ سے خود ہی پوچھ لیا تھا کہ کیوں نہ میں ان کی بیٹی زیتون سے شادی کرلوں۔ ان کا ان کی بیٹی کے علاوہ کوئی اور تھا بھی نہیں۔ میری ماں نے زیتون کو بدصورت کہہ کر مسترد کردیا۔ پھر ہم لوگ الٰہ آباد کے مہاجر تھے، میمنوں میں شادی نہیں کرسکتے تھے۔ زیتون بدصورت نہیں تھی۔ صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ خوب صورت نہیں تھی۔ قدرت نے، قسمت نے، حالات نے خوب صورت بیوی نہیں دی لیکن خوب صورت موقع ضرور دیا تھا۔ میں نے غفور سیٹھ کو شادی کے لیے ہاں کردی۔ میرے ماں باپ، بھائی بہن کسی نے بھی شادی میں شرکت نہیں کی تھی۔ میں ایک رات میں کھوکھراپار سے کلفٹن آ گیا تھا اور اب تو میں نے کینیڈا کی شہریت بھی لے لی تھی۔ اسی کی ضروریات کے لیے مانٹریال گیا ہوا تھا۔ میرے سسر نے ہی اس کا انتظام کیا تھا۔ وہ ہمیشہ دو قدم آگے کھیلتے تھے۔ ان کا خیال تھا نہ جانے کراچی میں، پاکستان میں کب کیا ہوجائے، اپنا انتظام خود ہی رکھنا چاہیے۔ حالات تو بد سے بدتر ہی ہوتے جارہے ہیں۔ جن گلیوں میں، میں بے خوف وخطر گھوما تھا، وہاں اب گولیاں چلتی ہیں۔ میں اپنے والد کی موت پر بہت دنوں بعد جب اپنے گھر گیا تو مجھے ایسا لگا تھا کہ مکانات میں ترقیاں تو ہوتی رہی ہیں مگر علاقہ خراب ہوچکا ہے۔ اس تھرڈ کلاس دنیا میں زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکا تھا۔ میری اپنی دنیا تھی، پل کے اس طرف ڈیفنس کی فرسٹ کلاس دنیا۔ میں شاید نشے میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس فرسٹ کلاس دنیا میں رہتا ضرور ہوں مگر کرتا ہوں سارے تھرڈ کلاس کام۔“

وہ مسکرائے تھے۔ ”مگر اس تھرڈ کلاس کام کے بعد اب تم فرسٹ کلاس دنیا کے شہری تو ہوگئے ہو۔ تھوڑے سے تھرڈ کلاس کام کر کے اگر فرسٹ کلاس میں آ جاؤ تو کون پوچھتا ہے۔“

شاید ان کی بات صحیح تھی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔ پھر یکایک مجھے خیال آیا اور میں پوچھ بیٹھا کہ آخر چالیس سال تک آپ کراچی کیوں نہیں گئے اور اب کیوں جارہے ہیں؟

”نہیں، میں کراچی نہیں جارہا ہوں، ہانگ کانگ جارہا ہوں۔ دبئی سے جہاز بدل جائے گا اور اب کراچی میں ہے ہی کیا جس کے لیے جاؤں۔ اب تو میں نے سنا ہے کہ صرف لوگ ہیں شہر نہیں ہے۔“ شاید ان کی بات صحیح تھی۔ وہ رک کے پھر خود ہی بولے تھے۔

”میں جب کراچی پہنچا تو صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ 1948ء میں اپنے والد اور ماں کے ساتھ۔ بہن کی شادی پھوپی زاد سے ہوگئی تھی اور ان کے پورے خاندان نے پاکستان نہ جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ ہم لوگ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کراچی ائرپورٹ پر ایک پولیس والا ملا تھا جس نے زور سے السلام علیکم کہا تھا۔ وہ پاکستان میں پہلا سلام تھا جو میرے ذہن پر چپک کر رہ گیا ہے۔ پھر تھوڑے دنوں میں ہی سولجر بازار کے علاقے میں ایک ہندو کا چھوڑا ہوا بڑا سا مکان ہم لوگوں کو مل گیا تھا۔ میں تو پہلے دن سے ہی کراچی کی محبت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ چھوٹا سا صاف ستھرا شہر جہاں درختوں کا سایہ نہیں تھا۔ مٹی کی پھوار تھی اور دلوں کی گرمی تھی۔ اس وقت کا کراچی ایک طرح کا Melting Point تھا۔ ساری دنیا کے لوگ کراچی آرہے تھے۔ ہر طرح کی صلاحیت کے حامل، ہر طرح کے کام کرنے والے مگر جلد ہی سب کچھ کھوگیا تھا۔ معزز بہاریوں، بارسوخ میمنوں، سمجھ دار حیدرآبادیوں نے اپنے اپنے علاقے کے لوگوں کے نام پر کالونیاں اور سوسائٹیاں بنائیں جہاں جاننے والوں کو چھوٹے چھوٹے پلاٹ دیے اور اپنے خاندانوں اور عزیزوں کو ایکڑوں کے حساب سے نوازا اور غریب آدمی لیاری اور کھارادر میں ہی رہ گیا۔ بے ایمانی جب اوپر سے شروع ہوئی تو سلسلہ دور تک چلتا چلا گیا۔ میرے والد شریف انسان تھے، وہ پاکستان کی اس ابتدا پر کڑھتے رہتے تھے۔ تم کو تو شاید پتا نہیں ہوگا کہ کراچی میں پرنسس اسٹریٹ کہاں ہے؟ میں تمہیں بتاتا ہوں، سول اسپتال کے پاس پرنسس اسٹریٹ ہے۔ اسی پر کراچی یونیورسٹی تھی جہاں ہندو، پارسی،

عیسائی اور مسلمان سب پڑھتے تھے اور پڑھانے والوں میں بھی ان کی بہت ساری تعداد تھی۔ میرے والد صاحب نے وکالت شروع کر دی تھی۔

''یونیورسٹی میں اچھا وقت گزرتا تھا...... اور اس دور میں یونیورسٹی میں پڑھائی ہوتی تھی۔ سخت محنت کرنی پڑتی تھی اور اس کے بعد ہم خوب گھومتے تھے۔ کیفے جارج یا فریڈرک کیفے ٹیریا میں خاص قسم کی پلیٹوں میں جو ایک کے اوپر ایک ننھی ننھی ہوتی تھیں اور ان میں پیٹیز اور پیسٹری پیش کی جاتی تھی۔ یہ تو ایک خاص قسم کی عیاشی ہوتی تھی۔ شام کے وقت وکٹوریہ روڈ اور الفنسٹن اسٹریٹ پر جب ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں تو لگتا تھا کہ قدرت کا سارا حسن زمین پر اتر گیا ہے۔'' جاوید صاحب بولتے بولتے مسحور سے ہو گئے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے ان کے دل میں بہار اور دل کے اوپر کراچی ہے۔ انہوں نے رک کر آخری گھونٹ سے اپنا گلا صاف کیا اور میں نے ان کے لیے ایک اور جام منگوا لیا۔

وہ تھوڑے سے مسکرائے پھر کہا تھا۔ ''میں نے زندگی کا پہلا بیئر کراچی میں ہی پیا تھا۔ میرے ساتھ بمبئی کا ایک لڑکا تھا۔ عبدالرحیم نام تھا اس کا۔ دلیپ کمار جیسی شکل تو نہیں تھی اس کی لیکن بال، چال اور ڈھال بالکل دلیپ کا ہی تھا۔ اب تو ٹورنٹو میں بڑی جائیدادیں ہیں اس کی اور وہاں وہ رچ بس گیا ہے۔ وہ مجھے بیئر پلانے کے چکر میں رہتا تھا اور میں نہ نہ کرتا۔ ایک دن صدر کے پرشین ریسٹورنٹ میں پیٹیز کھانے کے بعد ہم لوگ گپیں ہانک رہے تھے کہ رحیم نے کہا چلو تمہیں بیئر پلاؤں اور نہ جانے میں کیوں راضی ہو گیا تھا۔ بیئر کی دو ٹھنڈی بوتلیں اور اس کے بعد وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کرتے ہوئے فریئر گارڈن تک آنا کسی خواب کی طرح یاد ہے۔ پھر ایسی کئی شامیں گزریں جن پر کئی کئی دن قربان کیے جا سکتے ہیں۔ کراچی کے جن چھوٹے چھوٹے باروں میں جانا ہوتا تھا، ان کی اپنی زندگی تھی۔ شام کے وقت لوگ اپنا غم غلط کر لیتے تھے، سڑکوں پر گولیاں نہیں چلاتے تھے۔''

مجھے ان کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ وہ مجھے ایک ایسے کراچی کی کہانی سنا رہے تھے جو میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی خاموشی کو توڑنے کے لیے میں نے سوال کیا تھا کہ انہوں نے کراچی کیوں چھوڑا تھا۔

وہ تھوڑی دیر اور خاموش رہے تھے۔ ''یہ بڑی ذاتی بات ہے، بہت پرسنل سوال ہے۔ تمہیں نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ میں نے تو تم سے نہیں پوچھا تھا، تم خود ہی بولے تھے۔''

مجھے ایسا لگا تھا جیسے انہیں برا لگا ہو۔ میں نے فوراً ہی معذرت چاہی تھی۔ ''نہیں میرا مطلب آپ کا دل دکھانا نہیں ہے، میں تو ایسے ہی پوچھ بیٹھا تھا۔ پرانے کراچی کی جو باتیں آپ سنا رہے ہیں اس کے حوالے سے میں پوچھ بیٹھا تھا۔'' میں گڑبڑا کر وضاحت کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ مسکرائے تھے دھیرے سے، دوبارہ سے ان کی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں ایک روشنی سی آ کر چلی گئی تھی۔ ''نہیں، کوئی بات نہیں۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ایک بڑا گھونٹ لیا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد خود ہی آہستہ سے بولے۔ ''اس دن میں پیلس سنیما کے پاس کیفے فردوس میں بیٹھا چائے پی رہا تھا اور رحیم کا انتظار کر رہا تھا۔ کیفے فردوس میں فردوس کا ہی مزہ آ جاتا تھا۔ یہ کیفے تمام کا تمام ہرے رنگ کا تھا اور ہلکی روشنی میں ہم لوگ اکثر وہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے تھے۔ جلد ہی رحیم آ گیا تھا اور اس نے بتایا کہ چلو صدر میں عیسائیوں کا جلوس نکلا ہوا ہے اور کہا تھا کہ چل کے دیکھنا چاہیے۔ عیسائی ہر سال یہ جلوس نکالتے تھے اور نہ جانے کتنے سال سے نکال رہے تھے۔ ایمپرس مارکیٹ کے سامنے سے ہو کر الفنسٹن اسٹریٹ سے ہوتے ہوئے بڑے کیتھڈرل پر جلوس کا خاتمہ ہوتا تھا۔

''شہر کے دوسرے علاقوں سے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں کی صورت میں نئے اور خوب صورت لباس پہنے ہوئے لڑکے لڑکیاں جلوس میں شامل ہوتے تھے۔ پاکستان بننے کے کچھ سال تک تو یہ جلوس نکلتا رہا پھر کچھ تلخیوں کی وجہ سے نکلنا بند ہو گیا۔

''اس دن بھی وہ جلوس خوب تھا۔ الفنسٹن اسٹریٹ پر بینڈ بجاتے ہوئے لڑکے لڑکیاں گزر رہے تھے اور ان میں ہی وہ لڑکی تھی۔ سفید فراک میں ملبوس۔ ہلکی سی لپ اسٹک لگائے ہوئے۔ لانبا قد تھا اس کا اور چہرے پر ہلکا سا پسینا آیا ہوا۔ میں نے اسے دیکھا تھا پھر اسے دیکھتا ہی چلا گیا تھا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی کہ میرے دل و دماغ پر چھا گئی تھی۔ رحیم کو بھی وہ اچھی لگی تھی مگر اتنی نہیں۔ آج جب میں پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھے اب بھی وہ اتنی ہی خوب صورت نظر آتی ہے۔ سفید لباس میں ملبوس، گورا رنگ اور چہرے پر ایسی کشش کہ نظر نہیں ہٹتی تھی۔ میرے خیال میں یہ کیمسٹری کا مسئلہ ہے۔ کسی کا اچھا لگنا اور کسی کا برا لگنے کا تعلق خوب صورتی سے نہیں ہے۔ یہ تو ایک طرح کی باہمی کیمسٹری کا مسئلہ ہے۔ کبھی خوب صورت سے خوب صورت چہرہ بھی اچھا نہیں لگتا اور کبھی دوسروں کے لیے بدشکل صورت دل و

دماغ پر چھا جاتی ہے۔ اس کا نام تھا جوزفین ڈیرک۔ ماں اس کی گون تھی اور باپ ایک انگریز سپاہی جو کبھی کراچی میں آیا تھا اور جوزفین کی ماں سلویا برگنزا سے شادی کی تھی۔ پاکستان بننے سے پہلے جب جوزفین اور اس کے دو بھائی چھوٹے تھے تو ولیم ڈیرک کو برما کے محاذ پر جانا پڑا تھا جہاں سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ جوزفین کی ماں اب بھی کسی ایسی صبح کا انتظار کر رہی تھی جب مسکراتا ہوا ولیم مینس فیلڈ اسٹریٹ کے کونے والی بلڈنگ پر اس فلیٹ میں داخل ہوگا۔

''میں جلوس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا تھا۔ رحیم بھی میرے ساتھ تھا اور میری نگاہ مستقل جوزفین پر جمی ہوئی تھی۔ جلد ہی اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ میں اسے مسلسل تک رہا ہوں۔ جلوس کے ختم ہونے پر سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ چلی گئی تھی لیکن جاتے جاتے اس نے ایک بھرپور نگاہ ڈال کر مجھے دیکھا تھا، بہت غور سے۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ پھر ملیں گے۔

اس کے بعد میں اور رحیم ہوٹل ایکسلسیر کے بار میں چلے گئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی برف میں وہ مشروب جیسے جسم سے لے کر روح کو تر کر گیا۔ رحیم جلوس کے بارے میں اور میں جوزفین کے بارے میں باتیں کرتے رہے پھر ہم دونوں ہی تیز خوشبو اور سونف کا پان کھا کر گھر آ گئے تھے۔

''دوسرے دن میں یونیورسٹی میں، اس کے بعد دوستوں میں پھر شام کو گھر پر ایک عجیب قسم کی بے قراری کا شکار رہا تھا۔ کسی کام کو کرنے کا دل نہیں کرتا تھا، کسی بات میں جی نہیں لگتا تھا۔ نہ ریڈیو کے گانے اور نہ گراموفون کے ریکارڈ۔ ایک رحیم کو اندازہ تھا کہ میں کس قسم کی بے قراری کا شکار ہوں۔ میں کراچی کی مختلف سڑکوں پر اکثر بے سبب گھومتا رہتا تھا......''

یہ کہہ کر وہ رکے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا گلاس خالی ہو چکا ہے۔ میں نے اشارے سے سروس کرنے والی لڑکی کو بلایا۔ فرسٹ کلاس کے لاؤنج میں بیٹھنے کا مزہ ہی کچھ اور ہے۔ ہر چیز وافر ہے، جتنی بھی چاہیے لے لو۔ فرسٹ کلاس میں زندگی بسر کرنے والوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہے کہ سیکنڈ کلاس زندگی کا رخ کریں۔ میں نے یہ سبق آسانی سے سیکھ لیا تھا مگر سیکنڈ کلاس اور تھرڈ کلاس میں رہنے والے لوگ یہ نہیں سمجھتے ہیں۔ ویٹرس نے ان کا گلاس بھر دیا تھا۔ انہوں نے سگریٹ سلگائی، ایک زور کا کش بھرا، مسکرائے پھر بولنے لگے۔

''نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ کراچی کی پرانی عیسائیوں کی آبادی کی طرف چلا جائے۔ شاید اس امید اور اس آسرے پر کہ جوزفین وہاں ہوگی، کہیں نظر آ جائے گی۔ میں اور رحیم کراچی کی شام کی ٹھنڈی ہوا میں آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے لکی اسٹار پہنچے۔ وہاں سے گون ہال کے سامنے سینٹ جوزف کالج کے پیچھے سے ہوتے ہوئے مینس فیلڈ اسٹریٹ سے گزرتے ہوئے برگنزا اسکوائر تک پہنچ گئے تھے۔ اب نہ جانے وہاں کیا ہوگا۔ اس وقت وہ جگہ بڑی خوب صورت تھی۔ ایک طرف سینٹ پیٹرک چرچ نظر آتا تھا اور دوسری جانب سپریم کورٹ کی خوب صورت بلڈنگ۔ ہم دونوں وہاں دیر تک ادھر اُدھر گھومتے رہے تھے۔ کئی خوب صورت عیسائی لڑکیاں نظر آئی تھیں مگر وہ نہیں دکھائی دی تھی۔ جوزفین دل میں ایک کانٹے کی طرح اٹک گئی تھی۔ وقت گزرتا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کئی مہینے گزر گئے اور میں دوبارہ سے عیسائیوں کی سالانہ پریڈ کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ ایک دن مجھے وہ مل گئی، ایک حادثے کی طرح۔ میں کیپٹل سنیما سے نکل رہا تھا کہ میں نے اسے دیکھا تھا سیڑھی سے اترتے ہوئے۔ میں بے تحاشا بے قابو ہو کر اس کی طرف دوڑا تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر مسکرائی، شاید اسے بھی میرا انتظار تھا۔ میں نے اسے کیپٹل سنیما کے اوپر کیپٹل ریسٹورنٹ میں چائے کی دعوت دی اور وہ میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ ہم نے چائے اور پیٹیز کھائے تھے۔ وہ سینٹ جوزف کالج میں پڑھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی دوستی یکایک ہو گئی تھی جو بڑھ کر شدید پیار بن گئی۔ ہم روز ملتے تھے، کبھی پیلس سنیما میں فلم دیکھتے تھے، ہوٹلوں میں چائے پیتے تھے اور کئی دفعہ میں اس کے گھر بھی گیا تھا۔ کراچی چھوٹا سا شہر تھا۔ تھوڑے دنوں میں ہی یونیورسٹی میں اور میرے جاننے والوں کو میری اس سے بے تحاشا محبت کا علم ہو گیا تھا۔ اب یہ صرف محبت نہیں رہی تھی، میں اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے شادی پر تیار تھی مگر زندگی اتنی آسان نہیں ہے۔ میرے والد، والدہ اور خاندان کسی کرسچین سے میری شادی کرنے کو تیار نہیں تھے۔ جوزفین کی ماں اور ماں کے رشتے داروں کو جوزفین سے میری دوستی پسند نہیں تھی۔ زندگی یکایک مشکل ہو گئی تھی۔ اس کے خاندان کے بہت سارے کیتھولک لڑکے اس کے امیدوار تھے۔''

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئے تھے جیسے کچھ سوچ رہے ہوں، پھر انہوں نے سوال کیا تھا۔ ''تم نے سینٹ پیٹرک چرچ دیکھا ہے؟''

میں نے جواب دیا۔ ''ضرور، سینٹ پیٹرک اسکول کے سامنے سینٹ جوزف کالج کے ساتھ کئی دفعہ جیکب لائن

اور اے بی سینا لائن سے گزرتے ہوئے وہاں نظر پڑی ہے۔‘‘
’’تم وہاں کبھی رات میں تو نہیں گئے ہو گے؟‘‘
’’نہیں، کبھی نہیں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔
’’کبھی جانا اور جب چودھویں کی رات کا چاند نکلا ہوا ہو تو اس چرچ پر نظر ڈالنا۔ یہ اس وقت کے کراچی کا حسین ترین منظر تھا۔ نہ جانے اب کیسا ہوگا۔ میں نے سنا ہے بڑی بلڈنگیں بن گئی ہیں اور زیادہ تر کرسچین وہ جگہ چھوڑ کر آسٹریلیا اور امریکا چلے گئے ہیں۔ ایسی ہی ایک چاندنی رات تھی جب اس چرچ کی سیڑھیوں پر میں اور جوزفین بیٹھے ہوئے تھے اور زندگی کی مشکلات سے نمٹنے کے پلان بنا رہے تھے۔ مجھے یاد ہے اس دن اس نے اپنا پرس کھول کر ایک ہار مجھے دیا تھا۔‘‘ انہوں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک پرس نکالا جس کے اندرونی خانے میں پرانے اسٹائل کا ایک سونے کا چھوٹا سا دل تھا۔ ’’یہ دیکھ رہے ہو دل، ایک ہار میں پرویا ہوا تھا۔ وہ ہار تو میں نے کھو دیا مگر یہ دل ہر وقت میرے پاس ہوتا ہے۔‘‘

میں نے اس دل کو اٹھا کر دیکھا۔ اس کے ایک طرف بہت ہی خوب صورت انداز سے انگلش کا حرف جے جے کھدا ہوا تھا۔ میں وہ دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ بولے۔ ’’جاوید جوزفین‘‘ یہ مطلب ہے اس جے جے کا۔ یہ جوزفین کا پہلا اور آخری تحفہ تھا۔ اس رات کے بعد سب کچھ بہت تیزی سے ہو گیا تھا۔ میرے والد نے مجھے بلا کر کہہ دیا تھا کہ جوزفین سے میری شادی نہیں ہوسکتی۔ جوزفین بہت روئی تھی مگر اس کے بھائی، ماموں، ماں اور کیتھولک پادری کوئی بھی اس رشتے پر تیار نہیں تھے۔ میری یونیورسٹی کا آخری سال تھا اور رحیم کے مشورے سے میں کورٹ میرج کا پلان بنا ہی رہا تھا کہ وہ یکایک مرگئی۔ مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا کہ کیا ہوا تھا، نہ کوئی خط، نہ کوئی پیغام۔ اس کی دوست لوریٹا مجھے کئی دنوں کے بعد ملی تھی۔ بس اس نے اتنا بتایا تھا کہ جوزفین بہت پریشان تھی۔ اس کا اس کی ماں سے بھی جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے ایک انکل کالج میں آئے تھے پھر کالج کی پرنسپل مس این میری جوزفین سے کچھ باتیں کرتی رہی تھیں۔ اس دن اس نے لوریٹا کو بتایا تھا کہ وہ شام کو مجھ سے ملے گی۔ لوریٹا نے ہی بتایا تھا کہ وہ بہت پریشان تھی۔ بار بار گلے میں پڑے ہوئے کراس کو ہاتھ میں دبا دبا کر دعائیں مانگتی رہتی تھی۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ وہ میرے ساتھ بھاگنا بھی چاہتی تھی اور اس کو اپنی ماں کا بھی خیال تھا۔ وہ مسلمان بننا چاہتی تھی مگر اس کو مجھ سے بھی پیار تھا۔ کشمکش کے دو پلڑوں کے درمیان وہ نہ جانے کیا فیصلہ کر بیٹھی تھی۔ میری زندگی کا وہ معما آج تک مجھے حیران کر رہا ہے۔ میں اس سے ملاقات کا انتظار ہی کرتا رہ گیا تھا مگر وہ مجھ سے نہیں ملی تھی۔ دوسرے دن بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے بعد جب میں اسے تلاش کرتا ہوا مینس فیلڈ اسٹریٹ کے اس مکان میں پہنچا تھا تو اس کی ماں نے بتایا تھا کہ جوزفین مرچکی ہے۔ اس کو مرے ہوئے بھی پانچ دن ہو چکے تھے۔ اسے ڈرگ روڈ کے عیسائیوں کے قبرستان میں دفن کیا جا چکا تھا۔ اس کی ماں مجھ سے بار بار پوچھتی رہی تھی۔ یہ کیسے ہوا، یہ کیسے ہوا؟ اس کا غم میری سمجھ میں آ رہا تھا مگر میرے غم کی شدت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکا تھا۔ سلویا برگنزا کا ہاتھ پکڑ کر میں بہت دیر تک روتا رہا تھا پھر مجھے احساس ہو گیا تھا کہ سلویا کے علاوہ کسی کو بھی میری موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بوجھل قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اپنے گھر پہنچا تھا، اس کے بعد کراچی میں میرے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ ہوکر میں لندن چلا آیا تھا۔ میری ماں اور باپ میری بہن سے ملنے بہار گئے تھے جہاں میرے والد کی موت ہوگئی تھی اور میری ماں پھر کراچی واپس گئی ہی نہیں تھی۔ میرا کام بڑھتا گیا، بڑھتا گیا اور بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ کئی انگلش اور اسکاٹش لڑکیاں زندگی میں آئیں مگر میں ان میں بھی جوزفین کو تلاش کرتا رہا۔ جوزفین نہیں ملی، وہ تو مرگئی تھی...... یہ دل مجھے دے کر۔ میرے دل میں اتنا بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے...... لگتا ہے جیسے ساری کائنات اس میں سما جائے گی۔‘‘

انہوں نے اس دل کو بڑے زور سے اپنی مٹھی میں بھینچا ہوا تھا اور ان کی سرخ سرخ آنکھوں میں قطرے جھلملا رہے تھے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولے۔ ’’کیا ہے کراچی میں میرے لیے۔ وہ کیفے ٹیریا، نہ کیپٹل سینما، نہ کیفے فردوس، نہ برگنزا اسکوائر اور نہ ہی جوزفین۔ میں کراچی کی پرانی تصویر کے ساتھ ایڈنبرا میں ایک دن کہیں کھو جاؤں گا۔‘‘

سنگاپور ایئر لائنز کی فلائٹ دبئی کے لیے تیار تھی۔ ہم دونوں ساتھ ہی جہاز پر بیٹھے تھے۔ دونوں ہی کھانا کھا کر سو گئے۔ دبئی پر جب آنکھ کھلی تو وہ کافی ہشاش بشاش تھے۔ اس کے بعد ان سے پھر کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ اب بھی جب کبھی ہیتھرو کے فرسٹ کلاس لاؤنج میں بیٹھتا ہوں تو وہ یاد آتے ہیں۔ جن کی جیب میں ایک پرس ہے، پرس میں سونے کا بنا ہوا ایک دل اور دل پر لکھا ہوا ہے جے جے۔ جاوید جوزفین۔ جو بچھڑ گئے اور اس دل کا شہر جو روٹھ کر کہیں چلا گیا۔

''آخر تمہیں اس تھرڈ کلاس اور گھٹیا شخص میں کون سی خوبی نظر آئی جو تم نے اس سے شادی کا ہی فیصلہ کر ڈالا۔ میں تمہیں اپنے خاندان کی عزت پر کیچڑ اچھالنے کی اجازت ہرگز نہیں دوں گا۔'' مسٹر جسٹن نے گرجدار آواز میں اپنی بیٹی جینی سے کہا۔ ''تم نے شادی کے لیے کسی شریف اور عزت دار آدمی کا انتخاب کیوں نہیں کیا؟''

''ڈیڈ! آپ خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں، اپنی مرضی سے شادی کرنا میرا حق ہے۔ میں جوزف کو پسند کرتی ہوں

اکثر لوگ کہتے ہیں کہ معاملات کو زیادہ الجھانے سے الجھتے ہیں لہٰذا جب کوئی سرا ہاتھ نہ لگے تو مٹی ڈالو اور مزے سے زندگی گزارو لیکن ... زندگی کے ہر محاذ پر یہ فارمولا فٹ نہیں بیٹھ سکتا... کیونکہ جہاں عزت داؤ پر لگ جائے وہاں باتوں پر مٹی نہیں ڈالی جاسکتی لہذا وہ بھی صرفِ نظر سے کام نہ لے سکا کیونکہ وہ بہ بظاہر مغربی معاشرے میں سانس لے رہا تھا مگر جی وہ اپنے مشرقی معاشرے میں ہی رہا تھا۔

مخالف سمتوں میں چلنے والے مسافروں کی متضاد کیفیات کا دلچسپ احوال

مغرب و مشرق

شاکر لطیف



اورشادی بھی اسی سے کروں گی۔ مجھے آپ کے انکار کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آرہی۔ آپ نے اسے محض اس لیے ٹھکرادیا کہ وہ ہماری طرح دولت منداور اعلیٰ خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔“ جینی نے کہا۔

”یہ بات نہیں!“ مسٹر جسٹن نے پہلے سے بھی زیادہ گرجدار آواز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔” اعتراض اس کے خاندان پر نہیں بلکہ اس کے ذاتی کرداراور خراب شہرت پر ہے۔ تم سے پہلے بھی وہ کئی مالدار عورتوں سے معاشقے لڑا چکا ہے۔ اس کے علاوہ منشیات استعمال کرنے کے جرم میں ایک دو بار جیل کی ہوا بھی کھا چکا ہے۔ تم صرف ایک بار میری باتوں پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرو... تو تمہیں اندازہ ہوجائے گا کہ جوزف تم سے نہیں، تمہاری دولت سے شادی کررہا ہے۔ اس میں مردانہ وجاہت کے علاوہ کوئی ایک خوبی ہو تو بتاؤ؟“

”یہ تمام باتیں غلط اور بے بنیاد ہیں ڈیڈ۔“ جینی نے پُرزور لہجے میں مسٹر جسٹن کی نفی کرتے ہوئے کہا۔”حقیقت تو یہ ہے کہ کچھ عورتیں جان بوجھ کر جوزف کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں اور جب جوزف نے انہیں دھتکار دیا تو انہوں نے انتقاماً اسے بدنام کرنے کے لیے اس کے بارے میں اس قسم کی باتیں مشہور کردیں۔ جہاں تک جیل جانے کی بات ہے تو وہ منشیات کی وجہ سے جیل نہیں گیا بلکہ لڑائی جھگڑے کی وجہ سے گیا تھا۔ جوانی میں اکثر انسانوں کے ساتھ اس طرح ہوتا رہتا ہے۔“

”آخر تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہیں؟“ مسٹر جسٹن نے بے بسی سے کہا۔” اسے تم میں ذرا بھی دلچسپی نہیں وہ ایسے کھیل کھیلنے کا عادی ہے، اس کی دلچسپی کا محور صرف تمہاری وراثتی جائداد ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم میری بیٹی نہ ہوتیں تو وہ تمہاری طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا۔ میں تمہارا باپ ہوں اور کوئی باپ اپنی اولاد کے لیے کبھی برا نہیں سوچتا۔ کان کھول کرسن لو، میں ہرگز یہ نہیں ہونے دوں گا۔“

”آپ مجھے نہیں روک سکیں گے ڈیڈ۔“ جینی کو مسٹر جسٹن کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔” اگر آپ اپنے فیصلے پر بضد ہیں تو میں بھی آپ کو بتائے دیتی ہوں کہ میں جلد ہی جوزف سے شادی کررہی ہوں اور اگر آپ نے مجھ سے کسی قسم کی زور زبردستی کرنے کی کوشش کی تو میں اس سلسلے میں پولیس کی مدد بھی حاصل کرسکتی ہوں۔“

”تم مجھے یعنی اپنے باپ کو پولیس کی دھمکی دے رہی ہو...... جس باپ نے تمہاری پرورش بڑے ناز ونعم کے ساتھ کی اور تمہیں کبھی ماں کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ آج اس کے مقابلے میں تم جوزف جیسے گھٹیا انسان کو ترجیح دے رہی ہو۔“ جینی کا جواب سن کر مسٹر جسٹن کا پارہ مزید چڑھ گیا۔

”اسے بار بار گھٹیا کہہ کر اس کی توہین نہ کریں۔“ جینی کا لہجہ بھی غصیلا ہوگیا۔”وہ اب آپ کا ہونے والا داماد ہے۔ اس کا نام اب ہمارے خاندان سے جڑنے والا ہے، اسے بھی وہی عزت اور مقام حاصل ہوگا جو ہمارے خاندان کے کسی بھی دوسرے فرد کو حاصل ہے۔“

”یہ محض تمہاری خام خیالی ہے۔“ مسٹر جسٹن نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔”ہمارے خاندان کا کوئی بھی فرد جوزف جیسے آدمی کو قبول نہیں کرے گا کیونکہ سب اس کی اصلیت سے بخوبی واقف ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ تمہاری عقل پر پردہ پڑ چکا ہے۔ تم عمر کے جس جذباتی دور سے گزر رہی ہو، اس میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ نوجوانی میں لڑکیاں بالکل آگ کی طرح ہوتی ہیں، ذراسی غلطی سے سب کچھ جل کر خاکستر ہوجاتا ہے۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے ڈیڈ!“ جینی نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔”میں ایک عقل منداور باشعور لڑکی ہوں، اپنے برے بھلے میں تمیز کرنا جانتی ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ جذبات میں آکر نہیں بلکہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے اور پھر آخر جوزف میں اس کے علاوہ کیا خامی ہے کہ وہ ہمارے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا۔ اچھا خاصا ہینڈسم آدمی ہے۔“

”تم نہیں سمجھ سکوگی!“ مسٹر جسٹن کا لہجہ افسردہ ہوگیا۔ ”جب عقل پر جذبات حاوی ہوجائیں تو اسی طرح ہوتا ہے۔ بہرحال اگر تم فیصلہ کرہی چکی ہو تو پھر میرا آخری اور قطعی فیصلہ بھی سن لو اگر تم نے جوزف سے شادی کی تو میں تمہیں اپنی جائداد سے بے دخل کردوں گا۔“

”یہ اتنا آسان نہ ہوگا ڈیڈ!“ جینی تیز لہجے میں بولی۔ ”اس کے لیے آپ کو عدالت میں میرا سامنا کرنا ہوگا، میں آپ کی اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے اس جائداد کی قانونی وارث ہوں۔ آپ مجھے میرے وراثتی حق سے محروم نہیں کرسکتے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پیر پٹختے ہوئے مسٹر جسٹن کے وسیع وعریض بنگلے کے خارجی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اب جوزف سے مل کر کوئی فیصلہ کرلینا چاہتی تھی۔

مسٹر جسٹن خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ان کے چہرے پر موجود افسردگی کے تاثرات مزید

گھرے ہو گئے تھے۔ جینی کی ماں اس کے بچپن میں ہی وفات پا چکی تھی۔ وہ اپنی مرحوم بیوی سے محبت کرتے تھے اور انہیں اس کی آخری نشانی جینی سے بھی بہت پیار تھا۔ سوتیلی ماں جانے اس کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتی، اس اندیشے کے پیشِ نظر انہوں نے دوسری شادی بھی نہ کی تھی۔ جس بیٹی کو انہوں نے باپ اور ماں دونوں کا پیار دیا تھا اور اسے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا، وہ جوزف جیسے آدمی سے شادی کر کے ان کی عزت مٹی میں ملانے پر تلی ہوئی تھی۔ قرین از قیاس یہی تھا کہ وہ جلد ایسا ہی کرے گی جیسا کہ وہ کہہ چکی تھی۔

مسٹر جسٹن کا تعلق امریکا کے ایک اعلیٰ خاندان سے تھا اور وہ ایک باشعور اور پڑھے لکھے انسان تھے۔ امارت اور غربت کے درمیان لکیر کھینچنے کے قائل نہیں تھے اور نہ ہی انسانوں میں کسی طبقاتی فرق کو تسلیم کرتے تھے۔ اگر جینی جوزف کے بجائے کسی اور شریف النفس انسان کا انتخاب کرتی تو وہ بخوشی اس رشتے کو تسلیم کر لیتے مگر جوزف کے کردار سے وہ ذاتی طور پر واقف تھے۔ مال دار عورتوں کو پھانس کر ان سے مال بٹورنا اس کا پیشہ تھا۔ دراز قد اور وجیہہ جوزف کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اپنی چکنی چپڑی باتوں سے عورتوں کو بہ آسانی رام کر لیتا ہے۔ جینی بھی اس کے ٹرانس میں آ کر اپنے سگے باپ کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی تھی۔ آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ ان کے حد سے زیادہ اور بے جا لاڈ پیار نے جینی کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ اس قدر ضدی اور خودسر ہو گئی تھی کہ ان کے کسی حکم کو خاطر میں ہی نہ لاتی تھی اور جوزف کے معاملے میں بھی وہ مسٹر جسٹن کے مقابلے میں ضد پر اتر آئی تھی۔ انہیں اس بات کا ادراک بھی ہو چکا تھا کہ قانوناً وہ جینی کو اس شادی سے نہیں روک سکیں گے۔

وہ کچھ دیر تک سوچتے رہے اور پھر انہوں نے اپنے وکیل سے بات کرنے کا سوچا۔ ان کا خیال تھا کہ اپنے وکیل کے ذریعے سے اپنی بیٹی کے نام پر بے دخلی کا ایک قانونی نوٹس بھجوایا جائے۔ یہ ممکن تھا کہ نوٹس دیکھ کر وہ اپنے ارادے سے باز آ جاتی، اس نے اپنی زندگی بہت عیش و آرام سے گزاری تھی۔ جائداد چھن جانے کا ڈر اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مسٹر جسٹن نے اپنے اصولوں کے برخلاف اس معاملے میں اپنے بھانجے گراہم کو بھی ملوث کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ دراز قد کڑیل اور خاصی خوفناک شخصیت کا مالک گراہم اس علاقے میں ایک غنڈے کی سی شہرت رکھتا تھا۔ مسٹر جسٹن کو اکثر اوقات اس کے جھگڑوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ مار کٹائی کی وجہ سے کئی دفعہ جیل بھی جا چکا تھا مگر وہاں جانے کے بعد وہ سدھرنے کے بجائے مزید بگڑ گیا تھا۔ مسٹر جسٹن ذاتی طور پر اسے پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ ان کے خاندان کے لیے بدنامی کا باعث بن رہا تھا مگر چونکہ ان کی بیٹی جوزف سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اس لیے جوزف کو خوفزدہ کرنے کے لیے گراہم ہی کارآمد ثابت ہو سکتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اگر گراہم، جوزف کو اس شادی سے روکنے کے لیے دھمکی دے تو وہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ گراہم ان کے حکم کی تعمیل کرے گا۔ غنڈا ہونے کے باوجود وہ اپنے ماموں کی بہت عزت کرتا تھا، اس لیے اس سلسلے میں اس سے بات کی جا سکتی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکے تھے کہ وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنی بیٹی کو اس شادی سے روکیں گے۔

☆☆☆

''امی جان! آپ میری بات کیوں نہیں سمجھ رہی ہیں۔ میں سکندر کے سوا کسی اور سے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ نے اور ابا جان نے ہمارے بچپن میں ہی میرا اور اس کا رشتہ طے کیا تھا۔ اب آپ اس کے بھائی کے قصور کی سزا ہم دونوں کو کیوں دے رہی ہیں؟'' افشاں نے خاصی جارحانہ آواز میں اپنی والدہ سے کہا۔

''آہستہ بولو۔'' اس کی والدہ نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''تمہارے ابا جان آج دکان پر نہیں گئے۔ اگر انہوں نے سن لیا تو قیامت آ جائے گی۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں ہے جس شخص نے تمہارے بڑے بھائی جاوید کو قتل کیا تم اسی کے بھائی سے شادی کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ جس خاندان نے ہمیں اجاڑ دیا تم اسی خاندان کو آباد کرنا چاہتی ہو۔ تمہیں اپنے والدین کی عزت کا ذرا بھی پاس نہیں؟''

''مگر امی جان اس میں سکندر کا کیا قصور ہے۔ آپ لوگ کسی کے جرم کی سزا کسی دوسرے کو کیسے دے سکتے ہیں۔ یہ قتل سکندر نے تو نہیں کیا تھا نا۔ اصل مجرم تو اس کا بھائی شہباز ہے، وہ اب جیل میں ہے اور اسے سزا بھی سنائی جا چکی ہے۔ ابا جان نے اپنا سب کچھ بیچ کر مقدمے بازی پر خرچ کر دیا اور انہیں عدالت سے انصاف بھی مل چکا ہے۔ میری اور سکندر کی زندگی کیوں برباد کی جا رہی ہے اور پھر سکندر کے والدین اب بھی اس رشتے پر راضی ہیں، بس آپ ہی کی طرف سے انکار ہے۔'' افشاں کا جارحانہ لہجہ

بدستور برقرار تھا۔

''سکندر کے والدین رشتے پر اس لیے تیار ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک دفعہ تم بیاہ کر ان کے گھر چلی گئیں تو پھر وہ ہمیں اس مقدمے کے سلسلے میں صلح پر مجبور کر سکیں گے۔'' اس کی والدہ نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اگر ہم سکندر کے بھائی شہباز کو عدالت میں معاف کر دیں تو وہ اب بھی جیل سے رہا ہو سکتا ہے۔ تم ان کے گھر چلی گئیں تو بیٹی والے ہونے کی وجہ سے ہم مجبور ہو جائیں گے۔ تمہیں اپنے باپ کی سفید ڈاڑھی کا ذرا بھی خیال نہیں۔ اب اس بڑھاپے میں انہیں ذلیل کراؤ گی۔ پہلے ہی جوان اولاد کی موت کا صدمہ کیا کم ہے جو اب جوان بیٹی بھی سرکشی پر اتر آئی ہے۔''

''مگر امی جان......'' افشاں نے اعتراض کرنا چاہا۔

''بس!'' اس کی والدہ نے ہاتھ اٹھا کر غصے سے کہا۔ ''بہتر یہ ہے کہ سکندر کا خیال اپنے دل سے نکال دو۔ ہم تمہارا رشتہ کہیں اور طے کر رہے ہیں اور اب مزید اس بارے میں کوئی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی والدہ افشاں کے کمرے سے باہر چلی گئیں۔

ماں کا جواب سن کر افشاں وقتی طور پر خاموش ہو گئی تاہم اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس کا رشتہ سکندر کے ساتھ اس وقت طے کیا گیا تھا جب اس نے ہوش بھی نہ سنبھالا تھا۔ وہ بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی والدہ سے یہی سنتی آرہی تھی کہ سکندر اس کا منگیتر ہے اور اس کی شادی بھی اسی سے ہوگی۔ ماں کی یہ باتیں اس کے دل پر ثبت ہو گئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں سکندر کو اپنا سب کچھ تسلیم کر چکی تھی مگر اب اس کا رشتہ کہیں اور طے کیا جا رہا تھا۔ یہ سب اس کے لیے ناقابلِ قبول تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے سوا کسی اور کے ساتھ زندگی کیسے گزارے گی۔ وہ اب بھی سکندر سے رابطے میں تھی اور اس کی سکندر کے ساتھ خاصی ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ سکندر بھی اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔

تقریباً تین سال پہلے تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور افشاں کے گھر میں اس کے بڑے بھائی جاوید کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر اس وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ خوشیاں جلد ہی ماتم میں بدل جائیں گی۔ سکندر کا چھوٹا بھائی جو محلے میں خاصی خراب شہرت رکھتا تھا، اکثر اوقات اپنے اوباش دوستوں کے ساتھ محلے کی شریف زادیوں کو تنگ کرتا تھا۔ افشاں کے بڑے بھائی جاوید کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناپسند تھیں۔ اس نے ایک دو دفعہ اسے ان حرکتوں سے منع بھی کیا مگر شہباز پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جاوید کے ہونے والے بہنوئی کا چھوٹا بھائی تھا اس لیے اس نے شہباز کے منہ لگنے کے بجائے اس کے والد کو اس سلسلے میں شکایت کی۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں شہباز کی سرزنش کریں گے، جاوید بھی ان سے بات کر کے مطمئن ہو گیا۔ اس کا خیال تھا کہ والد کے سمجھانے پر وہ باز آجائے گا۔

چند دن تک سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلتا رہا اور شہباز بھی اپنے اوباش دوستوں کے ساتھ محلے میں دوبارہ نظر نہ آیا مگر پھر ایک دن اس نے اچانک جاوید کو گلی میں روک لیا۔ اسے اس بات کا شدید رنج و غصہ تھا کہ جاوید نے اس کی شکایت اس کے والد سے کی ہے۔ دونوں میں تلخ کلامی ہوئی جو بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ شہباز نے اچانک اپنی جیب سے خنجر نکالا اور جاوید پر پے در پے وار... کرنا شروع کر دیے۔ محلے کے لوگ جب تک مداخلت کرتے جاوید شدید زخمی ہو چکا تھا جبکہ شہباز خنجر لہراتا ہوا موقع سے فرار ہو گیا۔ جاوید کو فوراً اسپتال پہنچایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی موت کی خبر افشاں اور اس کے والدین پر بجلی بن کر گری۔ وہ تو چند دنوں کے بعد اس کے سر پر سہرا سجانے کے خواب دیکھ رہے تھے مگر اس گھر کا واحد کفیل منوں مٹی کے نیچے دفن ہو گیا تھا۔ جاوید اسی محلے میں اپنی ایک چھوٹی سی کریانے کی دکان چلاتا تھا مگر اب اس اندوہناک سانحے کے بعد گھر کی ساری ذمے داری افشاں کے بوڑھے اور بیمار باپ کے کاندھوں پر آن پڑی تھی، جوان بیٹے کی موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی مگر انہوں نے پھر بھی ہمت سے کام لیا اور بیماری کے باوجود دکان کو سنبھال لیا اور اب بمشکل گھر کی دال روٹی پوری کر رہے تھے۔ شہباز کے خلاف ایف آئی آر بھی انہی کی مدعیت میں درج کی گئی تھی۔ پولیس نے چند ماہ بعد نامزد ملزم شہباز کو بھی گرفتار کر لیا اور یوں دونوں خاندانوں کے درمیان قانونی مخاصمت کا آغاز ہوا۔ افشاں کے جہیز کے لیے جو زیورات سنبھال کر رکھے گئے تھے، وہ بھی اس مقدمہ بازی کی نذر ہو گئے تھے۔ سکندر کے والد نے جاوید کے والد سے صلح کی بہت کوشش کی مگر جاوید کے والدین سے مس نہ ہوئے اور پھر کچھ عرصہ پہلے ہی عدالت نے شہباز کو عمر قید کی سزا سنا دی تھی۔

افشاں جس خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتی تھی، وہاں پردہ داری کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ لڑکیوں کا اکیلے گھر

سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ موبائل فون رکھنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ پہلے تو وہ چھپ کر سکندر سے مل لیتی تھی مگر اب اس کی ماں نے اس کے گھر سے باہر نکلنے پر بھی سخت پابندی عائد کردی تھی۔ اگر کہیں جانا ضروری ہوتا تو وہ افشاں کے ساتھ خود جاتی تھیں تاہم افشاں کا رابطہ سکندر کے ساتھ اب بھی قائم تھا۔ وہ اپنے ہمسایوں کے ایک سات سال کے لڑکے کے ذریعے سکندر کو خطوط بھجواتی رہتی تھی۔ ایک طرح سے اب سکندر سے اس کے رابطے کا واحد ذریعہ یہ لڑکا ہی تھا جو دونوں کے لیے پیغام رسانی کا کام بخوبی سرانجام دے رہا تھا، بدلے میں اسے سکندر سے کچھ پیسے مل جاتے۔ اس کا اصل نام تو کچھ اور تھا مگر افشاں اور سکندر پیار سے اسے چندو کہہ کر پکارتے تھے۔ چندو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کم عمر ہونے کے باوجود وہ خاصا ذہین تھا۔ اس نے افشاں اور سکندر کے باہمی تعلق کا راز کبھی کسی پر افشا... نہ کیا تھا۔

افشاں اپنی والدہ کا دوٹوک جواب سن کر سمجھ چکی تھی کہ اس سلسلے میں اس کی کسی صورت نہیں سنی جائے گی۔ اپنے والد سے تو بات کرنا ہی بیکار تھا۔ وہ تو شہباز کی عمر قید سے بھی ناخوش تھے۔ ان کی رائے میں اسے سزائے موت... دی جانی چاہیے تھی۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور اپنے گھر کے صحن میں آ گئی۔ اس نے اپنے ہمسایوں کے ساتھ موجود اپنے گھر کی مشترکہ دیوار کے پاس جا کر چندو کو آواز دی، وہ جانتی تھی کہ اگر وہ گھر پر موجود ہوا تو فوراً اس کے پاس آ جائے گا۔ اس کی والدہ بھی صحن میں ایک چارپائی پر بیٹھی پیاز کاٹ رہی تھیں۔ انہوں نے چندو کو بلانے پر افشاں سے کوئی تعرض نہ کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ افشاں نے بازار سے کچھ منگوانا ہوگا۔ چندو کا ان کے گھر آنا معمول کی بات تھی، بچہ ہونے کی وجہ سے اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ چندو آیا تو افشاں اسے لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس نے تیزی سے سکندر کے نام ایک خط تحریر کرنا شروع کر دیا۔

''سکندر! میرے والدین اس رشتے کو قائم رکھنے پر کسی صورت بھی راضی نہیں ہیں۔ میں نے اپنی پوری کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں۔ میرا رشتہ بھی کسی اور جگہ طے کیا جا رہا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں؟'' خط لکھ کر اس نے اسے چندو کی جیب میں ڈالا اور کہا کہ اسے فوراً سکندر تک پہنچا دے۔ ساتھ ہی اس نے اسے کچھ سامان لانے کے لیے پیسے بھی دیے تاکہ

واپسی پر اس کی والدہ کو شک نہ ہو۔ وہ آج کل اس پر بہت نظر رکھنے لگی تھیں۔ چندو خط لے کر چلا گیا۔ افشاں اس دوران کمرے میں ہی ٹہلتی رہی۔ سکندر ایک سرکاری محکمے میں ملازمت کرتا تھا مگر آج چونکہ چھٹی کا دن تھا، اس لیے افشاں کو یقین تھا کہ وہ گھر پر ہی ہوگا اور چندو اس تک خط پہنچا دے گا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد چندو کی واپسی ہوئی۔ افشاں کی والدہ نے جو صحن میں ہی بیٹھی ہوئی تھیں، ایک نظر اس کی جانب دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ میں کچھ گھریلو سامان دیکھ کر سر جھکا لیا۔

چندو نے افشاں کو سامان کے ساتھ ساتھ سکندر کا جوابی خط بھی دیا اور پھر مطمئن انداز میں واپسی کے لیے مڑ گیا کیونکہ اس کا کام پورا ہو چکا تھا اور اسے سکندر سے اپنا انعام بھی مل چکا تھا۔

افشاں نے خط پڑھنا شروع کر دیا۔

''افشاں! ان حالات میں ہمارے پاس صرف ایک ہی حل رہ گیا ہے کہ ہم کورٹ میرج کر لیں۔ وقتی طور پر شاید تمہیں میری تجویز عجیب ہونے کے ساتھ ساتھ بری بھی لگے مگر اگر تم ٹھنڈے دماغ سے غور کرو تو تمہیں احساس ہو جائے گا کہ ہمارے پاس یہی راستہ باقی بچا ہے۔ تمہارے والد اب اس رشتے پر کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ انہوں نے تو میرے والد اور اپنے بچپن کے دوست سے بھی قطع تعلق کر لیا ہے۔ وہ اس معاملے میں حق بجانب بھی ہیں، آخر ان کا جوان بیٹا قتل ہوا ہے مگر اس میں ہم دونوں کا کیا قصور ہے۔ ہم اس ناکردہ جرم کی سزا کیوں بھگتیں۔ میں کورٹ میرج کے بعد کچھ دنوں تک تمہیں کہیں اور رکھنے کا بندوبست کر لوں گا۔ تقریباً ایک ماہ بعد ہم واپس آ جائیں گے۔ میرے والدین تو پہلے سے ہی اس رشتے پر راضی ہیں۔ تمہارے والدین کے پاس بھی اس شادی کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہے گا۔ یقین کرو کچھ عرصے بعد سب کچھ معمول پر آ جائے گا۔ اگر تمہارا جواب ہاں میں ہو تو میں کورٹ میرج کے لیے ضروری انتظامات کر لوں۔ اپنے دفتر سے چھٹی بھی لینا پڑے گی۔ اچھی طرح غور کرنے کے بعد جواب دینا، میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا......

سکندر۔''

خط پڑھنے کے بعد افشاں کے چہرے پر کشمکش و پیچ کے تاثرات نمایاں ہو گئے۔ سکندر نے اس سے جواب مانگا تھا۔ وہ ایک مشرقی لڑکی تھی اور اس کے لیے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ آسان نہ تھا۔

☆☆☆

جینی کی جدید ماڈل کی کار جوزف کے گھر کے باہر رکی تو اس نے چونک کر دیکھا اور پھر گاڑی سے اترتی جینی کو دیکھ کر مطمئن ہو گیا۔

''تم کہاں غائب ہو گئے تھے؟ آج پورے چار دن بعد نظر آئے ہو۔ تمہارا موبائل بھی آف جا رہا تھا۔'' جینی اس کے پاس پہنچتے ہی غصیلے لہجے میں بولی۔

''میری نانی کا انتقال ہو گیا تھا، میں دوسرے شہر گیا ہوا تھا۔ ان کے انتقال کی خبر اس قدر اچانک ملی تھی کہ عجلت میں موبائل ساتھ لے جانا بھی بھول گیا۔'' جوزف نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

''اوہ ویری سیڈ!'' اس کی وضاحت سن کر جینی نے افسردگی سے کہا۔ اس کا غصہ بھی جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ''تمہاری نانی کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔''

''کوئی بات نہیں۔ بیمار ہونے کی وجہ سے وہ ویسے بھی قریب المرگ تھیں۔ تم اپنی سناؤ!'' جوزف نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''یہ دیکھو۔'' جینی نے اس کی طرف ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ کیا ہے؟'' جوزف نے کاغذ ہاتھ میں تھامتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''ڈیڈ نے مجھے اپنی جائداد سے بے دخل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اپنے ہی گھر میں مجھے اپنے وکیل کے ذریعے سے قانونی نوٹس بھجوایا ہے۔''

''مگر یہ تو تمہارے ساتھ زیادتی ہے۔ آخر تم ان کی اکلوتی اولاد ہو اور اس جائداد کی قانونی وارث بھی۔'' جوزف نے نوٹس دیکھتے ہوئے پریشان سے لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں فوراً عدالت سے رجوع کرنا چاہیے۔''

''مجھے کوئی پروا نہیں!'' جینی نے بے نیازی سے کہا۔ ''اور تم اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو، تمہیں شادی مجھ سے کرنی ہے یا میری دولت سے؟''

''میں پریشان تو نہیں ہوں ڈارلنگ!'' جوزف نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے بھلا تمہاری دولت سے کیا مطلب...... میرے کہنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تمہیں اتنی جلدی اپنے حق سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے اور پھر شادی کے بعد بھی تو ہمیں پیسوں کی ضرورت پڑے

گی۔ دولت زندگی کی بہت اہم حقیقت ہے۔''

''اتنے پیسے میرے اکاؤنٹ میں موجود ہیں کہ ہمیں ایک دو سال فکر کی کوئی ضرورت نہیں اور پھر یہ کار بھی میرے نام پر ہے۔'' جینی نے اپنی جدید ماڈل کی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہم اسے بھی فروخت کر سکتے ہیں۔ تم اس وقت مجھے صرف یہ بتاؤ کہ اگر میں تمہیں یہ کہوں کہ ہم آج ہی شادی کر رہے ہیں تو کیا تم تیار ہو؟ میں ڈیڈ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر وہ اپنی ضد پر قائم ہیں تو میں بھی انہی کی بیٹی ہوں۔ تو کیا خیال ہے، آج شام کو ہی چرچ چلیں؟ میں ساری قانونی کارروائی کا بھی بندوبست کرلوں گی۔''

''جلد بازی کبھی بھی اچھی ثابت نہیں ہوتی۔'' جوزف نے ناصحانہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ہمیں صبر اور تحمل سے کام لینا ہوگا۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ آج جب میں گھر واپس آیا تو میرے دروازے پر سب سے پہلے آنے والا شخص تمہارے والد کا چہیتا بھانجا اور تمہارا کزن گراہم تھا۔ اس نے مجھے تم سے شادی کرنے کی صورت میں سنگین نتائج کی دھمکیاں دی ہیں۔ گراہم کے متعلق مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، تم مجھ سے بہتر جانتی ہو۔ کوئی بھی قریبی چرچ اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ وہ وہاں دھاوا بول دے گا۔''

''تو ڈیڈ اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔ ویسے تو بڑے بااصول بنے پھرتے ہیں۔'' جینی کا لہجہ زہر خند ہوگیا۔ ''گراہم کو بھلا میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کی کیا ضرورت ہے۔ اس نے ڈیڈ کے ایما پر ہی تمہیں دھمکی دی ہے مگر نہ جانے کیوں ڈیڈ یہ بھول گئے ہیں کہ میری رگوں میں بھی انہی کا خون ہے۔ ہم کسی قریبی چرچ میں جانے کے بجائے کہیں دور جا کر شادی کرلیں گے بلکہ اس مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم کسی دوسرے شہر جا کر ایسا کریں۔ اس طرح ہم اس غنڈے گراہم سے بھی محفوظ رہیں گے۔ ایک دفعہ شادی ہوگئی تو پھر ڈیڈ اس رشتے کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ تم آج رات تیار رہنا، میں تمہیں لینے کے لیے آؤں گی اور پھر ہم اس شہر سے دور چلے جائیں گے۔ تو کیا تم تیار ہو؟''

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، میں تیار رہوں گا۔'' جوزف نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے جواب دیا تو جینی مسرت بھرے انداز میں اپنی کار کی طرف بڑھ گئی۔ جوزف پُرخیال نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ جس عیش بھری زندگی کے وہ خواب دیکھتا رہا ہے، وہ عنقریب پورا ہو جائے گا۔ وہ مسٹر جسٹن کی اپنی بیٹی سے محبت کے بارے میں لاعلم نہیں تھا۔ جانتا تھا کہ وہ زیادہ دیر تک اپنی بیٹی سے دور رہنا برداشت نہیں کرسکیں گے اور آخر کار جوزف کو اپنا داماد تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے اور اس کے بعد اسے بھی مسٹر جسٹن کے وسیع و عریض بنگلے میں ایک مستقل مندوب کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔ جینی کی دولت پر وہ ساری زندگی عیش کرسکتا تھا۔ آج رات اسے جینی کے ساتھ فرار ہونا تھا۔ اس لیے وہ گھر کے اندر داخل ہوگیا تاکہ کچھ ضروری سامان پیک کرسکے۔ اس نے جینی کے سامنے ہامی بھی اسی لیے بھری تھی کہ ایک دفعہ شادی ہو جاتی تو پھر مسٹر جسٹن اور گراہم دونوں کچھ نہیں کرسکتے تھے۔

مسٹر جسٹن کو جینی اور جوزف کے بھاگنے کی خبر اس وقت ملی جب وہ اس شہر سے باہر جا چکے تھے۔ اس علاقے کے بہتیرے افراد نے دونوں کو شہر سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

مسٹر جسٹن جانتے تھے کہ جینی نے ایسا کیوں کیا ہے۔ شاید وہ جوزف سے شادی کرنے والی تھی اور گراہم سے بچنے کے لیے انہوں نے یہ حکمت عملی اپنائی تھی۔

''تو آخر کار تم نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنا ہی دیا جینی!'' انہوں نے افسردگی سے سوچا۔ ''کاش تم جوزف کو پہچان سکتیں، اس نے تم سے شادی کا فیصلہ صرف دولت و جائداد کے لیے کیا ہے مگر تم اس کی محبت میں اندھی ہوگئی ہو اور ایسی حالت میں انسان میں یہ صلاحیت نہیں رہتی کہ وہ کسی کو پرکھ سکے۔''

وہ نڈھال ہو کر سامنے موجود کرسی پر براجمان ہوگئے۔ ان کی سگی اولاد نے انہیں ایسا زخم دیا تھا جسے کوئی مرہم نہیں بھر سکتا تھا۔

جینی، جوزف جیسے گھٹیا اور لالچی آدمی کے ساتھ فرار ہو چکی تھی۔ مسٹر جسٹن جانتے تھے کہ کل تک یہ خبر ان کے پورے خاندان میں پھیل جائے گی اور ذلت اور بدنامی الگ سے ہوگی۔ اگرچہ مغرب میں لڑکیوں کا گھر سے بھاگ جانا عام سی بات تھی مگر ان کے خاندان میں یہ بات اب بھی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ ان کے ہاں کچھ قدیم معاشرتی اقدار اور اصول رائج تھے جن پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا گیا تھا۔ جینی مسٹر جسٹن کے خاندان کی وہ پہلی لڑکی تھی جس نے ان اصولوں کو توڑا تھا۔ مسٹر جسٹن نے سر جھکا لیا اور ان کی

آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ ان کے دل میں ایک ہلکی سی آس تھی کہ شاید ان کی بیٹی باپ کی عزت کا خیال کرلے مگر امید ٹوٹتے ہی ان کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا تھا۔

☆☆☆

سکندر اس وقت اپنے محلے سے کچھ آگے افشاں کی آمد کا منتظر تھا۔ وہ اپنی ذاتی موٹر سائیکل پر سوار تھا جس پر اس کے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بیگ بھی موجود تھا۔ افشاں نے اس کے خط کے جواب میں ہاں کردی تھی۔ وہ اس کے ساتھ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے پر تیار تھی اور آج اسے اپنے گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اس طے شدہ جگہ پر آنا تھا۔ سکندر اس سلسلے میں تمام ضروری انتظامات پہلے ہی کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت افشاں کے والد اپنی دکان پر ہوتے ہیں جبکہ اس کی والدہ بھی دوپہر کے وقت سو جاتی ہیں، اس لیے افشاں بہ آسانی گھر سے نکل سکتی تھی۔ ویسے بھی اس نے برقع اوڑھ کر آنا تھا اس لیے فوری طور پر محلے میں بھی کسی کو پتا نہ چلتا۔ اسے اس بات کا بھی یقین تھا کہ ایک دفعہ یہ شادی ہوجاتی تو افشاں کے والدین بھی آخر کار اس رشتے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوجائیں گے، اس کے بعد وہ اپنے بھائی شہباز کے معاملے میں ان پر صلح کے لیے دباؤ بھی ڈال سکتا تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی پریشانی کے تاثرات بھی موجود تھے کیونکہ افشاں کے ساتھ اس کا دو بجے کا وقت طے ہوا تھا جبکہ اب تین بجنے والے تھے اور اس کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ موٹر سائیکل سے نیچے اتر کر بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید افشاں کو ابھی تک گھر سے نکلنے کا موقع نہیں مل سکا ہوگا۔ تاہم وہ پُرامید تھا کہ وہ ضرور آئے گی۔

مگر اسی لمحے اسے دور سے چندو آتا دکھائی دیا۔ اس کی غیر متوقع آمد پر وہ چونک پڑا۔ افشاں نے خود آنے کے بجائے چندو کو بھیجا تھا۔ ضرور کوئی بات ہوگئی ہے، اس نے سوچا۔

قریب آنے پر چندو نے اس کے ہاتھ میں ایک خط رکھا اور پھر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ آگے کردیا۔ سکندر سے انعام وصول کرتے ہی وہ تیزی سے واپس لوٹ گیا۔

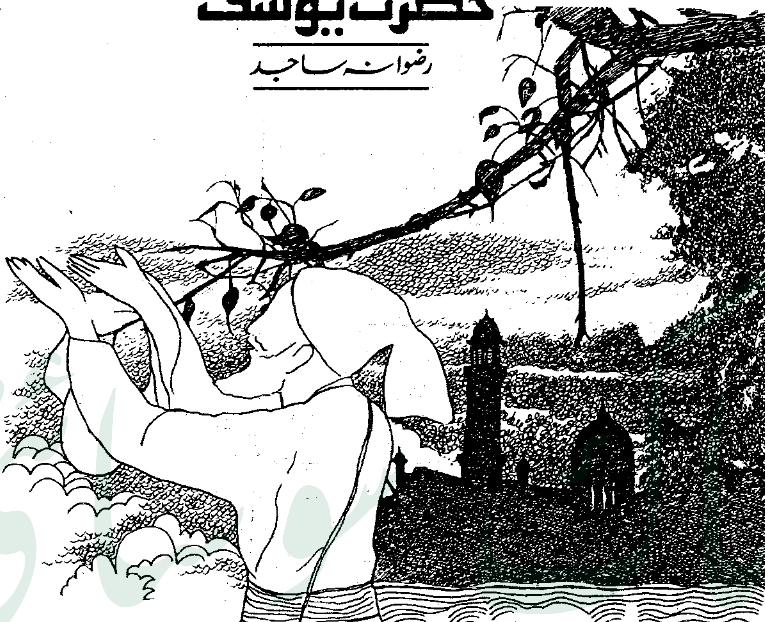
سکندر نے عجلت میں خط کھولا اور اسے پڑھنا شروع کردیا۔

”سکندر! میں نے تمہارے خط کے جواب میں کورٹ میرج پر ہاں کردی تھی کیونکہ میں تم سے واقعی میں شادی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے رات کو اپنا ضروری سامان بھی پیک کرلیا تھا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ میں ساری رات سکون کی نیند نہیں سوسکی۔ ذہن میں عجیب و غریب خیالات اور وسوسے آتے رہے۔ یہ میں کیا کرنے جارہی تھی...... کیا میرا فیصلہ درست تھا؟ کیا میرے والدین یہ صدمہ برداشت کرسکیں گے...... بدنامی کا داغ جب ایک دفعہ ماتھے پر لگ جائے تو پھر زندگی بھر ساتھ رہتا ہے مگر کیونکہ میں تمہارے ساتھ بھاگنے کا فیصلہ کرچکی تھی اس لیے میں نے جبراً ان تمام اندیشوں کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ صبح دکان پر جانے سے پہلے میرے والد نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا تو ان کی سفید ڈاڑھی اور جھریوں زدہ چہرے کو دیکھ کر مجھے گہری ندامت کا احساس ہوا۔ شاید اس لیے کہ میں اس باپ کے بھروسے اور اعتبار کو چکنا چور کرنے جارہی تھی جس نے غریب ہونے کے باوجود اپنی بساط کے مطابق میری ہر خواہش پوری کی تھی۔

”دوپہر کے وقت جب امی سوگئیں تو میں نے تمہارے پاس آنے کے لیے اپنا برقع اوڑھا اور صحن میں آگئی۔ میں نے دروازہ تو کھول لیا مگر اپنے گھر کی دہلیز پار کرنے کی ہمت نہ کرسکی۔ اس وقت میرے احساسات بہت عجیب سے تھے۔ مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس دہلیز کے پار ذلت اور رسوائی منہ کھولے میری منتظر ہے۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ گھر سے بھاگ کر شادی کرنے والی بہت سی لڑکیاں خوشحال زندگی بسر کررہی ہیں مگر اپنے والدین کی عزت پر کیچڑ اچھال کر خوشیاں تلاش کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ انسان کی زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب اس کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے، میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور میں نے ان چند لمحوں میں یہ فیصلہ کرلیا کہ میں اپنے گھر کی دہلیز پار نہیں کروں گی اور جہاں میرے والدین میرا رشتہ طے کررہے ہیں، وہیں شادی بھی کروں گی۔ اسے کسی جذباتی لڑکی کا خط نہ سمجھنا، یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آئندہ مجھ سے رابطے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ کوئی اچھی لڑکی دیکھ کر اپنا گھر بسا لو۔ مجھے اپنے والدین کی عزت و ناموس اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ میں ایک مشرقی لڑکی ہوں اور مشرقی لڑکیاں اپنے خاندان کی عزت قدموں تلے روند کر گھروں سے بھاگا نہیں کرتیں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ ساجد



اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر واستقامت کی اعلیٰ مثال بن کر بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جھانسے سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قیدو بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

حضرت یعقوب علیہ السلام خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔ آپ کے بارہ بیٹوں میں سے ایک حضرت یوسف علیہ السلام بھی تھے۔ یہ بھی اپنے والد، دادا، پردادا کی طرح سنِ رشد کو پہنچ کر خدائے برتر کے جلیل القدر پیغمبر بنے اور ملتِ ابراہیمی کی دعوت وتبلیغ کی خدمت سرانجام دی۔

آپ کا نسب نامہ یوں بیان کیا جاتا ہے۔

یوسف بن یعقوب بن اسحٰق بن ابراہیم علیہ السلام۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا نام مبارک قرآنِ عزیز نے چھبیس مرتبہ ذکر کیا ہے جن میں سے چوبیس جگہ صرف سورۃ یوسف میں اور ایک جگہ سورۃ انعام میں ایک جگہ سورۃ غافر میں آیا ہے۔ ان کو یہ فخر بھی حاصل ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرح ان کے نام کی بھی ایک سورۃ (سورۃ یوسف) نازل ہوئی جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات بیان ہوئے ہیں۔
قرآن عزیز نے حضرت یوسفؑ کے واقعے کو ''احسن قصص'' کہا ہے یعنی قصوں میں سے بہتر قصہ۔
''ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہتر قصوں میں سے ایک قصہ بیان کرتے ہیں۔ اس واسطے کہ ہم نے تیری طرف قرآن بھیجا۔
اس قصے کو احسن قصص اس لیے کہا گیا کہ اس ایک واقعے میں جس قدر عبرتیں، حکمتیں اور مواعظ ودیعت ہیں دوسرے کسی واقعے میں یکجا نہیں ہوئیں۔ یہ بدوی خانہ بدوش قبیلے کے ایک ایسے فرد یگانہ اور انمول موتی کی تاریخ ہے جس کو خدائے تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے اعجاز نے اس زمانے کی بڑی متمدن قوم کی راہنمائی اور ان پر حاکمانہ اقتدار کے لیے چن لیا تھا اور شرف نبوت سے نوازا تھا۔
سورۃ یوسف کے شان نزول کے بارے میں حدیثی روایات اور مفسرین کے اقوال کا حاصل یہ ہے کہ کفار مکہ نے ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق ''یہود'' سے گفتگو کی اور یہ کہا کہ وہ خود کو نبی کہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری سرداری خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اس پر یہود نے کہا کہ اس مدعی نبوت کو زچ کرنے اور جھوٹا بنانے کے لیے تم ان سے یہ سوال کرو کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد شام سے مصر کیوں منتقل ہوئی اور یوسفؑ سے متعلق جو واقعات ہیں ان کی تفصیل کیا ہے۔ اگر وہ نبی نہیں تو ہرگز نہ بتا سکیں گے۔
کفار مکہ نے یہود کی ہدایت کے مطابق ذات اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ دونوں سوال کیے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کے ذریعے وہ سب کچھ ان کو سنا دیا جو سورۃ یوسف میں موجود ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سورۃ یوسف نازل ہوئی۔
تفسیر ابن جریر میں نقل ہے کہ حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ ایک یہودی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جس کو ستانت الیہودی کہا جاتا تھا۔ اس نے عرض کیا، اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے ان ستاروں کے نام بتائیے جنہوں نے حضرت یوسفؑ کو سجدہ کیا تھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ اور پھر حضرت جبرائیل نازل ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نام بتلا دیے پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس یہودی کے پیچھے ایک آدمی بھیجا اور استفسار فرمایا کہ اگر میں نام بتلا دوں تو کیا وہ ایمان لے آئے گا۔ وہ یہودی آیا اور ایمان لانے کا وعدہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ یہ ہیں۔
''جریان، طارق، ذیال، ذوالکتفاتن، قابس، وثاب، عمودان، فیلق، مصبح، ضروح، ضیا۔''
یہودی پکار اٹھا۔ ''ہاں، اللہ کی قسم! یہی ہیں۔''

☆☆☆

حضرت یعقوب علیہ السلام کے نکاح میں ان کے ماموں کی دو بیٹیاں آئی تھیں (اس زمانے میں دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع ہونا شرعاً ممنوع نہ تھا) ان دونوں کے علاوہ لئیہ کی خانہ زاد زلفہ اور راحیل کی خانہ زاد بلہا بھی ان کی زوجیت کے رشتے میں منسلک ہو گئیں اور ان سب سے بھی اولاد ہوئی۔
توریت کے باب پیدائش میں حضرت یعقوبؑ کے بیٹوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔
''اور جب خداوند نے دیکھ لیا کہ لئیہ (لیاہ) سے نفرت کی گئی تو اس نے اس کا رحم کھولا مگر راحیل بانجھ رہی۔ لئیہ (لیاہ) حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا اور اس نے اس کا نام روبن رکھا کیونکہ اس نے کہا کہ خداوند نے میرا دکھ دیکھ لیا سو میرا شوہر مجھے پیار کرے گا۔''
اس کے بعد اس کے مزید تین بیٹے شمعون، لاوی اور یہوداہ ہوئے پھر اس کے اولاد ہونے میں توقف ہوا۔
اور جب راحیل نے دیکھا کہ یعقوب سے اس کے اولاد نہیں ہوتی تو راحیل کو اپنی بہن پر رشک آیا سو وہ یعقوبؑ سے کہنے لگی کہ مجھے بھی اولاد دے، نہیں تو میں مر جاؤں گی۔

اس نے کہا دیکھ میری لونڈی بلہا حاضر ہے۔ اس کے پاس جا تا کہ میرے لیے اس سے اولاد ہو اور وہ اولاد میری ٹھہرے اور اس نے اپنی لونڈی بلہا کو اسے دیا کہ اس کی بیوی بنے۔ بلہا حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا تب راحیل نے کہا کہ خدا نے میرا انصاف کیا اور میری فریاد بھی سنی اور مجھ کو بیٹا بخشا اس لیے اس کا نام ''دان'' رکھا اور راحیل کی لونڈی بلہا پھر حاملہ ہوئی اور اس کے دوسرا بیٹا ہوا۔ تب راحیل نے کہا میں نے اپنی بہن پر فتح پائی۔ سو اس کا نام نفتالی رکھا۔

جب لئیہ نے دیکھا کہ وہ جننے سے رہ گئی (پیدائش میں وقفہ آ گیا تھا) تو اس نے اپنی لونڈی زلفہ کو لے کر یعقوبؑ کو دیا کہ اس کی بیوی بنے اور لئیہ کی لونڈی زلفہ کے بھی ایک بیٹا ہوا۔ تب لئیہ نے کہا زہے قسمت! سو اس کا نام ''جاد'' رکھا۔ زلفہ سے پھر ایک بیٹا ہوا۔ تب لئیہ نے کہا میں خوش قسمت ہوں۔ عورتیں مجھے خوش قسمت کہیں گی اور اس کا نام ''آشیر'' رکھا۔

خدا نے لئیہ کی سنی اور وہ حاملہ ہوئی۔ اس کے پانچواں بیٹا پیدا ہوا۔ تب لئیہ نے کہا خدا نے میری اجرت مجھے دی اور اس کا نام اشکار رکھا۔ لئیہ پھر حاملہ ہوئی اور اس کے چھٹا بیٹا ہوا۔ تب اس نے کہا کہ خدا نے مجھے اچھا مہر بخشا۔ اب میرا شوہر میرے ساتھ رہے گا کیونکہ اس سے میرے چھ بیٹے ہو چکے ہیں۔ سو اس کا نام زبولون رکھا۔

اور خدا نے راحیل کو یاد کیا اور خدا نے اس کی سن کر اس کے رحم کو کھولا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے بیٹا ہوا۔ تب اس نے کہا کہ خدا نے مجھ سے رسوائی (بانجھ ہونے کی رسوائی) کو دور کیا اور اس نے اس کا نام ''یوسف'' یہ کہہ کر رکھا کہ خداوند مجھ کو ایک اور بیٹا بخشے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر بہ مشکل پانچ سال کی ہوئی تھی کہ ان کی والدہ حضرت راحیل ایک اور بیٹے کی ولادت کے بعد انتقال کر گئیں۔ حضرت راحیل نے اس کا نام ''نبونی'' رکھا تھا لیکن حضرت یعقوبؑ نے اس کا نام بن یامین رکھا۔

ان تمام اولادوں کی تفصیل اس طرح ہے۔

لئیہ بنت لایان سے راؤبین، شمعون، لاوی، یہوداہ، اشکار، زبولون۔

راحیل بنت لایان سے حضرت یوسف علیہ السلام، بن یامین۔

بلہا (لونڈی) سے دان اور نفتالی۔

زلفہ (لونڈی) سے جد اور آشر پیدا ہوئے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کم سن تھے اور بن یامین ابھی شیر خوار۔ باقی سب بھائی بڑے اور ہوشیار تھے۔ ان سب بھائیوں نے رشک و حسد کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ حضرت یعقوبؑ کی دونوں بیویوں کے درمیان اولاد کے معاملے میں رقابت رہتی تھی۔ ان بچوں کی پرورش اسی ماحول میں ہوئی تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو تو اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے چن لیا تھا اس لیے یہ جذبات ان کے دل میں پیدا ہی نہیں ہو سکتے تھے لیکن ان کے بڑے بھائی ان کی طرف سے مخالفانہ جذبات رکھتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی دیکھ رہے تھے کہ حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں لہٰذا ان کی مخالفت بڑھتی چلی گئی۔

حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسف علیہ السلام سے محبت دو وجوہات کی بنا پر تھی۔ ایک تو اس لیے کہ وہ بن ماں کے بچے تھے، دوسرے اس لیے کہ نورِ نبوت ان کی پیشانی سے ظاہر تھا اور وحی الٰہی کے ذریعے حضرت یعقوبؑ اس کی اطلاع پا چکے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی حضرت یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین تھے۔

بن یامین تو خیر ابھی سمجھ بوجھ کی منزل پر نہیں پہنچے تھے لیکن باقی بھائی بڑے تھے۔ سوتیلے ہونے کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام سے انہیں کوئی خاص محبت بھی نہیں تھی۔ وہ ان کی نظروں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے رہتے تھے۔ یہ بھائی جب بھی آپس میں مل کر بیٹھتے تو اپنی حق تلفی کا بناوٹی ذکر کرنے لگتے۔ ان کی زبان پر یہ شکایت آ جاتی کہ ان کا باپ ان سے وہ محبت نہیں کرتا جو یوسفؑ کے حصے میں آئی ہے۔ حسد کے یہ جذبات اس طرح ظاہر ہوئے کہ بڑے بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام سے قطع تعلق کر لیا۔ جب کھیلتے تو ایک ساتھ کھیلتے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو قریب بھی نہ آنے دیتے۔ انہیں بھی کھیل کود سے کچھ ایسی رغبت نہیں تھی اس لیے انہوں نے اس رویّے کی پروا بھی نہیں کی بلکہ بڑے بھائیوں سے ادب کے ساتھ پیش آتے رہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس رویّے پر خوش ہونے کے بجائے بھائیوں کی ضد اور بڑھ گئی۔ گیارہ بھائیوں کے ہوتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام اکیلے رہ گئے۔ حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو حضرت یوسف علیہ السلام کا اور بھی زیادہ خیال رکھنے لگے۔ حضرت یوسف علیہ السلام بھی بھائیوں کی طرف سے مایوس ہو کر باپ کے ساتھ عبادت میں مشغول رہنے لگے۔

وہ بھائیوں کی طرف سے غافل ہو گئے تھے لیکن یہ خیال کبھی کبھی ستاتا ضرور تھا کہ بھائی ان کے ساتھ بدسلوکی کررہے ہیں۔ یہی خیال ایک روز ان کے سامنے خواب بن کر آ گیا۔

توریت کے مطابق حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا۔ انہوں نے یہ خواب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کو سنایا۔

''میں اور میرے بھائی کھیت میں پولے باندھتے تھے اور کیا دیکھتا ہوں کہ میرا پولا اٹھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا اور بھائیوں کے پولوں نے میرے پولوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور اسے سجدہ کیا۔''

''تم نے یہ خواب اپنے بھائیوں کو تو نہیں بتایا؟''

''وہ تو مجھ سے بات ہی نہیں کرتے۔ انہیں کیا بتاتا۔''

''اگر وہ بات کریں بھی تو یہ خواب انہیں مت سنانا۔''

''آپ کی نصیحت یاد رکھوں گا لیکن اس کی تعبیر تو مجھے بتائیے۔''

''خدا تجھے ان پر تسلط دے گا۔ خدا بہت مہربان اور دیکھنے والا ہے۔''

(یہ خواب قرآن میں بیان نہیں ہوا ہے)

جس جس طرح عمریں بڑھتی گئیں، بھائیوں کے دلوں میں حسد کے جذبات بھی بڑھتے گئے۔ عمروں کے ساتھ یہ جذبات کوئی اور ہی رخ اختیار کر گئے۔ رقابت نے مجرمانہ ذہنیت اختیار کر لی۔ اب وہ باہم یہ مشورے کرنے لگے کہ کسی دن موقع پا کر یوسف (علیہ السلام) کو قتل کر دیا جائے۔ جب وہ نہیں رہیں گے تو باپ کی ساری توجہ ہمیں ملے گی ورنہ ہمیں یہ قدرت تو ہے نہیں کہ باپ کے قلب سے یوسفؑ کی محبت نکال دیں۔

وہ یہ منصوبے روز ہی بناتے تھے لیکن اس پر عمل کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

ایک رات ایسا ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام والد کے ساتھ عبادت کے لیے کھڑے ہوئے تھے کہ اچانک نیند کا غلبہ ہوا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ عبادت کے دوران نیند کا ایسا غلبہ ہوا ہو۔ شفقتِ پدری کو بھی احساس ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نیند کا غلبہ ہوا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا۔ ''نیند تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ پہلے اس کو دفع کر لو۔ کچھ دیر کے لیے آرام کرو۔''

''ابا جان! یہ تو شیطان ہے جو مجھ پر نیند غالب کر رہا ہے۔''

''ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو ورنہ ہم دونوں کی موجودگی میں شیطان کہاں آ سکتا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے باپ کے حکم کی تعمیل کی اور سونے کے لیے بستر پر چلے گئے۔ منشائے خداوندی تھی کہ انہیں ایک بابرکت خواب سے سرفراز کیا جائے۔ اسی لیے انہیں نیند نے گھیر لیا۔ نیند گہری ہوتے ہی انہوں نے دیکھا کہ گیارہ ستارے ان کے پاس آئے ہیں اور پھر سورج اور چاند بھی آئے ہیں۔ پھر سب مل کر تعظیم کے لیے ان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔

جب صبح ہوئی تو وہ باپ کی خدمت میں پہنچے اور یہ خواب انہیں سنایا۔ انہوں نے خواب سن کر پھر وہی کہا جو اس سے پہلے کہہ چکے تھے۔

''یہ خواب تم نے اپنے بھائیوں کو تو نہیں سنایا۔''

''مجھے آپ کی نصیحت یاد ہے۔''

''انہیں ہرگز نہ سنانا۔ کہیں وہ تیرے دشمن ہی نہ ہو جائیں۔''

''اس خواب میں آخر کیا بات ہے کہ وہ میرے دشمن ہو جائیں گے؟''

''یہ خواب تمہاری بزرگی اور سربلندی پر دلالت کرتا ہے۔ گیارہ ستارے تمہارے گیارہ بھائی ہیں جو تمہاری تعظیم پر مجبور ہوں گے۔''

قرآن اس کی گواہی اس طرح دیتا ہے۔

''جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا، اے باپ! میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا، اے میرے بیٹے! تو اپنے اس خواب کو اپنے بھائیوں کو نہ سنانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تیرے ساتھ کوئی چال چل جائیں۔ بلاشبہ شیطان انسان کے لیے کھلا دشمن ہے اور اس طرح تیرا پروردگار تجھ کو برگزیدہ کرے گا اور سکھائے گا تاویلِ احادیث اور اپنی نعمت کو تجھ پر اور اولادِ یعقوب پر تمام کرے گا جس طرح کہ اس نعمت

(نبوت) کو پورا کیا تیرے اجداد پر پہلے سے (یعنی) ابراہیم و اسحٰق پر۔ بے شک تیرا پروردگار جاننے والا حکمت والا ہے۔''

اس مقام پر توریت اور قرآن میں اختلاف ہے۔

توریت کے مطابق جب حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ خواب سنایا تو ان کے بھائی موجود تھے۔

''اور اس (حضرت یوسف علیہ السلام) نے اس خواب کو اپنے باپ اور بھائیوں کو بتایا۔''

قرآن عزیز سناتا ہے کہ حضرت یعقوبؑ اس خواب سے بہت مسرور ہوئے اور ان کو نبوت کی بشارت سنائی مگر توریت کے مطابق وہ خفا ہوئے۔

''تب اس کے باپ نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ یہ خواب کیا ہے جو تو نے دیکھا ہے۔ کیا میں اور تیری ماں اور تیرے بھائی سچ مچ تیرے آگے زمین پر جھک کر تجھے سجدہ کریں گے۔''

تحریف شدہ توریت کا یہ بیان صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ تقاضائے فطرت اسی کا داعی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے اس خواب کو بھائیوں سے الگ ہو کر بیان کریں اور حضرت یعقوبؑ بیٹے کے اس خواب کو سن کر مسرور ہوں کیونکہ یعقوبؑ نبی ہونے کی وجہ سے خواب کی تعبیر میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے جو بلندی دیکھ رہے تھے، وہ باعث مسرت تھی نہ کہ باعثِ الم۔

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام اور حضرت یعقوبؑ کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام اپنا خواب بیان فرما رہے تھے تو حضرت لیئہ کسی کام سے اس طرف آئیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سن لیا۔ غالباً وہ یہ نہیں سن سکی تھیں کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب سنانے سے روک دیا ہے ورنہ شاید وہ شوہر کی حکم عدولی نہ کرتیں۔ انہوں نے تو صرف یہ سنا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب دیکھا ہے اور وہ خواب بھی سن لیا۔

جب ان کا بڑا بیٹا رادبین گھر میں داخل ہوا اور ماں کے پاس آ کر بیٹھا تو ماں نے اسے اس خواب سے آگاہ کر دیا۔

''یوسف کو اب عجیب عجیب خواب آنے لگے ہیں۔ اب اس نے یہ خواب دیکھا ہے کہ چاند اور سورج اسے سجدہ کر رہے ہیں۔''

(یہ خیال مولوی محمد اسحٰق کا ہے جو انہوں نے داستان یوسفؑ میں لکھا ہے)

اس نے ماں کی زبانی یہ خواب سن لیا لیکن اسے بظاہر کوئی تعجب نہیں ہوا لیکن یہ ضرور سوچنے لگا کہ اس خواب کے بارے میں دوسرے بھائیوں کو بھی بتایا جائے، دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔

جب تمام بھائی ایک جگہ جمع ہوئے رادبین نے (ان کا نام روبن اور روئیل بھی لکھا گیا ہے) انہیں اس خواب سے آگاہ کیا۔ بھائیوں کے دل حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف سے پہلے ہی پھرے ہوئے تھے، اس خواب کو سن کر وہ بھڑک گئے۔

''یوسف اپنے من گھڑت خوابوں سے ہمیں نیچا دکھانا چاہتا ہے۔''

''مصیبت یہ بھی ہے کہ والد بزرگوار اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ اس کے خواب کو سچ سمجھ کر اس کی طرف مزید راغب ہو جائیں گے۔'' دوسرے بھائی نے کہا۔

''پھر ہماری حیثیت کیا رہ جائے گی۔'' ایک بھائی نے کہا۔

''ہمارے گلے میں تو غلامی کا طوق پڑ جائے گا۔ ہم کیا سچ مچ اسے سجدہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''

''بڑے تو ہم ہیں۔ اگر یہ خواب آتا تو ہم میں سے کسی کو آتا۔ وہ تو سب سے چھوٹا ہے۔ اسے یہ بزرگی کیوں ملے۔ کیوں رادبین تمہارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے تو اس معاملے میں تم سے اختلاف ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا خواب سچا ہو۔ یہ کیوں کہتے ہو کہ یوسف نے من گھڑت قصہ بیان کر دیا ہے۔''

''دیکھ لو اس خواب کے آثار ابھی سے ظاہر ہونے لگے ہیں۔ ہم میں کبھی کسی بات پر اختلاف نہیں ہوا تھا۔ اب تم اختلاف کر رہے ہو جیسے ہم سب جھوٹے، یوسف سچا ہے۔''

''میں اختلاف نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں کیوں پڑتے ہو۔ اگر یوسف کا خواب سچا بھی ہے تو بھی وہ زبردستی ہمیں مطیع نہیں بنا سکتا۔ ہم مضبوط جسموں کے مالک ہیں اور وہ کمزور۔''

''ہمیں یوسف سے غرض نہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ یہ خواب سننے کے بعد ہمارے والد اسے ہم سے بہتر اور برتر

سمجھنے لگیں گے اور ہمیں یہ منظور نہیں۔''

ایک بھائی نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔

''کیوں آپس میں لڑتے ہو۔ ہمیں تو اس وقت یہ سوچنا چاہیے کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ وہ کیا ترکیب کی جائے کہ اس خواب کا اثر زائل ہو جائے۔ گھر میں ہماری اہمیت ہو یوسف کی نہیں۔''

''اس کا تو ایک ہی حل ہے۔'' ایک بھائی نے تجویز دی۔ ''یوسف کو قتل کر کے کسی جگہ پھینک دو۔''

''کیوں اس کے قتل کا گناہ اپنے سر لیتے ہو۔ اسے قتل کرنے کے بجائے کسی گہرے گڑھے میں پھینک دو جہاں سے وہ نکل نہیں سکے گا۔ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ ہم اس کے خون سے ہاتھ کیوں رنگیں۔'' ان میں سے کسی بھائی نے کہا۔

یہ تجویز دینے والے بھائی کا نام کیا تھا، اس میں مفسرین میں اختلاف ہے۔ کسی نے شمعون لکھا ہے، کسی نے یہودا اور کسی نے راد بین۔

بہر حال کوئی بھی بھائی تھا، اس نے یہ تجویز دی۔ اس تجویز کو سن کر تمام بھائی کچھ دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ پھر ان میں سے ایک نے عقل مندی دکھائی۔

''ایسا گڑھا تم لاؤ گے کہاں سے جہاں یوسف پڑا رہے اور نکل نہ سکے اور کوئی اس کی چیخوں کو بھی نہ سن سکے۔''

''میں نے دور جنگل میں ''دوتین'' کے مقام پر ایک گہرا کنواں دیکھا ہے۔ یہ کنواں خشک ہو چکا ہے۔ اگر ہو گا تو تھوڑا پانی ہو گا۔ یوسف کو وہاں پھینک کر مطمئن ہو سکتے ہیں۔ اگر اسے کسی نے نکال بھی لیا تو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

ایک اور بھائی نے مزید عقل مندی کا مظاہرہ کیا۔

''یہ بھی ابھی سے طے کر لو کہ واپس آ کر والد سے کیا کہو گے۔ وہ یوسف کے بارے میں پوچھیں گے نہیں؟''

یہ ایسا مشکل مرحلہ تھا کہ سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ مختلف باتیں سامنے آتی رہیں، رد ہوتی رہیں پھر ایک بھائی کی رائے پر سب متفق ہو گئے۔

''ہم گھر آ کر کہہ دیں گے کہ یوسف کو بھیڑیا اٹھا کر لے گیا۔''

''کیا ابا جان اس بہانے کو مان لیں گے؟''

''ہم تو یہ بہانہ کر دیں گے۔ اگر وہ نہ مانے تو بھی یوسف تو واپس نہیں آ جائے گا۔''

''یوسف کو اپنے ساتھ لے جانے کی ترکیب کیا کی جائے گی۔ کیا والد صاحب اسے ہمارے ساتھ جانے دیں گے؟''

''انہیں کیوں اعتراض ہو گا۔ وہ ہماری نیتوں کا حال کیا جانیں۔''

غرض کئی گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد سب اس پر متفق ہو گئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں (چاہ کنعاں) میں پھینک دیا جائے۔

قرآن نے یہاں تک کے واقعات کا خلاصہ یوں بیان کیا ہے۔

''اس کے بھائیوں نے آپس میں کہا، یہ یوسف اور اس کا بھائی (بن یمین یا بن یامین) دونوں ہمارے والد کو ہم سب سے زیادہ محبوب ہیں حالانکہ ہم پورا جتھا ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمارے ابا جان بالکل ہی بہک گئے ہیں (غلطی پر ہیں) چلو یوسف کو قتل کر دو یا اسے کہیں پھینک دو تا کہ والد کی توجہ صرف ہماری طرف ہو جائے۔ یہ کام لینے کے بعد پھر نیک بن رہنا۔'' اس پر ان میں سے ایک بولا۔ ''یوسف کو قتل نہ کرو۔ اگر کچھ کرنا ہی ہے تو اسے کسی اندھے کنویں میں ڈال دو۔ کوئی آتا جاتا قافلہ اسے نکال لے جائے گا۔''

منصوبہ طے ہوتے ہی ان بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہلانے پھسلانے اور اپنی دوستی کا یقین دلانے کے لیے لگاوٹ کی باتیں شروع کر دیں۔

''تم اب بڑے ہو گئے ہو۔ ہمارے ساتھ باہر کیوں نہیں جاتے۔ ہم کھیتی باڑی کے لیے جانور چرانے کے لیے باہر جاتے ہیں۔ ہمارے ساتھ تم بھی چلا کرو۔ کھلی آب و ہوا لگے گی تو تم بھی ہماری طرح مضبوط ہو جاؤ گے۔''

''تم لوگ تو مجھے اپنے قریب تک نہیں آنے دیتے پھر میں تمہارے ساتھ باہر جا کر کیا کروں گا۔''

''ہم نے کہا نا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ ہمارے ساتھ جا سکتے ہو۔ تم ہمارے بھائی ہو اور سب سے نیک بھائی ہو۔ تمہاری صحبت میں رہ کر ہم اچھی اچھی باتیں سیکھ سکیں گے۔''

''یہ باتیں تم لوگ مجھے بہلانے کے لیے تو نہیں کہہ رہے ہو؟''

''ارے نہیں بلکہ ہمیں تو اب یہ احساس ہو رہا ہے کہ ہم نے تمہارا ساتھ کیوں چھوڑا۔ ہمیں اپنی اصلاح کا موقع تو دو۔''

ان کے بھائیوں نے اپنی لچھے دار باتوں سے انہیں یہ یقین دلا دیا کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور اب وہ پچھتا رہے ہیں۔ آخر بھائی تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان پر یقین آ گیا۔

''میں تو تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں لیکن شاید ابا جان مجھے تمہارے ساتھ نہ جانے دیں۔ پہلے ان سے بات کر لو۔''

''کب تک ابا جان سے لگے بیٹھے رہو گے۔ اب بڑے ہو گئے ہو۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے چلو، انہیں خبر بھی نہ ہو گی۔''

''وہ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی جدائی گوارا نہیں کرتے۔ مجھے تمہارے ساتھ کیسے جانے دیں گے۔''

''تم اپنی کہو۔ اگر وہ اجازت دے دیں تو تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا؟''

''مجھے تو خوشی ہو گی کہ تم نے مجھے اپنا بھائی سمجھا۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کو مطمئن کرنے کے بعد یہ بھائی حضرت یعقوبؑ کے پاس گئے اور ان پر اپنا مقصد ظاہر کیا اور اس سے پہلے کچھ لگاؤ کی باتیں کرنے لگے۔

''ابا جان! ہم اس وقت آپ کے پاس نہایت ضروری کام سے آئے ہیں۔''

''کیا بات ہے میرے بچو۔ تم لوگ کچھ گھبرائے ہوئے لگ رہے ہو۔ بات کیا ہے؟''

''ہم آپ سے یوسف کے متعلق بات کرنے آئے ہیں۔''

''خیر تو ہے۔ کیا شکایت ہے تمہیں اس سے؟''

''شکایت تو نہیں۔ بس یہ کہنے آئے تھے کہ وہ ہمارا بھائی ہے۔''

''یہ تم مجھے بتا رہے ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے۔ اس کی ماں الگ تھی لیکن باپ تو ایک ہے۔''

''ابا جان! ہم اپنے رویے پر شرمندہ ہیں۔''

''شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔''

''اور اب ہم اس کا ازالہ چاہتے ہیں۔''

''ازالہ کیسا۔ میں نے تمہیں معاف کیا۔''

''ایسے نہیں ابا جان۔ آپ نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔ ہم اس وقت سمجھیں گے جب آپ اسے ہمارے ساتھ جانے دیں گے۔''

''تم اسے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''ہم اکثر و بیشتر جنگل میں شکار کے لیے جاتے ہیں۔ اگر یوسف بھی ہمارے ساتھ ہو تو اسے بھی شکار سے رغبت ہو گی اور اسے شکار کرنا آ جائے گا۔ آئندہ زندگی میں یہ اس کے بہت کام آئے گا اور کچھ نہیں تو اس کی تفریح ہی ہو جائے گی۔''

''مجھے تمہاری طرف سے ڈر ہے۔''

''کیسا ڈر۔ کیا آپ کو ہم پر بھروسا نہیں؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں تو اس لیے ڈرتا ہوں کہ تم تو جنگل میں سیر و شکار میں لگ جاؤ گے اور یوسف کی طرف سے غافل ہو جاؤ گے۔ جنگل میں ہزار خطرے ہوتے ہیں۔ اسے نہ ہی لے جاؤ تو اچھا ہے۔''

''آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم سب طاقتور بھی ہیں اور بہادر بھی اور تعداد میں دس۔ کیا ہم اپنے بھائی کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔''

''پھر بھی مجھے ڈر تو لگا ہی رہے گا۔''

''آپ اس سے بہت زیادہ محبت کرتے ہیں۔ اسی لیے آپ کا دل نہیں کر رہا ہے کہ وہ آپ سے تھوڑی دیر کے لیے بھی دور رہے۔ یوسف بھی یہی کہہ رہا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟''

''یہی کہ آپ اسے ہمارے ساتھ نہیں جانے دیں گے۔''

''تم اس سے مل کر آ رہے ہو؟''

''ہاں بلکہ اس نے ہی ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ ہم آپ سے اس کے لیے اجازت لیں۔ وہ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے لیکن آپ سے ڈرتا ہے۔''

''وہ جانا چاہتا ہے تو میں اس کا دل رکھنے کے لیے اجازت دیے دیتا ہوں لیکن تم سے پھر کہتا ہوں کہ اس کا خیال رکھنا۔''

''ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ یوسف کی حفاظت کریں گے۔''

تمام بھائی ایک مرتبہ پھر حضرت یوسفؑ کے پاس آئے اور انہیں اپنی کامیابی کا مژدہ سنایا۔ ساتھ ہی یہ اصرار بھی کیا کہ وہ خود بھی حضرت یعقوبؑ کے پاس جائیں اور ہمارے ساتھ جانے پر اپنی رضامندی ظاہر کریں۔

بھائیوں کا اس سے مقصد یہ تھا کہ اگر حضرت یعقوبؑ نے اپنا ارادہ بدل بھی دیا ہو تو حضرت یوسفؑ کی ضد سے مجبور ہو جائیں۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کی خوشی بھی اسی میں تھی تو یعقوب علیہ السلام نے اجازت دے دی لیکن انہیں اندیشہ ضرور تھا۔ صاف لفظوں میں ظاہر نہیں فرما رہے تھے کہ کہیں وہ بگڑ کر اعلانیہ دشمنی پر آمادہ نہ ہو جائیں۔

''مجھے اس سے رنج اور دکھ پہنچتا ہے کہ تم اس کو لے جاؤ اور مجھے یہ خوف ہے کہ اس کو بھیڑیا کھا جائے اور تم غافل رہو۔''

برادرانِ یوسف نے یہ سن کر یک زبان کہا۔

''اگر کھا گیا اس کو بھیڑیا جبکہ ہم سب طاقتور ہیں تو بلاشبہ ایسی صورت میں ہم نے سب کچھ گنوا دیا۔''

''ہم اس کے خیر خواہ ہیں۔ کل اس کو ہمارے ساتھ بھیج کہ وہ کھائے پیے اور کھیلے کودے اور بلاشبہ ہم اس کے نگہبان ہیں۔'' (سورۂ یوسف)

اس جگہ توریت کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خود اپنے حکم سے حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں کے پاس جنگل میں بھیجا تھا۔

''تیرے بھائی سکم میں بھیڑ بکریوں کو چرا رہے ہوں گے۔ سو آ کہ میں تجھے ان کے پاس بھیجوں۔ اس نے اسے کہا میں تیار ہوں۔ تب اس نے کہا تو جا کر دیکھ کہ تیرے بھائیوں کا اور بھیڑ بکریوں کا کیا حال ہے اور آ کر مجھے خبر دے۔ سو اس نے اسے جبرون کی وادی سے بھیجا اور وہ سکم میں آیا اور ایک شخص نے اسے میدان میں اِدھر اُدھر آوارہ پھرتے پایا۔ یہ دیکھ کر اس شخص نے اس سے پوچھا کہ کیا ڈھونڈتا ہے۔ اس نے کہا میں اپنے بھائیوں کو ڈھونڈتا ہوں۔ ذرا مجھے بتا دے کہ وہ بھیڑ بکریوں کو کہاں چرا رہے ہیں۔ اس شخص نے کہا وہ یہاں سے چلے گئے کیونکہ میں نے ان کو یہ کہتے سنا کہ چلو ہم ''دوتین'' کو جائیں چنانچہ یوسف اپنے بھائیوں کی تلاش میں چلا اور انہیں دوتین میں پایا۔'' (توریت باب پیدائش)

حضرت یعقوبؑ تو انہیں بھائیوں کے ساتھ بھیجنے میں تامل کر رہے تھے، اکیلے کیسے بھیجے لہٰذا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا۔

یہ خدا کی کوئی مصلحت تھی یا امتحان مقصود تھا کہ حضرت یعقوبؑ کو بذریعہ وحی آنے والے خطرات سے آگاہ نہیں کیا گیا۔

یہ ان کے اپنے اندیشے تھے جس کا وہ اظہار کرتے چلے آ رہے تھے۔

ضروری تیاریوں کے بعد بالآخر وہ دن آ گیا جب یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ روانہ ہونا تھا۔ یعقوب علیہ السلام نے اپنے ہاتھوں سے اپنے عزیز از جان بیٹے کو کرتہ پہنایا اور شہر سے باہر اس درخت تک ساتھ آئے جہاں سے رسم کے مطابق مسافروں کو رخصت کیا جاتا تھا۔ ایک مرتبہ پھر اس خیال سے دل بھر آیا کہ یوسف ان سے ایک دن کے لیے یا ہو سکتا ہے زیادہ مدت کے لیے رخصت ہو رہا ہے۔ یہ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلا۔ نازک اندام ہے۔ سختیوں کا عادی نہیں۔ نہ جانے اس پر کیا گزرے۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے دیگر بیٹوں کو نصیحت کی۔

''میں اسے تمہارے ساتھ بھیج تو رہا ہوں لیکن اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اسے دھوپ اور بھوک سے بچانا ایسا نہ ہو یہ بیمار پڑ جائے۔''

بیٹوں نے شدومد سے یقین دلایا کہ وہ ان کا خیال رکھیں گے۔

بھائیوں کو جلدی ہو رہی تھی کہ کہیں حضرت یعقوبؑ ارادہ نہ بدل دیں۔ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر جلدی سے آگے بڑھے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹے شمعون کا دامن پکڑ لیا۔

''تم سمجھ دار ہو۔ یوسف کا خیال رکھنا۔''

شمعون نے وعدہ کیا اور دوڑ کر اپنے بھائیوں کے ساتھ مل گیا۔

یہ بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر چلے۔ یعقوب علیہ السلام درخت کے نیچے کھڑے انہیں دیکھتے رہے پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئے تو آپ گھر لوٹ آئے۔

تمام بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کو ہنساتے ہوئے، نرمی کا سلوک کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ''دوتین'' کا وہ مقام آ گیا جہاں ایک گہرا کنواں تھا جس کے مطابق روایت تھی کہ اسے نوح علیہ السلام کے بیٹے ''حام'' نے کھدوایا تھا۔

اس مقام پر پہنچ کر بھائیوں کا رویّہ اچانک بدل گیا۔ دھکے دے دے کر چلّانے لگے اور قہقہے برساتے جاتے تھے۔ طعن وطنز کے تیر برسا رہے تھے۔

''وہ چاند اور سورج کہاں ہیں جو تمہیں سجدہ کرنے والے تھے۔''

''اب دیکھو کون کس کو سجدہ کرتا ہے۔''

حضرت یوسف علیہ السلام کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھائیوں کو اچانک کیا ہو گیا۔ ایک ایک کی طرف دیکھتے تھے کہ شاید کسی کے دل میں رحم آ جائے۔

رحم تو کسی کو کیا آتا' دو بھائیوں نے مل کر ان کے جسم سے کرتہ اتار لیا اور دھکے دیتے ہوئے کنویں کے قریب لے گئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام سمجھ گئے تھے کہ اب کیا ہونے والا ہے لیکن کوئی مزاحمت نہیں کر رہے تھے۔ جانتے تھے کہ اللہ وہی کرے گا جو ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

بھائیوں کو ڈر تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کہیں شور نہ مچا دیں یا عین موقع پر مزاحمت نہ کرنے لگیں لہٰذا ان میں سے ایک بھائی نے اشارے سے انہیں سمجھایا کہ وہ اس وقت خاموش رہیں۔ وہ بعد میں آ کر انہیں نکال لے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو ایک لمبی رسی سے باندھ کر کنویں میں اتارنا شروع کیا۔ انہیں کنویں کی گہرائی کا علم نہیں تھا۔ رسی چھوٹی پڑ گئی۔ انہوں نے رسی چھوڑ دی اور حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں گر گئے۔ وہ اس پتھر پر گرے جو اکثر کنویں کے بیچ میں ہوتا تھا تاکہ جب پانی کم ہو جائے تو اس پتھر پر کھڑے ہو کر پانی بھر لیا جائے۔ اس وقت پانی کم تھا اور پتھر صاف نظر آ رہا تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے آپ کو پتھر پر گرا لیا۔

آپ پتھر پر خوفزدہ و پریشان بیٹھے تھے کہ اللہ نے وحی اتاری کہ آپ جس تکلیف و مصیبت سے دوچار ہیں، اللہ اس سے آپ کو چھٹکارا دے گا اور راستہ نکالے گا اور ایک وقت آئے گا کہ تو اپنے بھائیوں کو ان کے کرتوت کی خبر دے گا اور ان کو احساس تک بھی نہ ہوگا کہ تو ابھی زندہ ہے اور وہ سب تیرے سخت محتاج ہوں گے اور تجھ سے خوفزدہ ہوں گے۔

برادرانِ یوسف نے جب اپنی دانست میں حضرت یوسف علیہ السلام کو ٹھکانے لگا دیا تو خوشی سے ناچنے لگے۔ جنگل میں اس طرح ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کر لی ہو۔ ان کے منصوبے کے مطابق یہ بہت بڑی کامیابی تھی بھی۔

جب وہ خوب ناچ کود چکے تو یہ سوچا جانے لگا کہ اب کیا کیا جائے۔ ان سے جو گناہ سرزد ہو گیا تھا اس کا انہیں ڈر بھی تھا۔ ان بھائیوں میں سے کچھ نے یہ مشورہ دیا کہ گھر جا کر یوسف کی گمشدگی کے بارے میں باپ کو بتا دیا جائے۔ کچھ بھائیوں نے اختلاف کرتے ہوئے یہ کہا کہ اس کے لیے دن کا وقت مناسب نہیں۔ والد کو یہ شک ہو سکتا ہے کہ ہم اتنی جلدی کیسے آ گئے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دن چھپنے کے بعد رات میں کسی وقت گھر جائیں۔

وہ اس کنویں سے کچھ فاصلے پر ایک ایسی جگہ بیٹھ گئے جہاں کوئی انہیں آسانی سے نہیں دیکھ سکتا تھا جبکہ وہ کنویں کو دیکھ سکتے تھے۔ کھانے پینے کا جو سامان ساتھ لائے تھے وہ نکال کر بیٹھ گئے۔

ان کے بھائیوں کو جو کرنا تھا وہ کر چکے تھے، اب خدا ہی رازوں سے پردہ اٹھانے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں جو فیصلہ کر لیا تھا اس کی تکمیل کا وقت آ گیا تھا۔

حجازی اسمٰعیلیوں کا ایک قافلہ جو خوشبویات اور مسالاجات وغیرہ لے کر مصر کی طرف جا رہا تھا، اس مقام پر آ کر ٹھہرا۔ انہیں پانی کی ضرورت پیش آئی۔ اس قافلے میں شامل مالک بن زعر نامی ایک آدمی ڈول لے کر کنویں پر پہنچا اور پانی نکالنے کے لیے کنویں میں ڈول ڈالا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ کنویں میں ڈول آیا ہے تو انہوں نے رسی پکڑ لی۔

کنویں کے باہر کھڑے ہوئے شخص نے جب وزن محسوس کیا تو سمجھا ڈول میں پانی بھر چکا ہے۔ اس نے طاقت لگا کر ڈول اوپر کی طرف کھینچ لیا۔ پانی کے بجائے ایک نہایت حسین و جمیل لڑکے پر نظر پڑی تو فوراً پکارا۔

''بشارت ہو ایک غلام ہاتھ آیا۔''

ادھر یہ کارروائی ہو رہی تھی، دوسری جانب ایک بھائی کی نظر کنویں کی جانب گئی۔ وہ چیخا۔

''ادھر دیکھو، کسی نے یوسف کو باہر نکال لیا ہے۔ یوسف زندہ ہے اگر اس نے اپنی حقیقت بتا دی اور وہ سلامت گھر تک پہنچ گیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ پھر ہماری خیر نہیں۔''

سب اٹھ کر کنویں کی طرف بھاگے اور یوسف کو جا لیا۔ مالک بن زعر اکیلا تھا۔ اتنے لوگوں کو... دیکھ کر گھبرا گیا۔

''تم لوگ کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟''

''ہم اس لڑکے کے پیچھے آئے ہیں۔'' بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمارے باپ کا غلام ہے۔ گھر سے بھاگ کر کہیں چھپ گیا تھا۔ ہم تو اسے کئی دن سے تلاش کر رہے تھے۔''

''اگر یہ تمہارا غلام ہے تو مجھے انعام کے طور پر کچھ دے دو کہ میں نے اسے تلاش کیا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔''

حضرت یوسف علیہ السلام نے کچھ کہنا چاہا لیکن شمعون کی خوفناک آنکھوں نے انہیں خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔

''ہمارے لیے تو یہ غلام بے کار ہو گیا۔ ہم چاہتے ہیں تم اسے خرید لو اور جہاں تم جا رہے ہو اسے بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔'' راد بین نے کہا جو نہیں چاہتا تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہوں۔

''اس کے لیے تو تمہیں ہمارے سردار کے پاس چلنا ہو گا۔ وہی فیصلہ کرے گا کہ غلام خریدا جائے یا نہیں۔''

''کہاں ہے تمہارا سردار؟''

''کچھ ہی فاصلے پر ہمارے قافلے نے پڑاؤ کیا ہے۔ ٹھہرو، میں کنویں سے ایک ڈول پانی نکال لوں۔ تم اس غلام کا خیال رکھو۔ بھاگ گیا تو تمہارا ہی نقصان ہو گا۔''

شمعون آگے بڑھا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اگر تم نے سچ بتانے کی کوشش کی تو تمہیں گھر لے جانے کے بجائے راستے میں قتل کر دیں گے۔''

''مجھ سے اگر پوچھا گیا تو میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''ہم کوشش کریں گے کہ تم سے کچھ نہ پوچھا جائے۔ تم از خود مت بولنا۔ خاموش رہے تو تمہاری زندگی بچ جائے گی۔ زندگی رہی تو کسی وقت گھر پہنچ سکو گے۔ ہمارے ہاتھوں مارے گئے تو کبھی گھر نہ پہنچو گے۔''

''شمعون! تم تو ایسا نہ کہو۔ ابا جان نے تو تم سے کہا تھا میرا خیال رکھنا۔''

''خیال ہی تو رکھ رہا ہوں۔ میری بات مانو اور اپنی جان بچا لو۔''

اتنی دیر میں مالک بن زعر کنویں سے پانی بھر کر واپس آ گیا تھا اس لیے شمعون کو چپ ہونا پڑا لیکن اس کی آنکھوں کا قہر حضرت یوسف علیہ السلام کے گرد طواف کر رہا تھا۔

مالک بن زعر انہیں لے کر اپنے سردار کے پاس پہنچا اور ایک طرف لے جا کر اسے پورا ماجرا سنایا۔

''لڑکا خوبصورت ہے۔ مصر کے بازاروں میں بہت مہنگے داموں فروخت ہو گا۔ یہ لوگ اس غلام سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ معمولی قیمت پر فروخت کر دیں گے۔ آپ کہیں تو سودا کر لیا جائے۔''

''کیا مضائقہ ہے۔ ہم اسے اپنے ساتھ مصر لے جائیں گے۔''

''تو سودا طے کر لوں؟''

''قیمت ہرگز مت بڑھانا کیونکہ ان کا یہ غلام باغی ہو چکا ہے۔ ہرگز ان کے پاس نہیں رکے گا۔ اس لیے وہ اسے بیچنا ہی پسند کریں گے۔''

مالک بن زعر سردار سے بات کر کے برادرانِ یوسف کے پاس آیا۔

''یہ غلام اب تمہارے کام کا نہیں رہا اس لیے ہم خرید لیتے ہیں۔''

''کیا قیمت دو گے؟''

''ہم اس کے بیس درہم دیں گے۔''

''یہ تو بہت کم ہیں۔''
''کم ہیں تو اسے لے جاؤ۔''
اتنی کم قیمت سن کر وہ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پھر الگ جا کر اس قیمت پر غور کیا۔
''جو قیمت ملتی ہے لے لو۔ اگر ہم نے اسے واپس لے لیا تو گھر لے جا نہیں سکتے۔ قتل کیا تو ہمارے ہاتھ بیس درہم بھی نہیں آئیں گے۔ قتل کا گناہ الگ ہمارے سر آئے گا۔ ہمارا مقصد یوسف سے پیچھا چھڑانا تھا، سو وہ پورا ہو گیا۔''
ان ظالم بھائیوں نے بیس درہم کی معمولی قیمت کے عوض انہیں بیچ دیا۔
''آخر انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر چند درہموں کے عوض اسے بیچ ڈالا اور وہ اس کی قیمت کے معاملے میں زیادہ کے امیدوار نہیں تھے۔'' (سورۃ یوسف)

اس تمام کارروائی میں شام ہونے لگی تھی۔ انہیں واپس گھر بھی جانا تھا۔ گھر کا خیال آتے ہی یہ خیال آیا کہ گھر جا کر باپ سے کیا کہیں گے۔

انہوں نے بکری کا ایک بچہ ذبح کر کے اس کُرتے پر مل دیا جو یوسف علیہ السلام کے بدن سے انہوں نے اتار لیا تھا اور روتے پیٹتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس پہنچ گئے۔ حضرت یعقوبؑ نے رونے کا سبب پوچھا تو اور زیادہ رونے لگے۔ ممکن ہے یہ آنسو اصلی ہوں کیونکہ پچھتاوا تو انہیں ہو ہی رہا تھا۔
آخر ایک بھائی نے دل سے گھڑی ہوئی کہانی سنا ڈالی۔
''ہم سب دوڑ کا مقابلہ کر رہے تھے۔ یوسف کو سامان کے پاس بٹھا دیا تھا۔ اتنی دیر میں ایک بھیڑیا آیا اور یوسف پر حملہ کر دیا۔ یوسف کے چلّانے کی آواز آئی تو ہم اس کی طرف آئے لیکن ہمیں دیر ہو چکی تھی۔ وہ اس وقت یوسف کو کھا چکا تھا۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہماری بات پر یقین نہیں کریں گے لیکن حقیقت یہی ہے۔''
ایک بھائی نے کرتہ آگے کر دیا۔ ''یہ دیکھیے ہم یوسف کا کرتہ لے آئے ہیں۔ اس پر لگے ہوئے خون کے دھبے آپ کو یقین دلائیں گے کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔''
حضرت یعقوبؑ نے کرتہ لے کر اسے سونگھا۔ ''کرتہ تو یوسف ہی کا ہے لیکن اس پر لگے خون سے میرے یوسف کی بو نہیں آ رہی ہے۔''
''ہوسکتا ہے یوسف نے بھیڑیے کو بھی زخمی کر دیا ہو۔ یوسف کے خون میں بھیڑیے کا خون بھی شامل ہو گیا ہو۔''
''کیسا درندہ تھا کہ اس کے ناخن بھی نہیں تھے، دانت بھی نہیں تھے۔ کرتہ ایک جگہ سے بھی نہیں پھٹا۔''
برادرانِ یوسف کو اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ انہیں چاہیے تھا کہ کُرتے کو جگہ جگہ سے پھاڑ دیتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

وہ صرف رو رو کر اپنے جھوٹ کو سچ میں بدل سکتے تھے اور وہ یہ کام بخوبی انجام دے رہے تھے۔
حضرت یعقوبؑ، یوسف علیہ السلام سے ان کی عداوت کو جانتے تھے اور اب یہ علامات بھی بتا رہی تھیں کہ وہ جھوٹے ہیں اس لیے ان کا دھوکا نہ چل سکا۔
''تمہارے نفس نے تمہارے لیے ایک بڑے کام کو آسان بنا دیا۔ اچھا صبر کروں گا اور بخوبی صبر کروں گا۔ جو بات تم بتا رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد مانگی جا سکتی ہے۔''
حضرت یعقوب علیہ السلام اللہ کے نبی تھے۔ انہیں علامات اور نشانیوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ اللہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنی نبوت کے لیے اور اس سلسلے کو ان کی اولاد میں جاری رکھنے کے لیے ان کو منتخب فرمائے گا۔ اس لیے انہیں یقین تھا کہ اللہ ان کے یوسف کی حفاظت کرے گا۔ یہ خیال انہیں صبر سے ہم کنار کر رہا تھا۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا احوال بھی اس سے مختلف نہیں تھا۔ چھوٹی سی عمر ہے، والدہ کا انتقال ہو چکا ہے، باپ کی آغوشِ محبت تھی، وہ بھی چھوٹی۔ بھائیوں نے بے وفائی کی، آزادی کی جگہ غلامی نصیب ہوئی مگر ان تمام باتوں کے باوجود نہ شور وشیون ہے، نہ واویلا۔ قسمت پر شاکر، مصائب پر صابر اور خدا کے فیصلے پر راضی بہ رضا۔ سرِنیاز خم کیے مصر کے بازار میں فروخت ہونے جا رہے ہیں۔

☆☆☆

ایک دن اور ایک رات کے بعد اس اسمٰعیلی تاجروں کے قافلے نے کوچ کا ارادہ کیا۔ اس دوران حضرت یوسف علیہ السلام کی سخت نگرانی کی جاتی رہی تھی کیونکہ قافلے والوں کو ان کے بھائیوں کی زبانی یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ لڑکا اپنے مالکوں سے بھاگا ہوا غلام ہے۔ اسے بھاگنے کی عادت پڑ چکی ہے، ہوسکتا ہے پھر بھاگ جائے۔ یہ بات بھی انہیں عجیب سی لگ رہی تھی کہ اس غلام کے ہونٹوں پر اپنے سابق آقاؤں کی کوئی شکایت نہیں ہے۔ مالک بن زغر نے انہیں اعتماد میں لے کر اور نہایت مشفقانہ برتاؤ کر کے پوچھنے کی بھی کوشش کی کہ اسے اپنے آقاؤں سے کیا شکایت تھی۔ بھاگنے کی کوشش کیوں کی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آنکھوں میں آنسو بھرے رہے۔ جیسے انہیں اپنے آقاؤں سے بچھڑنے کا دکھ ہو۔

جب قافلے نے پائے سفر اٹھایا اور چلنے کی فکر ہوئی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی فکر ہوئی کہ کہیں وہ فرار ہونے کی کوشش نہ کریں یا راستے میں محافظوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر بھاگ نہ جائیں۔

''لڑکا اتنا حسین ہے کہ اگر ہم اسے مصر تک بہ حفاظت لے گئے تو ایسی بھاری قیمت میں فروخت ہوگا کہ ہمارے وارے نیارے ہوجائیں گے۔''

قافلے کے لوگوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیے اور اونٹ پر بٹھا دیا گیا۔ ان کے اونٹ کو قافلے کے بیچ میں رکھا گیا تاکہ ان کی اچھی طرح نگرانی ہوتی رہے۔

جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو اس خیال سے کہ وطن چھوٹ رہا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... بھائیوں نے بدسلوکی کی تھی لیکن وہ پھر بھی انہیں یاد آرہے تھے۔ باپ کی یاد آئی تو بے قابو ہوگئے۔ رسیوں سے بندھے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے کہ اب بے اختیار چیخنے کو جی چاہا۔ اسی وقت ایک آواز سنائی دی۔

''اے کریم ابن کریم! وقتی آزمائش سے مت گھبرا۔ عنقریب تیرے درجات بلند ہونے والے ہیں۔''

بہتے ہوئے آنسو تھم گئے جیسے کسی نے صبر کا رومال منہ پر رکھ دیا ہو۔ اپنے دل میں کہنے لگے۔ ''اے شام سے مصر کی طرف جانے والے راستو! تم گواہ رہنا کہ میں نے صبر کیا اور اپنے بھائیوں کو معاف کیا۔''

قافلہ سفر کرتا رہا اور حضرت یوسف علیہ السلام آنے والے وقت پر غور کرتے رہے۔ انہیں اپنے اللہ پر یقین تھا کہ جو کچھ ظہور میں آئے گا ان کے حق میں بہتر ہوگا۔

مصر قریب آگیا تھا۔ اس وقت کے شہری تمدن کا بے مثال نمونہ۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر کے فرعون کا بہت ذکر سن رکھا تھا۔ اب انہیں بھی فراعنہ مصر کے پُررونق شہروں کو دیکھنے کا اشتیاق ہو رہا تھا۔ اس سے زیادہ یہ دیکھنے کا اشتیاق تھا کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ کس طرح پورا ہوتا ہے۔ مصر میں ان پر کیا گزرتی ہے۔

فراعنہ مصر کا خاندان شاہی نسلی اعتبار سے ''عمالقہ'' میں سے تھا۔ مصر کی تاریخ میں ان کو ''ہیکسوس'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور ان کی اصلیت سے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ چرواہوں کی ایک قوم تھی۔ جدید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم عرب سے آئی تھی اور دراصل یہ ''عرب عاربہ'' ہی کی ایک شاخ تھی۔

مصر کے مذہبی تخیل کی بنا پر ان کا لقب ''فاراع'' (فرعون) تھا۔ اس لیے کہ مصری دیوتاؤں میں سب سے بڑا اور مقدس دیوتا آمن راع (سورج دیوتا) تھا اور بادشاہِ وقت اس کا اوتار اور ''فاراع'' کہلاتا تھا۔ یہی فاراع عربی میں ''فرعون'' کہلایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام جب مصر پہنچے ہیں تو اس وقت کے فرعون کا نام عرب مورخوں نے ''ایان'' بتایا ہے اور مصری آثار میں ''آیوفی'' کے نام سے موسوم ہے۔

جب مصر کے دروازے دور سے نظر آنے لگے تو قافلے نے شہر سے باہر واقع ایک چشمے پر آخری پڑاؤ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ اس چشمے پر غسل کر کے سفر کی گرد مٹی کو صاف کرلیا جائے۔ تمام لوگ کپڑے اتار کر پانی میں داخل ہوگئے۔ حضرت یوسف سے بھی کہا گیا کہ وہ غسل کرلیں۔ ان کے لیے تو یہ اور بھی ضروری تھا کیونکہ انہیں فروخت کیا جانا مقصود تھا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے سب کے سامنے نہانے سے انکار کر دیا۔

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیا۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

ناکام کوشش

باہر نعیم

کچھ لوگ وقت کے سانچے میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کچھ... وقت کو اپنا تابع کر کے فخر محسوس کرتے ہیں مگر... بھول جاتے ہیں کہ یہ تو وقت کی ایک ایسی چال ہوتی ہے جس کے جھانسے میں آکر بڑے سے بڑا طاقتور ٹھوکر کھا جاتا ہے... وہ بھی اس کے جھانسے میں آکر ایک غلط فیصلہ کر بیٹھی تھی اور یوں اس کی ساری کوششیں رائگاں گئیں۔

الجھی ہوئی فطرت اور بکھری ہوئی شخصیت کی الجھنوں کا احوال

ایما اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اور اس کا خیال تھا کہ کیل بھی ایسا نہیں چاہے گا۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے نظریں جھکائے کچن میں ٹہل رہا تھا جیسے فرش پر کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ کچھ مضطرب دکھائی دے رہا تھا اور ایما جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''میں نے تمہیں کبھی نہیں بتایا کہ تم وہ حاصل نہیں کرسکتیں جو تم چاہتی ہو۔''

''بالکل نہیں۔'' ایما نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے



اور دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے کبھی کچن کے بوسیدہ فرش اور دروازوں کے اکھڑے ہوئے رنگ کے بارے میں نہیں سوچا اور نہ ہی اسے پرانے فرنیچر یا ان تصویروں کا خیال آیا جو اس نے سیل میں خریدی تھیں اور ابھی تک سیڑھیوں کے پاس فریم کے بغیر رکھی ہوئی تھیں۔ اسے لانڈری روم میں لگے ہوئے پرانے سنک کی بھی پروا نہیں تھی جس کا پائپ لیک کر رہا تھا پھر وہ اتنی چھوٹی بات پر کیوں قائم تھی؟

''اگر اس کا اچھا نتیجہ نہیں نکلا تو؟'' گیل نے لیس کے پردے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''ایسی صورت میں تمہارے لیے زیادہ مشکل ہوگی۔''

''کوئی مشکل نہیں ہوگی گیل۔''

گیل نے مڑ کر اسے دیکھا اور بولا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ بعد میں کوئی مسئلہ ہو اور تمہیں تکلیف پہنچے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہوگا گیل۔'' ایما نے مسکراتے ہوئے کہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آئی اور اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میری بات کا یقین کرو۔''

ایک گھنٹے بعد ایما نے ایک نیلے رنگ کی چھوٹی اسٹیشن ویگن گھر کے سامنے پارکنگ ایریا میں داخل ہوتے دیکھی۔ اسے اگلی نشستوں پر دو خواتین بیٹھی نظر آئیں۔ ان میں ایک سماجی کارکن گنی مارش تھی جو فوسٹر ہومز میں لڑکیوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔ البتہ ایما اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی نوعمر لڑکی کو نہیں جانتی تھی۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا نام لوسی کونیل ہے۔ اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی اسے فراہم کی گئی تھیں۔ ایما نے پردہ برابر کیا اور کھڑکی سے ہٹ گئی۔ غیر متوقع طور پر وہ بھی گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی۔

ایما پورچ میں آئی۔ وہ نووارد سے ملنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ گو کہ اس نے اپنے شوہر کو یقین دلایا تھا کہ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا اور حالات اس کے قابو میں رہیں گے لیکن وہ اپنے آپ کو خوفزدہ محسوس کر رہی تھی۔ اس نے ذہن میں پیدا ہونے والے شک کو اسی لمحے کچل دیا اور خوف پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اس نے اپنی توجہ اس لڑکی پر مرکوز کر دی جو کار سے باہر آ رہی تھی۔

لوسی کار کے کھلے دروازے کے ساتھ اس طرح کھڑی ہوئی تھی جیسے اپنے نئے گھر کا جائزہ لے رہی ہو۔ گودام، اس کے قریب کھڑی ہوئی پرانی پک اپ، گودام کے دروازے کے ساتھ رکھی ہوئی بالٹیاں اور ڈول، پک اپ میں لدی ہوئی لکڑیاں وغیرہ۔ گودام کے عقب میں گائے کے ڈکرانے کی آواز سن کر لڑکی نے سر گھما کر اس جانب دیکھا۔ وہ لمبے قد کی دبلی پتلی لڑکی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال کندھوں تک آ رہے تھے۔ اس کی جینز کی لمبائی گھٹنوں تک تھی۔ ایما یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ اس قسم کی پتلونیں فیشن میں شامل ہیں یا اس لڑکی کا قد بڑھ جانے کی وجہ سے جینز کی لمبائی چھوٹی پڑ گئی۔

''ہیلو مسز سولون۔'' گنی مارش نے گرم جوشی سے کہا۔ اس کا قد ایما سے کئی انچ چھوٹا تھا۔ اس نے سوتی پتلون، سفید جرسی اور گہرے نیلے رنگ کا کارڈیگن پہن رکھا تھا۔ ایما نے بھی اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور بولی۔

''ہائے گنی۔''

''یہاں آؤ لوسی۔'' گنی نے کہا۔

لوسی نے کار کا دروازہ بند کیا اور گنی کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''کیا یہ کوئی فارم ہے؟''

''ہاں۔ بہت ہی عمدہ فارم ہے۔'' اس نے لوسی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہیں شیلٹر ہوم واپس لے کر نہیں جاؤں گی۔ تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ کاؤنٹی کا خیال ہے کہ یہ جگہ تمہارے لیے مناسب رہے گی۔ مسز سولون کے بچے بڑے ہو گئے ہیں اور وہ کام پر بھی نہیں جاتی۔ اس لیے وہ تمہارا پورا خیال رکھے گی۔''

تین گھنٹے بعد ایما نے اپنے شوہر کے لیے لنچ باکس تیار کیا اور بولی۔ ''تمہاری واپسی کب ہوگی؟'' پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ ہال میں آئی اور بولی۔ ''کیا تم نے سنا......؟''

گیل نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ وہ سمجھا کہ شاید وہ لوسی کے بارے میں کچھ کہہ رہی ہے۔ ''جب اسے بھوک لگے گی تو خود ہی آ جائے گی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ کوئی بچی نہیں ہے۔''

''وہ صرف پندرہ سال کی ہے۔'' ایما نے کہا۔

''دیکھنے میں شاید اٹھارہ کی لگتی ہو لیکن اندر سے وہ دس سال کی ہی ہے۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' اس کے شوہر نے ہاتھ بڑھا کر لنچ باکس لیا اور بولا۔ ''مجھے جو کہنا تھا، وہ کہہ دیا۔''

وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر ٹرک تک آئی اور ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا۔ ''تمہاری واپسی کب ہوگی؟''

اس کے شوہر نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا انحصار نیلام کے ختم ہونے پر ہے لیکن مجھے اس کے لیے نئی مشینری کی ضرورت ہے۔ اگر وہ آخر

میں آئی تو مجھے بقیہ دن وہیں گزارنا ہوگا۔ شاید شام ہوجائے۔ میں تمہیں فون کردوں گا۔'' اس نے جیب میں رکھے ہوئے سیل فون پر ہاتھ مارا۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم اس سے اتفاق کروگی؟''

''بالکل...... مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اور مسکرانے لگی۔ وہ اس پروگرام سے کچھ زیادہ ہی متفق تھی۔ وہ خود بھی اس دن کو شاندار اور خاص بنانا چاہ رہی تھی کیونکہ یہ اس کے اور کاؤنٹی کیئر سے آنے والی لڑکی کے لیے ایک نئی زندگی کا آغاز تھا۔

وہ گیل کے جانے کے بعد بھی کافی دیر تک پورچ میں کھڑی رہی۔ یہاں تک کہ اس کا پالتو کتا بھی بھونک بھونک کر تھک گیا۔ وہ باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ وہ مڑی اور کتے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں واحد طریقہ یہی ہے کہ شروع سے آغاز کیا جائے۔''

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کتا انتظار کرنے لگا کہ وہ کہاں جاتی ہے۔ وہ اندر گئی اور ہال عبور کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگی۔ کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ اس نے بیڈروم کے دروازے پر دستک دی اور بہ آواز بلند بولی۔ ''لوسی...... لوسی! کیا میں تم سے کسی معاملے میں مشورہ دینے کے لیے کہہ سکتی ہوں؟''

لوسی نے دروازہ کھولا اور بولی۔ ''کیا؟''

وہ اسی لباس میں کھڑی ہوئی تھی جسے پہن کر وہ یہاں آئی تھی۔ ایما دیکھ سکتی تھی کہ اس کا سوٹ کیس بیڈ پر رکھا ہوا تھا جو اس نے ابھی تک نہیں کھولا تھا۔

''میں کسی معاملے میں تم سے مشورہ چاہتی ہوں۔''

''یہ تم کہہ چکی ہو۔''

''میرے کمرے میں آؤ۔'' یہ کہہ کر وہ مڑی اور ایک چھوٹے ہال سے گزر کر دوسرے کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس نے شہر کی استانیوں کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ اپنے شاگردوں سے خوفزدہ رہتی ہیں۔ اسی طرح والدین بھی چاہنے کے باوجود اپنی اولاد سے اختلاف نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اس طرح کی باتوں پر ہنس دیا کرتی تھی لیکن اب اسے خود بھی حیرانی ہو رہی تھی۔ لوسی نے اسے بالکل بھی خوفزدہ نہیں کیا بلکہ وہ ایک بے یقینی کی کیفیت محسوس کر رہی تھی جو اس کے لیے نئی تھی۔

''یہ میرا کام کرنے کا کمرا ہے۔'' اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلی گئی۔ اس نے لوسی کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ البتہ اس کا کتا قریب سے گزرتے ہوئے بیس بورڈ کی طرف بڑھ گیا۔ یہ کمرا مکان کے پچھلے حصے میں تھا جس کی واحد کھڑکی سے سبزیوں کا باغ نظر آتا تھا۔ زیادہ تر سبزیاں پہلے ہی اتار لی گئی تھیں کچھ سبزیاں باقی تھیں۔ ایما کی عادت تھی کہ وہ نئی بوائی سے پہلے سبزیوں کو ڈبوں میں محفوظ کرلیتی یا ضرورت سے زائد سبزیاں بیچ دیتی۔

ایما نے چند برس پہلے اس کمرے میں ہلکا سبز رنگ کروایا تھا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی اور اس کمرے کو استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس لیے یہ ابھی تک عمدہ حالت میں تھا۔ اس کے وسط میں چھ فٹ طویل فولڈنگ میز اور دو عدد فولڈنگ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ شیلف میں کپڑوں اور دھاگوں سے بھرے کئی باکس اور ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ میز پر دو کاغذ کے تھیلے رکھے ہوئے تھے۔ ایما نے ان میں سے ایک تھیلا کھولا تو تہ کیے ہوئے دو کپڑے میز پر گر گئے۔

''میں نے یہ کچھ عرصہ قبل خریدے تھے لیکن یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ ان میں سے کون سا بہترین ہے۔ دراصل میں سال کے آخر میں ہونے والی ڈانس پارٹی میں شرکت کے بارے میں سوچ رہی تھی لہٰذا مجھے اس کے لیے ایک لباس تیار کرنا ہے۔''

ایما نے لوسی کو دکھانے کے لیے ایک کپڑا اٹھایا جو ابھی تک دروازے کی دہلیز پر کھڑی تیوری چڑھائے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''تم مارشلز، سے خریداری کیوں نہیں کرتیں؟'' لوسی نے کہا۔

''مجھے کام کرنا پسند ہے۔ اس کے علاوہ میں کسی ایسی چیز پر اتنے زیادہ پیسے خرچ نہیں کرسکتی جو میری مرضی کے مطابق نہ ہو۔''

ایما نے کپڑے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کے سامنے پھیلایا اور بولی۔ ''تمہارا کیا خیال ہے۔ سرخ یا زرد رنگ؟'' اس نے دونوں کپڑوں کو چھوا اور لوسی کا ردعمل دیکھنے کے لیے اس پر نظریں جما دیں۔

لوسی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میں نے سوچا کہ تم میری کچھ مدد کرسکوگی۔''

''کیسی مدد؟''

''اس لباس کی تیاری میں۔'' ایما نے کہا۔

''تم اسے خود بناؤ گی؟'' لوسی کے چہرے کی سختی پر

حیرت غالب آ گئی۔

''یقیناً۔کیا تم نے کبھی کوئی چیز نہیں بنائی ؟''

یہ جملہ کہتے ہی ایما کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔لوسی کا چہرہ سکڑ گیا اور وہ تنک کر بولی۔''بالکل، بنائی ہیں۔تم مجھے کیا سمجھتی ہو ؟''

''بہت عمدہ۔'' ایما نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔''پھر تو تم میری مدد کر سکتی ہو۔ہم تمہارے لیے بھی ایک لباس تیار کریں گے۔'' ایما نے میز پر سے کپڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔''میرے پاس دو نمونے ہیں، میں یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا بہترین رہے گا۔اس لیے دونوں خرید لیے۔''

اس نے پیکٹ میز پر پھیلا دیے جن پر سامنے کی جانب رنگین ڈرائنگ بنی ہوئی تھی پھر اس نے پیچھے ہٹ کر دونوں بازو سینے پر باندھ لیے جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے کیا فیصلہ کرنا ہے۔

ایما کے جاننے والوں میں تقریباً ہر عورت سلائی، بُنائی اور کشیدہ کاری کے علاوہ دوسرے بہت سے کام جیسے ڈبوں میں خوراک محفوظ کرنا، باغبانی، گودام کی صفائی، کار کی چھوٹی موٹی مرمت، جانوروں کو چارا دینا اور ٹریکٹر چلا لیتی تھی۔اسے اور اس کی کلاس فیلوز کو سویٹر بننے کی سلائیوں کی طرح اوزار خریدنے کی بھی پہچان تھی۔یہ سب ہاتھ سے کرنے کے کام تھے اور کوئی بھی لڑکی باہر کی دنیا میں قدم نہیں رکھتی تھی جب تک کہ اسے معلوم نہ ہو کہ وہ اپنے ہاتھوں کو کس طرح استعمال کر سکتی ہے لیکن بد قسمتی سے لوسی کے لیے یہ سارے کام اجنبی تھے۔

چرچ کے ایک اجتماع میں گنی نے ایسی ہی لڑکیوں کا ذکر کیا جو صحیح طریقے سے اپنا بستر بھی ٹھیک نہیں کر سکتی تھیں۔انہوں نے کبھی کھانا نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی کتاب پڑھی۔یہاں تک کہ وہ ایک بٹن بھی نہیں لگا سکتی تھیں۔اس نے ایک ایسی لڑکی کی مثال دی جو صرف اس لیے اسکول نہیں جا سکی کیونکہ اس کی جینز کا ایک بٹن گر گیا تھا اور اس کے پاس سیفٹی پن بھی نہیں تھی جو وہ بٹن کی جگہ لگا سکتی۔اسے سوئی دھاگے کا استعمال نہیں آتا تھا۔لہٰذا دوسری جینز کے آنے تک وہ اسکول نہیں گئی۔

وہ لڑکی لوسی کو کی نیل تھی جسے ایما کے سپرد کیا گیا تھا۔

''مسز سولون! ہمارے پاس ایک اور لڑکی بھی ہے جس نے اپنے والدین کے انتقال سے پہلے چند سال فارم پر گزارے ہیں۔وہ تمہارے گھر کے لیے زیادہ مناسب رہے گی۔'' گنی نے کہا۔

لیکن ایما اپنے ارادے پر سختی سے قائم رہی۔اسے لوسی ہی چاہیے تھی۔وہ جانتی تھی کہ یہی وہ لڑکی ہے جسے اس کی ضرورت ہے۔

''تم جانتی ہو کہ میں نے یہاں آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔'' لوسی نے دونوں ہاتھ جیبوں میں رکھے اور سر جھکا لیا۔اب وہ کمرے کے ایک کونے میں کھڑی ہوئی تھی جہاں سے وہ دروازہ، کھڑکی اور کمرے کے وسط میں رکھی ہوئی میز کو دیکھ سکتی تھی۔

''میں جانتی ہوں۔'' ایما نے زرد رنگ کا کپڑا ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔''میرا خیال ہے کہ موسم بہار کے لیے یہی مناسب رہے گا۔ڈانس پارٹی بہار میں ہی ہے۔کیا میں نے یہی کہا تھا؟''

''یہ زیادہ آسان ہو گا کہ کوئی لباس خرید لیا جائے۔'' لوسی نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے کہا اور کمرے کے دوسرے کونے کا جائزہ لینے لگی۔

ایما نے دونوں ہاتھوں میں نمونوں کے پیکٹ پکڑے اور باری باری انہیں دیکھنے لگی۔''تمہارے خیال میں موسم بہار کی مناسبت سے کون سا ٹھیک رہے گا؟ مجھے تو یہ اچھا لگ رہا ہے۔'' اس نے ایک پیکٹ اس کے سامنے کیا جس پر اے لائن اسکرٹ پہنے ہوئے ایک دبلی پتلی عورت کی تصویر بنی ہوئی تھی۔

''گو کہ میری کمر اب پہلے جیسی نہیں رہی۔'' اس نے پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔''لیکن تمہاری کمر بہت اچھی ہے۔''

''تمہیں مارشلز کے یہاں سے اس سے بہتر لباس مل سکتا ہے۔''

''شاید۔'' ایما نے دوسرا نمونہ شیلف پر رکھ دیا اور منتخب کیا ہوا پیکٹ کھولنے لگی۔''لگتا ہے کہ یہ کئی ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔''

وہ ٹکڑے میز پر بکھر گئے اور ایما نے ان پر سے باریک خاکستری کاغذ اتارنا شروع کر دیا۔وہ یہ کام بڑی احتیاط سے کر رہی تھی تاکہ کاغذ پھٹنے نہ پائے اور لوسی کو بھی یہ دیکھنے کے لیے مناسب وقت مل جائے کہ وہ یہ کام کیسے کر رہی ہے۔اسی وقت اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔دوسری طرف سے گنی بول رہی تھی۔

''ہیلو گنی۔''وہ پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے بولی۔''لوسی میرے پاس ہی ہے۔ہم ایک لباس تیار کر رہے ہیں اور وہ میری مدد کر رہی ہے۔میں اسے سکھا دوں گی اور اس بارے میں تمہیں بھی بتاؤں گی۔''

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد ایما نے کہا۔''گنی کا

فون تھا۔“

”ہاں۔ میں نے سن لیا۔“

”وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھی۔“

لوسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”تم اس کام میں میری مدد کرو گی؟ مجھے یہ تمام ٹکڑے کاٹنا ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک ٹوکری میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے قینچی نکال کر میز پر رکھ دی پھر اس نے دوسری بار باسکٹ ٹٹول کر ایک اور قینچی نکالی۔ لوسی بڑے غور سے قینچیوں کو دیکھ رہی تھی پھر وہ آگے بڑھی اور اس نے شہادت کی انگلی مرکزی بولٹ پر رکھ کر قینچی کو دائیں بائیں جھلانا شروع کر دیا۔ وہ اپنی انگلی لوپ میں رکھ کر قینچی کو دائرے کی شکل میں گھما رہی تھی۔

”کیا تمہیں گنی نے بتایا کہ میں کاؤنٹی میں کیوں تھی؟“

”ہاں۔“

اس جواب نے لوسی کو حواس باختہ کر دیا اور قینچی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اس نے ایما کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس نے تمہیں چھرا گھونپنے کے بارے میں بھی بتا دیا؟“

”ہاں۔“

اس نے دزدیدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے تقریباً مار ڈالا تھا۔“

”میں نے سنا ہے۔“ ایما نے کہا۔ ”گنی کو معلوم ہے کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔“

”تمہیں یہ خوف نہیں کہ میں دوبارہ ایسی کوشش کر سکتی ہوں۔ میں جسامت میں تم سے بڑی ہوں۔“

”نہیں۔ میں بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔“

”مگر تمہیں ہونا چاہیے۔“ یہ کہہ کر لوسی نے دوبارہ قینچی گھمانا شروع کر دی۔

”تم ان ٹکڑوں کو کاٹنے میں میری مدد کر سکتی ہو یا قینچی سے کھیلتی رہو جو تمہارا دل چاہے۔“

ایما نے ایک ٹکڑا کھول کر اسے میز پر پھیلا دیا اور بولی۔ ”یہ سیاہ لائنیں دیکھ رہی ہو۔ تمہیں یہاں سے کاٹنا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی قینچی اٹھائی اور کٹائی شروع کر دی۔ وہ ساتھ ساتھ گنگناتی بھی جا رہی تھی لوسی نے قینچی کاغذ کے نیچے رکھی اور دوبارہ کونے میں جا کر کھڑی ہو گئی۔ جب ایما نے کٹائی مکمل کر لی تو ایک قدم پیچھے ہٹ کر کٹے ہوئے نمونوں کا جائزہ لینے لگی۔

”تم نے ایک ٹکڑا چھوڑ دیا۔“ لوسی نے کہا۔

”کیا تمہیں یقین ہے؟“

”ہاں۔ وہ والا۔“ لوسی نے اشارے سے بتایا۔

”اوہ۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ ایما نے اپنی ہتھیلیاں کٹے ہوئے ٹکڑوں میں رکھیں اور ان کی سلوٹیں دور کرنے لگی۔

”کیا تم میرا یہ کام کر سکتی ہو؟“ ایما نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

دوسرے ہی لمحے لوسی نے قینچی اٹھائی اور کٹنگ کرنے لگی۔ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اس نے وہ ٹکڑا ایما کی طرف کھسکا دیا۔

”تمہارا شکریہ لوسی۔“ ایما نے کہا۔ ”اب ہم ان نمونوں کو لباس کی تیاری میں استعمال کریں گے۔“

”یہ پھٹ جائیں گے۔“

ایما نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم احتیاط کریں گے۔“ یہ کہہ کر اس نے قینچی اٹھائی۔ عین اسی وقت لوسی نے جھپٹا مارا اور تمام کٹے ہوئے ٹکڑے فضا میں بکھر گئے۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔ ”تم اتنے بڑے مکان میں رہتی ہو اور اپنے لیے ایک لباس نہیں خرید سکتیں؟“

پہلے ہی ہفتے میں لوسی نے جتا دیا کہ اسے فارم پسند نہیں اور وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی اور نہ ہی کسی کام میں مدد کرے گی۔ ایما نے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی کیونکہ اسے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس ماحول کی عادی ہو جائے گی۔ بالآخر وہ چھوٹے موٹے کام کرنے لگی جیسے جھوٹے برتن ڈش واشر میں رکھنا۔ واشنگ مشین میں کپڑے ڈالنا اور ڈبوں میں بند چیزیں تہ خانے کے گودام میں رکھنا۔

ایک دن ایما گائے کا دودھ دوہ رہی تھی کہ لوسی نے کہا۔ ”فرض کرو۔ یہ تمہیں لات مار دے۔“

”یہ ایسا نہیں کرے گی۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”ہم دونوں دوست ہیں۔“ ایما اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مجھے تو کراہیت محسوس ہو رہی ہے۔“ لوسی پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ”تم اس کا دودھ بھی نکالو گی؟“

ایما نے مڑ کر دیکھا کہ لوسی کس کے بارے میں بات کر رہی ہے پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”وہ تو جارج ہے۔ ہمارا بیل۔ وہ دودھ نہیں دیتا۔“

”پھر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“

''وہ سورج غروب ہونے پر کھانے اور سونے کے لیے آتا ہے۔''

''تم اسے باہر کیوں نہیں چھوڑتیں؟ کیا اسے اندھیرے یا کسی اور چیز سے ڈر لگتا ہے؟''

ایما قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔''اس میں آسانی یہ ہے کہ جب یہ رات کے وقت اندر ہوتا ہے تو گیل باہر کا کام کرسکتا ہے اور جب یہ دن میں باہر ہو تو میرا شوہر اندر آ کر تھان کی صفائی کرلیتا ہے۔''

''یہ تمہاری صفائی میں ٹانگ اڑاتا ہے؟''

ایما کھڑی ہوگئی۔ اس نے دودھ کی بالٹی اٹھائی اور بولی۔''یہ منہ زور ہے۔ سارے بیل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تم ان پر بھروسا نہیں کرسکتیں۔ میری بات یاد رکھنا لوسی۔ کبھی بھی اس کے قریب مت جانا۔ اس کا موڈ کسی بھی وقت بگڑ سکتا ہے۔''

''تم فکر مت کرو۔ مجھے جانور پسند نہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولی۔

☆☆☆

لباس کی تیاری کا کام شروع ہوگیا تھا۔ ایما نے کاٹے ہوئے نمونوں کو پنوں کے ذریعے کپڑے پر چسپاں کیا۔ جب وہ اپنا کام کرچکی تو لوسی بولی۔''یہ بہت بدصورت لگ رہا ہے۔''

''مکمل ہونے سے پہلے ایسا ہی لگتا ہے۔'' ایما نے جواب دیا۔ اس وقت تک لوسی اپنا انگوٹھا اور کلائی زخمی کرچکی تھی۔ اس نے ایما کی طرف دیکھا اور مطمئن ہوکر دوبارہ کونے میں جاکر کھڑی ہوگئی۔ ایما ان معمولی باتوں پر پریشان نہیں ہوتی تھی لیکن اس روز وہ اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو نہ پاسکی جب پہلا مہینا گزرنے کے بعد اسے گنی نے فون کیا۔

''وہ اسکول نہیں جارہی۔'' گنی نے کہا۔''مجھے بھی ابھی معلوم ہوا ہے۔ میں دوسرے کاموں میں مصروف تھی۔ بہر حال پرنسپل جاننا چاہتا ہے کہ اس کا ریکارڈ کہاں بھیجا جائے۔ اس کا خیال ہے کہ ہم لوسی کو کسی دوسرے اسکول میں بھیج دیں۔''

''مجھے یقین نہیں آرہا۔'' گنی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔''میں نے پرنسپل سے کہا ہے کہ وہ بس ڈرائیور سے پوچھے، وہ کب اور کہاں اترتی ہے۔ وہ گھر آئے تو تم بھی اس سے پوچھنا۔''

ایما فون ہاتھ میں پکڑے ہوئے کھڑی تھی جب کھڑکی سے لوسی کو آتے ہوئے دیکھا۔ 'شاید میں اسے پوری توجہ نہیں دے رہی۔' اس نے سوچا۔ 'یقیناً کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے۔' اس نے فون رکھا اور لوسی کے اندر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

''تم اسے ٹھیک نہیں کرسکتیں۔'' گیل نے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔

''کیا تم اسے پسند نہیں کرتے؟'' ایما نے پوچھا۔

''میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ اسے پسند نہیں کرتے ہوں گے لیکن وہ ہر ایک کے ساتھ ایسا برا سلوک نہیں کرتی جو وہ تمہارے ساتھ کرتی ہے۔''

ایما نے اس کی طرف چہرہ گھماتے ہوئے کہا۔''وہ بچی ہے گیل۔ اسے ہماری مدد کی ضرورت ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ ہر روز کہاں جاتی ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ وہ کتابوں کی دکان کے چکر لگاتی ہوگی؟''

''یہاں کوئی کتابوں کی دکان نہیں ہے۔'' ایما بستر پر چت لیٹ گئی اور چھت کو گھورنے لگی۔

''وہ ہماری توقع سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہورہی ہے۔ تم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔''

''بالکل کرسکتی ہوں۔'' اس نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

گیل نے کروٹ بدلی اور ایما کو دیکھنے لگا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اسی طرح ایما کے حسن کی تعریف کیا کرتا تھا۔ وہ اب بھی یہی توقع کررہی تھی کہ گیل اس سے معذرت کرے گا لیکن اس نے صرف اتنا کہا۔''تم کچھ نہیں کرسکتیں۔ کچھ لوگ ہم جیسوں سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں اپنی کوشش جاری رکھوں گی۔''

ایما کے پاس اپنی کار تھی جس میں وہ فیری کو ساتھ لے کر سودا سلف خریدنے جاتی تھی۔ وہ شاذونادر ہی اپنے شوہر کی پک اپ چلایا کرتی تھی لیکن اس روز... اس نے پک اپ سے جانے کا فیصلہ کیا۔ گنی کا فون ملنے کے دوسرے دن وہ پک اپ میں سوار ہوئی اور اسکول بس کے تعاقب میں روانہ ہوگئی۔ وہ کافی فاصلہ رکھ کر چل رہی تھی تاکہ اگر لوسی اتفاقاً پیچھے مڑ کر دیکھے تو اسے تعاقب کا پتا نہ چلے۔

لوسی دوسرے طالب علموں کے ساتھ ہی بس سے اتری لیکن جیسے ہی بس آگے بڑھی، اس نے تیزی سے موڑ کاٹا اور سڑک کے دوسری جانب چل دی۔ کچھ فاصلے پر جاکر اس نے انگوٹھے کے اشارے سے ایک گاڑی کو روکا۔

پاک سوسائٹی پر موجود مشہور و معروف مصنفین

عُمیرہ احمد	صائمہ اکرام	عُشنا کوثر سردار	اشفاق احمد
نمرہ احمد	سعدیہ عابد	نبیلہ عزیز	نسیم حجازی
فرحت اشتیاق	عفت سحر طاہر	فائزہ افتخار	عنایتُ اللّٰہ التمش
قُدسیہ بانو	تنزیلہ ریاض	نبیلہ ابر راجہ	ہاشم ندیم
نگہت سیما	فائزہ افتخار	آمنہ ریاض	مُمتاز مُفتی
نگہت عبدُاللّٰہ	سباس گُل	عنیزہ سید	مُستنصر حُسین
رضیہ بٹ	رُخسانہ نگار عدنان	اقراء صغیر احمد	علیمُ الحق
رفعت سراج	اُمِ مریم	نایاب جیلانی	ایماے راحت

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود ماہانہ ڈائجسٹس

خواتین ڈائجسٹ، شُعاع ڈائجسٹ، آنچل ڈائجسٹ، کرن ڈائجسٹ، پاکیزہ ڈائجسٹ، حناء ڈائجسٹ، رِدا ڈائجسٹ، حجاب ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، جاسُوسی ڈائجسٹ، سرگُزشت ڈائجسٹ، نئے اُفق، سچی کہانیاں، ڈالڈا کا دسترخوان، مصالحہ میگزین

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی شارٹ کٹس

تمام مُصنفین کے ناولز، ماہانہ ڈائجسٹ کی لسٹ، کِڈز کارنر، عمران سیریز از مظہر کلیم ایم اے، عمران سیریز از ابنِ صفی، جاسُوسی دُنیا از ابنِ صفی، ٹورنٹ ڈاؤنلوڈ کا طریقہ، آن لائن ریڈنگ کا طریقہ،

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براوزر میں لکھیں یا گُوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائیٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اِس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ایما پارکنگ لاٹ کے کونے پر کھڑی دیکھ رہی تھی کہ ایک اسٹیشن ویگن آ کر رکی اور لوسی اس میں سوار ہوگئی۔ ایما نے بھی اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ وہ اسٹیشن ویگن لینکسٹن کے پرانے شہر پر جا کر رکی اور ڈرائیور نے لوسی کو چوراہے پر اتار دیا۔ وہ کچھ دور فٹ پاتھ پر چلنے کے بعد ایک اسٹور میں داخل ہوگئی۔ ایما سست رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے وہاں تک پہنچی۔ وہ ایک ویڈیو آرکیڈ تھا لیکن وہاں کمپیوٹر گیمز کے لیے کمپیوٹر بھی رکھے ہوئے تھے۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے شخص کا وزن چار سو پونڈ سے کم نہیں تھا۔ اس نے پُرامید نگاہوں سے ایما کو دیکھا لیکن فوراً ہی اس کے تاثرات بدل گئے جس سے وہ پریشان ہوگئی اور سوچنے لگی کہ آخر اس نے کیا بات دیکھی جس کی وجہ سے وہ اسے اپنا گاہک نہیں سمجھ رہا۔ اس نے اپنی نیلی جرسی کو نیچے کی جانب کھینچا اور اس کے سامنے سیدھی کھڑی ہوگئی۔

''یہ ویڈیو شاپ ہے میم۔'' اس نے اپنا سر نیچے کیا اور ترچھی نظروں سے گیمز کی قطاروں کو دیکھنے لگا۔

''لیکن ......'' ایما نے لوسی کی تلاش میں دکان پر نگاہ دوڑائی مگر لگتا تھا کہ وہ یہاں سے بھی غائب ہوگئی ہے۔ ''وہ دروازے؟''

''پرائیویٹ۔'' اس نے دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر جماتے ہوئے کہا۔ ''ڈیمسلو اور ڈریگون کے گیم کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے ایک چھوٹی سی ڈسک ایما کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں شکریہ۔'' ایما نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ میں نے اپنی کسی جاننے والی کو آندر آتے دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔ زحمت کے لیے معذرت۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹور سے باہر چلی گئی۔

ایما گھر جاتے ہوئے اپنے آپ کو احمق محسوس کر رہی تھی۔ جب اس نے گنی کو اس بارے میں بتایا تو وہ شک بھرے لہجے میں بولی۔ ''وہ کسی آرکیڈ میں گئی تھی؟''

''ہاں، وہاں مختلف قسم کے گیمز بھی تھے۔''

ایما سوچ رہی تھی کہ وہ گیل کو کس طرح بتائے، بے شک اسے ٹرک لے جانے پر اعتراض نہ ہوتا لیکن یہ لوسی کے بے لگام ہونے کی ایک اور مثال تھی۔ ''وہاں صرف دو لڑکے کمپیوٹر گیم کھیل رہے تھے لیکن لوسی یا کوئی اور لڑکی نہیں تھی۔'' اس نے لمحہ بھر توقف کیا۔ ''عقبی حصے میں دروازے تھے لیکن میں نہیں دیکھ سکی کہ وہ کہاں کھل رہے تھے۔ اس آدمی کا کہنا تھا کہ وہ پرائیویٹ ہیں۔''

''میں معلوم کرلوں گی۔'' گنی نے کہا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں دوبارہ وہاں جانا چاہیے۔ میں جلد از جلد تمہارے پاس آنے کی کوشش کروں گی۔ پھر ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کہتی ہے۔ تمہیں اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ایسا کوئی کام نہیں کرنا۔ میرے آنے کا انتظار کرو۔''

اس نے فون بند کر دیا اور ریفریجریٹر کی طرف چلی گئی۔ لوسی اس کے تصور سے بالکل مختلف ثابت ہوئی تھی لیکن ہر صبح وہ اسے ناشتا کرواتے وقت محسوس کرتی کہ لوسی کو اس کی ضرورت ہے بلکہ وہ پوری سچائی سے یہ اعتراف کرتی تھی کہ خود اسے بھی لوسی کی ضرورت ہے۔ شادی کے بعد جب وہ پہلی بار امید سے ہوئی تو وہ بیٹی کی توقع کر رہی تھی۔ پہلے بیٹے کی پیدائش کے بعد وہ ایک بار پھر لڑکی ہونے کا انتظار کرنے لگی لیکن دوسری بار بھی بیٹا پیدا ہوا۔ اسے دونوں بیٹوں سے بڑا پیار تھا لیکن وہ بیٹی کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔

''وہ ایک طرح کا آرکیڈ ہے۔'' ایما نے اپنے چھوٹے بیٹے مورٹ کو بتایا۔ ''سالویشن آرمی اسٹور سے ذرا آگے۔ کیا تم نے وہ جگہ دیکھی ہے؟''

''میں نہیں سمجھتا کہ وہاں ایسی کوئی جگہ ہے۔ مجھے بالکل بھی یاد نہیں۔ تم خود اس سے کیوں نہیں پوچھ لیتیں؟''

ایما نے مایوس ہو کر کچن کی راہ لی تاکہ رات کا کھانا بنا سکے۔ جب وہ کھانا میز پر لگا رہی تھی تو لوسی حسب معمول اپنے مخصوص کونے میں بیٹھی اسے میز پر کھانا لگاتے اور گیل سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ ایما کو اس تعمیراتی کام کے بارے میں بتا رہا تھا جو اس نے ملحقہ کاؤنٹی میں ایک کمپنی کے لیے شروع کیا تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا اور ایما یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی تھی کہ گیل شاید ٹھیک ہی کہتا ہے۔ وہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔

گیل نے ہاتھ دھو کر تولیے سے خشک کیے اور بولا۔ ''لوسی! کیا تم کھانے کے لیے تیار ہو؟''

''میرا یہی خیال ہے۔'' اس نے کندھے اچکائے لیکن گیل کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

''ہم یہ کونا تمہارے نام کر دیتے ہیں؟'' گیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا بڑا بیٹا سمجھتا تھا کہ سیڑھیوں کے نیچے الماری اس کے لیے بنائی گئی ہے۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی اور اسے استعمال نہیں کرسکتا۔ اسی طرح ہم یہ کونا بھی تمہیں دے رہے ہیں۔''

ایما نے لوسی کی طرف دیکھا۔ اسے امید تھی کہ وہ بھی

جواب میں مسکرا دے گی۔ گیل اس کے ساتھ دل لگی کر رہا تھا اور اس کی آواز بڑی نرم اور مشفقانہ تھی لیکن لوسی کا چہرہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ ایما نے ہاتھ میں پکڑا ہوا فرائی پین رکھا اور اس کی جانب لپکی۔

''لوسی...... لوسی! کیا ہوا ہنی...... مجھے بتاؤ۔'' وہ اسے گلے لگانے کے لیے آگے بڑھی لیکن اس سے پہلے ہی لوسی نے اسے دھکا دے دیا۔ اس کے جبڑے سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔

''مجھ سے دور رہو۔'' وہ سانپ کی طرح پھنکاری اور گیل کے جوتوں کو دیکھنے لگی۔

''ٹھیک ہے ہنی۔'' ایما پیچھے ہٹتے ہوئے بولی اور کچن کاؤنٹر پر چلی گئی۔ اس نے فرائی پین اٹھایا اور جب مڑ کر دیکھا تو لوسی وہاں سے جا چکی تھی۔ انہوں نے سیڑھیاں چڑھنے، دروازہ بند ہونے اور چٹخنی لگنے کی آواز سنی۔ ایما نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

لمحہ بھر خاموش رہنے کے بعد گیل چلتا ہوا اس کونے تک گیا اور نیچے جھک کر کچھ دیکھنے لگا پھر اس نے انگلی سے اس جگہ کو چھوا اور ناک کے پاس لے جا کر سونگھنے لگا۔ ایما اس کے پاس آ کر بولی۔

''یہ کیا ہے؟''

''پیشاب۔'' گیل کھڑا ہو گیا اور اس نے فرش پر نظریں جما دیں۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' ایما نے کہا۔ وہ کچھ پریشان نظر آ رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ گنی نے تمہیں ہر بات نہیں بتائی۔'' گیل اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

ایما جان گئی کہ اس کا شوہر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ لوسی نے اس مہربانی، توجہ، دلچسپی اور پیار و محبت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اسے اس گھر میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے لیکن وہ ابھی تک پہلے روز جیسی ہی تھی۔ ایما کو یہ بھی اعتراف کرنا پڑا کہ لوسی اس کے ساتھ لباس کی تیاری میں کوئی حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ صرف اس کمرے میں موجود رہ کر اسے کام کرتا دیکھتی اور ایک بالغ عورت کی طرح اس پر تنقید کر کے ذہنی اذیت پہنچاتی تھی۔

کئی روز تک لوسی کا تعاقب کرنے کے بعد بھی وہ یہ پتا لگانے میں ناکام رہی کہ لوسی دکان میں داخل ہونے کے بعد کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ نہ تو باتھ روم استعمال کرتی ہے اور نہ ہی مختلف گیم کھیلنے کے لیے وہاں چکر لگاتی ہے چنانچہ اس نے ایک مختلف حربہ استعمال کرنے کی کوشش کی۔ جب لوسی اسٹور میں چلی گئی تو ایما نے اپنی گاڑی کافی فاصلے پر کھڑی کی اور اس گلی میں چلی گئی جو دکانوں کے عقبی حصے کی طرف جاتی تھی۔

یہ ایک یا دو منزلہ عمارتیں تھیں جن کے دروازے اور کھڑکیاں خستہ ہو چکی تھیں۔ ان کے قریب ہی لکڑی کی پیٹیاں اور دوسرا ناکارہ سامان پڑا ہوا تھا۔ ایما عمارتیں گنتی ہوئی آرکیڈ کے عقب میں پہنچ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اندر کا ایک دروازہ باتھ روم میں کھلتا ہے اور دوسرے دروازے سے ایک دفعہ اس نے ایک دفتر کی جھلک دیکھی تھی۔

ایما نے عقبی دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو اس کا ہینڈل گھوم گیا۔ اس نے اسے کھولا اور ایک تاریک ہال میں داخل ہو گئی۔ فرش پر پرانا براؤن رنگ کا کارپیٹ بچھا ہوا تھا اور دیواروں کا گلابی رنگ بھی ماند پڑ چکا تھا۔ سامنے ایک دروازہ تھا جس میں تین کھڑکیاں تھیں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی اور کھڑکیوں میں سے جھانکنے لگی۔ اسے ایک چھوٹی میز نظر آئی جس پر اخبارات اور کافی کے خالی مگ رکھے ہوئے تھے لیکن وہاں کوئی فرد نہیں تھا۔ وہ جس پہلے دروازے کو چھوڑ کر آئی تھی، وہ اس میں نہیں بلکہ کسی دوسرے کمرے میں کھلتا تھا۔

وہ واپس پہلے دروازے پر آئی۔ اس میں بھی تین چھوٹی کھڑکیاں تھیں لیکن کسی نے ان پر اندر کی جانب سے کاغذ لگا دیا تھا۔ ایما نے دروازے کے ساتھ کان لگائے تو اسے لوسی کی آواز سنائی دی۔ ایما کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا۔ اگر وہ وہیں کھڑے ہو کر سنتی اور پکڑی جاتی تو لوسی کی مدد کرنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا لیکن اگر وہ یہاں سے چلی گئی تو وہ کبھی نہیں جان پائے گی کہ لوسی یہاں کیا کرنے آتی ہے اور پھر اسے لوسی کی زندگی بنانے کا کبھی موقع نہیں ملے گا۔

ایما نے نیچے ہو کر کی ہول سے اندر جھانکا تو اسے دو لوگوں کے نچلے دھڑ نظر آئے۔ ان میں ایک لوسی اور دوسرا کوئی مرد تھا لیکن وہ ان کی آوازیں سن سکتی تھی۔ لوسی تاش کے پتے پھینٹ رہی تھی۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم جیت گئے۔'' اس نے کہا۔ اس کی آواز دھیمی، صاف اور جذباتی تھی۔ ''تم میرے پسندیدہ کھلاڑی ہو۔''

لڑکے نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''یہ ایک طویل گیم تھا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ تم بہت اچھا کھیلتی ہو لیکن میں ہر روز ہی جیتتا رہا۔''

''جیسا کہ میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ کوئی ایک ہی فاتح ہوسکتا ہے۔'' لوسی میز پر طبلہ بجاتے ہوئے بولی۔

''کیا میں نے یہ نہیں کہا تھا؟''

''ہاں۔ تم نے یہی کہا تھا۔''

''اگر میں جیت جاتی تو...... لیکن اب تم جیت گئے ہو۔''

''اور جیتنے والا جو چاہتا ہے، وہ حاصل کر لیتا ہے۔'' لڑکے نے معنی خیز انداز میں کہا اور اپنی جگہ سے کھسکنے لگا پھر ایما نے ایک اور آواز سنی۔

''یہ کیا ہے؟'' لڑکے نے پوچھا۔

لوسی نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولی۔ ''چاقو۔''

''لیکن تم نے اسے کیوں کھولا؟''

''اگر کوئی ایسی بات ہو۔''

''کیسی بات؟'' لڑکا گہری سانس لیتے ہوئے بولا۔

''اگر تم کوئی غلط کام کرو۔ میں نے کہا تھا کہ تم جو چاہو کر سکتے ہو، چاہے وہ کوئی بری حرکت ہی کیوں نہ ہو لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' اس نے چاقو اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ محض حفاظت کے لیے ہے۔''

لڑکے نے قہقہہ لگانے کی کوشش کی لیکن تھوک نگل کر رہ گیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے۔''

''تم اپنی خواہش پوری کر سکتے ہو۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔

لڑکا کچھ ہچکچایا لیکن جب ایما نے نظریں ہٹائیں تو اسے کرسی کھسکنے اور اس کے کھڑے ہونے کی آواز آئی۔ ایما کو بہت زور کا چکر آیا اور وہ سہارے کے لیے کوئی چیز ٹٹولنے لگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بند کمرے میں کیا ہو رہا ہے اور نہ ہی جاننا چاہتی تھی۔ اس نے عقبی دروازے کو دھکیلا اور کچرے کے کنٹینر پر آن گری اور اس نے وہیں قے کر دی۔

گنی مارش ہالووین سے ایک ہفتہ پہلے ایما سے ملنے آئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کے پاس بہت کم وقت تھا۔

''ہیلو لوسی، کیسی ہو؟'' اس نے گرم جوش انداز میں لوسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت کچن ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے کچن کی دیواروں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

''مسز سولون نے مجھے بتایا ہے کہ تمہیں کچھ مشکلات پیش آ رہی ہیں۔'' گنی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اس پر بات کر لینی چاہیے۔''

عقلمندی

مغل شہنشاہ اکبر اعظم گو کہ ان پڑھ تھا لیکن نہایت ہی عقل مند بادشاہ تھا۔ ایک دن اس نے اپنے درباریوں سے ایک عجیب سا سوال کر دیا جسے سن کر سب درباری خاموش رہ گئے اور اپنی لاعلمی پر شرمسار ہو کر گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں بیربل دربار میں داخل ہوا اور نہایت ادب سے درخواست کی کہ حضور عالم پناہ دربار میں اس سناٹے کی کیا وجہ ہے۔ شہنشاہ نے کہا کہ میں نے ایک سوال کیا ہے لیکن دربار میں موجود کوئی بھی درباری جواب نہیں دے سکا۔ بیربل نے عرض کی۔ حضور اس ناچیز کو سوال بتائیں ہوسکتا ہے کہ میں جواب دے سکوں۔ بادشاہ نے کہا کہ یہ بتاؤ کہ اس شہر میں کتنے کوّے ہیں۔ بیربل نے فوراً جواب دیا۔ عالم پناہ، شہر میں پانچ ہزار آٹھ سو اناسی کوّے ہیں۔ بادشاہ نے کہا اس کا ثبوت۔ تو بیربل نے کہا حضور والا آپ اپنے سپاہیوں سے گنتی کروا لیں۔ اگر کچھ کوّے زیادہ ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ دوسرے شہروں سے کوّے اپنے رشتے داروں کو ملنے آ گئے ہیں اور اگر کوّے کم ہوئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کچھ کوّے دوسرے شہروں میں اپنے رشتے داروں کو ملنے گئے ہوئے ہیں۔ بادشاہ لاجواب ہو گیا اور بیربل کی عقلمندی پر انعام و اکرام سے نوازا۔

(مرسلہ: جاوید اختر رانا۔ پاکپتن شریف)

گارنٹی

ایک صاحب جوتوں کے بڑے اسٹور پر گئے اور چلّانے لگے۔ ''بڑی گارنٹیاں دیتے ہو۔ جوتی نے تو دو دن بھی نہیں نکالے۔''

منیجر۔ ''ہوا کیا ہے؟''

وہ صاحب بولے۔ ''چوری ہوگئی ہے اور کیا!''

(مرسلہ: محمد یونس چودھری۔ سلطان پورہ، لاہور)

لوسی جواب دینے کے بجائے اسے دیکھنے لگی۔

''اسکول کیسا چل رہا ہے؟''

ایما اس سوال پر حیران ہو گئی کیونکہ وہ اسے تفصیل سے لوسی کی غیر حاضری اور اس پر بات نہ کرنے کے بارے میں بتا چکی تھی۔ اب گنی جو کچھ کر رہی تھی، اس بارے میں وہ خود ہی جانتی ہوگی۔ جب گنی نے کہا کہ وہ لوسی سے اکیلے میں بات کرنا چاہتی ہے تو وہ وہاں سے چلی گئی اور لیونگ روم میں جا کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' گیل نے پوچھا۔ وہ اسی وقت گھر میں داخل ہوا تھا۔

''گنی اور لوسی کچن میں باتیں کر رہی ہیں۔''

اس نے اپنے آپ کو کرسی پر گرا دیا اور بولا۔ ''تم نے اپنے حصے سے زیادہ کام کر لیا اور اپنی طرف سے بہترین کوشش کی۔''

''میں اس سے بھی آگے جانا چاہتی تھی۔''

چند منٹ بعد گیل اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''جانوروں کو چارا دینے کا وقت ہو گیا۔''

گنی مارش نے ایما اور گیل سے وعدہ کیا کہ لوسی کے لیے کوئی دوسرا انتظام کیا جائے گا کیونکہ اسے مہینوں تک اسکول سے غیر حاضر رہنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اگر وہ لوگ اس کی حاضری چیک نہیں کر سکتے تو کوئی دوسرا یہ کام کرے گا۔ یہ سن کر گیل کو غصہ آنے لگا لیکن ایما نے آنکھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔

''اس کے علاوہ ہمیں اس کے کلاس فیلو کے باپ کی جانب سے بھی ایک شکایت ملی ہے۔''

''کیسی شکایت؟'' گیل نے پوچھا۔

''اس نے کسی لڑکے کو زخمی کر دیا تھا۔''

ایما نے گہری سانس لی تو گنی اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہیں اس بارے میں کچھ معلوم ہے؟''

ایما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''دیکھو۔ میں جانتی ہوں کہ تم دونوں اس کا بھلا چاہتے ہو۔'' گنی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ایما جانتی تھی کہ اب اسے اس کیس میں اپنی غلطیوں پر پردہ ڈالنا ہے۔ ایما اور گیل کو صرف یہ بتایا گیا تھا کہ لوسی کو چاقو استعمال کرنے کے جرم میں آزمائشی مدت سے گزرنا پڑا لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ اس نے اپنے سوتیلے باپ پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ اس پر گھریلو تشدد کا الزام تھا۔ پڑوسیوں نے بھی لوسی کا ساتھ دیا۔ اس طرح اس کے جرم کی شدت کم ہو گئی۔

''اگلے ہفتے ہم اسے یہاں سے لے جائیں گے۔'' گنی نے کہا۔

''کیا تم نے اسے بتا دیا؟''

''ہاں۔ وہ جانتی ہے۔''

''کیا وہ یہ بھی جانتی ہے کہ کہاں جا رہی ہے؟'' ایما نے پوچھا۔

''ہم اس کے لیے کسی بہتر جگہ کا انتخاب کریں گے۔'' گنی نے کہا۔ ''گو کہ یہ ایک عیاشی ہوگی۔''

''پھر تم اسے کیوں لے جا رہی ہو؟''

''اس کی شہرت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آرکیڈ......'' گنی نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں لوسی ان کی باتیں نہ سن لے۔ ''ہمارا خیال ہے کہ وہ کارڈ گیم کے علاوہ بھی عقبی کمرا استعمال کرنے کے لیے مالک کو پیسے دے رہی تھی۔ کاؤنٹی کے کسی آدمی نے ایک دن اس کا تعاقب کیا اور اس کی شکایت ہم سے کی۔''

ایما نے سر ہلا دیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا، اس کے بارے میں تھوڑا بہت گیل کو بتا دیا لیکن گنی کو نہیں۔ وہ ایسی بات کسی اجنبی کے سامنے دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے بعد لوسی کے رویّے میں حیرت انگیز تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ گو کہ وہ بیشتر وقت اپنے کمرے میں بند رہتی لیکن ایما کی بات کا جواب نرمی سے دینے لگی۔ اس نے کہے بغیر لیونگ روم میں ویکیوم لگایا۔ برتن خشک کیے اور لانڈری میں ڈالنے کے لیے کپڑے الگ کیے اور جب اس سے کہا گیا تو کتے کو بھی ٹہلانے کے لیے باہر لے گئی۔

وہ اپنا کچھ وقت پورچ میں گزارتی تاکہ ایما اور گیل سے دور رہے۔ وہ بھی سڑک پر ٹہلنے نہیں گئی اور نہ ہی اس نے جنگل کا رخ کیا اور نہ ہی اس نے بھی ان راستوں پر جانے کی کوشش کی جہاں سے ہرن گزرتے تھے۔ ایما کو اعتراف کرنا پڑا کہ وہ فارم میں رہنے کی عادی نہیں ہے۔

''یہ کیا ہے؟'' کچن ٹیبل کے پاس کھڑی لوسی نے ایک ٹن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس میں مختلف قسم کے بسکٹ ہیں۔ یہ کل تم اپنے ساتھ لے کر جاؤ گی۔''

''لیکن میں نہیں جانتی کہ کہاں جا رہی ہوں۔''

''وہ تو میں بھی نہیں جانتی لیکن میرا خیال ہے کہ تمہارے پاس کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جس سے تم لطف اندوز ہو سکو۔''

لوسی نے کھڑکی سے باہر دیکھا اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ عین اسی وقت باہر سے کسی کے چیخنے کی آواز آئی جس نے ایما کو پریشان کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ اس کے شوہر کی آواز تھی۔ اصطبل میں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ اس کا شوہر باڑ کے ساتھ ہی زمین پر پڑا ہوا ہے اور اس سے چند فٹ کے فاصلے پر ان کا بیل سر جھکائے گہری سانس لے رہا تھا۔ اس نے دوشاخہ اٹھایا اور ریلنگ کی طرف جست لگا دی پھر پوری قوت سے وہ دوشاخہ بیل کے سر پر مارا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑایا پھر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر اپنا سر ایما کی جانب گھمایا۔ ایما نے دوبارہ اس کے سر پر وار کیا اور بار بار کرتی رہی۔ یہاں تک کہ اس کے سر سے خون بہنا شروع ہو گیا اور اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ مسلسل اس کے زخموں پر وار کرتی رہی اور دھکیلتی ہوئی تھان تک لے گئی پھر اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

ایما نے دوشاخہ پھینکا اور دوڑتی ہوئی گیل کے پاس گئی جو ابھی تک زمین پر پڑا ہوا تھا۔

''میں ٹھیک ہوں۔ اس نے مجھے کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچایا۔''

''ایمبولینس کو فون کرو۔'' ایما نے چلا کر لوسی سے کہا جو ریلنگ پر جھکی یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی لیکن ایما کے چلانے پر اس نے محض ایک مرتبہ پیچھے دیکھا اور پرسکون انداز میں وہاں سے چلی گئی۔

ایما اور گیل اسپتال سے واپس آئے تو گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ پولیس اور گنی کی معیت میں لوسی اپنے نئے گھر جا چکی تھی۔ وہ نیویارک کے شمال میں واقع ایک ایسا ادارہ تھا جہاں ایسے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کو رکھا جاتا تھا جو لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوں۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' گیل نے ایما کے کمرے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر پوچھا۔

''یہ وہی لباس ہے جو میں لوسی کے ساتھ مل کر تیار کرنا چاہ رہی تھی۔'' وہ سرد آہ بھرتے ہوئے بولی۔

''میں اسے اپنی بیٹی سمجھ رہی تھی جس کی مجھے ہمیشہ سے آرزو رہی۔ میں اسے بڑے ہوتا دیکھنا چاہ رہی تھی۔''

گیل اس کے پاس آیا اور کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''تم نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔

''پھر میں نے سوچا کہ اگر انہوں نے اسے گروپ ہوم میں رکھا، جیسا کہ گنی کہہ رہی تھی تو ہم اس سے متبادل والدین یا کم از کم دوستوں کی حیثیت سے ملنے جاسکیں گے۔'' یہ کہہ کر ایما نے نامکمل لباس تہ کرنا شروع کر دیا۔

''کیا تم اسے مکمل نہیں کرو گی؟''

ایما نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں اپنے لیے نہیں بلکہ لوسی کے لیے بنا رہی تھی۔ یہ رنگ اور ڈیزائن اس کے لیے بالکل مناسب تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ لباس اسے ضرور پسند آئے گا۔ جب وہ دیکھے گی کہ اس پر کیسا لگ رہا ہے لیکن جب اس نے کمر چیک کرنے کے لیے اسے پہنا تو آئینہ دیکھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔''

وہ اس کپڑے کو پلاسٹک کی تھیلی میں رکھتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم نے غور کیا کہ وہ کبھی میک اپ نہیں کرتی تھی جبکہ اس عمر کی لڑکیاں میک اپ کی بڑی شوقین ہوتی ہیں۔''

''اب وہ جہاں گئی ہے، وہ اس کی مدد کریں گے۔'' گیل نے کہا۔ ''گنی ہمارے یہاں آنا چاہتی ہے۔ یہ بتانے کے لیے کہ لوسی کی یہ کیفیت کیوں ہے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' ایما نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تم جانتے ہو گیل۔ اس روز پہلی بار وہ اپنے مخصوص کونے میں نہیں گئی جب اس نے بیل کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ وہ یہ دیکھ کر اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ مجھے کسی سوشل ورکر کی ضرورت نہیں جو مجھے بتائے کہ لوسی کی پرورش کن حالات میں ہوئی۔''

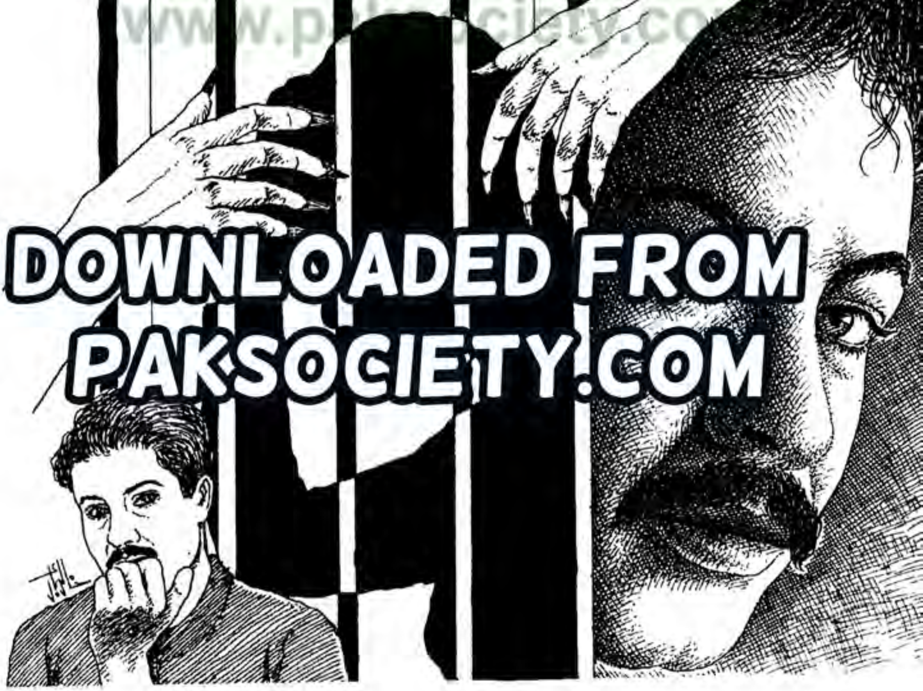
گیل نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی۔ ''وہ اسکول یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ہم کسی بھی روز وہاں جاسکتے ہیں۔''

''ایما! تم اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتیں۔ ایسے بچے ناقابلِ اصلاح ہوتے ہیں۔''

''میں جانتی ہوں گیل۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن میں مسلسل سوچ رہی ہوں کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا؟''

''وہ وہاں سے دو سال بعد چلی جائے گی اور اس دنیا میں اپنی جگہ بنا لے گی۔'' گیل نے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ اس کے بارے میں نہ سوچا جائے۔''

ایما کے لیے اس مشورے پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔



خواب سراب

ناہید سلطانہ اختر

دیارِ غیر میں اپنوں سے دوری بعض اوقات کتابِ زیست کو ایک الگ انداز سے ترتیب دیتی ہے... معاملہ دل کا ہو یا دماغ کا کبھی کبھی عجیب صورتِ حال اختیار کرلیتا ہے... بالخصوص کچّی عمر میں پکّے عہد کرلیے جائیں تو دنیا ادھر سے ادھر ہوجانے کے باوجود یہ پیمان اپنی جگہ قائم رہتے ہیں مگر یہ تماشا بھی دیکھنے میں آیا ہے اکثر جس کی خاطر یہ وعدے کیے جاتے ہیں، اس کے اپنی جگہ پر قائم رہنے کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔ وہ نازک اندام دوشیزہ بھی مصمم عزائم لیے عشق کے میدان میں ایسے اتر آئی کہ ہر قدم پر محبوب کی رضا کی خاطر قربان ہونے کو تیار... اپنی ذات... انا... عزت حتیٰ کہ اپنے خون کے رشتوں کو بھی آنکھ بند کرکے قربان کر ڈالا... اور محبت کے لازوال باب میں گم ہوگئی مگر... اچانک رم جھم برستی گھٹاؤں نے طوفانِ بادوباراں کا روپ دھارا اور کڑکتی بجلی نے جلا کر سب کچھ بھسم کردیا... اور پھر گہری نیند سے جیسے اس کی آنکھ کھل گئی... سارے تلخ حقائق خواب رخیال بن کر رہ گئے... اور سب سے آخر میں اس کا بکھرا وجود کرچی کرچی باقی رہ گیا۔
ہائے... اے عشق ترا تو نام برا... آغاز برا... انجام برا...

ہر موڑ پر چونکاتی لرزہ خیز واقعات اور معاشرتی رویوں کی ایسی دلگداز داستان جو برسوں یاد رہے



حسبِ معمول اپنی سفید بے داغ یونیفارم میں ملبوس ململ کا دوپٹا سر پر اوڑھے، شانے پر بیگ لٹکائے جو ابو سعودی عرب سے اس کے لیے لائے تھے ایمن، کالج جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ اسے اپنے عقب میں کسی مرد کے زور سے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی اور وہ بے دھیانی میں امی کی بے شمار ہدایتوں اور نصیحتوں میں سے ایک کی خلاف ورزی کر بیٹھی، اس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا تھا۔ امی کا کہنا تھا عورت کو مرد کی کھنکھار اور مرد کو عورت کی ہنسی پر پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھنا چاہیے۔ وہ شیطان بھی ہو سکتا ہے!

گردن میں ایک مفلر لپیٹے، سرخ رنگ کی چیک دار... ٹی شرٹ کا گریبان کھولے ایک نوجوان اس کے پیچھے تھا۔ ایمن کو گردن موڑ کر پیچھے دیکھتے پا کر وہ ٹھٹک گیا تھا اور بڑے فلمی سے انداز میں ایک ہاتھ اپنے بالوں پر پھیرتے ہوئے اسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا تھا۔ ایمن دوبارہ اپنے راستے پر چل پڑی۔

گھر سے بس اسٹاپ تک جانے کے لیے ایمن کو روزانہ لمبا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔ گھر کی گلی سے علاقے کے چھوٹے سے بازار تک تو صبح کے وقت خاصی چہل پہل ہوتی۔ بازار میں دودھ دہی اور عام اجناس کی دکانیں اور دونوں بیکریاں صبح ہی کھل جایا کرتی تھیں۔ باقی بازار رفتہ رفتہ دن چڑھے کھلتا۔ صبح سویرے کھل جانے والی دکانوں پر خریداروں کی آمدورفت صبح ہی شروع ہو جاتی۔ پھر ریلوے لائن کی چڑھائی، پٹری عبور کر کے ڈھلوان راستہ جو بتدریج مین روڈ کی سطح پر چلا جاتا۔ میدان میں صبح کے وقت لوگوں کی آمدورفت عموماً اس وقت شروع ہوتی جب کام پر جانے والے مرد اپنے گھروں سے بس اسٹاپ کی طرف جاتے یا کالونی میں غیر مقیم دکاندار بس اسٹاپ سے اپنی دکانوں کی طرف آتے۔ بچے زیادہ تر کالونی کے آس پاس اسکولوں میں پڑھتے۔ کالج، یونیورسٹی جانے والے لڑکے، لڑکیاں اپنے اپنے حساب سے نکلتے۔ ایمن کی آتے جاتے کبھی کبھار کسی لڑکی سے ملاقات ہو جاتی مگر ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ اسے طویل میدان اور ریل کی پٹری سے عموماً سناٹے ہی میں گزرنا پڑتا۔ شروع شروع وہ اس سناٹے سے بہت ڈرا کرتی تھی مگر رفتہ رفتہ عادی ہو گئی تھی۔ گھر سے نکلتی تو امی آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کر دیا کرتی تھیں۔

ایمن کا گھرانا چار نفوس پر مشتمل تھا۔ سمن، شاہد اور ان کے دو بچے، ایمن اور چھوٹا بیٹا دانش جو گھر کے نزدیک ہی ایک پرائیویٹ اسکول میں پڑھتا تھا۔ ایمن نے میٹرک کالونی کے گورنمنٹ سیکنڈری اسکول سے کیا تھا۔ اچھا اسکول تھا، کالونی کے زیادہ تر بچے اسی اسکول میں پڑھتے تھے۔ پرائمری تک بچے اور بچیاں اکٹھے پھر چھٹی جماعت میں لڑکیاں سیکنڈری اسکول کے گرلز سیکشنز میں اور لڑکے بوائز سیکشن میں چلے جاتے۔ گرلز اور بوائز سیکنڈری سیکشنوں کے درمیان ایک دیوار تھی۔ دونوں کے صدر مدرس بھی علیحدہ تھے گرلز سیکشن کی خاتون اور بوائز کا ایک مرد۔

میٹرک میں ایمن نے اپنے اسکول میں سب سے زیادہ نمبر لیے تھے۔ وہ ایک پڑھاکو اور محنتی طالبہ تھی۔ اپنی اساتذہ کی پسندیدہ اور ساتھی طالبات میں اپنی ذہانت اور عمدہ تعلیمی نتائج کے باعث مقبول۔ طبعاً وہ ایک سادہ اور منکسر المزاج سی لڑکی تھی۔ اساتذہ کا احترام کرتی، ساتھیوں سے مل جل کر رہتی۔ اپنی ذہانت ولیاقت پر کبھی نہ اتراتی تھی۔

میٹرک کے بعد اس کا داخلہ گھر سے دور ایک کالج میں کرا دیا گیا تھا۔ اگرچہ کالونی کے نزدیک بھی ایک کالج تھا مگر اس کے اسکول کی اساتذہ نے صلاح دی کہ اسے کسی معیاری کالج میں داخلہ لینا چاہیے جہاں اسے پڑھائی میں مقابلے کا بہتر ماحول میسر آ سکے چنانچہ سمن نے شاہد سے مشورہ کر کے اسے گھر سے دور ایک کالج میں داخل کروا دیا جہاں آنے جانے کے لیے اسے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا پڑتا۔

شاہد عرصہ دراز سے معاش کے سلسلے میں سعودی عرب میں مقیم تھے۔ امی سے ان کی شادی میں ان کی سعودی عرب میں ملازمت نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان دنوں جب کسی لڑکی کے لیے بیرونِ ملک ملازمت کرتے کسی نوجوان کا رشتہ آتا تو لڑکی والے ہاں کرنے میں دیر نہیں کرتے تھے۔ سمن نے بتایا تھا کہ شاہد سے ان کی شادی صرف ایک ہفتے کے اندر ہو گئی تھی کیونکہ جب شادی کی بات چیت چلی تو شاہد کو چھٹی پر سعودی عرب سے پاکستان آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور وہ کل چار ہفتوں کی چھٹی پر آئے تھے۔ شاہد کے گھر والوں نے کہا دلہا دلہن کو شادی کے بعد دس پندرہ دن تو ساتھ رہنے کا موقع ملنا چاہیے چنانچہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا قصہ ہو گیا۔

شادی کے بعد بھی شاہد سعودی عرب میں ہی ملازمت کرتے رہے تاہم سالانہ چھٹی کے دوران پاکستان آنا جانا رہا۔ امی شادی کے بعد کئی سال اپنی سسرال میں مشترکہ نظام خاندان کے تحت رہیں پھر ابو نے انہیں علیحدہ مکان خرید کر دیا اور وہ دونوں بچوں کے ساتھ اس گھر میں رہنے لگیں۔

ایمن کی پیدائش شادی کے دوسرے سال ہوئی۔ شاہد بیٹی کی پیدائش پر بطورِ خاص ایک ہفتے کی چھٹی لے کر پاکستان

آئے۔ وہ بیٹی کی پیدائش پر بھی نہایت خوش تھے۔ ''بیٹی اللہ کی رحمت اور نبی ﷺ کا سلام ہوتی ہے سمن۔'' انہوں نے بیوی سے کہا تھا۔ ایمن کا نام بھی انہوں نے خود ہی رکھا تھا۔

دانش کی پیدائش اس وقت ہوئی جب ایمن اسکول جانا شروع کر چکی تھی۔ دونوں کی عمر میں تقریباً ساڑھے پانچ سال کا فرق تھا۔ دانش کی پیدائش کے بعد شاہد نے سمن کو عمرہ کے لیے سعودی عرب بلایا۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ عمرہ کے بعد سمن دوبارہ پاکستان واپس آ گئیں شاہد وہیں رہے۔

شاہد ایک سعودی کمپنی میں ملازم تھے۔ تنخواہ اچھی تھی۔ سالانہ رخصت اور وطن آمدورفت کا فری ٹکٹ بھی ملازمت کی مراعات میں شامل تھے۔ کمپنی کی جانب سے ملازمین کو مل جل کر رہنے کے لیے بلامعاوضہ رہائش کی سہولت بھی میسر تھی، لہٰذا وہ خوش تھے۔ بیوی بچوں سے دوری ضرور تھی مگر جتنا وہ دیارِ غیر میں کما لیتے تھے، وطن میں رہتے ہوئے اس کا تصور بھی ممکن نہ تھا۔ وہ سمن کو ہر ماہ باقاعدگی سے ایک معقول رقم بھجواتے۔ جب بھی پاکستان آنے جانے والا کوئی شناسا ملتا اس کے ذریعے سمن اور دونوں بچوں کے لیے سعودی عرب سے کچھ نہ کچھ ضرور بھجواتے' سالانہ رخصت پر وطن آتے تو نہ صرف بیوی اور بچوں بلکہ اپنے اور سمن کے گھر والوں کے لیے بھی تحائف لے کر آتے۔

سعودی عرب میں شاہد کی اچھی ملازمت کے باعث گھر میں خوشحالی تھی۔ ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔ وطن عزیز میں محدود اور قلیل وسائل میں گزر بسر کرتے رشتے دار سمن کے مقدر پر رشک کرتے۔ شوہر پردیس میں ملازمت کرتا تھا۔ دوری تھی تو کیا، سمن اور دونوں بچے بافراغت زندگی تو بسر کر رہے تھے۔ سمن کے ہاتھوں میں موٹی موٹی طلائی چوڑیاں کھنکتیں، بٹوا پیسوں سے بھرا رہتا۔ اچھا کھاتیں اور عموماً سعودی عرب سے آئے ہوئے ریشمی کپڑے پہنتیں۔ اچھا کھانے، اچھا پہننے سے بچوں کے چہروں پر بھی خوشحالی کی دمک دکھائی دیتی۔ سمن اپنے میکے اور سسرال میں جہاں بھی جاتیں ہاتھوں ہاتھ لی جاتیں۔ شاہد چھٹی پر آئے ہوتے تو یہ پذیرائی اور بڑھ جاتی۔

شاہد کو اپنے دونوں بچوں سے انتہائی پیار تھا۔ ایمن کو تو وہ ابو کی جان کہتے تھے۔ اسے پکارنا ہوتا تو ایمن کے بجائے ''ابو کی جان'' کہہ کر بلاتے' دانش کہتا۔ ''ابو میرے ہیں۔'' ایمن اتراتی۔ ''ابو سے پوچھو کس کے ہیں ابو۔'' ابو کہتے...... ''دونوں کا!'' پھر دانش کو چمکار کر پیار سے کہتے...... ''مگر باجی تم سے بڑی ہے نا اس لیے ابو اس کے تھوڑے سے زیادہ ہیں۔'' دانش منہ بسورنے لگتا، سمن اسے بہلانے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتیں۔ وہ سمن کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کر کے ایمن کو دیکھتا...... ''میں چھوٹا ہوں نا اس لیے امی میری تھوڑی سی زیادہ ہیں۔'' دانش کا دل رکھنے کو یہ بات سمن نے خود اسے سمجھائی تھی۔

زندگی بڑی خوشحالی اور مزے میں گزر رہی تھی۔ سمن کو شاہد کئی مرتبہ سعودی عرب بلا چکے تھے۔ مستقل اپنے ساتھ رکھنے میں کچھ دشواریاں تھیں۔ کمپنی کی طرف سے انہیں اکثر دور دراز شہروں میں جا کر بھی ملازمتی ذمے داریاں انجام دینا ہوتی تھیں لہٰذا وہ بال بچوں کا مستقل قیام پاکستان ہی میں رہنے کو بہتر سمجھتے تھے۔ سمن اور دونوں بچوں کو انہوں نے حج بیت اللہ بھی کروا دیا تھا۔ سمن خوش تھیں کہ دونوں بچوں نے کم عمری ہی میں وہ سعادت حاصل کر لی تھی جس کے لیے لوگ بڑی عمر میں بےتاب رہا کرتے ہیں۔ خوش بختوں کو ملتی ہے یہ سعادت!

☆☆☆

سمن اور شاہد دونوں کی تمنا تھی کہ ایمن ڈاکٹر اور دانش انجینئر بنے۔ اسی لیے میٹرک میں ایمن نے سائنس گروپ رکھا تھا اور کالج میں پری میڈیکل گروپ کا انتخاب کیا۔

کالج میں ایمن کے داخلے کے دو ڈھائی ماہ بعد شاہد سالانہ رخصت پر گھر آئے تو انہوں نے ایمن کے اچھے نمبروں سے میٹرک پاس کر لینے کی خوشی میں اپنے اور سمن کے رشتے داروں کے لیے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا۔ اس دعوت میں بڑی پھپھو نے باتوں ہی باتوں میں ایمن کا رشتہ اپنے بڑے بیٹے جواد کے لیے جو انجینئرنگ یونیورسٹی کے ساتویں سیمسٹر میں تھا، مانگ لیا۔ جواد دونوں خاندانوں کا سب سے لائق اور وجیہہ لڑکا تھا۔ بہن کی بات پر شاہد نے سمن کو ایک طرف لے جا کر مشورہ کیا۔ اسی دعوت میں ہاں ہو گئی اور بڑی پھپھو نے اپنے ہاتھ میں پہنی ایک انگوٹھی اتار کر بطور شگون ایمن کو پہنا دی۔ رشتہ پکا ہو گیا مگر شادی ایمن کی تعلیم مکمل کر لینے سے مشروط ٹھہری۔ پھپھو کو بھی جلدی نہ تھی، ابھی تو بیٹا پڑھ رہا تھا۔ ایک سیمسٹر ابھی باقی تھا پھر ملازمت کی تلاش اور معاشی اعتبار سے مستحکم ہو کر اپنا بوجھ آپ اٹھانے کے لائق ہونا تھا۔

فرسٹ کزنز ہونے کے باعث ایمن اور جواد کا اکثر ملنا جلنا رہتا تھا۔ دونوں ہی پڑھاکو تھے جب ملتے ان کے درمیان زیادہ تر پڑھائی کے بارے میں ہی بات چیت ہوتی البتہ جواد سے رشتہ طے ہو جانے کے بعد ایمن اس سے بات کرنے میں کچھ جھجکنے لگی تھی۔

کچھ دن پہلے جب چھوٹی پھپھو کے دو بچوں کے ختم قرآن کی تقریب میں جواد کی ایمن سے ملاقات ہوئی تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیا حال چال ہیں مستقبل کی ڈاکٹر صاحبہ کے؟''

''الحمدللہ سب خیر وعافیت ہے۔''

''مریضوں کی لسٹ میں ہمارا نام بھی لکھ لینا۔''

بڑی پھپھو جو قریب ہی موجود تھیں اور دونوں کا مکالمہ سن رہی تھیں، جواد کو آنکھیں دکھاتے ہوئے بولیں۔ ''کیسی باتیں کرتا ہے جواد۔''

''امی جی ڈاکٹروں کے پاس مریض ہی تو جاتے ہیں۔''

پھپھو نے بیٹے کے سر پر ہلکے سے چپت لگائی اور ایمن کو گلے لگاتے ہوئے بولیں۔ ''میری ڈاکٹر بیٹی کا ایک ڈرائیور بھی تو ہوگا...... تجھے ڈرائیور بنتے شرم آتی ہے کیا!''

''یہ ڈرائیور کہاں سے آگیا درمیان میں!'' جواد نے چونکنے کا تاثر دیا۔

''میری ایمن کا ڈرائیور ایک انجینئر ہوگا۔'' پھپھو مسکرائیں۔

ایمن سے جواد کا رشتہ طے کرکے پھپھو بہت خوش تھیں۔ دونوں بھائیوں میں انہیں اپنے اور منجھلی بہن سے چھوٹے بھائی ایمن کے ابو سے بہت پیار تھا۔ دونوں بھائی بہن میں گہری انڈراسٹینڈنگ تھی۔ شاہد جب پاکستان میں ہوتے، بڑی پھپھو کے گھران کا زیادہ آنا جانا رہتا تھا۔

جواد سے ایمن کا رشتہ ہوجانے سے سمن بھی بہت مطمئن تھیں۔ ایمن ڈاکٹر بن جاتی تو کیا...... اس کی شادی تو بالآخر کرنا ہی تھی۔ بیٹیوں کو بٹھاتے تو بادشاہ بٹھاتے۔ صد شکر کہ اپنی بیٹی کے لیے انہیں غیروں کی دہلیز پر نہیں جانا پڑا تھا۔ گھر بیٹھے اپنوں ہی میں اور وہ بھی ایسے لڑکے سے جس پر نہ جانے کتنے لوگ اپنی بیٹیوں کے لیے نظریں لگائے بیٹھے تھے، رشتہ ہوگیا تھا۔ ایمن کی شادی ہونے میں ابھی دن نہیں کئی سال کی بات تھی مگر سمن نے ابھی سے اس کے جہیز کے لیے نہ صرف خود چیزیں خرید کر رکھنا شروع کردی تھیں بلکہ شاہد سے بھی کہہ دیا تھا کہ اب جو چھٹی پر گھر آئیں تو فالتو چیزیں خرید کر لانے کے بجائے ایسی چیزیں لے کر آئیں جو ایمن کے جہیز کے لیے سینت کر رکھی جاسکیں۔

ایمن کے لیے زیور کی سمن کو مطلق کوئی فکر نہ تھی۔ اپنی شادی پر انہیں میکے کی طرف سے تین سیٹ، دو کنگن، کلائی پنجہ اور ماموں کی طرف سے بھاری جڑاؤ نتھ ملی تھی۔ سسرال کی طرف سے چندن ہار اور چمپا کلی کے بھاری سیٹ، چھ طلائی چوڑیاں، ٹیکا، جھومر اور پازیبیں چڑھائی گئی تھیں۔ شادی کے بعد وہ جتنی بار سعودی عرب گئیں، شاہد نے سونے کے زیورات دلوائے تھے بلکہ ایک لاکٹ سیٹ ایمن کو بھی عام پہننے کے لیے خرید کردیا تھا۔ خالص سونے کے دس دس تولہ کے بسکٹ بھی شاہد نے سعودی عرب سے لاکر رکھے ہوئے تھے۔ شاہد کہتا تھا سونا اور زمین خرید کرڈال دینا ہمیشہ فائدہ دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ سونے کی قیمت بھی بڑھتی ہے اور زمین کی بھی۔ اسی لیے شاہد نے ایک رہائشی اسکیم میں اپارٹمنٹ بک کرا رکھا تھا جس کی قسطیں اب ختم ہونے کو تھیں اور قبضہ ملنے میں زیادہ وقت نہ تھا۔ اس اپارٹمنٹ کے علاوہ شاہد نے دو تین پلاٹس بھی خرید رکھے تھے۔ ایمن کی شادی کے خرچے کی سمن کو چنداں فکر نہ تھی۔ ملنے جلنے والوں سے کہتیں۔ ''انشاءاللہ ایمن کی شادی بہت دھوم دھام سے کریں گے ہم لوگ۔''

سب جانتے تھے کہ جس لڑکی کا باپ برسوں سے سعودی عرب میں ہو اور اچھا کمارہا ہو، اسے بھلا کیا کچھ نہیں ملے گا جہیز میں!

سمن تو کیا ایمن کے اپنے پرس میں بھی اس کے اپنے خرچ کے لیے پیسوں کی کوئی کمی نہ ہوتی۔ سمن کے ساتھ بازار جاتی تو جو اس کا جی چاہتا خرید لیتی۔ اسکول کے زمانے میں اور اب کالج میں بھی وہ اپنی دوستوں پر دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔

شاہد تو اس سے اتنا لاڈ کرتے تھے کہ انہوں نے اپنے ایک جاننے والے کے ہاتھ سعودیہ سے ایک موبائل فون بھی بھجوادیا تھا۔ سمن کو وہ پہلے ہی خود لاکر دے چکے تھے۔ ان دنوں موبائل فون ہر ایک کے ہاتھ میں نہیں ہوتا تھا ایمن نے اسے ایک نئی سیلولر فون کمپنی کی سم خرید دی تھی جو اس نے شاہد کے بھجوائے ہوئے فون میں ڈلوالی تھی۔ کالج میں ان دنوں موبائل فون کم لڑکیوں کے ہاتھوں ہی میں ہوتا اور انہیں وہ جن کے ہاتھ موبائل سے خالی ہوتے بڑے رشک سے اور امیر باور کرتے ہوئے دیکھا کرتیں۔ سو کالج میں ایمن کو ایک کھاتی پیتی لڑکی کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔

☆☆☆

ایمن کو اپنے عقب میں کھنکھار دوبارہ سنائی دی۔ اب کی بار اس نے پیچھے دیکھنے سے گریز کیا پھر منہ سے سیٹی بجانے کی آواز آئی۔ راستہ سنسان تھا۔ وہ تیز تیز چلنے لگی۔ قدرے توقف سے گنگنانے کی آواز اس کی سماعت تک پہنچی۔ ایمن کی رفتار اور بڑھ گئی۔ ''اجی سنیں تو۔'' دھیمی آواز میں کہا گیا۔ ایمن پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ قلانچیں بھر کر

چلنے لگی۔ ''گر پڑو گی۔'' پیچھے سے آواز آئی۔
''بدتمیز!'' ایمن نے دل ہی دل میں کہا۔
''بھوت نہیں ہوں بھئی۔''
ایمن بھاگ بھاگ کر چلنے لگی۔ مین روڈ اب نزدیک ہی تھی۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے اسٹاپ تک آ پہنچا۔ بس اسٹاپ پر اور لوگ بھی تھے۔ ان کے ہونے سے ایمن کو تسلی رہی۔ وہ بھی کھڑا ہو گیا اور گاہے بگاہے کن انکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔
بس آئی تو وہ اس خیال سے خائف سی بس میں سوار ہوئی کہ کہیں وہ بھی اسی بس میں سوار نہ ہو جائے مگر ایسا نہیں ہوا۔ سواریاں اٹھانے کے بعد جب بس دوبارہ چلی تو اس نے دیکھا وہ بس اسٹاپ پر کھڑا بس کے زنانہ حصے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

کالج میں اسے بار بار اسی کا خیال ہراساں کرتا رہا۔ توبہ! کیسا عجیب اور مشکوک سا تھا۔ گھر واپسی پر اس نے سمن کو بتایا تو وہ بولیں۔ ''کل صبح میں چلوں گی تمہیں اسٹاپ تک چھوڑنے...... دیکھتی ہوں کون ہے وہ لفنگا۔''
''زیادہ کچھ نہ بولیے گا امی...... بس سمجھا دیجیے گا...... مجھے تو روزانہ اسی راستے سے گزرنا ہوتا ہے۔'' وہ بولی۔
''ہاں ہاں، تم فکر نہ کرو...... دیکھتی تو ہوں وہ ہے کون۔''
اگلی صبح سمن اسے اسٹاپ تک چھوڑنے گئیں تو وہ دور دور تک کہیں نہ دکھائی دیا۔
''کوئی راہ گیر ہوگا...... اپنے علاقے کا ہوتا تو آج بھی آتا جاتا ملتا۔'' سمن نے اسٹاپ پر پہنچنے کے بعد دھیرے سے کہا۔
سمن کے ساتھ ہونے سے وہ بڑی تسلی محسوس کر رہی تھی۔ بس آئی تو سمن اس کی روانگی تک کھڑی رہیں۔ بس حرکت میں آئی تو اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی وہ واپس پلٹ گئیں۔
سمن ساتھ ہوتیں تو اس کے دل سے ہر خوف، ہر خدشہ مٹ جایا کرتا تھا۔ کالج سے واپسی پر سمن نے پوچھا۔
''سب خیریت رہی؟''
''جی امی...... آپ ٹھیک کہہ رہی تھیں...... وہ کوئی راہ گیر ہی ہوگا...... ہماری کالونی کے لڑکے تو ایسے نہیں ہیں۔''
''خیر کالونی کے لڑکے سب تو ایک جیسے نہیں ہوں گے...... بس لحاظ رکھتے ہیں اپنے علاقے کا...... بہر حال تم دیکھ بھال کر جایا کرو۔''
''جی امی۔''

☆☆☆

دو تین دن سمن صبح کے وقت اسے بس اسٹاپ تک پہنچانے جاتی رہیں، وہ نہیں ٹکرایا۔ سمن بھی مطمئن ہو گئیں۔ ایمن کے دل سے بھی خوف جاتا رہا۔ واقعی سمن کا اندازہ درست تھا۔ وہ کوئی راہ گیر ہی تھا جو راستہ سنسان دیکھ کر اس کے پیچھے لگ گیا تھا۔
تیسرے چوتھے دن سمن بازار تک اس کے ساتھ آئیں پھر آیت الکرسی پڑھ کر اس پر دم کرنے اور اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت کرنے کے بعد کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہیں پھر واپس پلٹ گئیں۔ ایمن اکیلی جاتے ہوئے قدرے خائف تھی مگر سمن کو روز روز تکلیف دینا بھی تو مناسب نہ تھا۔ وہ خیریت سے اسٹاپ تک پہنچ گئی۔ کالج پہنچی ہی تھی کہ سمن کی کال آ گئی۔ ''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی بیٹا؟''
''نہیں امی جی۔''
''شکر ہے۔'' سمن مطمئن ہو گئیں۔
لیکن اگلے دن وہ پھر ریلوے لائن کے نزدیک کھڑا ملا۔ ایمن کے قدم ڈانواں ڈول ہو گئے۔ اسے نظر انداز کر کے وہ آگے بڑھی تو وہ بولا۔ ''آج امی ساتھ نہیں آئیں!''
ایمن سراسیمہ ہو گئی۔ یعنی یہ امی کی اور اس کی خوش فہمی تھی کہ وہ کوئی راہ گیر رہا ہوگا۔ اس کی بات سے تو یہ پتا چل رہا تھا کہ وہ نظر رکھے ہوئے تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ساتھ آنے والی خاتون اس کی ماں تھیں۔
''ہو سکے تو امی جان کو میرا اسلام دے دینا۔''
ایمن کی اوپر کی سانس اوپر، نیچے کی نیچے رہ گئی۔ کتنی بدتمیزی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کر رہا تھا وہ!
ریلوے لائن پار کر کے وہ اس کے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ ''مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔''
یہ کیا کہہ رہا تھا وہ! بدتمیز...... آوارہ...... لفنگا کہیں کا!
ایمن کا دل بے تحاشا دھڑکنے لگا۔
وہ اس کے عقب سے اچانک ہی اس کے پہلو بہ پہلو آ گیا۔ ایمن گھبرا کر ہٹی۔ وہ سر جھٹک کر مسکرا دیا اور دھیرے سے بولا۔ ''محبت کرنے والوں سے دور تھوڑی بھاگتے ہیں...... میرے جیسا چاہنے والا تو کسی کسی کو قسمت سے ملتا ہے۔''
ایمن کو سانس لینا دوبھر محسوس ہونے لگا۔
''اپنے گھر والوں کو بھیجوں تمہارے گھر!''
ایمن کی نگاہیں زمین پر گڑی تھیں۔ مین روڈ نزدیک ہی تھا۔

"یو آر سو بیوٹی فل جان!"

خدایا! وہ کیا کہہ رہا تھا...... جان!...... ایمن کے پورے جسم میں سنسنی سی پھیل گئی۔

بس اسٹاپ پر وہ اس سے ذرا دور ہٹ کر کھڑا مسلسل اسی کو دیکھتا رہا۔ بس آئی تو وہ کئی دن پہلے کی طرح دوبارہ بس چلنے تک زنانہ کمپارٹمنٹ کی جانب ٹکٹکی باندھے رہا۔

کالج میں اسے بار بار اس کے جملے یاد آتے رہے۔

دوپہر کو گھر واپس لوٹی تو اس نے ثمن سے اس سے دوبارہ اپنے ٹاکرے کا ذکر نہیں کیا۔ آج تو اس نے عجیب ہی باتیں کی تھیں، ثمن کو کس منہ سے بتاتی۔ اسے تو اس کے جملے یاد کر کے ہی شرم آرہی تھی۔ "مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے...... محبت کرنے والوں سے دور تھوڑی بھاگتے ہیں...... اپنے گھر والوں کو بھیجوں تمہارے گھر...... یو آر سو بیوٹی فل جان۔"

انگریزی بھی جانتا تھا، گویا پڑھا لکھا تھا۔

اس نے ثمن کو کچھ نہیں بتایا۔ پہلی بار وہ ان سے رازداری برت رہی تھی۔ ورنہ اس کی تو عادت تھی جب تک ہر بات ماں کو نہ بتا دیتی، اسے چین نہ آتا...... ماں سے رازداری برتنا اس کی ایسی فاش غلطی تھی جس نے اس کے پیچھے لگے شیطان کو کھل کر کھیلنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

☆☆☆

رات کو جب وہ حسبِ معمول پڑھنے کے لیے بیٹھی تو اس کے جملوں کی بازگشت نے اس کا دھیان کتابوں میں نہ لگنے دیا۔

"مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے!"

"محبت کرنے والوں سے دور تھوڑی بھاگتے ہیں...... میرے جیسا چاہنے والا تو کسی کسی کو قسمت سے ملتا ہے۔"

"اپنے گھر والوں کو بھیجوں تمہارے گھر۔"

"یو آر سو بیوٹی فل جان۔"

کتابوں سے اس کا دھیان بار بار اچاٹ ہوتا رہا۔ وہ اس کے جملوں کی بازگشت میں کھوتی چلی گئی۔ اسے اس بازگشت میں عجیب سا لطف محسوس ہونے لگا۔ اس نے معمول سے پہلے کتابیں سمیٹیں اور بستر پر لیٹ گئی...... اس کے کہے ہوئے جملے بار بار اس کی سماعت میں گونجنے لگے اور دل میں میٹھی میٹھی سی چبھن بھی...... وہ کروٹیں بدلتی رہی...... اس کا جی چاہ رہا تھا وہ پھر ملے اور ایسی ہی باتیں کرے...... اس سے پہلے تو کسی نے اس سے ایسی باتیں نہیں کہی تھیں...... جواد نے بھی نہیں جو اس کا منگیتر تھا...... اس نے ایک دفعہ بھی جھوٹے منہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے...... نہ کبھی اس کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی...... وہ تو دوسری تیسری ملاقات ہی میں اس سے اپنی محبت کا اظہار اور اس کی خوبصورتی کی تعریف بے تکلفی سے کر گیا تھا۔ یہ تو وہ جانتی تھی کہ وہ خاندان بھر کی لڑکیوں میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ خاندان والے اپنے منہ سے کہتے تھے یہ بات...... مگر کسی نوجوان کے منہ سے اس نے پہلی بار اپنے حسن کی تعریف سنی تھی...... خاندان والوں کے تعریف کرنے اور کسی نوجوان کے منہ سے تعریف سننے میں کتنا فرق تھا! خاندان والوں سے اپنی خوبصورتی کی تعریف سن کر تو اس کے دل میں کبھی ایسی میٹھی میٹھی سی چبھن محسوس نہ ہوئی تھی۔

اسے تو پھر ملنا چاہیے...... بار بار ملنا چاہیے...... اور ایسی ہی باتیں کرنی چاہئیں۔

☆☆☆

اگلے دن بس اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے ایمن کی نظریں اسی کو ڈھونڈتی رہیں مگر وہ نظر نہ آیا۔ کالج پہنچ کر اس کا دل پڑھنے میں نہ لگا۔ بار بار اسی کا خیال آتا رہا۔ نہ جانے کیوں نہیں آیا تھا وہ! خدانخواستہ پھر کبھی نہ ملا تو! ایمن کے دل کی بیتابی بڑھ گئی...... اسے آنا چاہیے...... بلکہ ضرور آنا چاہیے...... ورنہ تو وہ...... وہ شاید بن جل مچھلی کی طرح تڑپتی رہے گی۔

کالج سے گھر واپس لوٹتے ہوئے بھی ایمن کی نظریں بس اسٹاپ سے ریلوے لائن تک اور پھر میدان میں بھی اس کی تلاش میں بھٹکتی ہی رہیں مگر اس کا دور دور تک سراغ نہ ملا۔

ایمن کے دل کی بیتابی اور بڑھ گئی۔

اگلی صبح وہ پھر اسی کیفیت سے گزری اور کالج سے واپسی پر گھر جاتے ہوئے بھی دل اسی کے ملنے کی تمنا میں تڑپتا رہا۔

ایمن کو شدید مایوسی ہوئی...... وہ شاید اب کبھی نہیں ملے گا!

مگر تیسرے دن وہ ریلوے لائن کے اس پار موٹر سائیکل پر بیٹھا اسی کی راہ تکتا نظر آ گیا۔ ایمن کے دل کی حالت غیر ہوگئی...... عجیب بات تھی یا تو وہ اس کے ملنے کی دعائیں مانگ رہی تھی اور اب جبکہ وہ نظر آ گیا تھا تو وہ اس کے نزدیک سے اجنبی بن کر گزر جانا چاہتی تھی۔

"سنو!" اسے اپنے عقب سے وہی آواز سنائی دی جسے سننے کے لیے وہ مری جا رہی تھی۔

وہ ٹھٹک گئی اور گردن کو خفیف سا گھما کر ترچھی نظروں سے اسی کی طرف دیکھنے لگی۔

''بیٹھو!'' اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ ''میں چھوڑ دیتا ہوں کالج تک۔''

ایمن کے سارے وجود میں ایک عجیب سا احساس برقی رو کے مانند دوڑ گیا۔ وہ موٹر سائیکل کو کھینچتا اس کے نزدیک آرکا۔ ''سوچ کیا رہی ہو، بیٹھونا۔''

''نہیں...... کوئی دیکھ لے گا۔'' ایمن نے دوپٹے کا کنارا دانتوں میں دباتے ہوئے کہا۔

اس نے اچانک ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ایمن نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''بیٹھو یار...... منہ ڈھک لینا اپنا۔'' اس نے ہینڈل سے لٹکتا ہیلمٹ پہنتے ہوئے کہا۔ وہ تنویمی سی کیفیت میں موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھ گئی اور اندیشوں بھری نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے اپنا دوپٹا آنکھوں کے سوا باقی سارے چہرے پر منڈھ لیا۔ اس نے موٹر سائیکل کو ایڑ لگائی اور بولا۔

''راستہ اونچا نیچا ہے، میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لو۔''

ایمن نے کچھ ہچکچاتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک گدگدی سی اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔

''مضبوطی سے پکڑ لو مجھے۔'' اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کر کے ایمن کے دوسرے ہاتھ تک پہنچایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی کمر کے گرد کر دیا۔

''نزدیک ہو جاؤ۔'' اس نے ڈھلواں راستے سے مین روڈ پر آنے کے بعد کہا۔

موٹر سائیکل سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی اور ایمن کا دل اس کی رفتار کو بھی مات دینے کی کوشش میں تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ بادلوں میں اڑی جا رہی تھی!

کالج سے ذرا پرے اس نے اپنی موٹر سائیکل روکتے ہوئے پوچھا۔ ''یہاں اتار دوں یا گیٹ تک؟''

''یہیں ٹھیک ہے۔'' وہ موٹر سائیکل سے اتر گئی۔

''چھٹی کتنے بجے ہوگی؟''

''دو بجے۔''

''میرا انتظار کرنا...... میں آؤں گا۔''

''دو دن کہاں تھے؟''

''ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اپنی امی کو میری مرمت کروانے نہ لے آؤ۔'' اپنی بات پر وہ خود ہی ہنس دیا۔

''میں نے امی کو بتایا ہی نہیں۔''

''کیا؟''

''وہی جو تم نے اس دن کہا تھا۔''

''آئی لو یو؟'' وہ اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''ہاں۔'' اس نے شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''لو یو میری جان۔'' وہ اسے ہیلمٹ کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''تم بھی کہو...... یو لومی۔''

''آئی لو یو۔''

''تھینک یو...... تھینک یو۔''

''جاؤ...... لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔'' ایمن نے آس پاس گزرتی طالبات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''دیکھنے دو...... محبت کرنے والے ڈرتے نہیں۔'' اس نے موٹر سائیکل کو ایڑ دی اور ایمن نے کالج گیٹ کا رخ کیا۔

''آج بس سے نہیں آئیں؟'' گیٹ ہی کی طرف جاتی اس کی ایک کلاس فیلو نے جو اسے موٹر سائیکل کے نزدیک کھڑے دیکھ چکی تھی، پوچھا۔

''نہیں...... کزن چھوڑ کر گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

اب وہ کالج کی ان چند لڑکیوں میں شامل ہو گئی تھی جنہیں ان کے ''کزنز'' کالج پہنچانے آیا کرتے تھے۔

دوپہر کو چھٹی کے بعد وہ جان بوجھ کر کچھ تاخیر سے کالج سے نکلی، وہ حسبِ وعدہ اسے لینے کے لیے آیا ہوا تھا۔

راستے میں ایک جگہ موٹر سائیکل روک کر اس نے اسے ٹھنڈی ٹھار بوتل پلائی۔

''گرمی بہت ہے تھوڑی ٹھنڈی ہو جاؤ۔'' اس نے کہا۔

ایمن کو اپنا آپ بڑا اہم اور معتبر سا لگا۔ کتنا خیال تھا اسے اس کا۔

کولڈ ڈرنک پیتے ہوئے اس نے بتایا کہ اس کا نام نبیل تھا۔ ایف اے کر چکا تھا۔ بی اے کے دو پرچوں میں رہ جانے کے بعد ان کی تیاری کر رہا تھا۔ باپ کسی دفتر میں ملازم تھا۔ بی اے کے بعد اس کا اپنا ارادہ کسی بینک میں جاب کرنے کا تھا۔ ایمن کے علاقے میں اس کا ایک دوست اپنی فیملی کے ساتھ کرائے کے ایک مکان میں کچھ عرصہ قبل ہی مقیم ہوا تھا۔ اس کی زبانی ایمن کا نام اور خوبصورتی کا ذکر سن کر اس کے دل میں بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق جاگا تھا۔ راشد نامی اس کے اسی دوست نے ایمن کی لاعلمی میں ایک روز کالج سے واپس آتے ہوئے اس کا دیدار کرایا تھا اور بقول نبیل وہ پہلی ہی نظر میں اس پر اپنا دل ہار بیٹھا تھا اور اگلے ہی دن کالج جاتے وقت اس کا پیچھا کرنے آ پہنچا تھا۔ بقول نبیل وہ اس دن یہ تہیہ کر کے اپنے گھر سے نکلا تھا کہ اس لڑکی کو ہر

قیمت پر اپنا بنانا تھا اور اب خوش تھا کہ ایمن نے معمولی رد و کد کے بعد بالآخر "پازیٹو رسپانس" دے دیا تھا۔

"میں نے سوچ لیا تھا ہر قیمت پر اس لڑکی کو منانا ہے۔" اس نے ایمن کو گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اگر میں نہ مانتی تو؟" ایمن نے بڑے ناز سے پوچھا۔

"تو؟" وہ اسے نہایت جذباتی انداز میں دیکھنے لگا۔

"ہاں..... تو؟"

"تم نہیں جانتیں کہ کیا کیا کرنے کا سوچ رکھا تھا میں نے۔"

"کیا؟"

"گلے میں پھندا ڈال کر چھت سے لٹک جاؤں گا..... سینے میں گولی ماروں گا..... تمہاری گلی میں خود کو آگ لگالوں گا..... ریل کی پٹری پر لیٹ کر اپنے جسم کے ٹکڑے کروالوں گا..... زہر کھالوں گا..... نیند کی گولیاں کھا کر اپنی جان دے دوں گا..... میں کچھ بھی کرسکتا تھا ایمن..... کچھ بھی۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ اس نے اپنا ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا تو اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور آنسو..... پھر وہ ہنسا اور منہ اوپر کر کے آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "آئی ایم سو ہیپی..... فیل مائی سیلف سو لکی کہ..... میری محبت نے مجھے مایوس نہیں کیا۔"

ایمن کو عجیب سی خوشی، راحت اور طمانیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ کوئی شخص اس کی محبت میں جان دینے کا بھی سوچ سکتا تھا۔ محبت تو اس سے امی، ابو بھی بے پناہ کرتے تھے مگر آج تک ان دونوں میں سے بھی کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ اس کی محبت میں اپنی جان دے سکتے تھے۔ وہ پہلا شخص تھا جو اس کے لیے اپنی جان دینے کی بات کر رہا تھا۔

ایمن خود کو بہت اعلیٰ، ارفع اور معتبر محسوس کر رہی تھی! نبیل نے اسے ریلوے لائن کے نزدیک اپنی موٹر سائیکل سے اتارا اور اگلی صبح پھر اسی جگہ سے اسے پک کرنے کا کہہ کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

شام کو وہ دانش کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتے ہوئے برآمدے میں رکھی آہنی میز سے اپنا پاؤں ٹکرا کر انگوٹھا زخمی کر بیٹھی۔ خون بھی نکلا اور تکلیف بھی بہت ہوئی۔ لوہے کی چوٹ کے باعث سمن نے ڈاکٹر کو دکھانا ضروری سمجھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگوانے اور انگوٹھے پر پٹی کرانے کی ہدایت کی۔

صبح سمن نے کہا۔ "پاؤں میں تکلیف ہے کالج نہ جاؤ۔"

مگر وہ چھٹی نہیں کرسکتی تھی۔ اسے جو آنا تھا! وہ بند جوتا نہیں پہن سکی۔ انگوٹھے پر پٹی بندھی ہونے کے باعث دو پٹی کی چپل پہن کر جانا پڑا۔ وہ ریلوے لائن کے نزدیک موٹر سائیکل پر منتظر تھا۔ وہ نزدیک پہنچی تو وہ اس کے پٹی بندھے انگوٹھے کی طرف دیکھتے ہوئے تشویش سے بولا۔ "یہ کیا ہوا؟"

"چوٹ لگ گئی۔"

"کیسے؟"

"یہاں سے نکلو تو بتاؤں گی۔" وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔

مین روڈ پر جانے کے بعد اس نے کچھ دور جا کر ایک ایسی جگہ موٹر سائیکل روک لی جہاں نسبتاً سناٹا تھا۔ "ہاں..... اب بتاؤ کیسے لگی چوٹ؟"

"چھوٹا بھائی اور میں پکڑم پکڑائی کھیل رہے تھے، میز کا پایہ لگ گیا۔"

وہ نیچے بیٹھ گیا اور انتہائی فکرمندی سے اس کے پاؤں کا معائنہ کرنے لگا۔ اپنے پاؤں پر اس کے ہاتھ کا لمس ایمن کو ایک عجیب سے احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ دفعتاً اس نے سر جھکا کر اپنے ہونٹ اس کے پاؤں سے مس کر دیے۔ وہ چونکی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

اس نے ایمن کا پاؤں اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ کچھ دیر تنویمی سی کیفیت میں اس کے پاؤں پر سر جھکائے بیٹھا رہا۔ دفعتاً ایمن کو اپنے پاؤں پر پانی کے قطرے ٹپکنے کا احساس ہوا، وہ چونکی۔ دیکھا تو وہ رو رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

اس نے جھکا ہوا سر اٹھا کر ایمن کو دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"تمہارے پاؤں کی یہ چوٹ میرے دل پر لگی ہے میری جان۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"ارے کچھ بھی نہیں..... تھوڑی سی لگی تھی۔" ایمن نے اسے اطمینان دلانا چاہا۔

"اپنا بہت خیال رکھا کرو ایمن..... اپنے لیے نہ سہی میرے لیے میری جان۔" وہ بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

ایمن دھیرے سے ہنسی۔ "ارے بھئی معمولی سی چوٹ ہے، تم خوامخواہ اتنے پریشان ہو رہے ہو۔"

"تمہیں کیا پتا تم میرے لیے کیا ہو ایمن..... میں تمہیں پھانس بھی چبھتے نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے کہا پھر موٹر سائیکل پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے گورے گورے،

چھوٹے چھوٹے پاؤں اپنے دل میں چھپا لینے کو جی چاہتا ہے میرا۔''

ایمن ہواؤں میں اڑنے لگی۔ اسے کیا پتا تھا کہ لچے لفنگے، اوباش نوجوان ایسی ہی باتوں سے لڑکیوں کے دل برماتے اور شیشے میں اتارتے ہیں۔

☆☆☆

چند دن وہ اسے اپنی موٹر سائیکل پر کالج لے جاتا، لاتا رہا پھر ایک دن کالج لے جانے کے بجائے وہ اسے ادھر ادھر گھماتا پھرا۔ چہرہ دوپٹے سے ڈھانپے وہ اس کے ساتھ گھومتی رہی۔ گو اندر سے اس کا دل اس خدشے سے ڈرتا بھی رہا کہ چہرہ ڈھانپے ہونے کے باوجود بھی اگر کسی جاننے والے نے پہچان لیا تو کیا ہوگا۔ خوش قسمتی سے کوئی شناسا نہیں ملا۔

پھر تو آئے دن کا معمول بن گیا کبھی کالج سے پورے ہی دن کی چھٹی کروا کے اور کبھی پیریڈز بنک کرا کے وہ اسے اپنے ساتھ کبھی کسی پارک میں... کبھی ساحل سمندر پر، کبھی کسی تفریح گاہ میں لے جاتا۔ دونوں کونوں کھدروں میں دبکے باتیں کرتے رہتے۔ نبیل اس کو اپنی لچھے دار باتوں سے مسحور و مخمور کیے جاتا۔ اس کی خوب صورتی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے جاتا۔ کبھی اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ کبھی ہاتھ کو اپنے ہونٹوں تک لے جاتا۔ کبھی اس کی زلفوں سے کھیلنے لگتا۔ کبھی اس کے دوپٹے کا پلو پکڑ لیتا اور اسے سونگھ کر گہری سانس کھینچتے ہوئے ایمن کو مست نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتا۔ ''یار! میں تو اس خوشبو کا غلام بن گیا ہوں۔''

ایمن کا پڑھائی میں دل نہ لگتا۔ صبح، شام، اٹھتے، بیٹھتے، گھر، کالج اس کا دھیان بس اسی کی طرف رہتا۔ رات کو کتابیں کھول کر بیٹھتی تو الفاظ گڈمڈ ہو کر نبیل کی شبیہہ بن جاتے۔ اس کی باتوں کی بازگشت کانوں میں رس گھولنے لگتی۔ اس کی انگلیوں کے لمس کا احساس دل کو گدگدانے لگتا۔ رات کی تنہائی میں وہ تنویمی سی کیفیت میں اپنا اور اس کا نام اکٹھے لکھے جاتی۔ پورا صفحہ ایمن نبیل کی تکرار سے بھر جاتا۔ کسی کی نظر پڑنے سے پہلے ہی وہ اس پرچے کو پرزہ پرزہ کر کے ڈسٹ بن میں ڈال دیتی۔

پہلے کی طرح اس نے خانہ دارانہ امور میں سمن کا ہاتھ بٹانے میں دلچسپی لینا بھی چھوڑ دی تھی۔ سمن کو اس سے کوئی گلہ نہ ہوتا بلکہ سوچتیں پڑھائی مشکل ہوگئی ہے نا اس لیے وہ ان کا پہلے کی طرح ہاتھ نہ بٹا پاتی ہے۔

نبیل سے وہ گھر کی ہر بات بڑے اطمینان سے شیئر کرنے لگی تھی۔ ابو کی نوکری، امی کی مصروفیات، دانش کی شرارتیں، خاندانی مسائل اور گھر کے اقتصادی معاملات۔ وہ نہایت توجہ سے سنتا اور خاطر خواہ دلچسپی بھی ظاہر کرتا۔

چھٹی کا دن ایمن سے کاٹے نہ کٹتا کہ اس دن اس سے ملنے کا کوئی راستہ ہی نہ ہوتا۔ نبیل کے پاس موبائل بھی نہ تھا جو وہ امی اور دانش سے چوری چھپے اپنے کمرے میں بند ہو کر اس سے بات یا میسیجنگ ہی کر سکتی۔ امی سے تو احتیاط برتنی لازم ہی تھی، دانش سے بھی رازداری ضروری تھی۔ ایمن کے تو ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا وہ اپنا حق سمجھتا...... یہ کیا ہے؟ ایمن ایسا کیوں ہے؟ وہ اسے اپنے سوالوں سے بیزار کر دیتا۔ چنانچہ اسے اکثر دانش کو ڈانٹنے کی ضرورت درپیش ہوتی۔ ''اپنے کام سے کام رکھو...... اچھا۔'' وہ اسے آنکھیں دکھاتی۔

چھٹی والے دن نبیل سے رابطے میں رہنے کے لیے اس نے ایک روز نبیل سے کہا۔ ''اگر تمہارے پاس بھی موبائل ہوتا تو ہم دونوں رات کو بھی اور چھٹی والے دن بھی بات کر سکتے ہیں۔ اتنی بور ہو جاتی ہوں میں تمہارے بغیر کہ کیا بتاؤں۔''

موبائل فون ان دنوں ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نہ پہنچا تھا۔ باحیثیت یا شوقین لوگ ہی اس کے متحمل ہو سکتے تھے۔ ایمن کو بھی شاہد نے اس سے اپنے غیر معمولی لاڈ کے سبب لا دیا تھا ورنہ اسے بھی اتنی آسانی سے کہاں ملتا۔ ایمن کی بات نبیل نے ایک کان سے سنی دوسرے سے نکال دی لیکن جب یہی بات وہ کئی مرتبہ کہہ چکی تو اس نے کہا۔ ''یار! تمہارے ابو تو کماتے ہیں سعودی عرب میں ریال اس لیے انہوں نے تمہیں موبائل لا دیا...... ہم تو بس سادہ سا فون ہی گھر میں رکھ کر ہر مہینے بل کے چکر میں رہتے ہیں...... لائن مین پتا نہیں کس کس کو ہمارے نمبر سے باہر کی کالیں کروا کے بل ہمارے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ابا اسی کو کٹوانے کے چکر میں رہتے ہیں۔''

''میں ابو سے کہوں گی مجھے اپنی ایک فرینڈ کو موبائل گفٹ کرنا ہے، کسی کے ہاتھ بھجوا دیں...... وہ میں تمہیں دے دوں گی۔''

''ابو یہ نہیں پوچھیں گے کون سی فرینڈ؟''

''نہیں نہیں...... ابو ایسا نہیں پوچھیں گے...... میں ان سے جو بھی فرمائش کروں پوری کر دیتے ہیں...... بہت پیار کرتے ہیں وہ مجھ سے۔''

''مجھ سے زیادہ پیار تمہیں کوئی بھی نہیں کر سکتا۔'' وہ بولا۔

''مجھے پتا ہے۔''

☆☆☆

سالانہ امتحان نزدیک آئے اور کلاسیں معطل ہونے لگیں تو نبیل نے کہا۔ ''اب تو تم بہت دن کے لیے گھر بیٹھ جاؤ گی...... کیسے ملیں گے ہم دونوں؟''

''یہی سوچ سوچ کر میں بھی پریشان ہو رہی ہوں۔''

''پریشان مت ہو...... جس دن تمہارا پیپر ہوا کرے گا میں تمہارے سینٹر پر آ جایا کروں گا۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' وہ خوش ہوگئی۔

کلاسیں معطل ہونے سے دو دن پہلے وہ اسے پہلے سے طے شدہ پروگرام کے تحت اپنے ایک دوست کے فلیٹ میں لے گیا۔ دوست کا تعارف اس نے سمیر کے نام سے کروایا۔ سمیر کچھ دیر ان کے ساتھ رہا پھر ان دونوں کو فلیٹ میں چھوڑ کر خود باہر چلا گیا۔ اکیلے گھر میں نبیل ساری حدیں پھلانگ گیا۔ ایمن کو احساسِ زیاں تھا، نہ گوہر آبدار کھو دینے پر شرمندگی، نہ ہی ماں باپ کی عزت کو داغدار کر دینے پر ملال...... بلکہ ایک نشہ تھا جو اسے مست کیے دے رہا تھا۔

وہ دنوں اس نشے میں ڈوبی رہی۔

☆☆☆

امتحان آئے اور گزر بھی گئے۔ وہ کتابیں کھولے اسی نشے میں گم بیٹھی رہی۔ امتحان کے دنوں میں نبیل اس کے امتحانی مرکز پر آتا اور ملتا رہا۔ ایک دو بار ادھر ادھر بھی لے گیا۔ ایمن کے دل میں اب یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا کہ وہ سرتا پیر صرف اور صرف اس کی تھی۔ کسی اور کا اس پر کوئی حق نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔

ابو نے اس کی فرمائش پر اپنے ایک دوست کے ہاتھ ایک موبائل بھجوا دیا تھا۔

''یہ کون سی دوست کو دینا ہے تم نے؟'' سمن جو اس کی اکثر دوستوں کو یا تو جانتی تھیں یا ان کے ناموں سے واقف تھیں، بولیں۔

''ایک فرینڈ ہے امی۔'' اس نے گول مول سا جواب دیا۔

''نام تو پتا چلے۔'' سمن نے کہا۔

''آپ کو نام سے کیا...... بس ہے نا ایک فرینڈ۔''

سمن کو تعجب ہوا کہ ایمن جو ان سے کوئی بات نہ چھپاتی تھی راز داری برت رہی تھی۔

''ویسے بیٹا! تمہاری عمر کی پڑھنے والی بچیاں اتنے مہنگے تحفے نہیں دیا کرتیں دوستوں کو...... تمہارے ابو اچھے ہیں جو انہوں نے تمہارے کہنے پر تمہاری دوست کے لیے مہنگا تحفہ بھیج دیا...... آئندہ احتیاط رکھنا۔'' سمن نے سمجھایا۔

''آپ کو کیا پتا امی دوستیں، دوستوں کو کتنے کتنے مہنگے تحفے دیا کرتی ہیں۔''

اس نے تنک کر کہا۔

سمن کو اس کے جواب پر غصہ بھی آیا، افسوس بھی ہوا۔ وہ تو ان سے ہمیشہ تمیز سے اور دھیمے لہجے میں بات کیا کرتی تھی۔ یہ کچھ دنوں سے کیا ہو گیا تھا اسے کہ وہ تنک کر جواب دینے لگی تھی۔

''تمہیں تو جیسے بہت پتا ہے۔'' سمن نے غصے سے کہا۔

...... ان کا خیال تھا وہ معذرت کرے گی...... سوری کہے گی...... مگر ایسا کچھ نہ ہوا بلکہ اس نے کہا۔ ''میں نے ابو سے فرمائش کی تھی آپ کو کیوں برا لگ رہا ہے۔''

''تمہیں ابو سے بھی ایسی فرمائش نہیں کرنی چاہیے تھی...... محنت سے کماتے ہیں...... ریال سڑکوں پر نہیں پڑے ہوتے...... روزی کی خاطر وہ بیوی بچوں سے دور پردیس میں پڑے ہیں۔''

''پلیز امی...... چھوٹی سی بات کا اتنا بڑا ایشو نہ کھڑا کریں۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''ایمن!'' سمن اسے حیرانی سے دیکھنے لگیں۔ ''ایشو تو تم کھڑا کر رہی ہو...... میں تمہیں سمجھا رہی ہوں اور تم مجھے تڑاتڑ جواب دے رہی ہو۔''

ایمن شرمندہ ہونے یا معذرت کرنے کے بجائے پاؤں پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ سمن دم بخود اسے دیکھتی رہ گئیں۔ کچھ دنوں سے وہ اس کے رویے میں تبدیلی تو محسوس کر رہی تھیں مگر یوں تابڑ توڑ جواب پہلے کبھی نہیں دیے تھے۔

''بیٹیوں کے بڑے ہو جانے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ وہ ماں سے برابری کرنے لگیں۔'' سمن زیرِ لب بڑبڑائیں۔

نتیجے کا انتظار کیے بغیر ہی کالج میں اگلی جماعتوں کی تعلیم و تدریس کا آغاز ہو گیا۔ ایمن نے ابو کا بھجوایا ہوا موبائل نبیل کو گفٹ کیا تو وہ بولا۔ ''اچھا نہیں لگتا کہ میں تم سے تحفہ لوں...... مجھے تو دینا چاہیے نہ کہ لینا۔'' اس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ وہ یہ بات محض رسماً کہہ رہا تھا۔

''مجھے کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں جو میں تم سے لوں...... ابو نے ڈھیروں چیزیں لا کر دے رکھی ہیں مجھے سعودیہ سے۔''

''ریال جو کما رہے ہیں!'' نبیل نے رشک سے کہا۔

''ابو کے پاس بہت پیسا ہے۔'' ایمن نے اتراہٹ دکھائی۔

"کتنا؟" نبیل مسکرایا۔

"بہت...... کتنے پیسے تو وہ امی کو بھجواتے ہیں گھر کے خرچے کے لیے۔ ایک گھر یہ ہے جس میں ہم لوگ رہتے ہیں۔ ایک اپارٹمنٹ ہے جو ابو نے خرید کر کرائے پر چڑھا رکھا ہے...... پتا نہیں کتنے تو پلاٹ خرید کر ڈال رکھے ہیں ابو نے......اور چیزیں الگ لاتے اور بھجواتے رہتے ہیں سعودیہ سے۔" ایمن شیخی میں بتاتی چلی گئی۔

"مزے ہیں تمہارے!"

"بہت جناب...... امی کہتی ہیں کہ وہ مجھے سونے میں پیلی کر کے میری سسرال بھیجیں گی۔"

"تمہاری پھوپی نے اپنے بیٹے سے تمہارا رشتہ اسی لالچ میں تو نہیں کیا تھا کہیں؟"

"ہوسکتا ہے یہ بات بھی ہو مگر امی بتاتی ہیں کہ پھپھو مجھ سے میرے بچپن ہی سے پیار کرتی تھیں۔"

"مجھ سے زیادہ پیار تم سے کوئی نہیں کرسکتا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" نبیل کی نگاہوں میں ڈولتی معنی خیزی سے جھینپ کر اس نے نظریں چرالیں۔

"میری ہو نا تم؟"

ایمن نے اثبات میں سر ہلایا۔

اچانک اس نے ایمن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے بہت نزدیک کر کے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔" اب اگر کسی اور کو لفٹ کرائی نا تم نے تو......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تو کیا کرو گے؟" ایمن نے جملے کی تکمیل چاہی۔

"شوٹ کر دوں گا تمہیں بھی اور اپنے آپ کو بھی۔"

وہ اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ایمن کا دل کانپنے لگا۔

"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو...... مجھے ڈر لگتا ہے...... نہیں کراؤں گی نا کسی اور کو لفٹ۔"

"گڈ گرل۔"

"اب میں گرل نہیں ہوں...... بڑی ہوگئی ہوں۔"

"ہاں مجھے پتا ہے۔" وہ معنی خیز انداز میں ہنسا پھر اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے بولا۔ "تم سچ مچ بڑی ہوگئی ہو۔"

ایمن نے اس کی بے باک نگاہوں سے جھینپ کر نظریں چرالیں۔ وہ سمیر کے گھر لے جانے کے بعد سے کیسی عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا تھا اسے!

☆☆☆

امتحان کا نتیجہ آیا تو وہ ایک مضمون میں فیل ہوگئی۔ باقی مضامین میں بھی نمبر ایسے نہ تھے کہ میڈیکل کالج میں داخلے کی امید کی جاسکتی۔ اچھے نمبر وہ لیتی بھی کیسے۔ سمن سمجھتی تھیں وہ کمرے کا دروازہ بند کیے پڑھ رہی ہوتی تھی جبکہ وہ تو دوسرے ہی چکروں میں ہوتی تھی...... خیالِ محبوب...... اور اس خیال سے وابستہ بہت سی اخلاقی قباحتیں جن سے وہ تنہائی میں لطف اندوز ہوتی رہتی۔ نبیل اس کے لیے عاشق نہیں معشوق بن گیا تھا۔ وہ اس کی اسیر بن گئی تھی۔ اس سے عشق کا نشہ اس کے سر پر اس طرح سوار ہوگیا تھا کہ اس کا دل، دماغ، حواس سب اسی کی غلامی میں چلے گئے تھے۔ امتحان کے دنوں میں کتابیں اس کے سامنے کھلی ہوتی تھیں مگر اس کا دل و دماغ نبیل کے تصور کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہوتے۔ نظریں کتاب پر مرکوز ہوتیں مگر نگاہوں میں نبیل کا چہرہ رقصاں ہوتا۔ اس کے گھسے پٹے، بدرنگ لباس اور بے ہنگم حلیے میں بھی وہ اپنی پسندیدگی کا کوئی نہ کوئی پہلو تلاش کرلیتی۔ اس کے شانوں تک جھولتے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو میں بھی اسے وجاہت دکھائی دیتی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی وہ دلبری کا جواز ڈھونڈ لیتی۔ اس کی جیب کے ہلکے پن سے بھی وہ ہمدردی محسوس کرتی۔ اس کی قباحتوں میں بھی وہ نفاست ڈھونڈ نکالتی۔ آیا تو تھا وہ اس کے پیچھے لیکن اب اس کا اپنا دل نبیل کے عشق میں دست و پابستہ قیدی بن گیا تھا۔

اس کے امتحانی نتیجے نے سمن کو سخت مایوس اور ناامید کیا۔ اپنے پرائے بھی حیران ہوئے کہ میٹرک میں چورانوے اعشاریہ چھ فیصد نمبر حاصل کرنے والی لڑکی کو کیا ہوگیا تھا جو ایک پرچے میں فیل اور باقی پرچوں میں بھی کچھ اچھے نمبر نہ لے سکی تھی۔ کسی نے کہا پرچے بدل گئے، کسی نے کہا بے ایمانی ہوئی ہے......غرض جتنے منہ تھے اتنی آرا۔

شاہد کو پتا چلا تو انہیں افسوس بھی ہوا اور حیرانی بھی۔ ایمن تو تعلیم میں غیر معمولی دلچسپی لینے اور عمدہ نتائج دکھانے والی بیٹی تھی ان کی، یہ اچانک کیا ہوا تھا!

سمن نے کہا۔ "پڑھا تو اس نے بہت تھا۔ کالج سے آنے کے بعد کمرا بند کر کے پڑھنے جو بیٹھتی تھی تو بس کسی ضرورت سے ہی باہر آتی تھی۔"

"اس سے کہو فرسٹ ایئر دوبارہ ری پیٹ کرے ورنہ میڈیکل کالج میں داخلہ کیسے ہوگا۔"

سمن نے شاہد کی ہاں میں ہاں ملائی۔

مگر ایمن نے صاف انکار کردیا۔ "میں ری پیٹ نہیں کروں گی۔"

"کیوں؟"

''بس...... میری مرضی۔''

نبیل نے اس کا نتیجہ معلوم ہونے پر مسکراتے ہوئے کہا تھا۔''مجھے خوشی ہوئی کہ اب تم میرے بچوں کو ان کے ابا کی بی اے میں سپلیوں کا طعنہ نہیں دے سکو گی۔''

''کتنے بدتمیز ہو تم!''اس نے شرما کر کہا تھا۔

نبیل نے اس کی کلائی پکڑلی تھی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔''یار تمہیں اچھے برے نمبروں کے چکر میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے۔تم نے جتنا پڑھ لیا ہے اتنا بھی نہ پڑھی لکھی ہوتیں تو مجھے اتنی ہی پیاری ہوتیں جتنی اب ہو...... محبوبہ کو بس محبوبہ ہونا چاہیے، عالمہ فاضلہ نہیں...... سمجھیں!''آخری لفظ پر اس نے اپنی انگلی کی پور کو اس کے رخسار پر انگریزی حرف''V''کی بناوٹ میں حرکت دیتے ہوئے اسے گہری نظروں سے دیکھ کر دوسرا ہاتھ اپنے سینے پر رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''ایک کیا تم سارے پرچوں میں بھی فیل ہو جاتیں تو پروا نہیں تھی تم اس دل کے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑی ہو۔''

اس کی ایسی ہی باتیں تو ایمن کے دل کو لوٹ لیتی تھیں۔

چنانچہ جب سمن نے شاہد کی خواہش کے بموجب سال اول کی دہرائی سے اس کے انکار پر کہا......''مرضی تمہاری چلے گی یا تمہارے ابو کی!''تو وہ نہایت بے خوفی سے بولی۔''میری۔''

''ایمن!''سمن نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

''میری مرضی چلے گی۔''اس نے دوٹوک کہا۔

''تمہاری مرضی کب سے چلنے لگی!''سمن نے نگاہیں ترچھی کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

''میں اب اپنا اچھا برا خود سمجھ سکتی ہوں۔''

''اچھا!''سمن اس کے روبرو آ کھڑی ہوئیں۔

''ابو کو بتادیں مجھے ان کا کیا ہوا رشتہ بھی پسند نہیں۔''

''کیا!''سمن نے اسے ہڑبڑا کر دیکھا۔

''ہاں...... میں کوئی گائے بھینس نہیں ہوں کہ جہاں مرضی آئے باندھ دیا۔''

''آہستہ...... دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔''

''ہوا کریں مجھے پروا نہیں۔''

''بہت زبان چلنے لگی ہے تمہاری۔''

''اپنا اچھا برا سمجھنے لگی ہوں۔''اس نے ماں کا لحاظ کیے بنا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

سمن نے فون پر شاہد سے اس کے رویے کی شکایت کی تو وہ الٹا اسی کی طرف داری کرتے ہوئے سمن کو سمجھانے بیٹھ گئے۔''ارے بھئی ہم اپ سیٹ ہوئے ہیں اس کے رزلٹ سے تو کیا وہ خود نہ ہوگی...... اس کی ذہنی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرو...... کوئی بات نہیں، وہ اگر فرسٹ ایئر ری پیٹ نہیں کرنا چاہتی تو نہ کرے۔تمام بچے ڈاکٹر انجینئر ہی نہیں بنتے...... ہاں البتہ بچوں کو انسان ضرور اچھا بنا چاہیے...... تم اب اس سے کسی بحث میں مت الجھو...... میں بھی اس پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کروں گا...... جو وہ چاہتی ہے وہی کرنے دو اسے۔''

''اور آپ کی بہن جو کہیں گی کہ یہ تو بیٹی کو ڈاکٹر بنانے کو کہتے تھے۔''

''ارے بھئی رشتہ کوئی اس شرط پر تھوڑی طے ہوا ہے...... رشتہ تو ہم بھائی بہن نے اپنی آپس کی محبت میں طے کیا ہے...... اپنے بچوں کو ایک دوسرے سے اور زیادہ قریب کرنے کے لیے...... بڑی آپا ایسا کچھ کہیں گی نہ سوچیں گی...... خیر تم ایمن سے کچھ مت کہو۔''

''جواب دینے لگی ہے برابر سے۔''سمن نے دبی زبان سے اس کی شکایت کی۔

''ہاں، یہ فکر والی بات ہے کہ وہ بڑوں کو جواب کیوں دینے لگی ہے بھلا اور بڑا بھی کون...... ماں! میں چھٹی پر گھر آؤں گا تو سمجھاؤں گا اسے۔ویسے تمہیں سچ بتاؤں سمن ...... بہت تھک گیا ہوں پردیس کاٹ کاٹ کر اب جی چاہتا ہے تم لوگوں کے ساتھ ہی رہوں۔''

''میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اب آپ ہمارے ساتھ ہی رہیں۔آپ کا انتظار کر کر کے میں بھی ادھ موئی ہو جاتی ہوں۔''

''اپنی خوشی سے کون رہتا ہے اپنوں سے دور...... دعا کرو اللہ کوئی راستہ نکالے ہمارے ساتھ رہنے کے لیے۔''

☆☆☆

کالج میں نئی کلاسز کا آغاز ہوتے ہی پھر وہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔نبیل کا موٹر سائیکل لے کر آنا اور اسے اپنے ساتھ بٹھا کر کالج لے جانا، واپسی پر کالج سے لینا اور گھر کے نزدیک چھوڑ دینا...... کسی جاننے والے کے دیکھ لینے یا ملنے کے خوف سے پک اینڈ ڈراپ کے مقامات میں آئے دن تبدیلی ہوتی رہتی اور آئے دن ہی وہ اسے کالج لے جانے کے بجائے یا کالج کے اوقات کے دوران پیریڈز بنک کروا کے ادھر ادھر بھی لے جاتا۔آتی سردیوں کے دن تھے۔اسی دوران خلاف توقع شاہد وقت سے پہلے ہی چھٹی پر آ گئے۔پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ انہوں نے اپنے آنے کی پیشگی

اطلاع بھی نہیں دی۔ سمن، ایمن، دانش تینوں ہی ان کی اچانک آمد پر حیران رہ گئے۔ سمن کے استفسار پر شاہد نے اپنی اچانک آمد کی یہ توجیہہ بتائی۔ ''پتا نہیں کیوں طبیعت کچھ دنوں سے بے چین تھی۔ تم لوگ بہت یاد آرہے تھے۔ میں نے کمپنی کو درخواست دی کہ جلدی چھٹی پر جانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری اچھی کارکردگی کی وجہ سے اجازت دے دی۔ بس آگیا۔''

ہمیشہ کی طرح شاہد سب کے لیے تحائف اور سعودی عرب کی متبرک سوغاتیں لائے تھے۔ سامان کھول کر شاہد نے سمن، ایمن اور دانش کو ان کی چیزیں دے کر اپنے اور سمن کے خاندان والوں کے چھوٹے موٹے تحائف اپنے چرمی صندوق ہی میں رہنے دیے۔ سمن، شاہد اور دانش کی نظریں بچا کر ایمن نے ''بروٹ'' کی شیشی اور دھوپ کا مردانہ چشمہ ابو کے صندوق سے نکال کر اپنے کمرے میں چھپالیا۔ شاہد 'بروٹ'' جواد کو اور دھوپ کا چشمہ اپنے چھوٹے بھائی کو دینے کے لیے لائے تھے۔ ارادہ تھا کہ جب رشتے داروں سے خود ملنے کے لیے جانا ہوا یا وہ خود ملنے کے لیے آئے تو جس جس کے لیے جو تحفہ لائے ہیں، دے دیں گے۔

ایمن اگلے ہی دن خوشبو اور چشمہ اپنے بیگ میں نہایت رازداری سے چھپا کر نبیل کے لیے لے گئی۔ دونوں ایک پارک میں بیٹھے تھے۔ نبیل نے چشمے کا معائنہ کیا اور ایمن کو دیکھ کر آنکھیں مٹکاتے ہوئے بولا۔ ''چشمہ تو فٹ ہے یار۔''

''برانڈڈ ہے۔'' ایمن فخر سے بولی۔

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''لو...... تم برانڈڈ نہیں جانتے......'' ایمن نے اس کی کم علمی پر حیرت ظاہر کی۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔

''اچھی اور بڑی کمپنیوں کی چیزوں کو برانڈڈ کہتے ہیں۔'' ایمن نے بتایا پھر بھویں اچکاتے ہوئے بولی۔ ''ابو ہمیشہ اچھی چیزیں لاتے ہیں...... ذرا پرفیوم بھی تو چیک کرو۔''

نبیل نے بظاہر اپنا اشتیاق اس سے چھپاتے ہوئے بروٹ کی شیشی پیکنگ سے نکالی۔ ہلکا سا اسپرے کیا۔ لمبی سانس کھینچی اور مست ہو کر بولا۔ ''واہ واہ ہے بھئی! بہت زبردست۔''

ایمن کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ ''ابو جواد کے لیے لائے تھے۔ میں ان کے سوٹ کیس سے چپکے سے نکال کر تمہارے لیے لے آئی۔'' ایمن نے کچھ اس طرح کہا جیسے کوئی غیر معمولی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔

''پھر تو تم نے بڑا نیک کام کیا! حق کو حقدار تک پہنچادیا۔''

''کیا مطلب؟''

''میرے دل کی ملکہ۔'' اس نے بے محابا اس کا رخسار چھوتے ہوئے کہا۔ ''جواد کی جگہ تو میں لے چکا ہوں نا۔''

''جواد منگیتر ہے میرا۔'' ایمن نے اسے چھیڑا۔

''قتل کردوں گا۔''

''کسے؟'' وہ مسکرائی۔

''جواد کو بھی اور تمہیں بھی۔''

''مجھے خوامخواہ!'' وہ ادا سے بولی۔

''تم اگر میری نہیں بنوگی تو کسی اور کی بھی نہیں بننے دوں گا تمہیں۔''

''اور اگر امی ابو نے زبردستی کی تو؟''

''تو میں سلطان راہی کی طرح سینہ تان کر ان کے بھی سامنے آجاؤں گا۔'' ایمن کھلکھلا کر ہنس دی۔

''ہنستی ہو تو اس دل میں قیامت مچادیتی ہو۔''

''واقعی؟''

''تمہاری قسم...... اچھا سنو قیامت سے قیامت تک دیکھی ہے تم نے؟'' اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا اور نبیل کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے گنگنانے لگی۔

''اے میرے ہمسفر اک ذرا انتظار......''

نبیل نے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کیا اور اس کے سر سے سر لگا کر اس کے ساتھ گانے لگا۔ ''سن صدائیں دے رہی ہیں منزل پیار کی۔'' ایمن ایک عجیب سی سرشاری محسوس کر رہی تھی!

☆☆☆

گھر میں گمشدہ تحائف کی ڈھنڈیا پڑی ہوئی تھی۔ سمن جو شاہد کے سوٹ کیس کی تمام پوشیدہ جیبوں کو بھی کئی بار ٹٹول چکی تھیں ایک مرتبہ پھر کھنگالتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

''میں نے خود رکھی تھیں دونوں چیزیں اس میں باقی چیزوں کے ساتھ۔''

''پریشان مت ہول جائیں گی۔'' شاہد انہیں تسلی دے رہے تھے۔

''ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ میں نے دونوں چیزیں خود اپنے ہاتھوں سے رکھی تھیں آپ کے سوٹ کیس میں...... پھر بھی میں نے سارا گھر چھان مارا...... ایک ایک الماری دیکھ لی...... کہیں نہیں ملیں دونوں چیزیں۔''

''ہوسکتا ہے میں ہی وہاں بھول آیا ہوں یا ائیرپورٹ

پر کہیں ادھر ادھر ہو گئی ہوں دونوں چیزیں۔"

"آپ نے مجھے اندھی یا دیوانی سمجھ رکھا ہے کہ ایک چیز دیکھی نہیں رکھی نہیں اور اپنے سر لوں گی کہ میں نے خود رکھی تھی...... خوشبو بھی اور چشمہ بھی، دونوں چیزیں میں نے اپنے ہاتھوں سے رکھی تھیں سوٹ کیس میں...... ہاں لاک البتہ نہیں کیا تھا میں نے سوٹ کیس۔"

بالآخر گھر میں کام کرنے کے لیے آنے والی ماسی مشکوک ٹھہری۔

"مجھے تو اسی کی کارستانی لگتی ہے...... ویسے پہلے بھی اس نے ایسا کیا تو نہیں مگر کسی چیز پر انسان کا ایمان برا ہوتے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔"

"اچھا تم پریشان مت ہو۔" شاہد نے کہا۔

"پریشان کیسے نہ ہوں...... گھر سے چیزیں گئی ہیں اور آپ کہتے ہیں میں پریشان نہ ہوں...... پوچھوں گی میں ماسی سے۔"

"نہ، نہ ایسی غلطی مت کرنا...... بغیر ثبوت کے کسی غریب پر الزام لگانے سے اللہ ناراض ہوگا۔"

"الزام نہیں لگا رہی ہوں، پوچھوں گی۔"

"پوچھنا، شبہ ہی کرنا ہوا نا...... جانے دو...... گھر میں پہلے کی جو چیزیں پڑی ہوں، انہی میں سے کچھ نکال دینا جواد اور چھوٹو کے لیے۔" شاہد چھوٹے بھائی کو پیار سے چھوٹو کہا کرتے تھے۔

"وہ تو خیر میں نکال ہی دوں گی مگر حیرت مجھے اس بات پر ہے کہ دونوں چیزیں گئیں کہاں۔"

"جہاں گئیں جانے دو۔"

ایمن جو نہ صرف انجان بنی ہوئی تھی بلکہ دونوں چیزوں کی تلاش میں سرگرمی سے ثمن کی مدد و معاون بھی بنی رہی تھی، چپ چاپ دیکھتی اور سنتی رہی۔ نبیل سے ملاقات ہونے پر اس نے یہ ساری کتھا مزے لے لے کر اسے سنائی۔

"تم پر شبہ نہیں ہوا امی ابو کو؟" نبیل نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"توبہ کرو...... اتنی کچی تھوڑی ہوں میں...... بات ہضم کرنے پر آؤں تو کوئی اگلوا نہیں سکتا مجھ سے۔"

"اچھا!"

"جناب عالی!" اس نے اترا کر کہا۔

"ایسے ہی تھوڑی عاشق ہوا ہوں میں تم پر...... کچھ دیکھ کر ہی عشق کیا ہے تم سے...... تم نہیں جانتیں ایمن کتنی محبت کرتا ہوں تم سے۔"

"تم بھی نہیں جانتے نبیل کہ میں تم سے کتنا پیار کرنے لگی ہوں۔"

"بائی دی وے کتنا؟"

"جتنا مجھے امی ابو سے بھی نہیں...... دانش سے بھی نہیں۔"

"کبھی میری خاطر چھوڑنا پڑا انہیں تو چھوڑ دو گی؟"

"ہاں...... چھوڑ دوں گی۔" اس نے ایک لمحہ بھی سوچنے میں نہیں لگایا۔ نبیل گنگنانے لگا۔

☆☆☆

ہر سال کی طرح اس سال بھی تعلیمی اداروں میں ہم نصابی سرگرمیاں شروع ہو چکی تھیں۔ عموماً یہ سلسلہ پندرہ بیس دن تک جاری رہتا۔ ایمن اسکول کے زمانے سے نیٹ بال کھیلتی رہی تھی، سو کالج ٹیم میں بھی شامل کر لی گئی تھی۔

شاہد کو آئے چوتھا پانچواں دن تھا۔ ایمن کو نیٹ بال فائنل کے لیے اپنی ٹیم کے ساتھ ایک دوسرے کالج جانا تھا۔ صبح وہ امی کو یہ بتا کر گھر سے نکلی کہ میچ کھیلنے کے لیے دوسرے کالج جانا تھا ہو سکتا ہے دیر ہو جائے لہٰذا وہ پریشان نہ ہوں۔ مگر نبیل اسے زبردستی اپنے اسی دوست کے گھر لے جانے کو بضد ہو گیا جہاں وہ اسے پہلے بھی لے جا چکا تھا۔ دوست کی فیملی پھر اپنے آبائی گاؤں گئی ہوئی تھی۔

"نبیل! آج تو مجھے میچ کھیلنے جانا ہے، آج تو تم مجھے مجبور مت کرو۔" ایمن نے مجبوری ظاہر کی۔

"یار! اس کی فیملی کل واپس آرہی ہے۔ آج موقع ہے۔"

"پرابلم ہو جائے گی۔"

"تمہارے ہاں ٹیم میں ریزروڈ کھلاڑی نہیں ہوتیں کیا؟"

"ہوتی تو ہیں مگر اسپورٹس ٹیچر مجھ ہی کو کھلانا چاہیں گی۔"

"دفع کرو اسپورٹس ٹیچر کو۔" نبیل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی منت کی۔

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

اپنے نمایاں کھیل کے باعث وہ ٹیم کی ضرورت تھی۔ کالج والوں نے اسے طلب کرنے کو گھر فون کر دیا۔ فون کرنے والی خاتون کالج کی وائس پرنسپل تھیں۔ ثمن نے ان سے کہا۔ "میڈم ہو سکتا ہے وہ ڈائریکٹ وہیں چلی گئی ہو جہاں اسے میچ کھیلنے کے لیے جانا تھا۔"

"ڈائریکٹ کیسے جا سکتی ہے؟ اسے ٹیم کے ساتھ کالج بس میں جانا تھا۔ پھر بھی میں وہاں فون کر کے پوچھ لیتی ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد ہی وائس پرنسپل کا دوبارہ فون آگیا۔

ایمن وہاں بھی نہیں پہنچی تھی۔

سمن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔شاہد گھر ہی میں تھے انہوں نے سمن کو تسلی دی اور ایمن کے موبائل نمبر پر فون کیا۔ ایک بیل بجی پھر موبائل بند ہوگیا۔شاہد بھی پریشان ہوگئے،نہ تیز رفتار عوامی بسوں کا اعتبار تھا، نہ لوگوں کا۔شہر میں عجیب و غریب واقعات رونما ہوجاتے تھے۔ ٹریفک حادثات تو آئے دن کا معمول بن چکا تھا۔

سمن رونے لگیں۔شاہد نے انہیں تسلی دی۔

''اس کے کالج چلیں۔'' سمن نے کہا۔

''کالج والے تو بتا چکے ہیں کہ کالج نہیں آئی۔''

''پھر؟''

یہ سوال بہت ٹیڑھا تھا۔

''ہوسکتا ہے کسی دوست کے گھر چلی گئی ہو۔''

''جاتی تو مجھے بتا کر جاتی۔''

شاہد سوچ میں پڑ گئے۔

''اٹھیں نا۔'' سمن نے تڑپ کر کہا۔ ''اسے کچھ ہوگیا تو میں مرجاؤں گی۔''

گھر میں گاڑی رکھنے کی ضرورت ہی نہ محسوس کی گئی تھی اب تک۔ شاہد مہمانوں کی طرح آتے چھٹی گزار کر چلے جاتے۔سمن اپنی باہر آمدورفت کی ضرورت رکشا ٹیکسی سے پوری کرلیتیں۔سوال یہ بھی تھا کہ ایمن کو تلاش کرنے کہاں جاتیں۔ بالآخر سمن، شاہد دونوں پریشانی اور فکرمندی کی کیفیت میں گھر سے نکلے۔گھوم پھر کر کالج ہی پہنچے۔ پرنسپل نے اس کی ہم جماعتوں کو بلا کر سمن، شاہد کے سامنے ان سے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کافی دنوں سے وہ کسی ''کزن'' کے ساتھ اس کی موٹر سائیکل پر کالج آ، جارہی تھی۔ اس انکشاف پر سمن اور شاہد نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا پھر نظریں جھکالیں۔ پرنسپل جہاندیدہ تھیں انہوں نے لڑکیوں کو واپس بھیجا اور سمن، شاہد سے بولیں۔ ''آپ لوگوں کے علم میں ہے اس کا کزن کے ساتھ آنا جانا؟''

''جی جی میڈم! ہمارے علم میں ہے......'' شاہد نے اپنے ساتھ بیٹھی سمن کا ہاتھ نہایت رازداری سے دباتے ہوئے پہلو بدلا اور کہا۔ ''دراصل میں ملازمت کے سلسلے میں باہر ہوتا ہوں اور میری مسز ہاؤس وائف ہے۔ ایمن کو میری بہن کا بچہ پک اینڈ ڈراپ کرتا ہے۔''

پردیس کی عطا شاہد کی زیرکی نے پرنسپل کی جہاندیدگی کو چاروں شانے چت کردیا تھا!

☆☆☆

لبوں پر کربناک چپ کی مہر لگائے سمن اور شاہد لٹے پٹے قافلے کے مانند ٹوٹے قدموں سے گھر واپس لوٹ رہے تھے کہ سمن نے شاہد کا بازو پکڑلیا اور ان کی خاموشی ٹوٹ گئی۔

''وہ رہی......'' انہوں نے ریل کی پٹری پر دور ایک سمت انگلی اٹھائی۔شاہد ٹھٹک گئے اور انہوں نے اس سمت دیکھا جدھر سمن نے انگلی سے اشارہ کیا تھا۔ایمن نے اگرچہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ رکھا تھا مگر سمن تو اسے لاکھوں، کروڑوں کے ہجوم میں بھی پہچان سکتی تھیں۔

ایک اجنبی نوجوان کی موٹر سائیکل پر سے جوان بیٹی کو اترتے دیکھ کر شاہد کو اپنے دل کی حرکت رکتی محسوس ہوئی۔وہ جہاں کے تہاں رہ گئے۔موٹر سائیکل ایمن کو اتار کر سرعت سے حرکت میں آئی اور ریل کی پٹری کے ایک حصے کو دھول میں اٹاتی کچے ڈھلواں راستے سے مین روڈ کی طرف چلی گئی۔

ایمن نے چہرے سے دوپٹا ہٹا دیا تھا۔

''ایمن!'' شاہد کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان کی آواز مردہ کنویں سے آتی محسوس ہورہی تھی حالانکہ انہوں نے اسے پورے زور سے پکارا تھا۔

ایمن نے چونک کر آواز کی سمت نظر اٹھائی اور جہاں کی تہاں تھم گئی۔ سمن اور شاہد اپنے اپنے نیم جان وجود کو کھینچتے مردہ لاشوں کی طرح اس تک پہنچے۔

''کہاں سے آرہی ہو؟'' شاہد کی آنکھوں میں آگ سی بھر گئی تھی۔

''کالج سے۔'' اس نے جوتوں سمیت ان دونوں کی آنکھوں میں اترنے کی کوشش کی۔

شاہد کے جبڑے بھنچنے لگے۔

''اور یہ کون تھا؟''

''کون؟'' اس نے دائیں بائیں نظر گھماتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کی۔

شاہد کو اپنی رگوں میں خون ابلتا محسوس ہوا۔

''وہی جو موٹر سائیکل پر چھوڑ کر گیا ہے۔''

''وہ! وہ میری فرینڈ کا بھائی تھا...... میچ ختم ہوا تو میری فرینڈ نے اپنے بھائی سے کہا یہ بے چاری یہاں سے اکیلی کیسے جائے گی...... اسے بھی بٹھالو راستے میں اتار دیں گے اسے۔''

''اور تمہاری سہیلی؟''

''وہ پہلے ہی اتر گئی تھی۔''

شاہد کا ہاتھ اوپر اٹھا اور پوری شدت سے اس کے چہرے پر پڑا۔ ''جھوٹ بولتی ہے...... یہ وہی نہیں ہے جس کے ساتھ تو کالج آتی جاتی رہی ہے۔'' شاہد جو اس سے ہمیشہ

نہایت شفقت سے بات کرنے کے عادی تھے' اچانک ''تو'' پر اتر آئے تھے۔

ایمن کی آنکھوں میں ایک لپک سی ہوئی۔

''اور تم کالج بھی نہیں گئی تھیں آج۔'' سمن گھٹی گھٹی آواز میں بولیں۔

وہ سمجھ گئی دونوں کو بھید پتا چل چکا تھا۔

''اس سے کہو سیدھی طرح گھر چلے۔'' شاہد نے سمن سے کچھ اس طرح کہا جیسے وہ ایمن سے مخاطب ہونے کے بھی روادار نہ رہے ہوں۔

تینوں خاموشی سے چلنے لگے۔ سمن نڈھال ہو رہی تھیں اور شاہد... کو اپنا دل پھٹ پڑنے میں بس کوئی کسر ہی لگ رہی تھی!

☆☆☆

دانش انہیں بستہ دروازے پر رکھے گلی میں کھیلتے ہوئے ملا۔

''کہاں چلے گئے تھے ابو...... کہاں چلی گئی تھیں امی...... میں اتنی دیر سے باہر ہی ہوں۔'' اس نے امی ابو کو دیکھتے ہی گلہ کیا۔ وہ دونوں اس کی بات کا جواب دیے بنا دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ ایمن بھی ان کے پیچھے پیچھے گھر میں داخل ہوئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ دانش کے لیے تینوں کے تاثرات ہی معنی خیز تھے۔ سمن نے اسے خاموشی سے کھانا نکال کر دیا۔ اس نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے آنکھیں دکھا کر پوچھنے کی اجازت نہ دی۔

ایمن نے نبیل کو ٹیکسٹ میسج کر کے صورتِ حال بتا دی تھی جو اسے ڈراپ کر کے اپنے دوست سمیر کے گھر جا پہنچا تھا جہاں وہ ایمن کو دادِ عیش دینے لے گیا تھا۔ وہاں دوبارہ جانے کا مقصد اس کا شکریہ ادا کرنا تھا۔

''کوئی بات نہیں یار جب ہمیں ضرورت پڑے تو ہمیں ایسا موقع فراہم کر دینا۔'' اس نے کہا۔

''ضرور سرکار!'' نبیل اپنے سینے پر ہاتھ دھر کر نیم خم ہوتے ہوئے اظہارِ نیازمندی کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے جگر لڑکی تم نے زبردست پھانسی ہے...... ایک پیس اور مل جائے ایسا تو ادھر پاس کر دینا ہے۔'' سمیر نے بڑے لفنگے پن سے کہا۔

''مشکل ہے پیارے۔''

''کیوں مشکل ہے۔''

''لڑکی جو خوبصورت بھی ہو، ماں باپ کی اکلوتی بھی، باپ سعودیہ میں ریال کماتا ہو اور مالدار بھی ہو...... قسمت ہی سے ملتی ہے...... خیر دیکھوں گا...... نظر میں آئی تو ضرور بتاؤں گا۔''

سمیر کا شکریہ ادا کر کے وہ اس کے گھر سے نکل ہی رہا تھا کہ ایمن کا میسج آ گیا۔

''لے یار! تیری نظر لگ گئی۔'' اس نے سمیر سے کہا۔

''کیا ہوا؟''

''اس کے اماں ابا نے اسے میری موٹر سائیکل سے اترتے دیکھ لیا۔''

''پھر؟'' سمیر نے پوچھا۔

''پھر کیا...... گھبرا رہی ہے بے چاری۔''

سمیر دھیرے سے ہنسا۔ ''اس سے بول گھبرانے کی کیا بات...... جب پیار کیا تو ڈرنا کیا۔''

''لڑکی ہے نا بے چاری۔''

''ابے عشق لڑکا لڑکی کچھ نہیں دیکھتا، بے خطر آگ میں کود پڑتا ہے...... اسے حوصلہ دے جگر...... ہمت بڑھا اس کی...... اس سے بول تو اکیلی نہیں جانِ من میں بھی تیرے ساتھ ہوں...... بلکہ ضرورت پڑی تو میرا جگر سمیر بھی ساتھ ہوگا۔'' سمیر نے سرفروشانہ انداز میں کہا۔

''بہت بہت شکریہ یار...... اسی لیے تو میں یار دوستوں میں تیری دوستی پر فخر کرتا ہوں۔''

سمیر کے گھر سے نکل کر راستے میں موٹر سائیکل روک کر نبیل نے ایمن کو اس کے میسج کا جواب دیا۔ ''کوئی بات نہیں...... تمہارے امی ابو نے دیکھ لیا ہے ہمیں تو دیکھ لینے دو...... تمہارے ساتھ سختی کریں تو صاف کہہ دو ان سے کہ میں اسی سے شادی کروں گی...... تم اکیلی نہیں ہو جانِ من...... تمہارا عاشق تمہارے ساتھ ہے۔ ہاں...... اپنے موبائل سے میرا نمبر اور میسجز ڈیلیٹ کر دینا۔''

☆☆☆

تا دیر گھر میں موت کا سا سناٹا چھایا رہا۔ دانش کے اپنی ٹیوٹر کے گھر جانے کے بعد شاہد نے اس خاموشی کا سینہ چیرا۔ ''جا کر پوچھو اس سے۔''

''کیا! کیا پوچھوں؟'' سمن، شاہد کا منہ دیکھنے لگیں۔

''اب یہ بھی بتانا پڑے گا۔'' شاہد نے سمن سے تلخی سے کہا۔

سمن اٹھیں اور شکستہ قدموں سے چلتی ایمن کے کمرے میں اس کے بیڈ کے کنارے پر یوں جا بیٹھیں جیسے کسی غیر کو اس کے گھر ہونے والی میت کا پرسہ دینے آئی ہوں۔ کچھ دیر

خاموش بیٹھے رہنے کے بعد انہوں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔
''کون ہے وہ؟''
''وہ جو بھی ہے میری اس سے شادی کردیں بس۔''
اس نے جواب دینے میں دیر نہیں کی۔
سمن کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس سے ایسی بات کا سان گمان بھی نہ تھا۔ وہ تو اس گمان میں تھیں کہ ایمن شرمسار بیٹھی ہوگی۔ روئے گی، معافی مانگے گی مگر وہ تو کچھ اور ہی رنگ دکھا رہی تھی۔
''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو!'' امی نے اسے تادیبی نگاہوں سے دیکھا۔
''ہاں...... مجھے پتا ہے۔'' اس نے بے خوفی سے کہا۔
''اور تمہارے ابو اپنی بہن کو کیا جواب دیں گے۔''
''مجھے کیا پتا۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''مجھ سے پوچھ کر تھوڑی کیا تھا آپ لوگوں نے ان کے بیٹے سے میرا رشتہ۔''
''اچھا تو ہم تجھ سے پوچھتے۔'' سمن نے اسے تلملا کر دیکھا۔ اس سے بات کرتے وہ ''تم'' سے ''تو'' پر آگئی تھیں۔ اس کی بے باکی اور بے حجابی سے انہیں کراہیت آرہی تھی۔ ایمن ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو بڑی معصوم، مودب اور شرمیلی سی لڑکی تھی۔ اچانک کیا ہوگیا تھا۔ ہر وقت سر پر دوپٹا اوڑھے رہنے والی وہ لڑکی جو اونچی آواز میں بھی بات نہ کرتی تھی۔ اتنی بلند آہنگ کیسے ہوگئی تھی۔ جواب تو وہ ماں کو کچھ عرصے سے دینے ہی لگی تھی مگر اس بے شرمی کی توقع نہ تھی اس سے کہ وہ اپنی شادی کا تقاضا کررہی تھی!
''سارا خاندان تھوتھو کرے گا۔''
''مجھے کسی کی پروا نہیں۔''
سمن کی سماعت طوفان بلاخیز کی زد میں تھی۔
''ہوش کر ہوش۔'' سمن نے اسے غصے سے دیکھا۔
''میں ہوش ہی میں ہوں...... میری اس سے شادی کردیں بس۔''
''بھول جا...... بھول جا کہ ہم تیری وجہ سے اپنی عزت داؤ پر لگادیں گے۔''
''عزت تو آپ لوگوں کی اس وقت داؤ پر لگے گی جب میں اس کے ساتھ بھاگ کر شادی کرلوں گی۔''
''یا اللہ! یا اللہ!'' سمن نے بے بسی سے چھت کی طرف نظریں اٹھائیں۔ ''یہ چھت گر کیوں نہیں جاتی...... کیوں ہمارا پردہ نہیں ڈھانپ لیتی...... کہاں ہے تو...... کہاں ہے تو میرے اللہ!'' سمن کے سارے جسم پر تناؤ سا طاری ہوگیا۔ مٹھیاں بھینچ کر اپنی پیشانی پر مارتے ہوئے وہ بلک بلک کر رونے لگیں۔ ایمن پر ان کے بلکنے کا مطلق اثر نہ ہوا۔
وہ اسی طرح اکڑی اکھڑی سی بیٹھی رہی۔ سمن شدید کرب سے دوچار تھیں۔ کیا یہ وہی ایمن تھی جو ان کی معمولی سی تکلیف پر ہراساں ہوجایا کرتی تھی۔ رونے لگتی تھی۔ آج ان کے زاروقطار رونے کا بھی اس پر مطلق اثر نہ تھا، بے حسی کا مظاہرہ کررہی تھی جیسے امی سے اس کا کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔
آنسوؤں کا سیلاب تھما اور سسکیاں رکیں تو سمن کچھ دیر سر جھکائے یوں مغموم و مایوس بیٹھی رہیں جیسے زندہ ایمن کے نہیں اس کی میت کے سامنے بیٹھی ہوں۔ ان کے دل میں جوار بھاٹا کی سی کیفیت تھی۔ جس بیٹی کو انہوں نے ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا، وہ نہایت بے دردی سے ان کے دل کی نشتر زنی کرچکی تھی۔ جس بیٹی کی عفت و معصومیت کی وہ آنکھ بند کرکے قسم کھاسکتی تھیں، وہ اس برہنگی سے ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی کہ انہیں اس کی ماں ہونے پر ندامت محسوس ہورہی تھی۔
''سمن!'' باہر سے شاہد کی پکار سنائی دی۔
''جی...... آرہی ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔
جاتے جاتے سمن نے ایمن کو دیکھا۔ وہ بھی انہی کو دیکھ رہی تھی۔ سمن کی نگاہوں میں درد تھا، ملال تھا، بے بسی تھی، گلہ تھا۔ ایمن کی نظروں میں بے حسی تھی، سرفروشی تھی، بے حجابی تھی۔ سمن کا خیال تھا ان کی نگاہوں میں ڈولتا ملال اور بے بسی ایمن کے دل کو برمادیں گے مگر اس نے جارحانہ تیوروں سے سمن کو دیکھتے ہوئے نہایت بے رحمی سے کہا۔
''انہیں بتادیں کہ میں ان کے بھانجے سے شادی نہیں کروں گی۔'' شیطان اس کے سر چڑھ کر ناچ رہا تھا۔
''موبائل کہاں ہے تمہارا؟''
''میرے پاس۔''
''مجھے دو۔''
''کیوں؟''
''بس۔''
''مجھے ضرورت ہوتی ہے۔''
''مجھے پتا ہے جو ضرورت ہوتی ہے...... دو مجھے۔''
...اس نے تکیے کے نیچے رکھا موبائل اٹھایا اور سمن کی جانب بڑھاتے ہوئے چیلنجنگ انداز میں بولی۔ ''موبائل بھی لے کر دیکھ لیں۔''
روزِ حشر تو جب ہوگا سو ہوگا، سمن کو تو وہ بھی روزِ حشر ہی لگ رہا تھا۔ اس کے کمرے سے وہ یوں نکلیں جیسے نامۂ

اعمال بائیں ہاتھ میں تھما دیا گیا ہو۔

دانش ٹیوشن سے گھر واپس آیا تو اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''امی! باجی کمرے میں بند کیوں ہے؟''

''امتحانوں میں وہ کمرے میں بند نہیں رہتی تھی کیا۔'' امی نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''مگر اب تو اس کے امتحان نہیں ہیں۔''

''تمہیں کیوں فکر ہو رہی ہے۔'' سمن جھنجلا گئیں۔

''لگتا ہے آج آپ کا اور ابو کا جھگڑا ہوا ہے۔''

''کیوں!'' سمن نے چونک کر اسے دیکھا۔

''تو پھر آپ دونوں اتنے چپ چپ کیوں ہیں؟''

''اپنے کام سے کام رکھو۔'' سمن نے اسے تنبیہہ کی۔

شاہد کو انہوں نے ایمن سے ہونے والی ساری بات بتا دی تھی۔ پردہ ڈالنے کا کوئی فائدہ نہ تھا اور شوہر سے بات چھپانا سمن کا مسلک ہی نہ تھا۔

☆☆☆

سمن اور شاہد دونوں ہی کے لیے رات گزارنا ایسا رہا جیسے گھر میں ہونے والی موت کے بعد لواحقین کو پہلی رات گزارنا کٹھن لگتا ہے۔ ماں باپ دونوں ہی شدید صدمے اور رنج کی حالت میں تھے۔ سمن کو کسی کل قرار نہ آ رہا تھا۔ کروٹیں بدلتی رہیں۔ رہ رہ کر انہیں یہ خیال ستاتا اور سہاتا رہا کہ جس بیٹی کی طرف وہ کسی بدنظر کی نظر بھی اٹھتے نہیں دیکھنا چاہتی تھیں، اسے وہ مردود نہ جانے کہاں کہاں لے جاتا اور کیا کچھ کرتا رہا ہوگا۔ سمن کی آنکھیں بار بار ڈبڈبائے جا رہی تھیں شاہد بھی کبھی لیٹتے کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ کبھی اٹھ کر بے تابی سے ٹہلنے لگتے۔ کمرے میں قبر کی سی تاریکی تھی اور جان لیوا سناٹا!

رات گئے ایمن کے کمرے کا دروازہ چرچرایا تو سمن اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ گمبھیر سناٹے میں بجلی کا سوئچ دبانے کی آواز آئی اور کچن میں روشنی ہوگئی۔

''بھوک لگی ہوگی نامراد کو۔'' سمن کا دل دکھ بھی رہا تھا کہ جس بیٹی کو بچپن تو کجا اب بھی وہ کبھی کبھی اپنے ہاتھ سے نوالے دیا کرتی تھیں، آج چوروں کی طرح اپنے ہی گھر کے کچن میں گئی تھی...... یقیناً کچھ کھانے پینے کے لیے۔

شاہد نے ایک گہری سانس کھینچی اور دل گرفتگی سے بولے۔ ''سچ ہے اولاد انسان کے لیے نعمت ہی نہیں فتنہ بھی ہے۔''

کچن کی لائٹ بند ہوئی تو سمن بستر سے اٹھ بیٹھیں اور گھٹی گھٹی آواز میں شاہد سے بولیں۔ ''اب کرنا کیا ہے؟''

''اسے گھر سے مت نکلنے دو۔''

''کب تک...... آخر کالج بھی تو جانا ہوگا اسے۔''

''بند کرو کالج بھیجنا۔''

''پڑھائی؟''

''پڑھائی عزت سے بڑھ کر نہیں۔''

''لوگ بھی تو پوچھیں گے گھر کیوں بٹھالیا۔''

''کہنا رزلٹ اچھا نہیں تھا اس لیے...... اب گھر بیٹھ کر پرائیویٹ امتحان دے گی۔''

''اور بڑی آپا...... ان سے کیا کہیں گے؟''

''ان سے بھی یہی۔''

''سوچ لیں۔''

''اب سوچنے کو کیا رہ گیا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے اسے ایک غیر لڑکے کی موٹر سائیکل سے اترتے دیکھ لیا۔ وہ کہہ رہی ہے میری اس سے شادی کر دیں ورنہ اس کے ساتھ بھاگ جاؤں گی...... اب کیا رہ گیا ہے سوچنے کو۔'' شاہد نے دل گرفتگی سے کہا۔

''خدا غارت کرے اس مردود کو۔''

''دعا کرو یہ بھی مر جائے۔''

سمن نے دہل کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا...... اس کی لغزش اپنی جگہ مگر ماں ہونے کے ناتے وہ ایسی دعا بھلا کیونکر کر سکتی تھیں!

☆☆☆

صبح کو ایمن کالج جانے کو تیار ہونے لگی تو سمن نے کہا۔

''کالج جانے کی ضرورت نہیں۔''

''کیوں؟'' اس نے چونک کر سمن کو دیکھا۔

''ابو منع کر رہے ہیں تمہارے۔'' سمن کے لہجے میں خفگی تھی اور انہوں نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔

''میں جاؤں گی۔'' اس کا انداز باغیانہ تھا۔

''جب ابو منع کر رہے ہیں تو کیسے جائے گی۔''

''بے شک منع کریں...... میں جاؤں گی۔''

''تو نہیں جائے گی۔''

''جاؤں گی...... جاؤں گی۔'' اس نے پاؤں پٹخے۔

شاہد ان کی تکرار سن کر اندر آ گئے۔ ''دیکھتا ہوں یہ کیسے قدم نکالتی ہے گھر سے۔'' شاہد نے اسے خونخوار نگاہوں سے دیکھا۔ سمن کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے نکالا اور دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگا دی۔

وہ اندر سے دروازہ دھڑدھڑانے اور اونچی آواز میں ''دروازہ کھولیں...... دروازہ کھولیں'' کی تکرار کرنے لگی۔

دانش جو اسکول جانے کو تیار تھا، سہم کر ایک طرف کھڑا

ہو گیا تھا۔

"تم تو جاؤ۔" شاہد نے اسے اسکول بیگ دیتے ہوئے کہا۔ وہ حیران پریشان ماں کا منہ دیکھنے لگا۔

"کچھ نہیں ہوا ہے...... باجی نے ابو کو کسی بات کا جواب دے دیا تھا اس لیے ناراض ہو رہے ہیں شاہد۔" سمن نے اسے مطمئن کرنے کو کہا۔

دانش کا اسکول گھر کے نزدیک ہی تھا۔ سو وہ پیدل ہی اسکول جایا کرتا تھا۔ سمن اس کی حیرانی پریشانی سو فیصد تو رفع نہ کر سکیں تاہم باپ کے غصے سے اس کے دل میں جنم لینے والا خوف جاتا رہا۔

ایمن کے دروازہ دھڑ دھڑانے اور مسلسل چلانے پر سمن نے شاہد سے کہا۔ "محلے والوں کو آواز جا رہی ہو گی۔"

"جانے دو۔" انہوں نے کہا۔

کل سے اب تک شاہد کے چہرے کی کیفیت ہی بدل گئی تھی۔ چھٹی پر گھر آ کر ان کے چہرے پر جو شگفتگی آ جاتی تھی، وہ مردنی میں بدل گئی تھی۔

کچھ دیر دروازہ دھڑ دھڑا کر اور زور زور سے چلا کر بالآخر... ایمن چپ ہو گئی۔ سمن کو یہ واہمہ ستانے لگا کہ کہیں وہ بند کمرے میں خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں انجام کا تھوڑی سوچتے ہیں، وہ تو بس جوش جذبات میں کر گزرتے ہیں۔

شاہد کو گہری سوچ میں بیٹھے دیکھ کر سمن ان کے نزدیک جا بیٹھیں۔ "کیا سوچ رہے ہیں؟"

شاہد نے تھکی تھکی سی نظروں سے سمن کو دیکھا اور نہایت دل شکستگی سے بولے۔ "سوچ رہا ہوں کہاں غلطی ہو گئی جو یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔"

"آپ سے بھلا کیوں غلطی ہوئی ہو گی...... آپ تو مہمانوں کی طرح آتے تھے، چلے جاتے تھے۔"

"یہ بھی تو غلطی تھی...... پیسے کی طلب میں میری طرح لوگ نکل تو گئے ہیں اپنے گھروں سے مگر پچھتاتے بھی ہیں۔" شاہد کے لہجے میں درد تھا۔

"میں سمجھاؤں گی اسے...... اس شیطان مردود نے اللہ جانے کیا پڑھ کر پھونکا ہے جو اتنی بدتمیزی کر رہی ہے...... ایسی تھوڑی تھی یہ۔ آپ زیادہ پریشان نہ ہوں...... میں اس خبیث کے جادو کا کوئی نہ کوئی توڑ نکال لوں گی۔"

"اس کو زیادہ پڑھانے لکھانے کے خواب چھوڑ دو...... آج آپا کی طرف جاتا ہوں، دیکھتا ہوں ان کا کیا ارادہ ہے۔"

"وہ تو یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ ایمن کے ڈاکٹر بننے کے بعد ہی شادی ہو گی۔" سمن نے کہا۔

"نہیں نہیں...... ان سے کہہ دوں گا اس کا رزلٹ اچھا نہیں آیا ہے۔ میڈیکل کا سوال ہی نہیں اس لیے جلدی اس ذمے داری سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔"

"ذرا حکمت سے بات کیجیے گا...... بیٹی کا معاملہ ہے اور اپنی عزت کا بھی۔ وہ یہ نہ سوچیں کہ اچانک......"

"میں سمجھتا ہوں...... سب سمجھتا ہوں۔" شاہد نے سمن کی بات کاٹی پھر دلسوز لہجے میں بولے۔ "سوچا بھی نہیں تھا کہ جس اولاد کو میں دنیا میں اپنا بہترین دوست اور ہمدرد سمجھتا ہوں، وہ ایسی دشمنی کرے گی مجھ سے۔"

☆☆☆

شاہد بہن کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ دانش اسکول سے آنے کے بعد کھانا...... کھا کر ٹیوشن لینے چلا گیا تھا۔ سمن غسل کر رہی تھیں۔ ایمن دبے پاؤں کمرے سے نکلی اور اچھی طرح اطمینان کر لینے کے بعد اس نے گھر کے نمبر سے نبیل کا موبائل نمبر ملایا۔

"کہاں ہو میری جان ...... مر گیا ہوں تمہیں دیکھے بغیر۔" اس نے ایمن کی آواز سنتے ہی کہا۔

ایمن کا دل بھر آیا۔ "ابو نے مجھے کالج سے اٹھا لیا ہے نبیل ...... کہتے ہیں تو کالج نہیں جائے گی ...... مجھے کمرے میں بند کر دیا ہے...... موبائل چھین لیا۔ ابھی کہیں گئے ہوئے ہیں۔ امی باتھ روم میں تھیں تو مجھے فون کرنے کا موقع مل گیا۔"

"میرے پیار پر اتنا ظلم ...... سمجھانا پڑے گا تمہارے باپ کو۔"

"نہیں نہیں، نبیل! تم سامنے مت آنا ورنہ اور گڑبڑ ہو جائے گی۔"

"سچی محبت کرنے والے کسی سے نہیں ڈرتے یار۔"

"میں بہت پریشان ہوں نبیل۔"

"جب تک نبیل زندہ ہے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہی نہیں۔ جان پر کھیل جاؤں گا تمہارے لیے۔"

"کیا کروں میں؟"

"کسی طرح گھر سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔"

"کیسے نکلوں نبیل؟"

"یار معافی شافی مانگ لو...... تھوڑا رو دھو لو...... سنا ہے عورت کے آنسو سے بڑا کوئی ہتھیار ہی نہیں دنیا میں...... ہاتھ پاؤں جوڑنا پڑیں تو جوڑ لو پر کسی طرح گھر سے باہر نکلو

...... گھر میں بیٹھے رہنے سے کام نہیں بنے گا جان! سمجھ رہی ہونا میری بات۔"

"ہاں...... اچھا نبیل میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتی تم سے...... پلیز دعا کرو کہ ابو جلدی واپس چلے جائیں۔"

"لعنت ہے ایسے ماں باپ پر...... اچھا میری جان۔ تم زیادہ پریشان نہ ہو۔ تم میری زندگی ہو...... موت کے سوا تمہیں کوئی نہیں چھین سکتا اب...... لو یو سویٹ ہارٹ!"

"لو یو نبیل...... اوکے۔"

نبیل سے بات کر کے اس کے دل کو قرار آ گیا تھا۔ بھری دنیا میں وہی ایک اسے اپنا دوست، ہمدرد اور چاہنے والا محسوس ہو رہا تھا۔ ماں باپ اسے اپنے دشمن لگ رہے تھے...... اس کے نزدیک یہ دشمنی نہیں تو اور کیا تھی کہ انہوں نے اس سے موبائل تک چھین لیا تھا۔ کھانے کو پوچھ رہے تھے نہ پینے کو...... امی نہ پہلے کی طرح اس کے لیے ٹرے میں ناشتا، کھانا سجا کر اس کے کمرے میں پہنچا رہی تھیں۔ نہ ابو لاڈ اٹھا رہے تھے۔ کالج جانے پر پابندی لگا کر اسے اس کے کمرے تک محدود کر دیا گیا تھا...... اور ایک نبیل تھا۔ کتنے پیار سے بات کر رہا تھا...... کتنی تسلی دی تھی اس نے...... کون کسی کے لیے جان دیتا ہے مگر وہ تو اس کی خاطر اپنی جان پر کھیل جانے کی بات کر رہا تھا...... اسے اپنی زندگی کہہ رہا تھا...... کون کہتا ہے کسی کو اپنی زندگی...... جب تک کسی کو کسی سے سچی محبت نہ ہو۔ وہ کہہ رہا تھا نا سچی محبت کرنے والے کسی سے نہیں ڈرتے...... وہ تو ابو کے سامنے بھی آنے کو تیار تھا...... وہ واقعی اس کا سچا ہمدرد تھا تبھی تو اس نے گھر سے باہر نکلنے کا راستہ بھی تلاش کرنے کی صلاح دی تھی اور تدبیر بھی بتائی تھی۔ نبیل سے بات کر کے وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

☆☆☆

"تیرا کام تو نکل ہی گیا ہے۔ اس سے کہہ تجھے بھول جائے۔" سمیر نے تمام احوال سننے کے بعد نبیل کا بازو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہوا ہے۔" نبیل نے اسے ٹیڑھی نظروں سے دیکھا۔

دونوں اس ہاؤسنگ اسکیم کی پارکنگ لاٹ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے جہاں سمیر رہتا تھا۔ نبیل اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دونوں میں پرانی اور گہری دوستی تھی۔ اسکول کے زمانے سے وہ ایک دوسرے کے رازدار رہے تھے۔ اسکول سے دیواریں پھلانگ کر بھاگ جانا، اکٹھے آوارہ گردی کرنا، قریبی گرلز اسکول کی لڑکیوں پر تاک لگانا، بازاروں میں بلا سبب گھومتے پھرنا، دکانوں میں گھس جانا اور چیزیں دیکھنے کے بہانے پار کر لینا، سگریٹ کے کش یوں لگانا جیسے جدی پشتی سگریٹ نوش ہوں، اسکول سے بھاگنے پر ٹیچرز سے شکایت کرنے والے لڑکوں کی دھنائی لگانا، اسکول سے باہر بھی ہم عمر اور کبھی کبھی بڑی عمر کے لوگوں سے بھی بات بے بات لڑائی جھگڑا کرنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا۔ اسکول سے کالج میں پہنچے تو گریبان کھولے، سینہ تانے، ہم سا ہو تو سامنے آئے کی تفسیر بنے پھرتے۔ جیبوں میں چاقو اور آہنی پنجہ رکھتے۔ ذرا ذرا سی بات پر چاقو نکال لیتے۔ پڑھائی سے عدم دلچسپی۔ کالج میں ہونے والی ہر الٹی سیدھی واردات میں پیش پیش، اساتذہ بھی ان سے پناہ مانگتے اور اپنی عزت بچاتے تھے۔ ایک مرتبہ پرنسپل نے کالج سے نکالنے کی دھمکی دی تو سینہ تان کر کھڑے ہو گئے کہ ہمیں نکالنے سے پہلے اپنے انجام کا سوچ لیں۔ ایف اے میں سمیر کی دو مرتبہ سپلی آئی تو بیوہ ماں نے اس کی کفالت سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اب مارا مارا پھرتا تھا۔ ماں اور دو چھوٹی بہنیں کسی خوشی غمی میں آبائی گاؤں جاتیں تو ان کی عدم موجودگی میں گھر میں دوستوں کو بلاتا، چائے پلاتا، تاش کھیلتا اور دوستوں سے مانگی سگریٹ کے کش لگاتا۔ نبیل کے حالات بھی کچھ مختلف نہ تھے۔ ایف اے ڈی گریڈ میں پاس کر کے اب بی اے کرنا چاہ رہا تھا مگر اپنی کوشش میں ہنوز کامیاب نہ ہو پایا تھا۔ بوڑھا باپ اور چھوٹا بھائی اس کی حرکتوں سے نالاں رہتے۔ ماں اس کی حرکتوں سے عاجز بھی رہتی اپنے پرایوں سے شرمندہ بھی!

نبیل اور سمیر دونوں ہی ایک دوسرے کے ہمراز تھے۔ ایمن کے معاملے میں کوئی بات نبیل نے سمیر سے راز نہ رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت بھی دونوں اسی معاملے میں سر جوڑے کھڑے تھے۔ ایمن کوئی پہلی لڑکی نہیں تھی۔ دونوں ہی اس سے پہلے بھی علیحدہ علیحدہ کئی لڑکیوں کے ساتھ چکر چلا کر انہیں بے آبرو کر چکے تھے۔ ان کا طریقہ واردات عموماً یہی ہوتا کہ آخر میں لڑکی سے دامن چھڑا لیتے یا منہ چھپا لیتے۔ سو سمیر نے نبیل کو ایمن کے معاملے میں بھی آزمودہ طریقہ کار آزمانے کا مشورہ دیا۔ لیکن نبیل کا مشورہ رد کرنے پر اسے چونکنا لازم ہوا۔ "کیوں پاگل ہونے کی کیا بات...... پہلے بھی تو ہم یہی کرتے رہے ہیں۔"

"پیارے یہ ویسی لڑکی نہیں ہے۔" نبیل نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"ایسی خوبصورت اور سعودیہ میں ریال کماتے باپ کی اکلوتی بیٹی روز روز نہیں ملتی۔"

"یعنی!"

"میں اس کے معاملے میں سیریس ہوگیا ہوں۔"
نبیل نے اپنا ہاتھ سمیر کے شانے پر رکھ دیا اور اس کا شانہ دباتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "شادی تو ایک نہ ایک دن کرنی ہی ہے...... سونے کی چڑیا ہاتھ لگ گئی ہے تو کیوں اڑنے دوں اسے...... ابے ایک گھر یہ جس میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ ایک اپارٹمنٹ جو کرائے پر اٹھا ہوا ہے، کئی کئی پلاٹ، بینک بیلنس، گھر میں آرام کی ہر چیز موجود، پتا نہیں کتنا تو اس کی ماں نے سونا جمع کر رکھا ہے اور وارث صرف دو۔ ایک یہ دوسرا اس کا چھوٹا بھائی...... لڑکی تو ہے ہی قابو میں...... ماں باپ بھی اگر مان جائیں تو گھر بیٹھے مقدر بدل جائے گا تیرے یار کا۔"
"ماں باپ مان جائیں گے؟"
"نہ مانے تو منالیں گے۔"
"کیسے؟"
"ابے لڑکی قابو میں ہے...... تو نے سنا نہیں لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"
"گڈلک پیارے۔"

☆☆☆

"امی پلیز! ایک دفعہ معافی دلوادیں مجھے ابو سے...... آئندہ کبھی شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" ایمن دونوں ہاتھ جوڑے سمن کے سامنے گڑگڑا رہی تھی۔
"ابو بہت مایوس ہوئے ہیں تیری طرف سے۔"
"صرف ایک بار امی...... صرف ایک بار...... آئندہ کبھی شکایت نہیں ہوگی ابو کو اور آپ کو مجھ سے۔"
"ان کا چہرہ نہیں دیکھتی کیا سے کیا ہوگیا ہے۔"
"مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے امی...... مجھے معاف کردیں۔" وہ ماں کے پاؤں پکڑنے کو جھکی مگر سمن الٹے قدموں پیچھے ہٹ گئیں۔
"میں بہت بری ہوں...... بے وقوف ہوں...... بھول ہوگئی مجھ سے۔ بہت شرمندہ ہوں۔" وہ رونے لگی۔
سمن کو اس پر ترس آنے لگا۔ آخر کو اولاد تھی۔ انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اللہ بھی تو ہم انسانوں کی کیسی کیسی غلطیاں معاف کردیتا ہے۔"
اس کے رونے سے ماں کا دل پگھل گیا۔ "اچھا رو مت۔" انہوں نے اپنا ہاتھ اس کے سر پر دھرتے ہوئے کہا۔
"معافی دلوائیں گی نا آپ ابو سے؟" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔
"بات کروں گی۔"

"تھینک یو...... تھینک یو امی جی...... اور مجھے کالج جانے کی اجازت بھی دلوادیں گی نا...... میں پڑھنا چاہتی ہوں۔"
"ہم کون سا کوئی تجھے پڑھانا نہیں چاہتے تھے...... میری تو آرزو تھی کہ تو ڈاکٹر بنے۔" سمن روہانسی ہوگئیں۔
"میں آپ کو ڈاکٹر بن کر دکھاؤں گی۔"
"جا...... جاکر ہاتھ منہ دھو...... گھر میں ماتم سا پڑا ہوا ہے۔"
ایمن آنکھیں پونچھتی باتھ روم میں چلی گئی۔

☆☆☆

"اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے...... بہت شرمندہ ہے...... میرے پاؤں پکڑنے لگی تھی...... اتنا روئی ہے کہ میرا دل کٹنے لگا...... معاف کردیں اسے۔"
"زندگی بھر اس دل پر داغ رہے گا اس کی اس حرکت کا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت آزردگی سے بولے۔
"مجھے آپ کے دکھ کا احساس ہے...... میں بھی تو شریک ہوں اس دکھ میں۔"
شاہد نے ایک ٹھنڈی سانس کھینچی۔
"پہلی غلطی تھی معاف کردیں...... معصوم بچیاں کبھی کبھی بہک جاتی ہیں اور بچیاں کیا بڑی بڑی ہستیاں بہک جاتی ہیں۔"
شاہد چپ رہے۔
"آپ نے مجھے اپنی خوشی سے جو دے دیا سو دے دیا، میں نے آپ سے اپنے منہ سے کچھ نہیں مانگا...... میری خاطر معاف کردیں اسے۔"
شاہد گھائل نظروں سے سمن کو دیکھنے لگے۔
"میری خاطر!" سمن نے خوشامد کی۔
"اس سے کہو آئندہ شکایت کا موقع نہ دے۔" یہ گویا شاہد کی طرف سے معافی کا اعلامیہ تھا۔
"انشاء اللہ نہیں دے گی۔" وہ خوش ہوگئیں اور خوشامدانہ انداز میں ان کا زانو دباتے ہوئے بولیں۔ "اور ہاں...... وہ کالج جانے کی اجازت بھی مانگ رہی ہے...... وعدہ کررہی ہے کہ دل لگا کر پڑھے گی اور ڈاکٹر بن کر دکھائے گی۔"
"نہیں......" شاہد نے صاف انکار کیا۔ "اس سے کہو گھر بیٹھ کر پڑھے۔"
"گھر بیٹھ کر پڑھائی کیسے ہوگی...... سائنس پڑھ رہی ہے، پریکٹیکل ہوتے ہیں اور پھر...... لوگ کیا کہیں گے۔"
"مجھے لوگوں کی نہیں اپنی عزت کی پروا ہے۔"
"عزت پر تو تب بھی حرف آئے گا جب لوگ بیٹی کو

کالج سے اٹھا لینے پر چہ میگوئیاں کریں گے۔"
"تم چاہتی کیا ہو؟" شاہد جھنجلا گئے۔
"اسے کالج جانے دیں اسی میں ہماری عزت ہے۔"
شاہد چپ رہے۔
سمن نے ان کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید کہا۔ "بس کچھ عرصے کی بات ہے۔ انٹر کا امتحان دے دے پھر جو نتیجہ آئے اس کی روشنی میں آپ جو مرضی آئے کریں مجھے گلہ نہیں ہوگا۔"
"ایک شرط پر جائے گی یہ کالج۔" شاہد نے گمبھیر لہجے میں کہا۔
"جی بولیں۔"
"صبح تم اسے بس میں بٹھانے جایا کروگی اور واپسی پر بھی اسٹاپ سے تم ہی لوگی۔"
"ٹھیک ہے۔"

☆☆☆

صبح جب وہ کالج جانے کے لیے گھر سے نکلنے لگی تو سمن نے اسے اپنی چادر اوڑھنے کو دی تھی۔ سمن بس اسٹاپ تک اس کے ساتھ آئی تھیں تمام راستہ وہ مشکوک نظروں سے ادھر ادھر دیکھتی رہی تھیں۔ ساتھ ہی دھیمی آواز اور محتاط لہجے میں اس سے سوال جواب بھی کرتی رہی تھیں۔
"وہ تمہاری کون سی دوست کا بھائی ہے؟"
"کسی کا بھی نہیں...... میں نے آپ کے اور ابو کے ڈر سے جھوٹ بولا تھا۔"
"رہتا کہاں ہے؟"
"پتا نہیں۔"
امی چونکیں۔
"تم سے کیسے جان پہچان ہوئی؟"
"یہیں ایک دن راستے میں مل گیا تھا۔"
"پھر؟"
"اس نے لفٹ دی۔"
"اور تم بیٹھ گئیں؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
"پھر؟"
"پھر بس وہ لفٹ دے کر کالج چھوڑ دیتا تھا۔"
"اور اس دن...... اس دن اس نے کالج کیوں نہیں چھوڑا تھا؟"
"اس کی بائیک راستے میں خراب ہوگئی تھی...... دیر ہوگئی تو وہ کہنے لگا واپس چھوڑ دیتا ہوں۔" ایمن نے بڑی چالاکی اور صفائی سے جھوٹ بولا۔
"اتنی دیر کیوں ہوگئی تھی؟"
"وہ مکینک کے پاس چلا گیا تھا بائیک ٹھیک کرانے۔"
"اور تم؟"
"میں بھی ساتھ تھی۔"
سمن نے ایک گہری سانس کھینچی اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولیں۔
"یہ شیطان کے چیلے ہوتے ہیں۔ سیدھی سادی لڑکیوں کو اپنے چکر میں پھنساتے ہیں، کبھی لفٹ دے کر کبھی کسی اور حیلے بہانے...... تیز اور چالاک لڑکیاں ان کے دام میں نہیں آتیں۔"
سمن کو کیا پتا تھا کہ ان کی اپنی سیدھی سادی اور معصوم بیٹی بھی کتنی چالاک ہوگئی تھی۔ نہایت سعادت مندی سے ان کے ہمراہ چلتے ہوئے وہ مسلسل نبیل ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔
"راستے میں کہیں نظر آئے تو مجھے بتانا۔ وہ جوتے لگاؤں گی کہ ساری زندگی یاد رکھے گا۔"
اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا نبیل کو کیسے پتا چلے گا کہ اس نے پھر کالج جانا شروع کردیا تھا...... ہاں...... تھا ایک ذریعہ...... کالج کے نزدیک واقع پبلک کال آفس جہاں سے کالج کی لڑکیاں بصورتِ ضرورت فون کیا کرتی تھیں۔
"خدانخواستہ اب اگر وہ پیچھے آئے تو منہ نہ لگانا اسے بیٹا! ایسے لفنگوں کا کچھ نہیں جاتا لڑکی بدنام ہوتی ہے۔ لڑکی کے گھر والے بدنام ہوتے ہیں...... سمجھ رہی ہو نا میری بات؟"
"جی امی۔"
بس اسٹاپ پر پہنچنے کے بعد بھی سمن مشکوک نظروں سے دائیں، بائیں، آگے پیچھے دیکھتی رہیں۔ بس آتی دکھائی دی تو سمن نے جلدی جلدی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونکا اور زیرِ لب کہا۔ "فی امان اللہ۔" بس میں سوار ہوتے ہی ایمن نے اطمینان کا سانس لیا۔ سمن اس وقت تک اسٹاپ پر کھڑی بس کے زنانہ حصے کی طرف دیکھتی رہیں جب تک کہ بس دوبارہ نہ چل پڑی۔ بس کے حرکت میں آتے ہی ایمن کو یوں لگا جیسے وہ زندان سے نکل آئی تھی۔ موبائل فون کی اسے اشد ضرورت محسوس ہورہی تھی۔ اس وقت اس کے پاس ہوتا تو وہ نبیل کو میسج کردیتی کہ ان کی بتائی ہوئی ترکیب نے اسے دوبارہ گھر سے نکلنے میں تریاق کا کام کیا تھا!

☆☆☆

صارفین کی ضرورت کے پیش نظر پبلک کال آفس سویرے ہی کھل جاتا تھا۔ ایمن نے بس سے اتر کر کالج کی طرف جاتے ہوئے راستے میں رک کر پبلک کال آفس سے نبیل کو فون کیا۔

ناشناسا نمبر سے کال موصول ہونے پر نبیل کی خواب آلودہ سی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے بے؟''

''میں۔'' پی سی او آپریٹر کی وجہ سے ایمن ایک کونے میں منہ دبکا کر بات کر رہی تھی۔

''تم!'' اس کی آواز میں چونکنے کا تاثر تھا۔

''ہاں...... میں۔''

''کہاں ہو؟''

''کالج جا رہی ہوں...... پی سی او سے فون کر رہی ہوں تمہیں۔''

''اچھا...... اچھا...... مجھے بتا دیا ہوتا تو میں پک کر لیتا۔''

''فون نہیں تھا نا میرے پاس اور گھر کے نمبر سے کر نہیں سکتی تھی۔''

''کالج جانے کی اجازت کیسے ملی؟''

''تمہاری ترکیب سے۔''

''دیکھ لو...... گھر بیٹھے ہی کیسے راستے بنا دیتے ہیں ہم...... نبیل کے مشوروں پر عمل کرو گی تو یونہی کامیاب رہو گی...... اچھا یہ بتاؤ مل کب رہی ہو؟ ابھی آ جاؤں؟''

''نہیں نہیں...... ابھی نہیں...... ہو سکتا ہے گھر سے امی، ابو چیک کرنے کے لیے کالج آ جائیں۔''

''تو پھر؟''

''چھٹی کے بعد تم مجھے کالج کی پچھلی دیوار کے پیچھے نالے کے پاس ملنا۔''

''اوکے۔''

وہ کالج پہنچی تو اسپورٹس ٹیچر سے سامنا ہونے پر انہوں نے پہلا سوال یہی کیا کہ وہ میچ والے دن کہاں غائب ہو گئی تھی۔

''میڈم! آ رہی تھی تو راستے میں بائیک خراب ہو گئی۔ اسے ٹھیک کرانے میں دیر ہو گئی۔'' اس نے وہی کہانی سنائی جو وہ ماں کو سنا چکی تھی۔

''میں نے پرنسپل کو رپورٹ کر دی تھی۔ وہ دو دن سے بلوا رہی ہیں تمہیں مگر تم کالج آ ہی نہیں رہی تھیں۔ آج ضرور مل لینا۔''

''اوکے میڈم۔''

پرنسپل کو بھی اس نے اسی خود ساختہ کہانی سے مطمئن کیا۔

دوپہر کو چھٹی کے بعد وہ کالج سے نکل کر ادھر ادھر دیکھتی اور دوسروں کی نظروں سے بچتی بچاتی کالج کی عقبی دیوار کے سائے میں انتظار کرتے نبیل تک جا پہنچی۔ اسے دیکھتے ہی وہ اچک کر موٹر سائیکل سے اترا اور اسے پذیرائی دینے والے انداز میں آگے بڑھا۔ ''کیسی ہو؟''

اس نے اپنی نگاہوں میں اداسی پیدا کرتے ہوئے نبیل کو دیکھا اور کہا۔ ''کیا بتاؤں!''

کالج کی عقبی دیوار کے پیچھے گندا نالا تھا اور نالے کے دوسری طرف نالے کے ساتھ ساتھ ایک دیوار تھی جو برسات کے موسم میں پانی کے بہاؤ کو دوسری طرف واقع آبادی کی جانب روکنے کے لیے کھڑی کی گئی تھی۔ نالے کی طرف لوگوں کا کم ہی آنا جانا ہوتا۔ وہ دونوں بھی اس وقت اکیلے تھے۔ ایمن کا جی چاہ رہا تھا نبیل کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دے۔

''نبیل! مجھے ابو نے کمرے میں بند کر دیا تھا۔ امی نے کھانے کو بھی نہیں پوچھا۔ پھر جب باہر سے کنڈی کھلی تو میں نے خود ہی کچن میں جا کر چپکے سے کھانا کھایا...... اتنی بھوک لگ رہی تھی کیا بتاؤں۔'' ایمن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

''رو مت میری جان۔'' نبیل نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کے بالوں پر سبک سبک ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایمن کو لگا دنیا میں اس کا واحد دوست اور ہمدرد وہی تھا۔

ایمن نے اپنا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ خود بھی رو رہا تھا۔ دونوں اب جدا اور روبرو کھڑے تھے۔

''تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے میری جان...... تم ایسے ہی کہتی تھیں کہ تمہارے ابو تم سے بہت پیار کرتے ہیں۔ پیار کرنے والے کوئی اتنا ظلم کرتے ہیں...... جب سے تم نے مجھے بتایا میں بے چین رہا ہوں...... آج تمہیں دیکھ کر ٹھنڈک پڑی ہے دل میں۔''

''ابو نے مجھے اس شرط پر کالج کی اجازت دی ہے کہ صبح امی مجھے اسٹاپ پر چھوڑیں گی اور واپسی پر بھی وہی لیں گی۔''

''تمہارے ابو کی ایسی کی تیسی!'' اس نے دانت پیسے پھر بولا۔ ''کل سے میں تمہیں دو اسٹاپ بعد سے پک کیا کروں گا۔''

''ٹھیک ہے...... بس ابو کے ہونے تک پرابلم ہے۔''

وہ چلے جائیں گے تو میں امی سے کہہ دوں گی بس میدان پار کرادیا کریں مجھے۔ آگے میں خود چلی جایا کروں گی۔"

"تمہارا باپ جائے گا کب؟"

"ایک مہینے کی چھٹی پر آتے ہیں۔ ہفتہ بھر تو ہو گیا۔"

"سمیر کے گھر والے اگلے مہینے پھر کسی شادی میں گاؤں جائیں گے۔" نبیل نے اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

وہ شرما گئی پھر بولی۔ "اس وقت تک ابو بھی چلے گئے ہوں گے۔"

"ایک بات بتاؤ تمہارا ظالم باپ ہم دونوں کی شادی پر کیسے راضی ہوگا۔"

"یہی سوچ سوچ کر تو میں بھی پریشان ہوتی رہتی ہوں۔"

"خیر کوئی بات نہیں...... کوئی مانے یا نہ مانے، یہ تو طے ہے کہ میں نے شادی تم ہی سے کرنی ہے۔"

"مجھے بھی نبیل ...... مجھے بھی صرف تم سے شادی کرنی ہے اب۔" وہ فورِ شوق سے بولی پھر یکایک اس نے گھبرا کر کہا۔ "اچھا اب میں چلوں...... دیر ہو جائے گی۔"

"بیٹھو...... میں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"کہاں تک؟"

"جہاں تک تم کہو گی۔"

دونوں دیوار کے کونے پر کھڑی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئے۔ ایمن نے چادر سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور اپنا بازو نبیل کی کمر کے گرد حمائل کر کے اس سے چپک کر بیٹھ گئی۔ نبیل کے ساتھ وہ عجیب سی تقویت، طمانیت اور سرور محسوس کر رہی تھی۔

☆☆☆

شاہد نے ایمن کو معاف تو کر دیا تھا مگر اس سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ دونوں کی کوشش ہوتی کہ ایک دوسرے کا سامنا نہ ہو پائے۔ ایمن زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں رہتی۔ دانش چھوٹا سہی مگر اتنا بچہ بھی نہ تھا کہ ابو اور ایمن کے درمیان سرد مہری کا احساس نہ کر سکتا۔ اس نے امی سے پوچھا تو انہوں نے پہلے تو اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ایمن سے دریافت کیا تو اس نے ڈانٹ دیا۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو۔" بالآخر اس کے کئی مرتبہ پوچھنے پر سمن کو اسے مطمئن کرنا ہی پڑا۔

"ایمن نے ابو کی کسی بات کا جواب بدتمیزی سے دیا تھا اس لیے ابو نے اس سے بات کرنا بند کر رکھی ہے مگر دیکھو یہ بات کسی کو بتانا مت...... کیا سوچیں گے لوگ کہ ایمن اپنے ابو سے بدتمیزی کرتی ہے اور ہاں تم بھی اپنے ابو کو کسی بات کا بدتمیزی سے جواب مت دینا ورنہ وہ تم سے بھی بات کرنا بند کر دیں گے۔"

دانش کی سمجھ میں بات آ گئی اور وہ مطمئن بھی ہو گیا۔

اس روز ہفتہ واری تعطیل تھی۔ شاہد نے بڑی بہن اور ان کے گھر والوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ سمن نے دانش کو ہدایت کی۔ "وہ لوگ آئیں تو کسی کو یہ مت بتانا کہ ابو، ایمن سے ناراض ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے سعادت مندی سے سر اثبات میں ہلایا۔

ایمن کو ماں نے آہستگی سے سمجھایا۔ "بڑی پھپھو اور ان کے گھر والے آ رہے ہیں۔ ان پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ابو کے اور تمہارے درمیان بات چیت نہیں۔"

"میں سامنے آؤں گی ہی نہیں۔" ایمن نے کہا۔

"نہیں نہیں، یہ تو خیر بری بات ہوگی اور دوسروں کو شک میں ڈالنے والی بھی۔" امی بولیں۔

"یہ بات تو ابو کو بھی سوچنی چاہیے۔ خوامخواہ منہ پھلا رکھا ہے۔" ایمن شرمندہ ہونے کے بجائے معافی ملنے کے بعد ڈھیرے ڈھیرے پر نکال رہی تھی۔

"خوامخواہ تو مت کہو۔" سمن کو غصہ آ گیا۔ "انہیں صدمہ پہنچا ہے تمہاری طرف سے۔"

"بار بار یہ بات نہ دہرایا کریں۔" اس نے نخوت سے کہا۔

سمن نے مصلحتِ وقت دیکھتے ہوئے کسی بحث میں پڑنا مناسب نہ جانا اور بولیں۔ "بس نارمل رہنا ان لوگوں کے سامنے اور ابو سے چھپ کر کمرے میں بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔"

پھپھو اور ان کے گھر والے آئے تو کھانا تیار تھا۔ ایمن، پھپھو اور پھوپا کو سلام کر کے کچن میں آ گئی اور ماں کی مدد کرنے لگی۔ جواد بھی وہیں آ گیا اور اس نے حسبِ عادت ایمن سے ہلکی پھلکی بات چیت کرنے کی کوشش کی۔ وہ سپاٹ لہجے میں ہوں ہاں کرتی اور جواب دیتی رہی۔ کچھ زیادہ گرمجوشی اور دلچسپی نہ دکھائی۔

کھانے کے بعد سمن، شاہد، پھپھو اور پھوپا لاؤنج میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ جواد کو دانش اپنے کمرے میں کھینچ کر لے گیا اور اسے وہ چیزیں دکھانے لگا جو شاہد اس مرتبہ اس کے لیے لائے تھے۔ سمن نے ایمن کو سبز چائے بنا کر لانے کو کہا۔ اس بہانے وہ ایمن کو شاہد کے سامنے سے ہٹا کر اس کے اور شاہد کے درمیان سرد مہری کا پردہ رکھنا چاہتی تھیں۔

پھپھو نے بڑے فخر سے شاہد کو بتایا کہ جواد کو جاب کی کال آ گئی تھی۔ جواد ان کا اکلوتا بیٹا ہونے کے ناتے ہر جگہ ان کی گفتگو کا مرکز و محور ہوا کرتا تھا۔ ان کی سنائی خبر پر شاہد نے خوشی کا اظہار کیا اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''آپا ارادہ تو یہ تھا اور ہماری آپ کی بات بھی یہی ہوئی تھی کہ ایمن کی میڈیکل کی تعلیم کے بعد اس کی شادی کریں گے لیکن اول تو اس کے فرسٹ ایئر میں نمبر اچھے نہیں آئے ہیں۔ دوسرے اب مجھے احساس ہوتا ہے کہ ہم نے شادی کے لیے کچھ زیادہ ہی لمبا وقفہ رکھ دیا ہے۔ پردیسی آدمی ہوں، زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ میں چاہتا ہوں ایمن کو جتنی جلدی ہو سکے رخصت کر دوں۔'' شاہد بات ختم کر رہے تھے کہ ایمن گرین ٹی کی پیالیاں ٹرے میں لیے لاؤنج میں داخل ہوئی۔ شاہد کے آخری دو جملے اس نے سن لیے تھے۔ ایمن کو دیکھتے ہی شاہد نے پہلو بدلا اور ایسے زاویے پر بیٹھ گئے کہ ایمن پر ان کی زیادہ نظر نہ پڑے۔

''تم نے تو میرے دل کی بات کر دی شاہد۔'' پھپھو خوش ہو کر بولیں۔

ایمن شاہد کا اپنا زاویہ نشست بدلتے دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی اور سمن مصلحت وقت کے تحت گرین ٹی مہمانوں اور شاہد کو دینے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

پھوپا دھیرے سے کھنکھارے اور بیگم کو ایک نظر دیکھ کر شاہد سے گویا ہوئے۔ ''شاہد بھائی! جواد ہمارا ایک ہی بیٹا ہے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ اب جبکہ وہ تعلیم مکمل کر کے ماشاء اللہ جاب بھی شروع کرنے جا رہا ہے تو اس کی شادی میں زیادہ لمبا وقفہ نہ رکھا جائے۔ گھر آنے والی بچی نے آگے پڑھنا چاہا تو ہم خود پڑھا لیں گے۔''

''لو بھئی ایمن اب تم تیار ہو جاؤ۔'' پھپھو نے ایمن کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کس لیے پھپھو۔'' ایمن نے تجاہل عارفانہ سے کہا۔

''ہمارے گھر آنے کے لیے...... انشاء اللہ اگلے سال تم ہمارے گھر کی رونق بن کر ہمارے گھر آ جاؤ گی۔''

''ارے بھئی کیوں چھیڑ رہی ہو بچی کو۔'' پھوپا نے بیگم سے کہا۔

''مجھے پیار آ رہا ہے اپنی بچی پر۔'' پھپھو اٹھیں اور ایمن کو پیار کر کے اس کی بلائیں لینے لگیں۔ ایمن کسمسائی۔ اسے پھپھو کا پیار کرنا ذرا اچھا نہ لگ رہا تھا۔ پھپھو نے اس کے کسمانے کو شرمانے پر محمول کیا۔ ''اچھا جاؤ شرماؤ مت...... ہم تمہارے ابا سے کچھ ضروری باتیں کر لیں۔''

ایمن خالی ٹرے ہاتھ میں لیے لاؤنج سے نکلی اور یہ سننے کو کہ پھپھو کیا ضروری باتیں ابو سے کرنا چاہتی تھیں، لاؤنج کی کھڑکی کے نزدیک ٹھہر گئی۔

''تو پھر اگلے سال تمہارے آنے پر شادی کی بات پکی؟'' پھپھو کے لہجے سے خوشی کا احساس ٹپکے پڑ رہا تھا۔

''یہ تو بہت اچھا ہو گیا۔'' پھوپا بولے۔

''ابھی ابھی ایک خیال آیا ہے میرے دل میں۔'' پھپھو نے کہا۔

''وہ کیا؟'' پھوپا کی آواز ایمن کے کانوں تک پہنچی۔

''ایسا ہے شاہد کہ ہم لوگ تمہاری واپسی سے پہلے جواد کی ڈگری اور نوکری کی خوشی میں سارے خاندان والوں کو بلانا چاہ رہے ہیں۔ اگر تم خوشی سے راضی ہو تو اس تقریب میں جواد اور ایمن کا نکاح پڑھا دیا جائے، خوشی دوبالا ہو جائے گی۔''

''بھئی واہ! بھئی واہ!'' پھوپا بے ساختہ پھڑک کے۔ ''کیا بات کی ہے تم نے...... قسم خدا کی مزہ آ جائے گا اگر شاہد بھائی راضی ہو جائیں۔''

''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بھلا۔'' شاہد بولے۔

''تو پھر ملائیں ہاتھ۔'' پھوپا نے کہا۔

''مبارک ہو بھابی۔'' پھپھو نے امی کو مبارک باد دی۔

''آپ کو بھی۔''

''تمہاری واپسی کب ہے شاہد؟'' پھپھو نے ابو سے پوچھا۔

''چوبیس تاریخ کو۔''

''میں باقی بہن بھائیوں اور اپنے دیور اور نندوں سے بھی صلاح کرتی ہوں۔ انشاء اللہ تمہاری واپسی سے دو چار دن پہلے کی کوئی تاریخ رکھ لیتے ہیں...... کیوں بھابی؟''

''جیسے آپ بھائی بہن کی مرضی۔''

''ارے بھئی آپ بھی تو ہماری ہونے والی بہو کی امی جان ہیں۔'' خوشی پھپھو کے لہجے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

اور لاؤنج کی کھڑکی سے لگی ایمن کا دل ان کی باتیں سن کر بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جواد سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس کے لیے تو نبیل اس کی محبت ہی نہیں منزل بھی تھا۔ اپنی منزل حاصل کرنے کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے اور ہر راستے پر آنکھیں بند کر کے قدم اٹھانے کے لیے تیار تھی!

☆☆☆

''کیا! کیا کہہ رہی ہو!'' نبیل نے ایسے کہا جیسے اسے اپنی سماعت پر اعتبار نہ ہو۔

''ہاں نبیل ...... میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' ایمن نے اسے امی، ابو، پھپھو اور پھوپا کے درمیان ہونے والی گفتگو سے بالتفصیل آگاہ کر دیا تھا۔

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا پھر فلمی ہیرو کے سے انداز میں اس کے دونوں بازو اپنے ہاتھوں میں جکڑتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تم کسی اور کی نہیں ہوسکتیں ایمن...... آئی لو یو۔''

''آئی لو یو ٹو نبیل۔'' ایمن روہانسی ہو رہی تھی۔

وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق دکھائی دینے لگا اور یوں سر جھکا کر بیٹھ گیا جیسے انتہائی دل گرفتہ ہو۔ ایمن کا دل دکھنے لگا۔ کتنا اداس لگ رہا تھا وہ اس وقت اور ایمن کے خیال میں اس کا یوں ازحد دل گرفتہ دکھائی دینا اس کی سچی محبت کی دلیل تھا۔

''نبیل!'' اس نے اپنا ہاتھ بڑی دلسوزی سے اس کے شانے پر رکھ دیا۔

''بولو۔''

''اب کیا ہوگا؟''

''یہی سوچ رہا ہوں۔''

''ہم دونوں کہیں بھاگ نہ جائیں۔''

''کہاں؟''

''کہیں بھی ...... اللہ تعالیٰ کی دنیا اتنی وسیع ہے ...... کہیں بھی چلے جائیں گے۔''

''وسیع دنیا میں کہیں جانے کے لیے پاسپورٹ بنوانا پڑتا ہے، ویزا لینا پڑتا ہے۔''

''پاسپورٹ اور ویزا کی ضرورت تو دوسرے ملک جانے کے لیے ہوتی ہے۔ میں تو یہیں کی بات کر رہی ہوں۔ لاہور، فیصل آباد، ملتان۔''

''لاہور، فیصل آباد میں میرے باپ نے ملیں، فیکٹریاں لگوا رکھی ہیں نا اور ملتان میں تو جیسے میرے ابا کی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں یہاں سے وہاں تک۔'' وہ غرایا۔

''غصہ کیوں ہو رہے ہو؟''

''مجھے تمہارے اماں ابا پر غصہ آ رہا ہے۔'' اس نے اپنی انگشت شہادت ایمن کی طرف کی۔

''ابو پر تو مجھے بھی بہت غصہ آ رہا ہے۔''

''تم کوئی بھیڑ بکری یا گاجر مولی نہیں ہو کہ تمہارا باپ منہ اٹھا کر جسے چاہے تمہیں دے دے۔''

''ٹھیک کہتے ہو۔''

''ٹھیک کہتا ہوں تو اپنے حق کے لیے لڑو یار...... تم پڑھی لکھی لڑکی ہو۔'' نبیل نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

''لڑی تو تھی...... میں نے تمہارے بارے میں صاف صاف بتا دیا تھا انہیں کہ مجھے اس سے محبت ہے، میری شادی کر دیں اس سے...... تمہیں پتا ہے نا کیا کیا تھا انہوں نے ...... موبائل چھین لیا، کمرے میں بند کر دیا، کالج جانے سے روک کر گھر بٹھا لیا...... تم تدبیر نہ بتاتے مجھے تو میں شاید آج بھی گھر میں بند پڑی ہوتی۔'' اپنی مظلومیت کا اظہار وہ بڑی دل گرفتگی سے کر رہی تھی۔

''فکر مت کرو...... نکال لوں گا اب بھی تمہیں، تمہارے ماں باپ کے ظلم سے بچانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ، کوئی نہ کوئی راستہ...... بس تم میرا ساتھ نہ چھوڑنا۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں نبیل ...... تمہارے لیے تو میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں...... اپنا گھر، امی، ابو، بھائی سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں تمہاری خاطر۔''

☆☆☆

''جگر! سوچ لے ...... بہت اچھی طرح ...... ٹھنڈا ہو کر۔'' سمیر نے نبیل سے سرگوشی میں کہا۔ دونوں ایک پبلک پارک میں نہایت رازدارانہ انداز میں بیٹھے تھے۔

''سوچ لیا ہے پیارے...... مزید سوچ بچار کے لیے ٹائم شارٹ ہے۔ اب انتظار نہیں ہوسکتا۔''

''تو نے اس سے بات کی؟''

''کی ہے یار۔'' نبیل جھنجلا گیا...... ''وہ کہتی ہے نبیل تمہارے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔''

''یار! یہ اس کی سوچ سے بھی بڑا ایونٹ ہوگا، اگر بدل گئی تو؟'' سمیر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہ بدلے گی نہ بدکے گی۔''

''پکا؟''

''بالکل پکا...... تو اپنی بتا۔''

''رسک ہے بابو...... گئے تو لمبے...... پر اپنا شیوہ ہے کہ یاروں کے لیے جان بھی حاضر۔'' سمیر نے اپنے سینے پر ہاتھ دھرتے ہوئے سر خم کر دیا۔

''اور اپنا تو تجھے پتا ہے۔'' نبیل نے شانے اچکائے۔ ''یاروں کے احسان کا بدلہ چکانے میں نہ دیر نہ بخل۔''

''ویسے ایک بات بتا، ایسا کیا پلا دیا تو نے بچی کو جو وہ تیرے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہے۔''

''اب! عشق کرتی ہے وہ مجھ سے ...... اور عشق میں بندہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''ابھی کیا نہیں ...... کسی سے کر کے دیکھیں گے۔''

''پاگل نہ ہوجائے تو میرا نام بدل دینا...... میں تو تفریح لے رہا تھا۔ وہ شغل ہی شغل میں عاشق ہوگئی مجھ پر ...... پیارے لڑکی بھی ملے گی مال بھی...... دونوں بھائی دبئی، لندن، پیرس، امریکا گھومیں گے...... میں ہنی مون پر اور تو کسی چٹی چمڑی والی میم کی تلاش میں۔''

''آئیڈیا اچھا ہے...... کسی میم کو پھنساؤ۔''

''ابے انہیں تو پھنسانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی...... ذرا اشارہ کرو تڑاتڑ گرتی ہیں۔''

''ایک تو بھی لے آنا۔''

''ابے پہلے گلے پڑی سے تو نمٹ لیں...... مجھے لڑکی سے زیادہ انٹرسٹ روکڑے میں ہے پورو کڑے میں...... پیارے ہمارا بھی تو کچھ حق ہے دنیا کی نعمتوں پر یا نہیں؟''

''کیوں نہیں۔''

''تو پھر ہاتھ ملا۔'' نبیل نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کیا۔ سمیر نے اپنا ہاتھ اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اوندھا دھر دیا!

☆☆☆

ایمن اور جواد کے نکاح کی مقررہ تاریخ سے ایک دن قبل دوپہر کو شائع ہونے والے اخبارات سڑکوں پر فروخت کرنے والے ہاکرز شہر کی مصروف شاہراہوں اور چوراہوں پر سنسنی خیز انداز میں صدائیں لگا رہے تھے۔

ایک ہی گھرانے کے تین افراد کا قتل ...... سفاک قاتلوں نے بیٹی کے نکاح سے صرف ایک روز قبل باپ، ماں اور کمسن بھائی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ علاقے کے مکینوں میں خوف وہراس۔ شام کے اخبارات میں شائع ہونے والی تفصیلات کے مطابق سعودی عرب سے چھٹی پر وطن آئے محمد شاہد، اس کی بیوی ثمن شاہد اور بیٹے دانش شاہد کو جن کی عمریں بالترتیب 44، 38 اور 12 سال تھیں، شہر کے ایک متوسط علاقے میں بدقسمت کنبے کی جواں سال اکلوتی بیٹی ایمن شاہد کے نکاح کی تقریب سے صرف ایک دن قبل رات کو سوتے میں ان کے سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کردیا گیا تھا۔ گھر کی تمام الماریاں کھلی اور چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ لواحقین کا کہنا تھا کہ قاتل گھر سے تمام قیمتی اشیا، نقدی اور زیورات بھی لوٹ کر لے گئے تھے جو ایک دن قبل ہی بیٹی کے نکاح کے لیے بینک لاکر سے نکلوائے گئے تھے۔ مقتول کے بھائی کی مدعیت میں علاقہ تھانہ میں اس واردات کی ایف آئی آر درج کرادی گئی تھی۔ پولیس مصروف تفتیش تھی۔

اخبارات نے بدقسمت گھرانے کے مقتولین اور کنبے کی واحد زندہ بچ جانے والی نوعمر دوشیزہ ایمن شاہد کی تصاویر بھی شائع کی تھیں جو تین افراد کے قتل کی اس واردات کے بعد اپنے ہوش وحواس میں نہ تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح نبیل اور سمیر اپنے ایک مستقل ٹھکانے پر اکٹھے بیٹھے صبح کے ایک کثیر الاشاعت اخبار میں شائع تین افراد کے قتل کی تفصیلات پڑھ رہے تھے۔ اخبار نے ایک نیوز ایجنسی کے حوالے سے لکھا تھا کہ قتل کی یہ واردات مقتولین سے قاتلوں کی دشمنی کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے جسے ڈکیتی کا رنگ دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ مقتولین کی جانب سے مزاحمت کے کوئی آثار نہیں تھے۔ آج گھر میں مقتول محمد شاہد کی بیٹی ایمن شاہد کے نکاح کی تقریب ہونے والی تھی جس کے لیے ایک روز قبل ہی بینک لاکر سے زیورات نکال کر گھر میں رکھے گئے تھے۔ مقتول محمد شاہد طویل عرصے سے سعودی عرب میں ملازمت کرتا تھا اور اس کے گھر میں بعض ایسی قیمتی اشیا بھی موجود تھیں جو اس کے قریبی رشتے داروں کے علم میں تھیں مگر اس واردات کے بعد وہ غائب پائی گئیں۔ گھر کی واحد زندہ بچ جانے والی لڑکی ایمن شاہد اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ صبح اس کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند ملا۔ واردات کا علم اس وقت ہوا جب گھر میں کام کرنے والی ملازمہ گھر میں ہونے والی تقریب کے پیش نظر خلاف معمول علی الصباح کام پر آئی تو اسے گھر کا مین گیٹ کھلا ہوا ملا۔ اندر داخل ہونے پر تین افراد کی لاشیں گھر میں پڑی دیکھ کر اس کے حواس معطل ہوگئے اور اس نے بھاگ کر اہل محلہ کو اطلاع کی جنہوں نے مقتولین کی بیٹی کے کمرے کا دروازہ باہر سے کھولا اور کھٹکھٹایا تو پتا چلا وہ دروازہ اندر سے بند کر کے سوئی ہوئی تھی اور گھر میں رونما ہونے والے المیے سے بے خبر تھی۔ ماں، باپ اور بھائی کی لاشیں دیکھ کر اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ مقتول محمد شاہد کے ورثا اطلاع ملتے ہی جائے واردات پر پہنچ گئے۔ محمد شاہد کے بھائی کی مدعیت میں تھانے میں ایف آئی آر درج کرادی گئی ہے۔ پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق مقتولین کو ان کے سروں میں گولیاں مار کر ہلاک کیا گیا۔ خدشہ ہے کہ مارنے سے قبل انہیں بے ہوش بھی کیا گیا۔ تفصیل حتمی پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے پر ہی معلوم ہوسکے گی۔ پولیس نے جائے واردات کا تفصیلی معائنہ کیا اور ملزمان کے فنگر پرنٹس حاصل کرلیے ہیں۔ آخری خبر موصول ہونے تک بدقسمت کنبے کی واحد زندہ فرد رنج وغم کی شدت کے باعث پولیس کو بیان دینے سے قاصر تھی۔ اسے مسکن دوائیں دے کر سلایا جارہا تھا۔ میتوں کی مقامی قبرستان میں تدفین کردی

گئی تھی۔ تدفین میں علاقے کے لوگوں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ اہلِ محلہ کا کہنا تھا کہ محمد شاہد ایک نیک اطوار شخص تھا۔ بیرونِ ملک ملازمت کرتا تھا اور اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ واردات کے بعد سے علاقے میں خوف و ہراس ہے۔

''اخبار والوں نے تو پوری فلم ہی چلادی یار۔'' نبیل نے خبر پڑھنے اور تصویریں دیکھنے کے بعد سمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''جگر یہ کہیں فلم کا ٹریلر نہ بن جائے۔'' سمیر کی نگاہوں میں خوف تھا۔

''کیا مطلب؟'' نبیل بولا۔

''لڑکی انوالو ہے پیارے...... کہیں کھل نہ جائے۔'' سمیر نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں نہیں...... اس نے مجھے وچن دے رکھا ہے کہ مرجاؤں گی مگر تم پر حرف نہ آنے دوں گی۔''

''اللہ کرے ایسا ہی ہو۔''

''تیرا مطلب ہے وہ مرجائے!'' نبیل مسکرایا۔

''میرا مطلب ہے اب آگے کیا پروگرام ہے؟''

''یار ہم ادھار کے قائل نہیں...... پہلے تو نقدوں نقد اس مال کا حساب ہوگا جو بیعانہ ملا ہے۔ باقی اللہ خیر کرے بعد میں۔''

''اور بعد میں چھوکری نے حساب مانگا تو؟''

''پیارے اسے مال شال کی کوئی پروا نہیں...... وہ تو بس نبیل کے عشق میں اس کی ہیر بنی ہوئی ہے۔'' نبیل نے کہا۔

☆☆☆

سوئم تک رشتے دار ایمن کو کسی نوزائیدہ بیمار بچے کی طرح لیے بیٹھے رہے۔ کوئی اس کا سر دباتا، کوئی ہاتھ پاؤں سہلاتا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہتی۔ آنکھیں کھولتی تو ماں، باپ اور بھائی کو یاد کرکے چیخنے چلانے اور رونے لگتی۔ اپنے پرائے خدا کی پناہ مانگتے، کانوں کو ہاتھ لگاتے۔ خدا ایسی بری افتاد دشمن پر بھی نہ ڈالے۔

شاہد کے رشتے دار پولیس سے مسلسل رابطے میں تھے۔ بھائی کہتے جب تک میں اپنے بھائی، بھاوج اور بھتیجے کے قاتلوں کو پکڑوا نہ لوں گا چین سے نہ بیٹھوں گا۔ ایسے واقعات میں پولیس اور قانون کا جو کردار ہوتا ہے، وہ مسلم لیکن اس کے ساتھ ہی متعلقین کی دلچسپی اور سرگرمی بھی مجرموں تک رسائی اور انہیں انجام تک پہنچانے میں کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ ورنہ کتنے ہی قتل اور دیگر جرائم ایسے ہوتے ہیں جو متعلقین کی سستی، کاہلی، عدم دلچسپی، خوف یا کمزوری و بزدلی کے باعث

سرد خانوں میں جا پڑتے ہیں یا داخلِ دفتر ہوجاتے ہیں اور جرائم کی بیخ کنی کے بجائے انہیں پنپنے کا موقع دیتے ہیں۔ جرم کرتے ہوئے مجرم سوچتا ہے، فلاں واردات کا مجرم کب پکڑا گیا جو میں پکڑا جاؤں گا۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مجرم کی ہزار چالاکی و عیاری اور متعلقین کی عدم دلچسپی کے باوجود پولیس اگر مجرم تک پہنچنا چاہے تو مجرم کی ساری چالاکی و عیاری پولیس کی زیرکی اور فرض شناسی کے سامنے دھری رہ جاتی ہے۔

تین افراد کے قتل کی اس واردات میں پولیس کی توجہ اس نکتے پر تھی کہ مجرموں کو مقتول جوڑے سے تو دشمنی ہوسکتی تھی بارہ سالہ بچے سے کیا عداوت تھی جو اسے بھی مار دیا تھا اور اگر یہ ڈکیتی کی واردات تھی تو علیحدہ کمرے میں سوئے اس بچے کو بھی قتل کرنا کیوں ضروری سمجھا گیا تھا۔ اس کے کمرے کو بھی باہر سے ویسے ہی کنڈی لگا کر اسے واردات سے بے خبر اور زندہ رہنے دیا جاسکتا تھا جیسے وہ اس گھرانے کی نوجوان لڑکی کو زندہ چھوڑ گئے تھے۔ رہی اس کی واردات سے بے خبری کی شافی و کلی تصدیق، وہ ایمن کے حواسوں میں آنے کے بعد ہی ہوسکتی تھی۔

بالآخر ایمن کی حالت سنبھل گئی۔

☆☆☆

نبیل کے حسابوں ایمن لاکھ پکی، کتنی ہی ہوشیار، اس پر کتنی ہی عاشق اور اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہ کر گزرنے کی حامل سہی، تھی تو ایک نوجوان اور ناتجربہ کار لڑکی، کبوتر کے آنکھیں بند کرلینے سے بلی کے جھپٹنے کا خطرہ تو نہیں ٹل جاتا۔

اس کی حالت سنبھلی تو پولیس کے تفتیشی افسر نے اس کا بیان لیا اور اس پر تابڑتوڑ ایسے سوالوں کی بوچھاڑ کردی کہ ایمن کو کھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

اخبار فروشوں نے شہر کی سڑکوں اور چوراہوں پر صدائیں لگانی شروع کردیں۔

''تین افراد کے قتل کا ڈراپ سین۔ مقتول جوڑے کی اپنی ہی بیٹی شریک جرم، آشنا اور اس کے دوست کی ماں، باپ اور بھائی کے قتل میں معاونت کی ملزمہ زیر حراست، دیگر دو ملزمان کی گرفتاری کے لیے چھاپے۔''

جس نے سنا، دم بخود رہ گیا۔ اہلِ محلہ، رشتے دار، اقارب انگشت بدنداں تھے۔ کیا اولاد اور وہ بھی بیٹی اس قدر بے رحم ہوسکتی ہے! ایمن ہر گھر کا موضوع گفتگو بن گئی تھی۔ لوگ اس پر لعنت ملامت کررہے تھے۔ بڑی پھپھو سے کہا جاتا۔ ''شکر کرو تم ایسی قطامہ سے بچ گئیں۔ تمہارا تو

ایک ہی بیٹا ہے۔ ایسی حرافائیں تو شادی کے بعد بھی اپنے ہوتے سوتوں کو سسرال کا رستہ دکھا دیتی ہیں۔'' پھپھو دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتیں، کہنے والے غلط تو نہیں کہہ رہے تھے۔

اپنے اعترافی بیان میں ایمن نے پولیس کو بتایا تھا کہ اس کے ماں، باپ اور بھائی کے قتل کا منصوبہ نبیل نے بنایا تھا۔ اس نے ایمن سے کہا تھا کہ والدین کے راستے سے ہٹ جانے کے بعد وہ خود مختار ہو جاتی اور اپنی مرضی سے شادی کر سکتی تھی۔ نبیل نے کہا تھا شادی کے بعد وہ باپ کی چھوڑی ہوئی تمام جائداد کی واحد وارث اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب اس کے چھوٹے بھائی کا پتا بھی کاٹ دیا جائے۔ جائداد کی واحد وارث ہونے کی صورت میں وہ اسے فروخت کرنے کی مجاز تھی۔ نبیل کا پروگرام یہ تھا کہ ساری جائداد فروخت کر کے دونوں کسی بیرونی ملک میں جا بسیں گے اور چین کی زندگی گزاریں گے۔

قتل کے لیے طریقہ واردات کی منصوبہ بندی نبیل اور سمیر نے مل کر کی تھی۔ دونوں نے اسے کوئی ایسا محلول دیا تھا جسے اس نے بڑی رازداری سے کھانے میں ملا دیا تھا۔ پیٹ درد کے بہانے اس نے اس رات خود کھانا کھانے سے گریز کیا تھا۔ کھانے کے دوران شاہد اور دانش بار بار ثمن سے کہتے رہے کہ کھانے کا ذائقہ کچھ عجیب اور بدلا بدلا سا تھا۔ ثمن خود بھی یہی محسوس کر رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں اللہ نہ کرے کھانا کڑوا محسوس ہو تو کوئی بری خبر سننے کو ملتی ہے۔ کھانا کھاتے ہی تینوں کو نیند آنے لگی تھی اور وہ سو گئے تھے۔ ایمن جاگتی اور جلے پاؤں کی بلی بنی گھر میں پھرتی رہی تھی۔ رات ایک بجے کے لگ بھگ پہلے اس نے دانش کے کمرے میں جا کر اسے ہلا جلا کر جگانے کی کوشش کی تھی مگر وہ نہیں جاگا تھا۔ اس کی سانس بھی کچھ عجب طرح چل رہی تھی پھر اس نے ماں، باپ کے کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانک کر ثمن کو پکارا مگر وہ بھی کئی مرتبہ پکارنے کے باوجود نہ جاگی تھیں۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ تینوں بے ہوشی کی نیند سوئے ہوئے تھے، اس نے اپنے موبائل فون سے جو ثمن نے شاہد کی طرف سے اسے معافی ملنے کے بعد واپس کر دیا تھا نبیل کو جس سے وہ وقوعہ والی رات مسلسل رابطے میں تھی ثمن شاہد اور دانش کے بالکل بے خبر ہونے کی خبر دی تھی۔ نبیل جو سمیر کے ساتھ ریلوے لائن کے آس پاس موجود تھا، سمیر کو لے کر گھر کی عقبی گلی میں آیا اور دونوں دیوار سے کود کر گھر میں داخل ہوئے۔ ایمن نے انہیں ثمن، شاہد پھر دانش کے کمروں کا راستہ دکھایا۔

دونوں نے پستول سے تینوں کے سروں پر گولیاں ماریں اور تکیے سے منہ ڈھانپ کر ان کی سانسیں گھونٹیں۔ پھر انہوں نے ایمن کی مدد سے گھر سے ساری نقدی، الماری سے وہ سارے زیورات جو ثمن اور شاہد اس کے نکاح کے لیے بینک لاکر سے نکال کر لائے تھے، ثمن اور شاہد اور خود ایمن کے موبائل فون، شاہد کی گھڑی اور گھر میں موجود چند اور قیمتی چیزیں ایک بیگ میں ڈالیں اور ایمن سے کہا کہ وہ مین گیٹ کی کنڈی کھول دے تاکہ صبح جب دودھ والا یا ملازمہ آئے تو اسے گھر میں داخل ہونے میں دشواری نہ ہو۔ عقبی دیوار پھلانگ کر واپس جانے سے قبل انہوں نے ایمن کو اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لینے کی ہدایت کی تھی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ اس کے کمرے کی کنڈی باہر سے چڑھا دیں گے تاکہ لوگوں کو واردات کا علم ہونے پر یہ تاثر ملے کہ اس کا دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ صبح کو دودھ والے یا ملازمہ کے نہ آنے کی صورت میں انہوں نے ایمن کو آٹھ بجے کے بعد زور زور سے اپنے کمرے کا باہر سے بند دروازہ پیٹ کر ''دروازہ کھولو'' کی اونچی اونچی صدائیں لگانے کو کہا تھا تاکہ اہل محلہ تک آواز پہنچے اور وہ گھر کے اندر آئیں۔

تفتیشی پولیس افسر کے استفسار پر پہلے تو ایمن نے یہی کہا کہ وہ سو رہی تھی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا لیکن پولیس افسر کے چند ہی کڑے سوالوں کے بعد وہ رونے لگی تھی اور اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

ایمن کو حراست میں لیے جانے کے بعد پولیس کے لیے نبیل اور سمیر پر جلد از جلد ہاتھ ڈالنا فی الفور کارروائی کا متقاضی تھا۔

نبیل کا گھر ایمن نے دیکھا نہیں تھا۔ اس کی نشاندہی پر پہلے سمیر کے گھر پر چھاپا مارا گیا۔ وہ گھر ہی میں تھا اس لیے پکڑا گیا۔ سمیر نے نبیل کے گھر کی نشاندہی کی۔ نبیل گھر میں موجود نہ پایا گیا البتہ اس کے گھر والوں نے اپنی عزت اور پولیس کے ڈر سے اس کے ممکنہ خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں بتا دیا۔ پولیس نے بڑی سرعت سے اس کی تلاش شروع کر دی تھی۔

☆☆☆

ایمن اور سمیر کو عدالت میں پیش کر کے پولیس نے عدالت سے دونوں کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔

ایمن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نبیل سے اس کے تعلق کا انجام اتنا بھیانک بھی ہو سکتا تھا۔ اپنے جرم کا اعتراف

وہ کر چکی تھی۔ نبیل تک پہنچنے کے لیے پولیس اس سے پوچھ گچھ کے لیے ہر حربہ آزما رہی تھی۔ تشدد، ذلت، تضحیک، بے حرمتی...... اس نے بھولے سے بھی نہیں سوچا تھا کہ نبیل سے عشق کی اتنی بھاری قیمت چکانی پڑے گی اسے کہ اپنے آپ سے ہی گھن آنے لگے۔ سمن اور شاہد کی زندگی میں اس نے ایسے کڑے وقت کا کب سوچا تھا۔ اسے گھر یاد آتا...... ماں باپ یاد آتے...... دانش کی آواز کانوں میں گونجتی...... شیطان کے بہکائے میں آ کر جنت بدر کیے جانے کے بعد آدم و حوا بھی شاید اسی طرح جنت کی یاد میں تڑپے ہوں گے جیسے وہ حوالات میں گھر کا آرام یاد کر کے رو رہی تھی!

امی اور ابو کے بھرے خاندانوں میں سے کسی ایک فرد نے بھی پلٹ کر اس کی خبر نہیں لی تھی...... لیتے بھی کیوں...... اس کی وجہ سے وہ اپنے پیاروں سے محروم ہو گئے تھے...... اس کا نام تو دونوں خاندانوں کی آنے والی نسلوں کے لیے بھی گالی بن گیا تھا۔

تلاش بسیار کے باوجود پولیس نبیل تک نہیں پہنچ پا رہی تھی۔ نہ جانے کس کھوہ میں جا چھپا تھا وہ؟ اس کے ممکنہ ٹھکانوں، شناساؤں اور سمیر کے جسمانی ریمانڈ کے نتیجے میں پولیس کو اس کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوئی تھیں کہ وہ عادی مجرم تھا۔ اسکول کے زمانے میں اپنے ہم عمر لڑکوں سے دھونس، دھمکی، مار پیٹ، دنگا فساد اور چوری کی چھوٹی چھوٹی وارداتوں نے اسے بالآخر بڑا مجرم بنا دیا تھا۔ چوری، ڈکیتی، بلیک میلنگ اور بھولی بھالی لڑکیوں کو اپنے دام میں پھانس لینا اس کا شعار تھا۔ گھر والے اس کی حرکتوں سے عاجز آئے ہوئے تھے۔ سمیر کی نشاندہی پر جب پولیس نے اس کے گھر پر چھاپا مارا تو نبیل کے بوڑھے باپ نے اس کی تازہ ترین واردات علم میں آنے پر ہاتھ جوڑ کر کہا تھا۔ ''صاحب! وہ کمینہ تو دو تین دن سے گھر پر نہیں ہے لیکن آپ کو جہاں ملے اس کی بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو کھلا دو...... اسے چوراہے پر لٹکا دو صاحب تاکہ اس جیسوں کو عبرت ملے...... ایک آنسو نہیں بہاؤں گا میں اس کے لیے۔'' تاہم سمیر کی نشاندہی پر آلۂ قتل اور وہ اشیا اور نقدی برآمد کر لی گئی تھی جو بقول اس کے نبیل نے واردات کے بعد اسے بطور حصہ دی تھی۔ آلۂ قتل پلاسٹک کی مضبوط دہری تھیلیوں میں لپیٹ کر ایک ویرانے میں دفن کر دیا گیا تھا تاکہ معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد اسے بہ ضرورت دوبارہ استعمال کرنے کے لیے نکالا جا سکے!

نبیل تک پہنچنے کے لیے پولیس نے اس کے بوڑھے باریش باپ اور چھوٹے بھائی کو حراست میں لے لیا تھا۔

☆☆☆

ایمن کمرۂ عدالت میں .... جج کے روبرو اکیوزڈ باکس (ملزموں والے کٹہرے) میں کھڑی تھی۔ عدالت کا وہ کمرا انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کچھ دیر قبل جب وہ پولیس کی تحویل میں جج کے سامنے پیش ہونے کے لیے کمرۂ عدالت کی جانب آ رہی تھی تو میڈیا کے نمائندے اس کی ایک جھلک اپنے کیمروں میں مقید کرنے کے لیے ٹوٹے پڑ رہے تھے۔

پولیس نے دوران ریمانڈ ضروری تفتیش کے بعد تہرے قتل کیس میں گرفتار ملزمان کو عدالت میں پیش کر دیا تھا۔ عدالت نے ملزمان کو اپنے دفاع کے لیے اپنی مرضی کا وکیل مقرر کرنے کی اجازت دی تھی۔ سمیر کی ماں نے اس کے دفاع کے لیے وکیل کی خدمات حاصل کر لی تھیں مگر ایمن کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ اس کے تو اپنے سگے رشتے دار دشمن...... بنے کھڑے تھے ایمن نے جو کچھ کیا تھا اس کے پیش نظر داد خواہی ان کا پورا حق تھا۔

آداب قانون و وکالت سے ناآگاہ ایمن نے ہراساں نظروں سے ارد گرد دیکھا۔ اسے کمرے میں موجود ہجوم میں چاچو کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کی نظریں جھکیں اور پلٹ آئیں۔ وہ ان کی مجرم تھی...... بلکہ صرف انہی کی نہیں، پورے معاشرے کی...... ریاست اس کے گھناؤنے جرم پر اس کے خلاف کھڑی تھی...... وہ مجرم تھی ساری انسانیت کی...... جس دین کی وہ پیرو تھی وہ کہتا ہے...... جس نے ایک انسان کو قتل کیا اس نے گویا ساری انسانیت کو قتل کیا...... قانون کہتا ہے جس نے کسی بے گناہ انسان کے قتل میں معاونت کی، اس کی وہی سزا جو قاتل کی...... اس نے تو تین بے گناہ انسانوں کے قتل میں معاونت کی تھی...... اور انسان بھی کون...... جن سے اس کا، خدا اور بندے کے تعلق کے بعد سب سے قریبی رشتہ تھا...... ماں، باپ اور بھائی! اتنے سنگین جرم اور اعترافِ جرم کے بعد وہ کیونکر اور کس سے اپنے دفاع کو کہتی۔ وہ ماں باپ کی ناخلف تھی۔ معاشرے اور قانون کی مجرم تھی۔ دین و انسانیت کی گناہ گار تھی اور اپنی بداعمالی کے لیے اپنے خالق کو جوابدہ تھی۔

اصلاح معاشرہ کے لیے کوشاں ایک این جی او نے اپنی قانونی ٹیم کے ذریعے ایمن کے دفاع کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں!

معاشرے کی اصلاح کے لیے روز افزوں بگاڑ کے

اسباب وعواقب کو اجاگر کرنا لازم...... ہجوم عاقبت نااندیشاں میں کوئی تو عبرت پکڑے گا۔

☆☆☆

جیل کی زندگی عجیب تھی۔ یاس وحسرت میں ڈوبی...... وسوسوں اور اندیشوں میں گھری...... بھنور میں پھنسی ناؤ کی طرح ہر لحہ ڈانواں ڈول...... جیل سے باہر آزاد فضا میں سانس لیتے اور رب کی ان گنت نعمتوں کی کبھی محسوس اور کبھی غیر محسوس طور پر ناشکری کرتے لوگ جیل میں قید انسانوں کی اکثریت کے کرب کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

نازونعم میں پلی ایمن نے کبھی خواب میں بھی اس محروم اور محبوس زندگی کا تصور نہیں کیا تھا۔ زندگی اب اس کے لیے انتظار کا نام بن گئی تھی۔ عدالت میں ایک پیشی کے بعد دوسری پیشی کا انتظار! مقدمے کی سماعت والے دن وہ جیل سے باہر کی آزاد فضا میں چند سانسیں لے سکتی تھی۔ اگرچہ قید میں ہونے کا احساس اس وقت بھی دل کو اپنی مٹھی میں جکڑے رکھتا۔

جیل میں بوڑھی عورتیں بھی تھیں، جوان بھی، نوجوان لڑکیاں بھی اور بہت سی قیدی عورتوں کے ساتھ ان کے بچے بھی تھے۔ بااثر اور طاقتوروں کے لیے جیل میں بھی آسائشیں تھیں۔ اہلکاران جیل انہیں تعظیم دیتے اور خاطر خواہ خدمت کرتے۔ نادار اور کمزور قیدی عورتوں کو گالیاں ملتیں، ذلت ملتی، ان کی تضحیک کی جاتی اور بسا اوقات اور بھی بہت کچھ......! ایمن بھی لاوارث قیدی عورتوں میں شامل تھی جس سے اپنا کوئی بھولے سے بھی نہ ملنے آتا۔ سب اسے بھول گئے تھے حالانکہ اب کوئی ایسا لحہ نہ تھا جب وہ اپنا دامن دل ان کی یادوں سے چھڑا پاتی۔ اسے امی یاد آتیں، ابو یاد آتے، دانش یاد آتا، خاندان کے ایک ایک فرد کی صورت اس کی نگاہوں میں رہ رہ کر گھومتی...... محلے والے یاد آتے، کالج کی دوستوں کی یاد تڑپاتی، اساتذہ کا خیال آتا...... وہ سب اب اسے نہ جانے کن الفاظ میں یاد کرتے ہوں گے اور یاد بھی کرتے ہوں گے کہ نہیں! امی، ابو اور دانش کی کفن میں لپٹی میتوں کا تصور اسے رات رات بھر جگائے رکھتا۔ ”تو نے یہ کیا کیا ایمن!“ امی کے بے حس وحرکت لب گلہ کرتے۔ ”اتنی بے رحمی کی امید نہیں تھی تم سے۔“ سفید کفن میں لپٹے ابو کے چہرے پر اسے یہ تحریر لکھی نظر آتی۔ دانش کا معصوم اور بے جان چہرہ کہتا۔ ”باجی میرا قصور!“

وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور بیرک میں ٹہلنا شروع کر دیتی۔ کبھی وحشت زدہ ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگتی، کبھی اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر کھینچتی۔ کبھی رونے لگتی۔ یہ ایک اسی کا نہیں بہت سی قیدی عورتوں کا حال تھا بلکہ بعض تو وحشت میں دیوانگی کی حدوں کو جا پہنچتیں۔ چیخنے، چلانے اور اول فول بکنے لگتیں۔

ایمن کو اکثر نبیل کا خیال بھی آتا۔ محبت سے نہیں نفرت اور حقارت سے۔ دل بستگی نہیں گھن کے ساتھ...... اسی کی وجہ سے وہ ان حالوں کو پہنچی تھی...... پولیس اسے تلاش نہیں کر سکی تھی...... وہ ہنوز مفرور تھا...... مرد ہوتا تو بھاگتا نہیں...... اور اگر نہ بھاگتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ وہ اب بھی اس کے سحر سے نہ نکلی ہوتی...... اس کے فرار نے ایمن کو اس کی کمینگی اس کی تمام تر بدصورتی کے ساتھ دکھا دی تھی۔ وہ بدکردار ہی نہیں بزدل بھی تھا۔ ایمن کو اس سے نفرت ہوگئی تھی۔

☆☆☆

این جی او کی قانونی ٹیم کے ایک سینئر وکیل نے ایمن سے وقوعہ اور اس سے قبل کے حالات و واقعات کی جملہ تفصیلات حاصل کر لی تھیں۔ ان وکیل صاحب نے اس مقدمے میں ایمن کے لیے ڈیفنس کونسل یعنی وکیل صفائی کا کردار ادا کرنا تھا۔ ایمن ابتدا میں بہت گھبرائی۔ وہ زبان ہی نہیں کھولنا چاہتی تھی لیکن وکیل نے اس سے کہا۔

”اولاد کو اپنے والدین سے، شاگرد کو استاد سے، مریضوں کو طبیب سے اور مجرم کو اپنے وکیل سے کوئی بات چھپانی نہیں چاہیے ورنہ نقصان ہوتا ہے۔“

ماں باپ سے رازداری برتنے کا انجام تو وہ بھگت رہی تھی۔ نبیل کے اپنے پیچھے آنے کا قصہ اس نے صرف ایک مرتبہ امی کو بتایا تھا۔ اگر وہ ان سے رازداری نہ برتتی اور انہیں مسلسل باخبر رکھتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچی ہوتی۔

اس نے اپنی کتاب زندگی کا ایک ایک ورق اپنے وکیل کے سامنے الٹ دیا تھا جسے انہوں نے نہایت عرق ریزی سے دیکھا تھا۔

ایمن اعتراف جرم کر چکی تھی۔ اپنے کیے پر نادم اور ضمیر کی خلش سے مضطرب تھی۔ اس نے اپنے وکیل کو اپنی چھوٹی سی عمر کی مختصر سی داستان سے آگاہ کرنے کے بعد کہا۔

”سر! آپ مجھے بے قصور ثابت کر کے سزا سے بچانے کی کوشش مت کیجیے گا...... میں نے گناہ کیا ہے...... میں مجرم ہوں...... مجھے اپنے جرم کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔“

”سزا سے تو کوئی مجرم نہیں بچ سکتا۔“ وکیل نے کہا۔

”نہیں سر...... بچ بھی جاتے ہیں...... وہ بچ گیا کہ نہیں؟“ ایمن کی آواز رندھ گئی۔ اس کا اشارہ نبیل کی جانب

تھا۔ اب وہ بھولے سے نبیل کا نام بھی اپنی زبان پر نہیں لانا چاہتی تھی۔

''کون!'' وکیل نے بے ساختہ چونک کر پوچھا۔

''وہی جو مجھے یہاں پہنچا کر خود بھاگ گیا ہے۔''

''نبیل؟''

اس نے نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ بچ گیا ہے...... ہوسکتا ہے، وہ تم سے اور سمیر سے بھی زیادہ عذاب میں مبتلا ہو۔''

ایمن چونک کر قدرے بے یقینی سے وکیل کو دیکھنے لگی۔

''جب سڑک پر کوئی شدید حادثہ ہوتا ہے تو متاثرین میں سے کوئی زخموں کی تاب نہ لاکر مرجاتا ہے۔ کوئی زخم بھرنے کے بعد دوبارہ زندگی میں واپس آجاتا ہے۔ کوئی معذور تو ہوجاتا ہے مگر پھر زندگی سے سمجھوتا کرلیتا ہے مگر کوئی ایسا بھی ہوتا ہے جو کوما میں جاکر موت اور زندگی کے درمیان معلق رہتا ہے۔ سانس کی ڈور تو چلتی ہے مگر زندہ ہوتے ہوئے بھی مُردوں سے بدتر...... اس کی وجہ سے اس کے متعلقین بھی امید اور ناامیدی کے تختے پر لٹکے رہتے ہیں...... جرم کے بعد سزا سے بچنے کے لیے مفرور ہوجانے والا مجرم اور اس کے متعلقین بھی ایسی ہی کیفیت میں ہوتے ہیں...... اور ایک بات تمہیں بتادوں...... میرا ایمان ہے کہ مجرم اپنے جرم کی سزا کسی نہ کسی صورت اسی دنیا میں بھگتتا ہے اور اوپر کا معاملہ تو اوپر والا ہی جانے کہ اسے معاف کرتا ہے یا دیتا ہے دائمی عذاب!''

''سر! جب آپ کو معلوم ہے کہ مجھے سزا ملنی ہی ملنی ہے تو آپ اپنا وقت کیوں ضائع کررہے ہیں میری وکالت کرکے؟'' ایمن نے کہا۔

وکیل نے چونک کر اسے دیکھا۔ بڑا عجیب سوال کررہی تھی وہ...... مجرم تو سزا سے بچنے کے لیے اپنے وکیل کو نعوذ باللہ خدا سمجھ کر اس کی منت سماجت، ٹھوڑی میں ہاتھ ڈالنے اور پاؤں پکڑنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

''جرم کی بیخ کنی کے لیے ان اسباب و واقعات کو بھی تو ہائی لائٹ کرنا ضروری ہوتا ہے جو کسی انسان کو مجرم بنانے کی وجہ بنتے ہیں...... بگڑتے معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر محاذ کو گرم رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''سر!'' ایمن نے اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں ہتھیلی پر دُہری کرکے ناخنوں پر نگاہیں مرکوز کرتے ہوئے بوجھل آواز میں کہا۔ ''میں...... میں اپنی غلطی کی وجہ سے تعلیم بھی مکمل نہیں کرسکی...... مجھے اس کا بے حد افسوس ہے۔''

''تعلیم کسی پر اپنے دروازے کبھی بند نہیں کرتی...... تم اب بھی پڑھ سکتی ہو...... تعلیم انسان کو انسان بناتی ہے۔''

''میں نے تو انسان بننے کی کوشش ہی نہیں کی...... حیوان بن گئی...... اپنے ماں، باپ اور اکلوتے بھائی کے قتل میں کون شریک ہوتا ہے بھلا۔'' ایمن کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

یہ اشکِ ندامت تھے!

☆☆☆

مقدمے کی سماعت کے دوران میں مختلف مقامات پر وکیل صفائی نے اپنی مؤکلہ کی حمایت میں ان کے اسباب و علل کو ممکنہ حد تک اجاگر کرنے کی کوشش کی تھی جن کے اثرات کے باعث ایک بھولی بھالی لڑکی مجرم بن گئی تھی جبکہ وکیل استغاثہ کا نکتہ اعتراض یہ تھا کہ وکیل صفائی اپنی مؤکلہ کو معصوم اور بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ہر پیشی پر غیر ضروری جذباتی تقریریں کرکے قتل کے اس بھیانک مقدمے کو ڈرامائی رنگ دینے کے لیے کوشاں ہیں۔ دوسری طرف وکیل صفائی کا کہنا تھا کہ وہ اس مقدمے میں عوام الناس اور میڈیا کی غیر معمولی دلچسپی کے باعث ان سماجی رویوں اور معاشرتی ناہمواریوں کو نمایاں کرنے کی ذمہ داری ادا کررہے تھے جو معاشرے میں اس قسم کے جرائم کو جنم دینے کی وجوہ بنتے ہیں تاکہ ان وجوہ کا سدباب کیا جاسکے۔

وکیل صفائی نے مختلف اوقات میں جن نکات پر روشنی ڈالی اس کا لب لباب یہ تھا کہ...... اس عمر میں جب لڑکیاں خوشبوؤں اور ہواؤں سے سرگوشیاں کرتی ہیں۔ پھولوں کی پنکھڑیوں کو اپنی کتابوں کے اوراق میں دبالیتی ہیں۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگتی، جگنوؤں کو مٹھی میں دبا کر خواب دیکھتی اور گھر کے آنگن میں لیٹ کر چاند ستاروں سے باتیں کرتی ہیں، معاشرے کے بعض افراد کے غیر سماجی رویے ان نازک اور کومل نوعمر لڑکیوں کے احساسات کو بری طرح مجروح کرتے ہیں۔ کچلے ہوئے جذبات ان میں احساس محرومی کو جنم دیتے ہیں پھر وہ تاریک راہوں کی مسافرت اختیار کرنے پر مجبور ہوجاتی ہیں۔ معاشرے کا ناانصافی پر مبنی رویہ ان کے اندر موجود معصومیت کو سفاکی میں بدل دیتا ہے۔ ایسے ہی بے رحم حالات نے ایمن جیسی نازونعم میں پلی بڑھی ایک معزز اور تعلیم یافتہ خاندان کی لڑکی کو خطرناک مجرم بنادیا ہے۔

وکیل صفائی کا کہنا تھا ان کی مؤکلہ جس معاشرے کی فرد تھی وہ ماضی میں بھی انسانوں ہی سے گندھا بندھا تھا۔

انسانوں میں آپس میں رشتے ناتے بھی وہی تھے جو آج ہیں لیکن شاید...... ان رشتوں ناتوں میں آج کے معاشرے کی سی بے حسی، لاتعلقی، خودغرضی اور نظرانداز گی نہیں تھی۔ رشتوں کو باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ تعلق اور ناتوں کی حفاظت کی جاتی تھی۔ کسی کو غلط راہ پر چلتے دیکھ کر ٹوکنا فرض عین سمجھا جاتا۔ جرم کی کونپل پھوٹنے سے پہلے ہی اس کی بیخ کنی کر دی جاتی۔ بیٹیاں اور بہنیں سانجھی ہوتیں۔ ان کی آبرو کو اپنی ناموس سمجھا جاتا۔ بہنیں، بیٹیاں گھروں سے نکلتیں تو گھر کے مرد بے پاؤں ان کے پیچھے جایا کرتے تھے اس لیے نہیں کہ انہیں اپنی بہن، بیٹی پر بھروسا نہ ہوتا تھا بلکہ انہیں تحفظ دینے اور یہ دیکھنے کے لیے کہ کوئی لفنگا... ان کے پیچھے نہ لگا ہو۔ کنبے مشترکہ نظام خاندان کے تحت رہتے۔ باپ سر پر نہ ہوتا تو بھائی اور اگر بھائی نہ ہوتا تو چچا، تایا، ماموں، خالو گھر سے نکلنے والی لڑکی کی محافظت سرانجام دیتے۔ ایمن کے باپ کی بسلسلہ روزگار گھر سے دوری کے دوران اس کے خاندان کے کسی فرد نے یہ ذمے داری ادا نہیں کی۔

ماں، ایمن کے کالج اس وقت گئی جب کالج سے اس کی غیر حاضری کی خبر آئی۔ اس سے قبل اس نے کبھی کالج جانے اور بیٹی کی سرگرمیوں کی خیر خبر لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ حالانکہ ایک جوان بیٹی کی ماں ہونے کے ناتے یہ اس کی اولین ذمے داری تھی۔

کالج میں ایمن کی ہم مکتب ساتھیوں نے اسے ایک نوجوان کے ساتھ موٹر سائیکل پر آتے جاتے دیکھا، ان میں سے اپنی قریبی دوستوں کو ایمن نے خود بتایا کہ وہ نوجوان اس کا کزن نہیں عاشق تھا۔ کیا کبھی کسی لڑکی نے اپنی اساتذہ کو بتایا اور اگر بتایا تو ایمن کی کبھی سرزنش کی گئی؟...... کبھی نہیں! ایمن کا کہنا ہے کالج کی لڑکیوں کا اپنے بوائے فرینڈز کے ساتھ آنا جانا عام سی بات تھی جو پرنسپل، اساتذات اور کالج کے چوکیدار اور دیگر غیر تدریسی عملے کے علم میں بھی ہوتی تھی مگر سب چشم پوشی کرتے بلکہ کالج کے مین گیٹ پر تعینات چوکیدار تو لڑکیوں کو کالج کے اوقات کے دوران ان کے بوائے فرینڈز کے ساتھ آنے جانے کی سہولت فراہم کرنے کی رشوت بھی لیا کرتا تھا!

مفرور ملزم نبیل ایک دو دن نہیں بلکہ کافی عرصے تک ایمن کو اس کے علاقے ہی سے پک اینڈ ڈراپ کرتا رہا۔ ایمن کے بیان کے مطابق کئی مرتبہ محلے کے بعض لوگوں نے اسے نبیل کے ساتھ آتے جاتے دیکھا بھی مگر کسی نے اس سے اس نوجوان کی بابت پوچھ گچھ کرنا یا مؤکلہ کے گھر والوں کو بتانا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ معاشرے کا ہر فرد دوسرے سے چشم پوشی کر کے اپنی اپنی نبیڑنے کے چکر میں ہے۔

ملزم نبیل، ایمن کو شریک جرم سمیر کے فلیٹ پر بھی لے جاتا رہا۔ سمیر کے اہلِ محلہ میں سے کسی کو تو یہ معلوم ہوگا کہ سمیر کی ماں بہنیں ان دنوں گھر پر نہیں ہیں۔ اہلِ محلہ سمیر کی حرکتوں سے بھی آگاہ تھے۔ کسی نے تو خالی گھر میں مفرور ملزم کو ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ جاتے دیکھا ہوگا۔ کسی نے یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ علاقے کے لیے نامانوس وہ نوجوان لڑکی جو کئی گھنٹے ایک نوجوان کے ساتھ ایک اکیلے فلیٹ میں رہی کون تھی، کہاں سے آئی تھی اور ساتھی نوجوان اور اس کے دوست سے اس کا کیا تعلق تھا اور اگر بالفرض آس پاس فلیٹوں میں مقیم افراد میں سے کسی نے انہیں دیکھا ہی نہیں تو اس بے خبری پر دو حرف بھیجنا چاہئیں۔

ایمن نے مفرور ملزم کو اپنے باپ کے ذریعے موبائل فون منگوا کر تحفتاً اسے دیا اور بہانہ یہ کیا کہ وہ اپنی دوست کو تحفہ دینا چاہتی ہے، ماں نے اس دوست سے ملنا ضروری کیوں نہیں سمجھا!

وقوعہ کی شب دونوں ملزمان رات گئے دیوار پھاند کر مقتولین کے گھر میں داخل ہوئے۔ محلے میں رات کے لیے چوکیداری نظام نہیں تھا جو دیکھ سکتا کہ رات گئے دو افراد کسی کے گھر میں دیوار پھاند کر کیوں داخل ہوئے تھے۔

وکیل صفائی کے خیال میں معاشرے میں بسنے والے افراد کے غیر سماجی رویے جرم کی بنیادی وجہ تھے۔ وکیل صفائی کا کہنا تھا ہر سطح پر افراد کی غیر ذمے داری، لاتعلقی، بے حسی اور چشم پوشی نے ایک نوجوان لڑکی کو اس سطح تک پہنچانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا تھا جس نے اسے قتل کی ایک ہولناک واردات کی شریک جرم بنا دیا تھا!

وکیلِ دفاع نے دورانِ بحث نہایت دردمندی سے کہا معاشرے سے جرائم کی بیخ کنی کے لیے معاشرے کے تمام افراد کو اپنی اپنی ذمے داری کا ادراک اور اس ذمے داری سے نظرپوشی نہ کرنے کی روایت کو پوری سنجیدگی سے عمل میں لانا ہوگا تبھی اس معاشرے کے سدھار کی امید کی جا سکتی ہے۔ نیز گلوبل ویلیج بنتی اور میڈیا کی اس بے لگام دنیا میں افراد کو کم از کم اپنے اپنے گھروں کی حد تک ایسا نظام ضرور ترویج دینا ہوگا جہاں والدین اپنی اولاد کو اور بڑے اپنے چھوٹوں کو خیر و شر، نیکی و بدی، ثواب و عذاب، جزا و سزا اور جنت و جہنم کا واضح اور راسخ تصور دے سکیں، وکیلِ دفاع کے خیال میں دنیا ماضی میں بھی یہی دنیا تھی۔ زمین پر پہلے بھی

انسان ہی بستے تھے لیکن ماضی میں جرائم اتنے نہیں ہوتے تھے۔ دنیا گناہوں میں اتنی لتھڑی ہوئی نہیں تھی۔ انسان، درندے اس لیے بن گئے کہ انہوں نے ذمے داریوں سے صرفِ نظر کر کے صرف اپنے حقوق پر نظر رکھنا سیکھ لیا ہے۔ معاشرے کو بگاڑ او ردرندگی سے بچنا ہے تو اسے شیطان کی راہ چھوڑ کر رحمان کا راستہ اپنانا ہوگا۔

وکیل استغاثہ نے وکیلِ صفائی کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے کہا۔ ''وکیلِ دفاع اپنی مؤکلہ کا جرم معاشرے کی گود میں ڈال دینا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں سارا معاشرہ گناہ گار ہے سوائے ان کی معصوم مؤکلہ کے۔''

وکیلِ دفاع نے تائید کی۔ ''بالکل جناب...... میری مؤکلہ درحقیقت معصوم ہے۔ اس کی معصومیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ......'' وکیلِ دفاع نے توقف کیا پھر کہا۔ ''میرے اس نکتے کی گواہی اس معزز عدالت میں جمع تفتیشی پولیس افسر کی رپورٹ دے گی کہ...... جس شخص کے بارے میں میری مؤکلہ یہ تک نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں رہتا ہے، کیا کرتا ہے، اس شیطان نے میری مؤکلہ کو اپنی شیطنت سے جنت بدر کروادیا۔''

''لیکن اسی کے ساتھ آپ کی معصوم مؤکلہ اپنی مرضی سے بدفعلی کی مرتکب ہوئی...... ایک بار نہیں...... کئی بار...... آپ کی معصوم مؤکلہ پر قتل کے ساتھ زنا کی تعزیز بھی لگتی ہے...... اور زنا کی تعزیر، آپ میرے فاضل دوست بخوبی جانتے ہیں کیا ہے۔'' سرکاری وکیل نے کہا۔

جنہیں عدالتوں سے واسطہ نہیں پڑا وہ سمجھتے ہیں عدالتوں میں نہ جانے کس زبان میں اور کیسی باتیں ہوتی ہوں گی...... جن کا واسطہ پڑا ہے، وہ جانتے ہیں عدالتوں میں بھی زندگی کی زبان بولی جاتی ہے...... زندگی کی باتیں ہوتی ہیں...... زندگی کے نوحے پڑھے جاتے ہیں...... زندگی ہی کا ماتم برپا ہوتا ہے...... اس ماتم کے بعد...... کچھ لوگ عدالتوں سے سرخرو ہو کر نکل آتے ہیں، کچھ اپنے جرم کی سزا بھگتنے سلاخوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے طوماروں دنیا لپیٹے جانے کے بعد آخرت میں سرخرو ہونے والے داخلِ جنت اور سزا پانے والے واصلِ جہنم ہوں گے۔ فرق ہوگا تو اتنا کہ وہاں نہ کسی کے ساتھ ذرہ برابر ناانصافی ہوگی نہ کوئی مجرم نبیل کی طرح مفرور ہو سکے گا! وہاں تو مجرم کے لیے ہر صورت پکڑ ہی پکڑ ہے!

☆☆☆

عدالت میں وکیل صفائی کی جذباتی تقریریں بھی ایمن کو سزا سے نہ بچاسکیں۔ جرم کی شدت، ہولناکی اور حالات وواقعات کی روشنی میں سمیر کو سزائے موت اور ایمن کو تاحیات قید اور باپ کی وراثت سے محرومی کی سزا سنائی گئی۔ نبیل مفرور اشتہاری ملزم تھا۔ وہ جب اور جہاں بھی قانون کے ہاتھوں پکڑا جاتا، اسے اپنے جرم اور اس کی سزا کا سامنا کرنا ہی کرنا تھا۔

سمیر کی بیوہ ماں کی آنکھوں سے آنسو تھمتے نہ تھے اور ایمن کے لیے کوئی ایک آنکھ بھی آنسو بہانے کو تیار نہ تھی۔

عدالت کے فیصلے کے بعد عدالت سے باہر سرکاری وکیل نے ایمن کے وکیل سے کہا۔ ''افسوس ہے جناب کہ آپ کی بھاری بھر کم جذباتی تقریریں بھی آپ کی مؤکلہ کو سزا سے نہ بچاسکیں۔''

''میری مؤکلہ سزا سے بچنا بھی نہیں چاہتی تھی سرکار۔'' ایمن کے وکیل نے کہا۔

''پھر تو آپ نے بلاوجہ اپنی توانائی اور وقت برباد کیا۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا...... ہماری جگہیں مختلف تھیں...... اپنی مؤکلہ کے وکیل کے طور پر میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا چاہیے تھا...... آپ اگر میری جگہ پر ہوتے تو آپ بھی وہی کرتے جو میں نے کیا۔''

''اور میری جگہ پر آپ ہوتے تو......؟''

''تو میں بھی وہی کرتا جو آپ نے کیا۔'' ایمن کے وکیل نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ وکیل سرکار کی جانب بڑھادیا۔ وکیل سرکار نے وکیلِ دفاع کا ہاتھ تھام لیا اور دونوں مسکرادیے۔

کمرائے عدالت سے باہر نہ سرکاری وکیل، وکیل استغاثہ ہوتا ہے نہ وکیلِ دفاع، ملزم کا وکیل...... وہ نہ کمرائے عدالت کے منظر میں ایک دوسرے کی تکذیب کے درپے نظر آتے ہیں، نہ ایک دوسرے کے حریف دکھائی دیتے ہیں...... ان کے رویے عام انسانوں کے رویے ہوتے ہیں اور ان کی باتیں عام انسانوں کی سی باتیں!

ایمن کی وکالت کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے والی این جی او نے ایمن کی سزا میں تخفیف کے لیے عدالت عالیہ میں اپیل دائر کرنے کا فیصلہ کیا۔

اپیل دائر کردی گئی۔

اپیل میں عدالت عالیہ سے درخواست کی گئی کہ چونکہ وقوعہ کے وقت ملزمہ کی عمر اٹھارہ برس سے کم تھی اور حالات وواقعات ثابت کرتے ہیں کہ اصل مجرم جو مفرور ہے اس کے بہکائے میں آکر وہ ایسے بھیانک اور ناقابلِ تلافی نقصان

سے دوچار ہوئی جس نے اس سے وہ رشتے چھین لیے جنہیں ایک نظر دوبارہ زندہ دیکھنے کے لیے وہ ساری زندگی بھی بھٹکتی رہے تو نہ دیکھ پائے گی۔ وہ تاحیات اپنے ضمیر کی سولی پر لٹکی رہے گی اور اس کے لیے یہ سزا اسے عدالت سے ملنے والی تاحیات قید سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا اس کی سزا میں تخفیف کی گزارش ہے۔

عدالتِ عالیہ نے ایمن کو دی جانے والی سزا میں تخفیف کا پروانہ جاری کر دیا۔

☆☆☆

جیل میں گزارے جانے والے وقت نے ایمن کی جون ہی بدل دی۔ اس کا روپ گہنا گیا۔ آنکھیں جو کبھی ستاروں کے مانند دمکتی تھیں، آنسوؤں کی یورش سے اپنے اردگرد سیاہ حلقوں میں ڈوب گئیں۔ وہ لب جو ذرا ذرا سی بات پر غنچوں کی طرح مسکرا اٹھتے تھے بھول گئے کہ کبھی مسکرائے بھی تھے۔ وہ سراپا جو پر بہار تھا، اس پر ایسی خزاں چھائی کہ ہڈیوں کی مالا بن گیا۔ زبان جسے ڈراموں اور فلموں کے نام از بر ہوا کرتے تھے، اب اللہ کے ذکر سے تر رہتی۔

اپنی نادانی اور عاقبت نااندیشی سے اس نے سارے خونی رشتے کھو دیے تھے۔ ہمن یا شاہد کے خاندانوں میں سے کبھی کوئی اس سے جیل میں ملنے کے لیے نہیں آیا۔ لگتا تھا وہ سب اسے ایک حرفِ غلط سمجھ کر اپنی بیاضِ زندگی سے مٹا بیٹھے تھے۔ اس کے ملاقاتی مقدمے کی پیروی کرنے والے این جی او کے وکلاء تھے اور چند دیگر ارکان جو عید، بقر عید پر اس کے لیے اچھا کھانا اور چھوٹے موٹے تحائف لے کر آجاتے اور کبھی کبھار کوئی کتاب۔

جیل کوئی اچھی جگہ نہ تھی۔ گنجائش سے زیادہ قیدی، بیماریاں، گھٹن اور دل کو اپنے پنجے میں جکڑتی سوگواریت اور مردنی، اس مردنی میں خود کو زندہ رکھنا بھی ہنر تھا۔ زندہ رہنے کے لیے لوگ اللہ سے لو لگا لیتے۔ ایمن نے بھی اسی سے ناتا جوڑ لیا تھا۔ نماز سے دل کا سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ قرآن پڑھنے اور اس کو سمجھنے میں جو وقت گزرتا، وہی اسے حاصل زندگی لگتا۔ وہ قرآن مجید کا ترجمہ اور تفسیر نہایت خشوع وخضوع سے پڑھتی۔ دینی کتب کبھی جیل کے اندر ہی مختلف ذرائع سے مل جاتیں۔ کبھی این جی او سے آنے والا کوئی ملاقاتی لا دیتا۔

ماں، باپ اور دانش اسے ٹوٹ کر یاد آتے...... کبھی زندہ، کبھی مردہ ان کے چہرے اس کی نگاہوں میں گھومتے رہتے۔ اس منظر کی یاد جب اس نے آخری مرتبہ ان تینوں کو کفن میں لپٹے، آنکھیں بند کیے اور لبوں پر چپ کی مہر لگائے دیکھا تھا۔ امی کہتیں۔ ”تو نے یہ کیا کیا ایمن...... ہمیں تو مٹایا ہی خود بھی مٹ کر رہ گئی۔“ ہاں واقعی ...... مٹ ہی تو گئی تھی وہ ...... لاکھ ڈھونڈے بھی اسے اپنا پتا نہ ملتا تھا اور نبیل جس کے عشق کی اسیر ہو کر اس نے اپنا تن من ہی اس پر نثار نہیں کیا تھا ماں، باپ اور بھائی کو بھی اس پر وار دیا تھا، اس سے اسے ایسی نفرت ہو گئی تھی کہ تصور میں بھی اس کا چہرہ نگاہوں کے سامنے آتا تو اس کے منہ پر تھوک دینے کو جی چاہتا...... اس بدبخت نے اسے دنیا کا چھوڑا تھا نہ دین کا۔

وہ کبھی کبھی سوچتی دنیوی عدالت سے ملی سزا بشرط زندگی ایک نہ ایک دن ختم ہو ہی جانی تھی۔ جس دن کسی قیدی کو جیل سے رہائی نصیب ہوتی، جیل میں اسے اچھا کھانا کھانے کو ملتا۔ متعلقین اسے لینے کے لیے آتے اور رہائی پانے والا قیدی اپنے ساتھیوں سے مل کر خوشی خوشی جیل سے باہر جاتا۔ ایمن سوچتی جب وہ اپنی سزا پوری کر کے رہا ہوگی تو اسے کون لینے آئے گا...... ہمن اور شاہد کے خاندانوں میں سے تو شاید کوئی بھی نہیں ...... کبھی اسے اپنے گھر کا خیال آتا ...... نہ جانے کس حال میں ہوگا...... وہاں کوئی بستا بھی ہوگا یا نہیں...... شام کو اس گھر میں بتی جلتی ہوگی یا کسی مرقد کی طرح تاریک رہتا ہوگا؟ عدالت سے سنائی جانے والی سزا نے اسے اس گھر سے بھی محروم کر دیا تھا۔

کبھی کبھی وہ سوچتی جیل سے نکل کر وہ دنیا کا سامنا کیسے کر پائے گی...... معاشرے میں اس کی ایک ہی پہچان رہ گئی تھی کہ وہ ایسی سفاک بیٹی تھی جس نے اپنے محبوب کی خاطر ماں، باپ اور بھائی کے قتل میں معاونت کی تھی۔ کیا معاشرہ اس کے اس قبیح جرم کو کبھی بھول سکتا تھا...... معاف کر سکتا تھا...... شاید کبھی نہیں...... اور اللہ رب العزت نے تو اس جیسوں کے بارے میں اپنی مقدس کتاب قرآن حکیم میں واضح صراحت فرما دی تھی کہ جو شخص کسی کو عمداً قتل کر دے تو اس کی سزا دوزخ ہے (سورۃ النسا۔ آیت 93)

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”قیامت کے دن مقتول اپنے قاتل کو اس شان سے اللہ تعالیٰ کے حضور لائے گا کہ اس کی پیشانی اور سر اس کے ہاتھ میں ہوگا اور اس کی شہ رگ سے خون کی دھاریں بہہ رہی ہوں گی اور وہ کہے گا اے پروردگار! اس سے پوچھ اس نے مجھے قتل کیوں کیا؟“ اس

موقع پر لوگوں نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ اگر کسی نے قتل کے بعد توبہ کرلی تو؟ جناب ابن عباسؓ نے سورۃ النسا کی آیت نمبر ترانوے پڑھی اور فرمایا۔ ''یہ آیت نہ منسوخ ہوئی نہ تبدیل ہوئی ہے۔ مومن کے قاتل کے لیے توبہ کہاں؟''

زنداں خانہ میں ایمن دن رات خود احتسابی کے کٹہرے میں مجرم بنی کھڑی رہتی۔ نبیل کے عشق میں اسے اچھے برے، نیکی بدی کی تمیز ہی نہ رہی تھی۔ اس عشق خانہ خراب میں اس سے ایک اور قبیح گناہ بھی تو سرزد ہوا تھا جس کی قباحت قرآن حکیم کے الفاظ میں یہ ہے۔ ''اور نہ قریب پھٹکو زنا کے، بے شک وہ ہے بڑی بے حیائی اور بہت ہی بری راہ۔'' (بنی اسرائیل۔ آیت نمبر 32) اور جس کی سزا کی مد میں قرآن مجید فرقانِ حمید کا واضح اعلامیہ ہے۔ ''زانی عورت اور زانی مرد، کوڑے مارو ہر ایک کو ان دونوں میں سے سو سو کوڑے۔ اور نہ دامن گیر ہو تم کو ان کے سلسلے میں ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں اگر رکھتے ہو تم ایمان اللہ پر اور آخرت پر اور چاہیے کہ مشاہدہ کرے ان کی سزا کا ایک گروہ مومنوں کا۔'' (النور۔ آیت نمبر 2)۔ اس گناہ کی سزا اگر اسے ملتی تو کیا وہ اسے برداشت کرسکتی تھی؟

جیل میں وہ صرف عدالت سے ملنے والی سزا ہی نہیں اپنے ضمیر کی عدالت سے لگاتار ملنے والی سزا بھی بھگت رہی تھی۔

ایک تصنیف کے یہ الفاظ اس کے احساسِ جرم پر تازیانہ ثابت ہوئے۔ ''یہ یقین رکھو کہ لوگوں کو اندر سے خبر ہوتی ہے کہ وہ آخر اس حال کو کیوں پہنچے؟'' اس کی آنکھیں اشک ندامت و حسرت سے چھلک اٹھیں۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس حال کو کیوں پہنچی...... وہ لوگ بھی جو اس سے واقف تھے، وہ بھی جانتے تھے کہ وہ اس حال کو کیوں پہنچی...... اور عجب بات یہ تھی کہ وہ بھی جو اسے نہیں جانتے تھے انہیں بھی خبر تھی کہ اس جیسے اس حال کو کیوں پہنچتے ہیں!

اس جیسوں کو آئینہ دکھاتی اور رنج و ملال کو گہرا کرتی ایک صاحب نظر عالم کی تصنیف زنداں خانہ میں اس کے ہاتھوں تک پہنچی۔ عشق کے باب میں لکھا تھا۔

''عشق عین فطرت ہے۔ عبودیت ہے۔ جس نے اخلاص کے ساتھ اپنے خالق و مالک سے عشق کا رشتہ قائم کرلیا اس کے لیے حیات کی دشوار گزار گھاٹی کا ہر راستہ آسان...... جس نے چار چیزوں کی حفاظت کرلی، اس نے شیطان کے خلاف مورچے بنا کر اپنی دنیا اور دین دونوں محفوظ کرلیے...... نظر، قلب، الفاظ اور قدم!...... شیطان ملعون انسان کی دنیا اور دین برباد کرنے کے لیے سب سے پہلے آدمی کی نگاہ پر گھات لگاتا ہے اور نگاہ کے راستے اس کے قلب میں داخل ہوکر قلب کو اس طرح فاسد کرتا ہے کہ انسان خالق کے بجائے اپنے نفس کا غلام بن جاتا ہے۔ انسان کے ارادے، افعال اور اقوال فاسد ہوجاتے ہیں۔ محرم اور نامحرم کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ سفلی جذبات کی رو میں بہہ بندے کا اپنے ہی جیسے بندے سے عشق اسے اسیری اور غلامی کے اس درجے پر پہنچا دیتا ہے جہاں وہ کسی سے پانی مانگنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ عاشق پر عشق کا نشہ کچھ اس طرح سوار ہوتا ہے کہ اسے اس نشے کے نتیجے میں ملنے والی ذلت و رسوائی کی مصیبت کا شعور و احساس تک نہیں ہوتا۔ عاشق اور معشوق اپنی اپنی اغراض کی خاطر اللہ کے بندوں پر ظلم کرتے اور کراتے ہیں۔ ظلم کرنے میں ایک دوسرے کی اعانت و امداد کرتے ہیں۔''

یہ الفاظ تو اس کی اپنی بپتا تھی!...... نہ وہ اس بدبخت نبیل کی طرف نگاہ اٹھاتی نہ شیطان کو اس کے قلب میں داخل ہونے کا راستہ ملتا...... کیسا فساد مچایا تھا شیطان نے اس کے دل میں داخل ہوکر! ارادے، افعال، اقوال سب پراگندہ کردیے تھے...... نبیل کے عشق میں گرفتار ہوکر اس کے الفاظ بھی فاسد ہوگئے تھے...... امی سے کتنی بدزبانی کرنے لگی تھی وہ، ہر بات کا بے دھڑک جواب اور جھوٹ پر جھوٹ...... نبیل سے وہ ایسی ایسی باتیں کرجاتی تھی جو کسی نامحرم کے لیے کسی لڑکی کی زبان سے زیب نہیں دیتے تھے...... اور قدم بہک کر وہاں وہاں جا پہنچے تھے جہاں سے لوٹ کر اسے بدنامی، ذلت، مصیبت اور بالآخر قید خانے کی ہولناکی کے سوا کچھ نہ ملا تھا...... اگر اس نے اپنی نگاہ، قلب، الفاظ اور قدم کی حرمت کا پاس رکھا ہوتا، ان کی حفاظت کی ہوتی تو...... امی، ابو اور دانش کی زندگی اگر اتنی ہی تھی جتنی وہ جیے تو ان کے خون کے چھینٹے اس کے اپنے دامن پر نہ ہوتے اور...... وہ اپنے ضمیر کی ٹکٹکی سے بندھی اور نزع کی بنی ہر پل تازیانہ نہ کھا رہی ہوتی...... یہ بھی تو ممکن تھا کہ...... امی، ابو اور دانش زندہ ہوتے اور...... وہ خود بڑی پھپھو کے بیٹے جواد کی منکوحہ بن کر عزت کی زندگی بسر کر رہی ہوتی!

یہ یقین رکھو کہ لوگوں کو اندر سے خبر ہوتی ہے کہ وہ آخر اس حال کو کیوں پہنچے!